محبّت، یقین، اعتماد
WWW.PAKSOCIETY.COM
سمیرا شریف طور
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

محبت یقین اعتماد

سمیرا شریف طور

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور
فون: 042-37652546 ، 042-37668958
www.alquraish.com E.mail:info@alquraish.com

فہرست

پیش لفظ

محبت، یقین، اعتماد......

محبت، جسے سمیرا شریف طور کا قلم جس ہیئت میں ڈھالنا چاہتا ہے ڈھال سکتا ہے۔ چاہے وہ شدت پسندی کی انتہا پہ ہو یا بے بسی کی انتہا پہ۔ ''یقین'' جس پر محبت کا پورا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے۔ محبت کا وجود یقین کی ٹھوس زمین پر تعمیر ہوتا ہے، تشکیل پاتا ہے۔ اپنے حُسن، شدت اور انتہا کو ظاہر کرتا ہے۔ محبت جو کبھی زافر کی مانند ہوتی ہے تو کبھی کانچ کی مانند، خوشبو جو بکھر جاتی ہے، جو نہال کرتی ہے اور کانچ جس کی نوک جہاں بھی لگتی ہے بس زخم چھوڑ جاتی ہے۔ محبت اور یقین کو زیبائش اعتماد کی جگمگاہٹ سے ملتی ہے۔

جب بے یقینی کا ''دیمک'' محبت کو چاٹتا ہے تو اعتماد کے وجود کو خود بخود ڈھا دیتا ہے۔ اگر محبت ثادق کی مانند ٹھنڈک ہے تو یقین اور اعتماد مضبوطی، قرار، پائیداری اور پختگی کا نام ہیں۔

محبت جو کچے دھاگے کی طرح کمزور بھی کرتی ہے اور ''تھام'' بھی بخشتی ہے۔ محبت، یقین کے توسل سے اعتماد تک پہنچتی ہے اور اگر اعتماد کو ٹھیس پہنچے تو محبت کا وجود پاش پاش ہو جاتا ہے۔

محبت ''ترصد'' کی مالا کا ایک موتی ہے جس کو یقین کی آس، اُمید کی سانس اور توقعات سے تزئین دی جاتی ہے۔ محبت جو کبھی تر ابر کی مانند ہے تو کبھی سیاہیٔ شام کی مانند۔ کبھی قربانی مانگتی ہے تو کبھی خود قربان ہو جاتی ہے۔

سمیرا شریف طور کی اس تیسری کتاب ''محبت یقین اعتماد'' میں گرما دینے والی محبت کی پرتیں کھلیں گی۔ یہ سمیرا کے قلم کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ جو بھی تحریر قاری کے ذوقِ مطالعہ کے لئے لکھی جائے اسے ''اکمل'' بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر منظر نگاری یا مکالموں کا استعار کیا جائے یعنی مول کیا جائے یا انہیں اسطر (میزان) پر رکھا جائے تو یہ کہنا مشکل ہو گا کہ کون سا پلڑا زیادہ بھاری ہے۔

خوب صورت پلاٹ سے لے کر کردار نگاری یا منظر نگاری تک لفظوں کے ازدھر کو صفحۂ قرطاس پر پھیلا دینا سمیرا کے قلم کا ایک انوکھا اور منفرد فن ہے۔

میں تے ''جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا'' جیسے مدتوں نہ بھولنے والے ناول میں جو محبت کی اونچائی، بلندی اور رازہاریعنی شگوفے اور کلیاں بکھرتی دیکھیں، عموماً سمیرا کے قلم کا یہی اسلوب اور طریقہ رہا ہے۔

''عبدالباری'' کے کردار میں سمیرا نے انسانی ذہن کی گتھیاں کھولیں جو پنہاں اور خفیہ، مثبت اور منفی خوبیاں یا خامیاں موجود تھیں، ان کو بڑے سلیقے اور سبھاؤ کے ساتھ سامنے لائی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ یہ ناول محبت کی اونچائی کے ساتھ ساتھ ''عبدالباری'' جیسے کردار کی بدولت ''مہد'' ہوا۔ اور سمیرا کے لئے یہ ناول رفعت کی جانب ایک بہترین ''سمبل'' بنا۔

نایاب جیلانی

محبت، یقین، اعتماد

''ساری دنیا کے گھروں میں اٹیشین، اٹالین، یوربین ڈشز بنتی ہیں۔ ساری دنیا شوق و رغبت سے کھاتی ہے۔ لے دے کے ایک ہمارا انوکھا زالا بلکہ خالص روایتی گھر ہے، جس میں دیسی کھانوں کے سوا کچھ اور پکتا ہی نہیں۔'' روٹیوں پر طبع آزمائی کرتے، منہ بسورتے وہ خاصی اونچی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''یقین کریں ونیزے آپی! کبھی کبھی دل چاہتا ہے احتجاج کروں۔ باقاعدہ بھوک ہڑتال شروع کردوں، لیکن ہائے میری دادی اماں...... بڑی سخت ڈکٹیٹر ہیں۔ کاش کچھ روح ان کے اندر رہتی ہے، مجال ہے کبھی مرغ کو چکن جاؤ من بنانے کی سوچ بھی ذہن میں در آنے دیں جو گستاخی کرے۔''

وہ بدستور اپنے اردگرد سے بے خبر کہہ رہی تھی کہ کچن میں داخل ہوتیں دادی اماں کے ناتواں کانوں نے اس کے نادر خیالات سن لیے تھے۔ وہ جو آہستہ آہستہ چلتی اپنے گھٹنوں کے درد کو کوس رہی تھیں، وجیہ کے نادر فرمودات سے بہرہ ور ہونے کے بعد تیز تیز قدم اٹھاتی اس کے عقب میں جا کھڑی ہوئی تھیں۔

بڑی نفاست سے گھونٹ گھونٹ چائے اپنے حلق میں انڈیلتی ونیزے انہیں جلال کی بجلیاں اپنے چہرے پر طاری کیے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''وجیہ۔'' خاصی نحیف آواز میں اسے متوجہ کرنے کو پکارا، اگرچہ مجال ہے جو اس نے سنا ہو۔ وہ کن انکھیوں سے دادی اماں کو دیکھنے لگی، پھر ایک نظر وجیہ پر ڈالی جو بدستور روٹیاں بنانے آج دال گوشت پکنے پر برے برے منہ بنا رہی تھی۔ بلکہ چند سیکنڈ پہلے ادا ہونے والے فرمودات بھی اسی حوالے سے تھے۔ وہ مزید دادی اماں کی آمد سے بے خبر اپنی راگنی چھیڑے کچھ کہہ رہی تھی۔ ونیزے نے بمشکل ڈرتے ڈرتے دادی اماں کے تیور ملاحظہ کیے۔ ان کے چہرے پر وجیہ کی بات پر غصہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

''سچ ونیزے آپی! مجھے تو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ آپ تو چائنیز کھانوں کی عادی ہیں پھر اب کیسے یہ سڑیل روایتی دیسی کھانے کھا لیتی ہیں۔ کیا آپ کو ان کم مرچ مصالحوں والے کھانے کھا کر ابکائی نہیں آتی۔''

ونیزے کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر دادی اماں اس کی چٹیا پکڑ لیں گی اور ہوا بھی ایسے ہی تھا۔ جیسے ہی اس نے وجیہ کے پاؤں پر پاؤں مار کر اسے دادی جان کی موجودگی سے باخبر کرنا چاہا مگر رزلٹ الٹا ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی بلبلا کر پلٹی ونیزے کے اپنے ہی ہاتھ میں پکڑا گلاس اس کا ہاتھ لگنے سے چھوٹ کر زمین بوس ہو کر شہید ہو گیا۔ بے چارے مرحوم کے ٹکڑے اردگرد بکھرے ہوئے تھے۔

''ارے...... خدا کی پناہ...... کیسی بلا خور لڑکی ہو تم۔ ہر وقت ناشکری پر تلی رہتی ہو۔ ذرا ادھر تو آؤ میں تمہیں بتاتی ہوں کیسے ابکائی آتی ہے۔'' اتنا قیمتی خوبصورت شیشے کا گلاس ٹوٹنے پر دادی اماں مزید چراغ پا ہو گئیں۔ فوراً آگے بڑھ کر وجیہ کا بازو دبوچا وہ جو ان کی آمد سے قطعی بے خبر تھی، اپنی جگہ سے یوں اچھلی گویا بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ وہ ایک دو قدم پیچھے بھی ہٹی تھی مگر اب دادی اماں

سے بچنا ناممکن تھا۔

"خدا کی مار تجھے... لے کے اتنا خوبصورت گلاس توڑ دیا ہے اوپر سے ناشکری کی حد کرتی ہے۔ موئے انیٹی اناٹی کو روتی ہے۔" وجیہ کے بازو کو زور زور سے جھنجوڑتے انہوں نے اٹیلین اطالین کو "انیٹی اناٹی" میں تبدیل کر دیا۔ ویزے کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری مگر اس نے کمال ہوشیاری سے ضبط کر لی۔

"اوہوں دادی اماں! کونسا کچھ میں نے غلط کہہ دیا ہے۔ جس دور میں ہم جی رہے ہیں، روز نئی نئی ڈشز دریافت ہو رہی ہیں۔ لوگ انتہائی شوق سے کھاتے ہیں اور ہمارے گھر میں دیسی کھانوں کے علاوہ کچھ اور پکتا ہی نہیں ہے۔ کبھی دال پالک، کبھی مرغ چاول، کبھی دال کدو، کبھی خالی دال۔ میں تو تنگ آ چکی ہوں اس روٹین سے۔" وجیہ ایک لمحے کو ڈری تھی غصے سے اپنا بازو چھڑوا کر زور زور سے مرغ دال والی ہنڈیا میں چمچہ چلایا اور پھر روٹی بیلنے لگی۔ دادی اماں نے اس کے یوں دو بدو جواب دینے پر زور سے اسے دوہتڑ مارا۔

"خبردار لڑکی! اگر تم نے تیکھی والی بات کی تو۔ جان نکال لوں گی تمہاری۔ ارے ناشکری! خدا کا شکر ادا کر۔ تینوں وقت کی اچھی بھلی کھا کر سوتی ہے۔ تجھے کیوں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ کچھ دال کھا، چاہے سب وقت یہ منہ ہے تجھے۔ کس چیز کی کمی ہے۔ کبھی ان لوگوں کی طرف نظر اٹھا کر کیوں نہیں دیکھا جو ایک لقمے کی خاطر دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ جب تک میں ہوں اس گھر میں ایسے ہی کھانے پکیں گے۔ چسکا لگ گیا ہے تجھے مرچ مصالحوں بھرے کھانے کھانے کا۔ اگر میں دیسی کھانوں پر زور دیتی ہوں تو تم لوگوں کی صحت کی وجہ سے ورنہ یہ جو اٹیلیانی کھانے کھا کر تم لوگوں کے دماغوں میں کچھ ہوتا ہے نہ ہی آنکھوں میں کچھ سمجھ میں آئی میری بات۔ موئے انگریز یہ کھانے نکال کر چلے گئے اور ہم مردوں کی عادت ڈال گئے ہیں۔" اپنے خاصے بے لچک تحکمانہ انداز میں کہتے انہوں نے گھورتے ایک لمبی تقریر کر ڈالی تھی۔ وجیہ نے آنکھ اٹھاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

ویزے کے ہونٹوں پر اس سعادت مندی کے بھرپور مظاہرے پر ایک خوبصورت مسکان ابھر آئی تھی۔ اس دفعہ ویزے نے مسکراہٹ روکنے کی ناکام کوشش نہیں کی تھی۔ کھل کر مسکرائی۔ وجیہ کی تمام روٹیاں پک چکی تھیں۔ توا اتار کر بات پاٹ ڈھک کر اس نے برنر بھی آف کیا۔

"بس کریں دادی اماں! بچی ہے نا، سمجھ جائے گی آہستہ آہستہ ہی عقل آ جائے گی۔" دادی اماں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کو اس نے بھی زبان کھولی تو اس کی بھولی بھالی معصوم صورت دیکھ کر وہ فوراً ہی دھیمی پڑ گئیں۔

"میں اس گھر کی یا اس کی دشمن نہیں ہوں۔ سب کے بھلے کی ہی کہتی ہوں۔ اب یہ تو نہ ہی بچی ہے اور نہ ہی کم عقل۔ جب میں اس کی عمر کی تھی تو اللہ رکھے اس کے بڑے ابو جہانگیر احمد کو، وہ میری گود میں تھا، دودھ پیتا تھا اور ایک یہ نحوست ماری ہے۔ بارہویں میں پڑھتی ہے، دیو جتنا قد ہے اور عقل نام کی نہیں ہے۔ لڑکوں کی طرح اچھلتی کودتی ہے۔ چیخنا چنگھاڑنا کرتی ہے، ہر بات پر اعتراض۔ لڑکیاں تو نظر کے اشارے سے ہی سمجھ جانے والی مخلوق ہیں۔ خدا جانے یہ مصیبت کس پر چلی گئی ہے۔ خدا کا عذاب ہی تو ہے۔" دادی اماں نے وجیہ کی اور بھی بہت سی خامیاں جو ایک عرصے سے کھٹک رہی تھیں گنوائیں۔ وہ اندر ہی اندر غصے سے تلملا اٹھی۔

"دادی اماں پلیز..... " خاص طور پر ان کی آخری بات پر وجیہ احتجاجاً چیخی تھی۔ مگر غصے کی زیادتی سے فوراً چپ بھی ہو گئی۔ مبادا کچھ غلط نہ بول جائے۔ دادی اماں کے سامنے تو ابو چچا، امی چچی تک کی زبان بند ہو جاتی تھی وہ تو پھر نیا نیا بولنا سیکھی تھی۔ اتنی گستاخی کیسے کر جاتی۔

"یہ پولیس، ولیس کی ترکیاں مجھے مت لگایا کرو۔ سیدھی ہو جاؤ جب سے کالج جانا شروع کیا ہے زبان ہی دراز کر لی ہے۔ ہر وقت ٹر ٹر کرتی رہتی ہے۔ اگر اب بھی اثر نہ ہوا تو ٹانگیں توڑ کر کمرے میں ڈلوا دوں گی۔ جو گھر میں پکتا ہے، جو سب کھاتے ہیں،

وہی تم بھی کھاؤ گی۔ مہارانی نہیں ہو جو تیرے لیے علیحدہ مرغ مسلم بھون کر رکھے جائیں۔" دادی اماں نے تو رہی سہی کسر بھی نکال دی تھی۔ وہ سر جھکا کر رہ گئی مگر دھیمی آواز میں کہے بغیر نہ رہی۔

"اتنی کنجوسی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ جب خدا نے ہمیں دیا ہے تو شکر ادا کرتے کھائیں بھی ناں۔ سنبھال سنبھال کر رکھیں گے قبر میں لے جانا ہے نا۔"

"کیا کہا تو نے.....؟" اسے اچھی خاصی سنا کر دادی اماں جو باہر جانے کو قدم اٹھا رہی تھیں ان کے تیز کانوں تک وجیہ کی یہ مدھم سرگوشی پہنچ گئی تھی۔ فوراً پلٹیں، وجیہ کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

"کچھ نہیں دادی اماں! میں تو کہہ رہی تھی آپ بالکل بجا فرماتی ہیں بلکہ میں ہی ناشکری ہوں بلکہ بقول آپ کے نحوست ماری۔" بوکھلا کر وہ پھر چبا چبا کر کہتی ویزے کو مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

"اچھا جلدی سے کھانا لگاؤ سب انتظار کر رہے ہیں۔" وجیہ چونکہ بیان بدل گئی تھی اس لئے دادی اماں نے اسے گھورنے پر اکتفا کرتے اس کی جان بخشی کی تھی۔ وہ پھر اپنے گھٹنوں کے درد کو کوستے باہر نکل گئیں تو وجیہ قریب رکھی کرسی پر یوں گری جیسے معرکہ سر کر کے آئی ہو۔

"توبہ ہے..... ایک تو یہ ہماری پیاری دادی اماں بھی ناں..." بات ادھوری چھوڑ کر اس نے اپنے گالوں پر ہاتھ رکھ کر ان سے پھوٹتی حرارت محسوس کی جو صرف اور صرف دادی اماں کے جلال کی وجہ سے پھوٹ رہی تھی۔

"تم نے بھی تو حد کر دی وجیہ! تو پہ اتنا بولتی ہو، کبھی تو چپ رہ لیا کرو۔ سامنے بیٹھے تو ہوتے ہیں تم لوگوں کے کھانے۔ کیا کمی ہے، مجھے تو اتنا مزہ آتا ہے ایمان سے میں بہت لطف اندوز ہوتی ہوں۔ ایسا ٹیسٹ تو میں نے کبھی اپنی ساری زندگی میں اپنے چائنیز کک کی تیار کردہ ڈشز میں بھی نہیں محسوس کیا۔"

"آپ صرف اس لیے کہہ رہی ہیں کہ آپ نے کبھی ایسے کھانے کھائے ہی نہیں۔ ابھی تو آپ کو دو ہفتے ہوئے ہیں یہاں رہتے ہوئے۔ مزید وقت گزاریں گی تو اس روٹین سے اکتا جائیں گی۔" وہ ایک منٹ رکی پھر بولی۔ "میں ان کھانوں کو ہرگز ہرگز برا نہیں کہتی مجھے تو اس روٹین کی خوراک سے اکتاہٹ ہوتی ہے۔ کیا کمی ہے ہمارے پاس، ماشاءاللہ اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے ہر چیز ہے پھر بھی اتنی کنجوسی اور الزام صحت کو۔ کبھی کبھی روٹین سے ہٹ کر کچھ اور بھی پکا لیا جائے تو منہ کا ذائقہ ہی چینج ہو جائے۔ یہاں چاہے کدو ہو یا بھنڈی، پالک آلو، گوشت چاول، کوفتے، کباب کچھ بھی پکے۔ سب میں دال کا ہی ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔" وہ برے برے منہ بناتے ہوئے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ ویزے کھل کر مسکرا دی۔

وجیہ اپنی جگہ درست تھی اور دادی جان اپنی جگہ پر۔ وہ پرانے خیالات کی حامل پرانی سوچ و روایت کی مالک پرانی عورت تھیں۔ وہ ہر بات میں دیسی ٹوٹکوں اور بزرگوں کی باتوں کو اہمیت دیتی تھیں۔ چاہے معاملہ کھانے کا ہو یا صحت کا یا پھر عام گھریلو مسئلہ ہو وہ ہر کام اپنی مرضی، اپنی سوچ کے مطابق ہی کرواتی تھیں۔ باقی لوگ تو ان کی رائے کو، کام کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کے فیصلے کو مانتے تھے مگر وجیہ نئے دور کی پروردہ، نئی سوچ رکھنے والی نئی لڑکی تھی۔ اسے ہر کام میں، ہر بات میں جدت چاہیے ہوتی تھی۔ اسے دادی اماں کے ٹوٹکوں سے اکثر اختلاف رہتا تھا۔ اسی لئے وہ سارے گھر میں سب سے زیادہ دادی اماں کی جھڑکیوں، صلواتوں کا نشانہ بنتی تھی۔

"وجیہ! تم نے ابھی تک دستر خوان پر کھانا نہیں لگایا۔ وہاں سب انتظار کر رہے ہیں اور یہ تو اب نازک یہاں استراحت فرما رہی ہیں۔ چلو اٹھو جا کر دستر خوان بچھاؤ میں کھانا لاتی ہوں۔" چچی جان جو دادی اماں سے اس کی تازہ ترین کارگزاری سن کر آئی تھیں اسے یونہی بیٹھے دیکھ کر غصے ہوئیں۔ ماں کا غصہ دیکھ کر وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

بڑبڑاتے ہوئے باہر چل دی۔

"ایک تو میں ہی ہر ایک کو فارغ نظر آتی ہوں۔ مجھے ہی ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں۔"

"یہ دیکھو ذرا وتیرہ سے! یہ حال ہے اس لڑکی کا ایک ذرا سا کام کیا کہہ دیا ہے۔ زبان ہی نہیں رک رہی۔ کیا ہوگا اس کا۔ اگلے گھر جا کر ماں کی ناک کٹوائے گی۔" اسے مخاطب کر کے انہوں نے اپنا دکھڑا رو دیا تو اس نے مسکراتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

"کچھ نہیں ہوتا ٹھیک ہو جائے گی۔"

"مشکل ہی ہے۔" چچی جان کافی ناامید تھیں۔ وہ بھی خاموش رہی۔

پھر اس نے چچی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ان کے ساتھ مل کر کھانا لگوایا۔ ایک ایک کر کے سب دسترخوان پر جمع ہونے لگے تو وہ بھی ہاتھ دھو کر دادی اماں اور بڑی امی کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

❊ ❊ ❊

وہ صبح فجر کی نماز ادا کر کے باہر لان میں نکل آئی۔ ٹھنڈی گھاس پر گرتی اوس اسے یہ دلآویز منظر ہمیشہ کی طرح دنیا جہاں کے سب منظروں سے زیادہ دلنشین، حسین اور روح پرور لگا۔ روح اندر تک معطر ہوتی چلی گئی۔ جوتا اتار کر ایک طرف رکھا اور شبنمی مخملی سبز گھاس پر چہل قدمی کرنے لگی۔ آنکھیں بند کئے گہرے گہرے سانس لیتی، خارج کرتی یونہی ادھر سے ادھر چکر لگاتے اس خوبصورت ماحول کا ایک حصہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے جب وہ اپنے گھر میں تھی تو باقاعدگی سے اسے صبح صبح اٹھا دیتی تھیں۔ وہ نماز ادا کر کے باہر لان میں نکل جاتی اور بوا قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر خوبصورت منظروں کو اپنے اندر اتار کے وہ دیر تک واک کرتی، کبھی پھولوں کو سونگھتی، چڑیوں، شاخوں سے اٹھکیلیاں کرتی درختوں کے گرد جھومتی، شاخوں سے آزاد ہو جاتی تھی۔ یاد رہتا تو صرف اتنا کہ صبح کا خوبصورت منظر، قدرتی حسن، شبنمی قطروں کی نزاہت و چمک سب اس کے لیے ہے اور پھر لان کے وسط میں بنے خوبصورت حوض کی چھوٹی سی سنگ مرمر سے تراشی دیوار پر بیٹھ کر گھٹنوں تک ٹھنڈے پانی میں اپنے پاؤں ڈبوئے غافل ہو جاتی تھی۔ گرد و پیش کا کوئی ہوش نہیں رہتا تھا یہاں تک کہ اسے بوا آ کر متوجہ کرتیں۔ پھر اتنی دیر تک لان میں رہنے پر ماما کی ہلکی پھلکی پیار بھری جھاڑ پڑتی تھی۔ اگلے دن پھر وہی روٹین ہوتی تھی۔ ماما کے انتقال کے بعد تو بہت کچھ بدل گیا تھا، گھر، رشتے بزنس اور خود پاپا بھی۔ اگر نہیں بدلے تھے تو وہ امجد بھیا اور نسیمہ بھابی تھیں۔ ان کی محبتیں اب بھی ویسی ہی تھیں۔ جان لٹاتی ہوئی۔

اسے اپنے گھر کے لان سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کا اپنا لان تھا بھی بہت خوبصورت اور وسیع۔ رنگ برنگ پھولوں سے لدا ہوا۔ شاید ہی کوئی پودا ہو جو اس میں نہ ہو۔ ورنہ جب پاپا اور ماما زندہ تھے وہ نجانے کہاں کہاں سے ورائٹڈ پلانٹس منگواتے تھے۔ اس کام کے لیے انہوں نے بطور خاص دو ملازم (مالی) رکھے ہوئے تھے۔ اس کی ماما کو گارڈننگ کا بہت شوق تھا اور پاپا نے کبھی ان کی کوئی خواہش رد ہی نہیں کی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کا لان اپنی کلاس کے تمام لوگوں کے گھروں کے لانز سے زیادہ خوبصورت اٹریکٹو اور صاف ستھرا تھا۔

آنکھیں بند کئے وہ اپنے گھر کے لان میں پہنچی ہوئی تھی۔ جہاں کبھی بھی کسی کو اس کی محویت میں دخل اندازی کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی سوائے ماما اور بوا کے۔ اب تو ڈیڑھ ماہ سے یہ قیدیوں جیسی زندگی گزارتے ہوئے اسے گزشتہ تمام واقعات و مناظر خواب ہی لگ رہے تھے۔ پچھلی سب باتوں کو سوچتے ہوئے اسے سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ وقت یہیں تھم جائے اور وہ خوابوں کے اسی جزیرے میں گھومتی رہے۔ ماما پاپا کے متعلق سوچتی رہے۔

"آ...... آ...... ہم" وہ آنکھیں بند کئے ماضی کو یاد کرتے شاید اس گھر کے چھوٹے سے مگر خوبصورت لان کا کوئی دسواں

چکر لگا چکی تھی، جب اسے یہ عجیب سی آواز سنائی دی۔ شاید کوئی اس کے قریب کھانسا تھا۔ اندازہ تو یہی ہوا تھا۔ وتیرہ نے ایکدم آنکھیں کھول دیں مگر اپنے بالکل سامنے قدرے بہت نزدیک کھڑے قطعی اجنبی شخص کو دیکھ کر پہلے بوکھلائی، ڈری اور پھر اس کے حلق سے بے اختیار چیخ ہی نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید حماقت کا مظاہرہ کر کے چور چور کا شور مچاتی، اس اجنبی شخص نے فوراً آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اپنا کھردرا مگر مضبوط ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا سفری بیگ وہیں گھاس پر ڈھیر کیا اور مضبوطی سے ڈری سہمی ڈرپوک سی وتیرہ کا نرم و نازک بازو بھی دبوچا۔ اجنبی کی اس جرأت پر وتیرہ کی خوف و ہراس سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ تو اچھی خاصی ڈرپوک لڑکی واقع ہوئی تھی۔ اس اچانک افتاد سے مزید گھبرا گئی۔ نروس سسٹم نے کام کرنے سے یکدم انکار کر دیا۔ وتیرہ جیسی دھان پان سی، کانچ کی طرح نرم و نازک لڑکی کے لیے اتنے قوی مضبوط و توانا، ڈیل ڈول والے چور کا تصور ہی سوہان روح تھا۔

اپنے منہ سے اس کا فولادی ہاتھ ہٹانے کو اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو تھام کر پیچھے ہٹانے کی کوشش کی مگر سب مزاحمتیں بے کار گئیں۔ تڑپنا بے سود تھا۔ مقابل نہ صرف خاصا چالاک تھا بلکہ نہایت فولادی اعصاب کا مالک تھا۔ وہ کچھ بھی کر لیتی سب بے کار تھا۔ وہ اس کی مزاحمت رد کئے کو نظر انداز کئے بازو سے دبوچے بے دردی سے گھسیٹتے ایک سائیڈ پر لے گیا۔

"خبردار! شور مچانے یا کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو جان سے مار دوں گا۔" جسم کی طرح لہجہ بھی بہت کرخت کسی احساس سے عاری تھا۔ آواز اتنی بھاری، گونج دار، تحکم بھری مضبوط و بے لچک تھی کہ وتیرہ کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ ٹانگوں نے اس کے وجود کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔ ہاتھ پاؤں...... ٹھنڈے ہوئے کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا ناچتا محسوس ہوا۔ بزدل اور کم ہمت وہ شروع سے ہی تھی۔ بجلی کی کڑک چمک سے بے ہوش ہو جانے والی وتیرہ اب بھی خود کو کمپوز کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک دو بار آنکھیں جھپکتے مختل حواسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش میں بے حال ہوتی اتنی اجنبی شخص کی بانہوں ہی میں تو جھول گئی تھی۔

"اوہ...... نو......" زوال کی طرح، چمکدار کانچ کی طرح نازک چاندی سے بھی زیادہ روشن خود پر گرے اس معطر ہوشربا وجود پر اس نے ایک نگاہ کی۔ لڑکی کے بے ہوش ہو جانے سے اس کی سوچ کا رخ یکدم بدلا تھا۔ نظریں اس کانچ سے وجود پر گویا جم سی گئی تھیں۔ لڑکی بلا کی حسین تھی۔ اتنا مکمل حسن شاید اس نے پہلی دفعہ ہی دیکھا تھا یا پھر پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ اندازہ نہ لگا سکا۔ پورا وجود ہی سحر انگیز تھا۔

"یہ کون ہے؟ اس قدر استحقاق سے یہاں کیا کر رہی تھی۔" یہ الجھن اسے بے چین کرنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس کانچ کے پیکر کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا تھا۔ کہاں؟ پہچان کے رنگ واضح نہیں ہو رہے تھے۔ مزید ستم یہ تھا کہ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ اس کے چیتے سے کسی بازوؤں کی گرفت میں تھی۔ اتنی جلدی وہ حواس کھوئی تھی کہ وہ اس سے کوئی پوچھ گچھ یا کوئی رائے قائم ہی نہیں کر سکا تھا۔ اس کے لیے اصل پریشانی موجودہ صورتحال تھی۔ اگر اس وقت کوئی گھر کے اندر یا باہر سے ادھر نکل آتا تو وہ بری طرح پھنس جاتا۔ اپنی پوزیشن خاصی آکورڈ محسوس ہو رہی تھی۔ اپنی نیچر پر غصہ بھی آیا کہ بلا سوچے سمجھے اتنا خوفناک ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ بہت آہستگی سے اس لڑکی کو گھاس پر لٹا کر اس کا سر اپنی جھولی میں رکھا۔

"ہیلو گرل...... دیکھو ہوش کرو...... پلیز اٹھو......" دونوں ہاتھوں سے اس کے گلابی چھلکتے رخساروں کو تھپتھپاتے اس نے کہا مگر دوسری طرف وہ یونہی بے حس و حرکت تھی۔ اس نے اس کی ناک کو زور سے بند کر دیا تا کہ سانس بند ہو اور وہ ہوش میں آئے مگر یہ طریقہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ اب اس کے حقیقت میں ہوش اڑے تھے۔ اجنبی لڑکی بے ہوش پڑی تھی وہ بھی اس کی اپنی کم عقلی کی وجہ سے۔

"کیا ضرورت تھی یار اتنے مشکوک ہونے کی۔" اس نے جھنجلا کر خود کو لتاڑا۔ کلائی تھام کر نبض چیک کی تو سکون ہوا۔ وہ نارمل تھی۔ اپنی تسلی کے لیے دل کی جگہ پر ہاتھ رکھ کر دھڑکن چیک کی۔ جہاں کچھ سکون ہوا اس اجنبی لڑکی کی اس بے ہوشی پر کوفت بھی ہونے لگی۔ آج اسے اپنا یہ سرپرائز بہت مہنگا پڑا تھا۔ ایک آخری کوشش کے بعد بھی وہ ہوش میں نہ آئی تو اس نے اس کا سر بھی گھاس پر رکھا اور دونوں ہاتھ جھاڑتا اندر کی طرف لپکا۔

"امی..... امی..... دادی جان..... بھئی سب کہاں ہیں..... وجی..... چچی جان۔" اندر داخل ہوتے ہی اس نے پکارنا شروع کر دیا تھا۔

"امی......" وہ پکارتا بغیر ادھر اُدھر دیکھے امی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ امی اس کی آواز سن کر حیران ہوتیں کچن سے باہر نکل رہی تھیں اسے کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر فوراً پکارا۔

"واحق....." وہ اس پکار پر ایکدم پلٹا تھا۔ امی اسی کی طرف آ رہی تھیں۔ دوسرے کمروں سے دادی جان، چچی بیگم، وجیہ، ابو، شہروز، مہران وغیرہ بھی نکل آئے تھے۔ ان سب کو دیکھ کر وہ بے طرح خوش ہوا تھا تھا فوراً سب سے پہلے امی کے آگے جھکا۔

"السلام علیکم امی جان۔"

"وعلیکم السلام جیتے رہو بیٹا..... اس قدر اچانک....." سر پر ہاتھ پھیرتے انہوں نے اسے گلے سے لگا لیا۔

"واحق تو اتنی صبح صبح، بیٹے تو آج..... دن بعد آیا تھا۔" اس کی اچانک آمد پر دادی اماں بھی حیران ہوتے پوچھ رہی تھیں۔ اس کی توقع کے مطابق سب اس قدر اچانک آمد پر حیران تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے ان کے ساتھ لگ گیا۔

"بس بہت یاد آ رہی تھی آپ سب کی..... جلدی جلدی سارا کام سمیٹے فوراً یاد آ گیا۔" اپنے سرپرائز کی کامیابی پر مسرور بھی تھا۔

ان سے ہٹ کر اس نے باری باری سب سے سلام دعا کی اس دوران وہ یہ بھول بیٹھا تھا کہ باہر کوئی وجود اس کی حرکت کی وجہ سے بے ہوش پڑا ہوا ہے۔

"واحق بھیا میں آپ کو بہت یاد کرتا رہا تھا۔" چچی جان کے چھوٹے زارون نے کہا۔

"ارے واہ، میرا یار تو مجھے یاد کرتا رہا تھا۔ یار میں نے بھی تمہیں بہت یاد کیا تھا۔ خاص طور پر تمہاری اس چونچ سی ناک کو۔" اس نے شرارت سے زارون کی لمبی ناک کو کھینچا تو سب ہنس پڑے تھے۔

"مجھ سے تو تم بات مت کرنا۔ پانچ مہینوں میں تو ایک بار بھی ملنے نہیں آئے۔ اب بھی مت آتے۔" شہروز نے بھی کہا۔ ان سب کے شکوے بجاتھے وہ ہنس دیا۔

"اور دادی اماں کیا آپ بھی مجھ سے ناراض ہیں۔" اس نے دادی اماں سے پوچھا تو انہوں نے کچھ نہ کہا۔

"ارے آپ تو واقعی ناراض ہیں۔" انہیں خاموش دیکھ کر وہ تھوڑا سا پریشان ہوا۔ پھر اچانک باہر بے ہوش ہونے والی لڑکی بھی یاد آئی تو سر پر ہاتھ مارتے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے مارے گئے۔ پلیز دادی اماں سارے گلے شکوے بعد میں، پہلے میرے ساتھ باہر چلیں۔ وہاں باہر لان میں کوئی لڑکی بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ پلیز دیکھیں وہ کون ہے؟" اپنی کارستانی اور لڑکی کے بے ہوش ہونے کی وجہ حذف کیے اس نے خاصی عجلت دکھائی تو دادی امی، چچی وجیہ کے ساتھ باقی سب بھی چونک گئے۔

"کون لڑکی؟" دادی اماں کے لہجے میں شک بول رہا تھا۔ وہ زچ ہوا۔

"پتا نہیں دادی اماں، میں جب گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا تو وہ لڑکی وہاں چکر لگا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بے ہوش ہو

گئی۔ پلیز آپ لوگ چل کر دیکھیں تو سہی۔"

"ارے..... میں مر جاؤں..... وہ تو اپنی ویز ے آپی ہیں....." وجیہ کو بروقت یاد آیا۔ "وہ روز صبح لان میں واک کرتی ہیں لیکن واحق بھائی انہیں ہوا کیا؟" اونچی آواز میں بڑبڑاتے اس نے باہر کی طرف دوڑ لگائی۔ اس کے پیچھے واحق، چھوٹی چچی، دادی، دادی، شہروز اور زارون وغیرہ بھی تھے۔

ویز ے ابھی تک اسی حالت میں تھی جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ دادی اماں اسے اس حالت میں ہوش و خرد سے بیگانہ دیکھ کر تڑپ کر آگے بڑھیں۔

"ارے میری بچی کیا ہوا ہے؟" اس کا سر اپنی گود میں رکھتے انہوں نے بطور خاص واحق کو دیکھا۔ سب ہی پریشان تھے۔ خاص طور پر واحق کے چہرے پر پریشانی سے زیادہ الجھن تھی۔ یہ لڑکی ابھی بھی اس کے لیے سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔ جس کے لیے سب ہی پریشان ہو گئے تھے۔

"ارے کوئی اسے اٹھا کے تو..... اندر تو لے جائے..... میرے خدا..... یہ تو امانت ہے میرے پاس..... کیا جواب دوں گی میں اس کے بھائی بھاوج کو..... اے میرے خدا عزت رکھنا....." اونچی آواز میں کہتے انہوں نے سب کو دیکھا تو وجیہ اور چچی نے اس کی کمر میں بازو ڈال کر سر اونچا کر کے اسے اٹھایا۔

"واحق بھائی پلیز..... ہماری مدد کریں۔ انہیں اندر لے چلیں۔ کرائی سے اور چچی سے تنہا ویز ے کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ تین قدم آگے بڑھنے کے بعد ہی اس نے اسے پکارا جو اس ویز ے کی اس بے ہوشی کا ذمہ دار تھا۔ وہ فوراً آگے بڑھا تھا۔ چچی کو ایک طرف ہٹا کر اس نے اسے سنبھالا۔

وجیہ اور وہ بے ہوش ویز ے کو اندر لے آئے تھے۔ کمرے میں لے جانے کے بجائے اسے دادی اماں کے مخصوص تخت پر لٹا دیا۔ امی نے تکیہ اس کے سر کے نیچے رکھا۔ دادی اماں چچی اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے لگیں۔ وجیہ پانی کا گلاس لے آئی تھی۔

"بھائی! آپ پلیز کسی ڈاکٹر کو بلوائیں۔" اس کے منہ پر پانی کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے وجیہ نے شہروز سے روہانسے لہجے میں کہا تو وہ ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔ اس دوران باقی لوگ بھی ارد گرد جمع ہو گئے تھے جبکہ دادی اماں نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ مزید چور بن گیا۔ لڑکی کا تعارف حاصل کیے بغیر ہی وہ یہ اچھی طرح جان چکا تھا کہ یہ لڑکی گھر والوں کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

"میں نے فون کر دیا ہے۔ ڈاکٹر بس آ تا ہی ہے۔" شہروز نے واپس آ کر سب کے اترے روہانسے چہرے دیکھ کر تسلی دی۔

"بڑی بہو! اس کے ہاتھ سہلاؤ..... پاؤں ملو..... کچھ کرو۔ خدا کے لیے اسے ہوش تو آئے..... پرائی امانت ہے یہ تو۔" دادی اماں مسلسل بول رہی تھیں۔ ان سب کو پریشان دیکھ کر وہ خود بھی آگے بڑھا۔ وجیہ کے ہاتھ سے گلاس لے کر اس نے پورا گلاس اس پر انڈیل دیا تھا۔ ایک دم سر پر پانی گرا تھا۔ وہ کسمسائی مگر پھر بھی ہوش میں نہیں آئی تھی۔

"خرم فریج سے ٹھنڈا پانی لے کر آؤ..... جلدی کرو۔" اس نے قریب کھڑے بھائی کو کہا تو وہ فوراً دوڑا۔

"ارے کیا کرتے ہو تم..... اس موسم میں ٹھنڈا پانی ڈالو گے۔ مار دو گے اسے۔"

خرم بوتل لے آیا تھا وہ ڈھکن کھول کر ڈالنے ہی لگا تھا جب دادی اماں نے ٹوکا۔

"کچھ نہیں ہو گا..... آپ پلیز چپ رہیں۔ دیکھیں یہ ابھی ہوش میں آتی ہیں۔" بہت چڑچڑے انداز میں اس نے

جواب دیا۔ دادی اماں چپ ہو گئیں۔ آج تو وہ اپنے دیسی ٹوٹکے تک بھول گئی تھیں۔ اس نے بوتل پوری کی پوری اس پر الٹا دی تھی اتنا یخ ٹھنڈا پانی ایکدم گرنے سے اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے یوں ہڑبڑا کر آنکھیں کھولنے سے سب کے جسموں میں جان لوٹ آئی تھی۔

''کیا ہوا تھا میری بچی کو؟'' دادی اماں نے بہت ہی حلاوت و مٹھاس بھری آواز میں پوچھا تھا۔ وہ جو سب کو خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی اس میٹھی نرم پھوار پر انہیں دیکھنے لگی تو تھوڑی دیر پہلے خود پر بیتنے والی سچویشن بھی یاد آ گئی۔ آنکھیں نمکین پانی سے جل تھل ہو گئیں۔

''دادی اماں..... وہ..... وہ وہاں چور..... وہ مجھے..... '' مزید اس سے کچھ کہا نہیں گیا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دادی اماں نے اسے یوں بچوں کی طرح روتے دیکھ کر ساتھ چمٹا لیا۔ بچوں کی طرح چمکارنے لگیں۔ وجیہہ گلوکوز ملا پانی لے آئی تھی۔ بڑی امی نے وینز ے کے ہونٹوں سے لگایا۔

''لو یہ پانی پیو..... شاباش..... '' اس نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا تھا۔ دل کی دھڑکن معمول پر آئی حواس بحال ہوئے تو اس نے دادی اماں کے سینے سے سر اٹھا کر سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ مگر اب کی بار اسے پھر ایک شدید جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

سینے کے اندر موجود دل نے شور مچا دیا۔ ''چور چور'' وہ ان سب میں موجود تھا جو اس کی اس حالت کا ذمے دار تھا۔ اس کی آنکھیں ایک دفعہ پھر پھیل گئی تھیں۔ دماغ میں سرگوشی سے ابھری تھی۔

''خبردار شور مچانے یا کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو جان سے مار دوں گا۔'' کتنی سفاک آواز تھی احساس ورحم سے عاری جس نے اس کے حواس چھین لیے تھے۔ اب بھی وہ اس کے کان کے قریب پکار رہا تھا۔ اپنے ہونٹوں پر اس کی نمکین انگلیوں کی سختی پوری شدت سے محسوس ہوئی۔ وہ پوری جان سے چیخی۔

''نہیں..... '' اس کی نظریں جیسے واسق پر جمی گئی تھیں پھر ایک دم حرکت میں آئی۔ دادی اماں کو جھنجوڑ ڈالا۔ ''دادی اماں..... یہ..... یہ چور..... اس نے مجھے..... '' انگلی سے اس نے باقاعدہ واسق کی جانب اشارہ کیا تھا۔ سب نے یکبارگی حیرانی و بے یقینی سے واسق اور پھر وینزے کو دیکھا۔

''لاحول ولا قوۃ..... '' وہ با آواز بلند بڑبڑایا۔ ''دادی اماں! لگتا ہے ان کے حواس ابھی تک ٹھکانے نہیں آئے۔ بہتر یہاں تماشہ مت لگوائیں۔ یہ جو کوئی بھی ہیں ان کو کمرے میں لے جائیں۔ ڈاکٹر آنے ہی والا ہوگا۔'' ناگواری سے کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دادی جان نے فوراً اسے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ وجیہہ اور امی ایکدم ہنس پڑی تھیں۔ چچی جان بھی تخت پر بیٹھیں تو باقی سب بھی مطمئن ہو گئے۔

''پاگل ہو تم تو..... بھئی وہ کوئی چور وور نہیں۔ میرا بیٹا ہے سب سے بڑا، پانچ ماہ سے پشاور گیا ہوا تھا اپنی بہن کے ہاں اسے سرپرائز دینے کی عادت ہے۔ بغیر بتائے ہی صبح صبح چلا آیا۔ تم نے چونکہ اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اسی لیے غلط فہمی ہوئی ہو گی ویسے وہ شکل کا اتنا پیارا ہے چور تو نہیں لگتا۔'' اس کے سر پر یں نرم ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں دباتے انہوں نے بتایا اور آخر میں کچھ شریر سے انداز میں چھیڑا تو اسے کچھ حیرت ہوئی۔

''مگر اس نے تو مجھے..... '' وینزے نے انہیں اس کا رویہ بتانا چاہا۔ پھر لب بھینچ لیے۔

''بڑا سنجیدہ ہے کبھی کبھار دل چاہا دوسروں کو حیران کرنے کی بات آئی تو یوں چپ چپاتے بغیر بتائے گھر آتا ہے۔''

طور پر جب وہ گھر سے باہر ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ یا مہینوں رہ کر آتے تو یونہی سرپرائز دیتا ہے۔ مشکوک لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے اب خود بھی ایسی مشکوک حرکتیں کرنے لگا ہے کہ کوئی اجنبی پہلی ہی نظر میں دیکھے تو فوراً غلط سمجھ بیٹھے۔'' چچی جان نے بھی بتایا۔ وہ چپ رہی۔ اسے دیکھ کر اچھی خاصی الجھ گئی تھی۔ وہ اسے نظر سے ہی نہیں واقعی مشکوک لگ رہا تھا۔

''وجیہہ! بہن کو کمرے میں لے جاؤ۔ سب کو کام دھندے پر نکلنا ہے۔ ہم ذرا کچن دیکھ لیں۔'' بڑی امی نے وجیہہ کو کہا تو دادی اماں نے پیار سے اسے خود سے جدا کر کے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور وجیہہ کے حوالے کیا۔ وہ چپ چاپ اس کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گئی۔ دماغ تو ابھی بھی سنسنا رہا تھا۔ وہ ٹوٹلی غیر حاضر تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر بھی آ گیا تھا۔ چیک اپ کے بعد اسے ''ٹوٹلی پرفیکٹ'' کہہ کر ایک دو ہدایتیں دیتے چلا گیا۔ باقی سارا وقت وہ آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔

✠ ✠ ✠

واسق کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد صبح صبح گھر پہنچا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ غافل ہو کر ایسا بے خبر سویا کہ سارا دن سوتا ہی رہا تھا۔ شام کے بعد رات کے کھانے سے پہلے امی کے بار بار پکارنے پر وہ بمشکل بستر سے اٹھا تھا۔ بغیر حلیہ سنوارے کپڑے بدلے منہ ہاتھ دھوئے وہ باہر نکل آیا۔

''کیا ہے امی..... ؟ کیوں آوازیں دے رہی ہیں۔ سونے تو دیتیں۔ اتنے دنوں بعد سویا تھا وہ بھی نیند خراب کر دی۔'' آنکھیں ملتے وہ دادی اماں کے تخت پر ہی دراز ہو گیا۔ کچن سے باہر نکلتی وینزے نے انتہائی ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔ اس کے حلئے پر نظر پڑی تو شدید ناگواری کی لہر نے اس کے وجود کو گھیر لیا۔ وہ واپس کچن میں چلی گئی۔

واسق جہانگیر احمد اسے پہلی نظر میں ہی انتہائی مشکوک لگا تھا۔ اس کے رویے نے بھی اس پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ پہلی نظر سے لے کر وہ بعد میں کافی دیر تک یہی سوچتی رہی کہ اس نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ پہلی بار کب اور کہاں ملی تھی۔ ملنے کی وجہ کیا تھی وہ یہی سوچتی اور کڑھتی رہی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ ان لوگوں سے پہلی دفعہ دو ماہ پہلے ملی تھی۔ جب بھائی اور بھیا اور اسے یہاں چھوڑنے آئے تھے۔ بعد میں یہاں رہنے کے دوران بھی اس واسق نامی کسی شخص کے وجود کا علم تک نہیں تھا۔ بہت زیادہ کڑھنے سوچنے اور تفکر کے بعد اسے سب یاد آتا گیا کہ وہ اسے پہلی دفعہ کب کہاں اور کیوں ملی تھی؟

پچھلے سال جب وہ بی کام کے دوسرے سال میں تھی تو ان کے سیکشن میں اسلام آباد سے ایک روشا نامی لڑکی مائیگریٹ ہو کر آئی تھی۔ بہت ہی ملنسار اور باتونی لڑکی تھی۔ دنوں میں ہی وہ اساتذہ اور لڑکیوں کی منظور نظر بن گئی۔ شروع میں وینزے کی اس سے واجبی سی سلام دعا تھی، بعد میں اچھی خاصی ٹھیک ٹھاک سلیک بھی ہو گئی۔ دو تین ماہ بعد اسے اس لڑکی سے تعلق ختم کرنا پڑا تھا۔ وجہ اس لڑکی کی بہت ہی مشکوک حرکات تھیں اور لڑکیوں اور اساتذہ نے غور کیا ہو یا نہ ہو اس نے بہت جلد جان لیا تھا کہ وہ کوئی سیدھی سادی لڑکی نہیں ہے۔ اس کو روزانہ ایک لڑکا اپنی پاجیب پر کالج چھوڑنے بھی آتا تھا اور لے جانے بھی۔ ایک دن روشا نے ہی اس کا اس لڑکے سے سرسری تعارف کروایا تھا یہ کہہ کر کہ وہ اس کا فیانسی ہے اور وہ لڑکا کوئی اور نہیں واسق جہانگیر احمد تھا۔ آج جب اسے پہلی نظر دیکھا تو بالکل نہیں پہچان پائی تھی مگر جب سارا دن سوچتے رہنے کے بعد یاد آیا تو اسے واسق جہانگیر سے کافی ناگواری محسوس ہوئی۔ وجہ وہ روشا نے تھی۔ وہ اچھی لڑکی نہیں تھی اس کی اس کی مشکوک حرکات کی بدولت اس نے بہت جلد اس سے دوستی ختم کر لی تھی اور تقریباً دو ماہ بعد ہی ایک دن اس نے صبح کے اخبار میں خبر پڑھی کہ ایک لڑکی جو معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کو ورغلا کر اغوا کر لیتی تھی۔ اپنے پورے گروپ

سمیت گرفتار ہوگئی۔ نیچے روشانے کی تصویر تھی۔ اخبار میں اس کے متعلق اور بھی بہت کچھ لکھا ہوا تھا مگر اس نے پڑھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اپنے ذہن سے روشانے کا خیال تک جھٹک ڈالا تھا کہ اب دوبارہ وہ واسق جہانگیر کی صورت میں اس کی سوچوں میں در آئی تھی۔

وہ تو شروع سے ہی سیدھی سادی تھی۔ بقول سب کے معصوم احمق، پاگل اور بیوقوف وتیزے کو ان سب القابات سے چڑ نہیں تھی۔ بس وہ بچپن سے ہی ایسی تھی۔ بزدل اور کم ہمت سی۔ آج جو کچھ بھی ہوا تھا وہ شاید بزدلی کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ ابھی وہ کچھ اور بھی سوچ رہی تھی کہ بڑی امی کی پکار نے اسے حواسوں میں لا پٹخا۔ وہ واسق سے مخاطب تھیں۔

''یہاں لیٹ گئے ہو تم۔ یہ وقت ہے سونے کا۔ اٹھو یہاں سے کم از کم اپنا حلیہ ہی درست کر کے کمرے سے نکلتے۔ اب بچے تو نہیں ہو کہ تمہیں بات بے بات سمجھانا پڑے۔'' امی جب کچن سے نکلیں تو نظر سیدھی تخت پر آڑھے ترچھے لیٹے واسق پر جا پڑی۔ فراوزر اور بنیان میں اس کا سڈول جسم بہت نمایاں ہو رہا تھا۔ بنیان میں سے سینے کے ساتھ ساتھ ورزشی بازو اور کندھے صاف عیاں تھے۔ ان کے ہونٹوں سے بے اختیار ''ماشاءاللہ'' نکلا۔ ان کا واسق لاکھوں میں ایک تھا۔ ہر صفت شکل و صورت کا مالک۔ حسن، جوانی، نیک کرداری، نیک سیرتی، خوش اخلاقی، خوش گفتاری جیسی سنہری صفات بدرجہ اتم اس میں موجود تھیں۔

اس کا سر فخر سے بلند ہو تو ''اللہ'' کہتے ہوئے انہوں نے بے اختیار نظریں پھیر لیں، اس ڈر سے کہ کہیں ان کے ہونے والی اپنی ہی نظر نہ لگ جائے۔

''واسق! سنا نہیں.... کیا کہہ رہی ہوں میں؟'' اسی طرح غافل پڑے واسق کو انہوں نے پھر ٹوکا۔ واسق کے وجود میں ہلکی سی حرکت ہوئی۔ آنکھیں کھول کر وہ دیکھنے لگا۔ .... سے آواز آئی تھی۔ امی کچن سے باہر دیوار کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھے پلیٹ میں موجود .... صاف کر رہی تھیں۔ واسق نے دوبارہ .... آنکھیں بند کر لیں۔

''واسق.... یہاں ہوں میں تمہاری والی اماں کو ورنہ.... اٹھ جاؤ....'' کچن میں چچی بیگم کے ساتھ بیٹھی وتیزے نے اٹھ کر بڑی امی کی آواز پڑی اور دروازے سے سر باہر نکال کر باہر جھانکا۔ سیدھی نظر واسق پر جا پڑی۔

عین اسی لمحے ماں کی پکار پر اس نے بھی آنکھیں کھولی تھیں۔ نظروں کا سیدھا رخ وتیزے کی ہی طرف تھا۔ چونکہ تخت اور کچن کا درمیانی فاصلہ باقی کمروں کی نسبت بہت کم تھا اس لیے ہر منظر بہت واضح تھا۔ سرخ ڈوروں والی موٹی موٹی خمار آلود نیند سے بھری آنکھیں جب وتیزے کی جانب اٹھیں تو وہ بے ساختہ .... سے مزید جھینپ گئی۔ چہرہ واسق کے ہل تھوڑا سا اٹھ کر تکیے کے سہارے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا تھا۔ اس سارے عمل کے درمیان بھی اس نے اپنی نظریں بدستور وتیزے پر گاڑھے رکھیں۔ وتیزے پہلے تو اس کے یوں بے دھڑک بغیر پلکیں جھپکے انہماک سے دیکھنے پر جھنجلائی پھر جھائی کے جلیے پر کوفت کا شکار ہوئی واپس کچن میں گم ہو گئی۔ واسق کے متعلق دل میں موجود ناپسندیدگی و ناگواری میں مزید اضافہ ہوا۔

''واسق بیٹا! شاباش اٹھو، کمرے میں جا کر کپڑے چینج کرو۔ یوں مت لیٹو۔''

وتیزے کے سر اندر کر لینے کے بعد واسق نے بھی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں گھنے بالوں میں پھنسا کر اس نے اپنے بالوں کو مٹھیوں میں قید کیا اور پھر ایک جھٹکا دیا۔ امی کی آواز تو جیسے سنائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ اتنے سست کیوں ہو رہے ہو؟'' واسق پر اپنی کسی بھی پکار کا اثر نہ دیکھ کر امی اس کے پاس تخت پر آ بیٹھیں۔ دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما تو اس نے دھیرے سے مسکراتے آنکھیں وا کر دیں۔

''بالکل ٹھیک ہوں۔ بہت دنوں بعد آپ کی آواز سن رہا ہوں۔ ایمان سے بہت اچھی لگ رہی ہے آپ کی یہ آواز، بار بار

میرا نام پکارتی ہوئی۔'' واسق نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا تھا۔ امی بے اختیار مسکرا دیں۔ جھک کر اس کی پیشانی پر محبت بھری کارروائی کی۔ لاڈ سے سارے بال بکھرا دیئے۔

''جیتے رہو۔'' آنکھوں میں ہزاروں ستاروں کی چمک لیے دعا دی۔ محبت سے بھرپور لہجہ تھا۔ وتیزے جو کچن سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی، راستے میں ماں بیٹے کو یوں لاڈ کرتے کرواتے دیکھ کر رک گئی۔

''میں روز آپ کو یاد کرتا تھا۔ بہت یاد آتی تھی سب گھر والوں کی۔''

وتیزے کو یوں لگا جیسے وہ کوئی چھوٹا سا بچہ ہو اور اپنی ماں سے دوری پر پہنچنے والی بے قراری اسے ستا رہا ہو۔

''جبھی تو اتنے ماہ گھر سے باہر رہ لیا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ ان کے لبوں سے ادا ہو گیا۔ واسق نے مسکراتے ہوئے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا پھر ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

''اللہ کی قسم! میں اس محبت بھری آغوش کو ترس گیا تھا۔'' کتنا سچا لہجہ تھا امی نہال ہو گئیں۔ وتیزے کے لیے یہ محبت بھرے جملے، اپنائیت بھرے شکوے، اور مان و الفت سے لبریز مناظر سب نئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آن واحد میں اتنی حسرت آسمائی کہ وہ بغیر پلکیں جھپکائے دونوں کو دیکھے گئی۔

''سچ سچ بتائیں آپ نے بھی مجھے یاد کیا تھا۔ مجھ سے زیادہ....'' شوخ سا انداز تھا۔ خاصا چھیڑنے والا، وہ ہنس دیں۔ وتیزے بس دیکھتی رہی۔

''ماں کی محبت کو تولا نہیں جاتا۔ اگر کہیں دنیا میں کوئی ایسا میزان ہے، جو ماں کی محبتوں، اس کی شدتوں اور بے قراریوں اور بے چینیوں کو تولتا ہے تو تم پھر بھی میری محبت، بے قراری اور شدت کو کبھی تول سکو گے۔ میری ایک رات ہی تمہاری سب شدتوں پر حاوی ہے۔ جوان چند ماہ میں میرے دل میں تمہارے لیے شدتیں تھے چھپائی بے قراریاں موجود رہی تھیں۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر تمہاری سلامتی و کامیابی کے لیے دعا کرتی رہی تھی۔'' ان کی آواز میں ان کی شدتوں کی گواہ محبت لیے لبریز آواز آنسوؤں سے رندھ گئی تھی۔

''مجھے آپ کی بے قراری کا اندازہ ہے۔ میں جانتا ہوں آپ کتنی دعائیں مانگتی ہیں۔ یہ آپ کی دعاؤں کا ہی تو ثمر ہے کہ کامیابی و کامرانی کے ساتھ واپس لوٹ آیا ہوں۔ بخدا امی! اگر مجھے فرض کی ادائیگی کا احساس نہ ہوتا تو ساری عمر یونہی آپ کے قدموں تلے محبت بھری اس آغوش میں سر رکھے گزار دوں۔'' بہت سنجیدگی و مضبوطی سے کہتے اس نے یونہی نظر اٹھائی تو ماں کے دائیں طرف کچھ قدموں کے فاصلے پر کھڑی وتیزے پر پڑ گئی۔ وہ بت بنی دونوں کو نہایت انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھ لینے پر بھی اس نے پہلے کی طرح ناگواری سے نہ ہی رخ موڑا تھا اور نہ ہی پلکیں جھپکی تھیں۔

''امی! مجھے تو یہ لڑکی ہوش و حواس سے بیگانہ، کچھ پاگل پاگل سی لگتی ہے۔ بائی دا وے یہ ہیں کون....؟'' بہت سرگوشیانہ انداز تھا۔ امی نے فوراً وتیزے کو دیکھا۔ وہ یونہی ایستادہ تھی۔ وہ مسکرا دیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔

وتیزے کی حسرتیں! اس کی محبتیں! احساس طبیعت، اور مجبوریاں۔

وقت اسے ان کے گھر لے آیا تھا اور ان سب نے اسی کھلے دل سے قبول کیا تھا۔ بے پناہ محبت دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ کانچ سی لڑکی نگینے کی طرح شفاف، نازک اور حساس تھی۔ اسی لیے سب مل کر اسے سنبھال رہے تھے، ایک قیمتی زیور کی طرح، اس ڈر سے کہ کوئی چھین کر نہ لے جائے۔

امی نے واسق کے سر کے نیچے دھرا اپنا ہاتھ نکال کر وا کر دیا۔ وہ بھی چونک گئی۔ پہلے تو جھجکی، پھر آہستہ آہستہ چلتی ان کے کھلے بازوؤں میں آ سمائی۔ تخت پر یوں بیٹھی کہ اب اس کی گھنے سیاہ ریشمی بالوں والی چٹیا واسق کے سینے سے لپٹنے لگی تھی۔ وہ اس کے بہت قریب تھی۔ شاید دل کی دھڑکنوں کو چھیڑ رہی تھی۔ وہ مبہوت سا اس کانچ کے پیکر کو دیکھے گیا۔ کسی پرفیوم کی خوشبو تھی، اس کے وجود

سے الجھی، ہلکی ہلکی مہک تھی یا پھر اچانک بیدار ہونے والے احساس کی ڈور سے لپٹا خوبصورت منظر ہوا کا تیز ایک جھونکا تھا جو واثق کے اندر اترتا اس کا تن من بھگوتا چلا گیا۔ اپنے سر کو بے خیالی میں جنبش دیتے ایک گہری سانس لیتے وہ اٹھ بیٹھا۔

"یہ ونیزے ہے۔ تمہاری دادی اماں کی بھانجی کی نند۔" امی نے بہت محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے بتایا۔ "پہلی دفعہ ہمارے گھر آئی ہے۔ ڈیڑھ ماہ سے یہیں رہ رہی ہے اور کچھ عرصہ مزید یہاں رہے گی۔ تمہیں جانتی نہیں تھی نا اس لیے صبح تمہیں مشکوک سمجھتے ہوئے بے ہوش ہو گئی تھی۔ بہت کمزور دل کی مالک ہے یہ میری بیٹی۔ بالکل بھولی بھالی، سیدھی سادی۔" کتنے خلوص سے وہ اسے بتا رہی تھیں۔

واثق اس "سیدھی سادی" بیٹی کا رخ روشن دیکھنا چاہتا تھا جو ابھی ابھی اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ گئی تھی۔ بے خیالی میں، بے دھیانی میں وہ کبھی نہ تسخیر ہونے والا مضبوط ذہن و دل کا مالک تسخیر ہو گیا تھا۔ اسے صرف ہوا کے ایک جھونکے نے فتح کر لیا تھا اور وہ جھونکا ونیزے ہی تھی۔ مگر افسوس وہ امی کے سینے میں اسی طرح منہ چھپائے ہوئے تھی کہ امی کا دوپٹہ اس کا چہرہ ڈھانپے ہوئے تھا۔

واثق نے ایک گہرا سانس کھینچتے ہوئے اپنی مٹھی میں بند اس کی چٹیا چھوڑی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرا خیال ہے اب مجھے اپنے کمرے کی طرف چلنا چاہیے۔ لگتا ہے اب میرے حصے کا پیار امی اب انہیں دیا کریں گی۔" سینے پر بازو لپیٹے اس نے صرف اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے امی کو متوجہ کیا تھا۔ رد عمل اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ نہ صرف امی نے خفگی سے اسے دیکھا بلکہ ونیزے بھی ان کے سینے سے سر اٹھا کر قدرے حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی۔

"بری بات بیٹا! یوں نہیں کہتے۔ ہر انسان اپنے حصے کی ہی محبتیں وصولتا ہے۔ یہ میری بیٹی ہے، پیاری سی، اور ماں کے لیے اپنے سب بچے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔"

"آئندہ ایسی بات مت کہنا..... ورنہ....." بہت سنجیدہ انداز میں کہتے انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ مسکراتے ان کی طرف بڑھا۔ امی کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر ونیزے کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"امی جان! مذاق کر رہا تھا۔ اگر یہ آپ کی بیٹی ہیں تو اس ناتے ہماری بھی کچھ لگتی ہیں۔ جب ہماری ماں کا دل محبتیں بانٹنے میں اتنا وسیع ہے تو ہم تو دل و جان سے ان کے ہوئے۔ کیوں سچ کہہ رہا ہوں میں؟"

بظاہر مذاق کے رنگ میں کہتے وہ امی کو مطمئن کر رہا تھا جبکہ نظریں معنی خیز انداز میں اس کی طرف بے باکی سے دیکھتی ونیزے کے اندر خطرے کی گھنٹی بجا گئی تھیں۔ وہ ان نظروں کی تاب نہ لا سکی تھی ایکدم نروس ہوتے ہوئے پلکیں جھکا گئی تھی۔ واثق اس کی اس ادا پر بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ وہ مزید جھینپ گئی۔

"امی آپ کی بیٹی تو اچھی خاصی ڈرپوک ہیں۔ چڑیا جتنا دل ہے ان کا۔ صبح خوامخواہ مجھے چور سمجھ کر بے ہوش ہوتے ہی میرے....." وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر ہنس پڑا تھا۔ ونیزے نے تڑپ کر سر اٹھا کر اسے تنبیہی انداز میں دیکھا تو وہ محظوظ ہوتا رہا تھا۔

واثق کے ہونٹوں پر رقصاں دلآویز، معنی خیز مسکراہٹ کا مفہوم وہ بخوبی سمجھ سکتی تھی۔ ہاتھ پسینے سے تر ہو گئے۔ سینے کی دیواروں میں مقید دل اتنی زور سے دھڑکا کہ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "واثق مت تنگ کرو میری بیٹی کو۔" اس کے یوں گھبرا اٹھنے پر امی نے واثق کو ٹوکا۔

"بخدا امی حضور! میں تنگ تو نہیں کر رہا۔ اتنی بھولی بھالی، سیدھی سادی، معصوم صورت والے لوگوں کو کون کافر ہے تنگ کرے گا۔ جو بھی ایسا کرے گا گنہگار ٹھہرے گا۔" وہ اسے چھیڑنے سے اب بھی باز نہیں آ رہا تھا۔

"واثق....." امی نے دم بدم سرخ ہوتے ونیزے کے چہرے کو دیکھتے اسے پھر ٹوکا تو وہ ہنستا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"برا مت ماننا ونیزے! وہ جو کچھ بھی کہتا ہے صرف مذاق کہتا ہے۔ دل کا بہت اچھا اور نرم ہے۔ بہت محبت کرنے والا ہے میرا بیٹا۔ دیکھنا بہت جلد تم دونوں آپس میں گھل مل جاؤ گے۔"

"اللہ نہ کرے۔" امی بہت اپنائیت سے اپنے بیٹے کی خوبیاں گنوا رہی تھیں اس نے دل میں سوچا۔ "میں کیوں اس مشکوک کردار والے بندے سے گھلنے ملنے لگی۔ بہت اچھی طرح میں اسے سمجھ گئی ہوں۔ نظر باز اور فلرٹ انسان۔" کسی کے متعلق رائے قائم کرنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اب بھی دل ہی دل میں کہہ رہی تھی مگر بظاہر مسکراتی رہی۔

* * *

ماما پاپا کراچی سے تعلق رکھتے تھے۔ ونیزے اور امجد صرف دو ہی بہن بھائی تھے۔ چھ سال قبل ماما کی ڈیتھ ہو گئی تو خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کی صحت بھی گرنے لگی۔ اس کے باوجود انہیں اپنے بچوں کی فکر تھی۔ امجد بھائی جب ایم بی اے کے بعد وطن واپس لوٹے تو پاپا نے ان کی شادی اپنے دوست کی بیٹی صبیحہ سے کر دی۔ صبیحہ بھابی بہت ہی اچھی بیوی اور بہو تھیں۔ امجد بھائی اور پاپا بڑا احسن طریقہ سے بزنس چلا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کا بزنس دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا جا رہا تھا کہ اچانک نہ صرف ان کے گھر بلکہ بزنس کو بھی کسی کی نظر لگ گئی۔ محبوب رحمانی جو کہ بزنس کی دنیا کی اہم شخصیت تھا، نہایت مکار، چالباز اور عیار شخص واقع ہوا تھا۔ اس کی اچانک پاپا سے دوستی ہو گئی اور پھر وہ ان کے بزنس میں پارٹنر بننے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ پاپا کو مزید ترقی کے سہانے خواب دکھا کر آخر کار اس نے پاپا کو شراکت داری پر آمادہ کر ہی لیا۔

پاپا جو بہت سلجھے ہوئے دھیمی طبیعت کے مالک اور بردبار انسان تھے، وہ محبوب رحمانی کی چالبازیوں کو سمجھ نہ سکے۔ پہلے اسے بزنس میں شامل کیا بعد میں گھریلو سطح پر تعلقات استوار ہونے لگے۔ محبوب رحمانی نے دو شادیاں کر رکھی تھیں ایک بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور دوسری کو اس نے خود طلاق دے دی تھی۔ کل چار بچے تھے۔ سب سے بڑا بیٹا ونیزے سے صرف ایک سال ہی چھوٹا تھا۔ نجانے اس مکار شخص نے پاپا پر کونسا ایسا سحر پڑھ کر پھونکا تھا کہ پاپا کو اس کے علاوہ دنیا میں کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ امجد بھائی اکثر انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے تو وہ ہر بار انہیں "ناتجربہ کار" کہہ کر ٹال جاتے تھے۔

اصل طوفان تب آیا تھا جب اس نے ونیزے کو دیکھا اور دل ہار گیا۔ ونیزے جو اس کے بیٹے سے صرف ایک سال ہی بڑی تھی۔ نہایت معصوم، سیدھی سادی لڑکی اسے کہاں سے کہاں تک پہنچا سکتی تھی۔ اس نے پاپا سے ونیزے کے لیے بات کی۔ شروع میں تو پاپا نے صاف انکار کر دیا پھر اس کی چالاکیوں اور سمجھانے سے کشمکش و پیچ میں پڑ گئے۔ سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا۔ اس دوران تک محبوب رحمانی ان کی اس قدر برین واشنگ کر چکا تھا کہ پاپا اس مکار شخص کی عیار باتوں میں پھنس کر اسے ہاں کر بیٹھے۔

ونیزے کی تو حالت ہی بری تھی یہ جان کر کہ یہ پاپا کا اپنا ذاتی فیصلہ ہے۔ امجد بھائی نے بہت سمجھایا، ہر طرح سے پاپا کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ دونوں کے سٹینڈرڈ لیول اور عمروں کے فرق کو واضح کیا مگر سب بے سود تھا۔ پاپا کی آنکھوں پر محبوب رحمانی کے نام کی پٹی چڑھی ہوئی تھی اس کی موجودگی میں انہیں اپنی معصوم و بھولی بھالی بیٹی اور فرمانبردار سا بیٹا بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اگر انہیں کسی کی پرواہ تھی تو وہ محبوب رحمانی تھا۔ بزنس کو ڈبل کرنے کی فکر تھی۔ اس کے پاپا اتنے مادہ پرست انسان نہیں تھے مگر محبوب رحمانی کی صحبت نے انہیں ایسا بنا دیا تھا۔

پاپا نے ونیزے کی شادی کی بی کام کر لینے تک مہلت مانگی تو محبوب رحمانی نے بخوشی دے دی اور اس دوران تک وہ نہ

صرف بزنس پر بلکہ وِنیزے کے حوالے سے بھی پاپا کے گرد بھی اچھا خاصا جال کس چکا تھا، یوں کہ فرار کسی بھی طور پر ممکن نہ تھی۔ وِنیزے کے بی کام کے بعد جیسے پاپا نے شادی کی بات کی۔ امجد بھائی ٹال گئے اور چند ماہ کی مہلت مانگی۔ امجد بھائی جوان چند ماہ میں وِنیزے کے بچاؤ کے لیے کوئی نہ کوئی مضبوط پناہ گاہ تلاش کر لینا چاہتے تھے، مگر محبوب رحمانی پاپا کے ذریعے ان پر دباؤ ڈالنے لگا اور یوں امجد بھائی کو وِنیزے کے بچاؤ کی تمام راہیں تاریکی کی گہری لپیٹ میں لپٹی دکھائی دیں۔ جب حالات ان کے کنٹرول سے باہر ہو گئے۔ محبوب رحمانی کا دباؤ مزید بڑھا تو انہوں نے رشتے سے صاف انکار کر دیا۔ جہاں پاپا امجد بھائی سے ناراض ہوئے وہیں محبوب رحمانی نے کمال ہوشیاری و چالاکی سے ان کے بزنس کے ۵۰ فیصد شیئرز اپنے نام منتقل کروا لیے۔ یہ سب کچھ اس قدر صفائی اور ہوشیاری سے ہوا کہ پاپا جیسے ذہین شخص اس کھلی دھوکہ دہی پر صرف ہاتھ ملتے رہ گئے۔

محبوب رحمانی نے شیئرز نام کروانے سے پہلے پاپا سے کچھ سادہ کاغذات پر دستخط کروا لیے تھے اور پھر ان کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا تھا۔ آدھا بزنس محبوب رحمانی کے قبضے میں چلا گیا تھا پاپا نے جب اب محبوب رحمانی سے وِنیزے کی شادی سے انکار کر دیا تو اس نے پاپا کا دستخط شدہ ایک اسٹام پیپر پاپا کے سامنے لا رکھا۔

جس کے مطابق جواد حسن وِنیزے کی شادی اس سے کرنے پر راضی تھے، بلکہ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو جاتا تو ان کے بعد وِنیزے سے کبھی بھی شادی کرنے کا حق رضا صاحب اور وِنیزے کی شادی کے سلسلے میں امجد جواد حسن کو کوئی بھی اعتراض کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ پاپا کے لئے محبوب رحمانی کا یہ نیا روپ بہت دلبرداشتہ اور غیر متوقع تھا۔ ان کی اپنی کم عقلی اور غلطیوں کی وجہ سے نہ صرف آدھا بزنس ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا بلکہ اب بیٹی کا مستقبل بھی خطرے میں تھا۔ انہوں نے قانونی چارہ جوئی کر کے محبوب رحمانی پر غبن اور دھوکہ دہی کا الزام لگا کر کے مقدمہ دائر کر دیا۔

یہ وِنیزے اور امجد بھائی پر خدا کی طرف سے شاید ایک آزمائش ہی تھی جو پہلی پیشی کے بعد ہی پاپا ہارٹ اٹیک ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے تھے۔ ان کی اس قدر اچانک موت پر دونوں تقریباً ایک ماہ تک سنبھل ہی نہیں سکے تھے اور محبوب رحمانی نے اس ایک سانحہ کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے حالات اپنے حق میں اس طرح موافق کئے کہ امجد بھائی دیکھتے ہی رہ گئے۔ بزنس کے بعد اب اس کا اگلا ٹارگٹ وِنیزے تھی۔ محبوب رحمانی نے بھیا کو ایک ماہ کے اندر اندر ان سے وِنیزے کی شادی کر دینے کی پرزور دھمکی دی اور ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر امجد بھیا نہ مانے تو وہ کسی اور طریقے سے وِنیزے کو حاصل کر لے گا۔

جہانگیر انکل صبیحہ بھابی کے کزن تھے۔ یہ لوگ اسی شہر میں رہتے تھے۔ صبیحہ بھابی اکثر اپنی خالہ کے ہاں جاتی رہتی تھیں البتہ وہ خود ان لوگوں سے کبھی بھی نہیں ملی تھی۔ صبیحہ بھابی کو زبانی انہیں جب حالات کا علم ہوا تو انہوں نے ہی بھیا کو آفر کی کہ وہ کچھ عرصہ وِنیزے کو ان کے ہاں چھپا دیں اس دوران امجد بھیا یا وہ خود کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر وِنیزے کی شادی کر دیں گے اور محبوب رحمانی اور باقی سب لوگوں کو یہی بتایا جائے کہ وِنیزے اس شادی پر راضی نہیں تھی اسی لئے جب چاپ کہیں چلی گئی ہے اور کہاں گئی ہے انہیں بالکل بھی علم نہیں۔ جب وِنیزے کی شادی ہو جائے گی تو حالات کافی سازگار ہو جائیں گے بعد میں محبوب رحمانی کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔

بھیا اور بھابی کو ان کی تجویز اچھی لگی تھی اگلے ہی دن وہ وِنیزے کو ان کے ہاں چھوڑ گئے تھے۔ اب اسے ڈیڑھ ماہ ہو گیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے گھر رہ رہی تھی اور اسے تب تک یہیں رہنا تھا جب تک اس کے لئے کسی معقول لڑکے کا بندوبست نہیں ہو جاتا۔

بڑی امی کی تو یہی خواہش تھی کہ وہ وِنیزے کو اپنے واحق کے لئے مانگ لیں۔ اس خواہش کا اظہار انہوں نے اپنی ساس اور دیورانی سے بھی کر دیا تھا مگر زبان سے کچھ کہتے وہ لوگ ڈرتے تھے۔ پہلی بات تو واحق کی تھی۔ امی کا خیال تھا کہ وہ شاید نہ مانے اور دوسری وجہ امجد جواد حسن کا اسٹیٹس تھا۔ وہ امجد جواد حسن کے اسٹیٹس سے بہت کم تھے۔ پھر وِنیزے خود بھی کوئی معمولی لڑکی نہ تھی۔ چاند

کا ٹکڑا تھی۔ شہزادیوں کی طرح پلی بڑھی تھی۔ عیش و عشرت میں اس نے زندگی گزاری تھی۔ اب بھی اس کے نام کروڑوں کی جائیداد تھی۔ وہ وِنیزے اور امجد جواد حسن کے لیول کے تو نہیں تھے مگر خلوص و چاہت اور محبتیں بانٹنے میں ان سے کم نہیں تھے۔ اسی لئے ان سب لوگوں کے دل کی خواہش فی الحال دل ہی میں تھی۔ صبیحہ امجد بھائی اکثر رات کو وِنیزے سے ملنے آتے رہتے تھے۔ جبکہ وِنیزے اس ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں ایک دفعہ بھی ان سے ملنے اپنے گھر نہیں گئی تھی۔

یہاں آکر وِنیزے نے بالکل وہی انداز اختیار کر لئے تھے جو اس گھر کے مکینوں کے تھے۔ نہ کسی بات پر ناک بھوں چڑھائی، نہ کوئی تنقید نہ زد و بد۔ البتہ اسے کوئی کام کرنا نہیں آتا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ نوکروں کی فوج کے درمیان جوان ہوئی تھی۔ پانی پینے تک کے لئے اسے نوکر کو آواز دینا پڑتی تھی مگر یہاں آکر وہ بصد اصرار سب کے منع کرنے کے باوجود ضد کر کے کسی نہ کسی کام میں ہاتھ الجھا لیتی تھی۔ خاص طور پر جب چچی یا بڑی امی میں سے کوئی کچن کا کام کر رہا ہوتا تو کبھی سلاد بنا دیتی تھی کبھی دال چاول صاف کر دیتی تھی۔ اس خوشحال کھاتے پیتے گھرانے میں جہاں عام فیملیوں کی طرح پیسہ کی کوئی کمی نہیں تھی وہ بخوشی رہ رہی تھی صرف اس لئے کہ یہاں اسے ہر کسی سے بھرپور محبت اور غیر معمولی عزت ملی تھی۔

ماما، پاپا ان دونوں بہن بھائیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ کبھی آنکھ میں آنسو نہیں آنے دیا تھا۔ منہ سے نکلی ہر چیز حاضر ہوتی تھی مگر ان کی وہ محبت توجہ اور نگہداشت بہت نارمل نوعیت کی تھی۔ تکلف میں لپٹی ہوئی۔ اس کے اندر شروع سے ہی یہ تشنگی رہی تھی کہ وہ اپنی ماما کو عام ماؤں کی طرح لاڈ پیار کرتے دیکھنے کی خواہش رکھتی تھی۔ ماما پاپا کی محبت دادی اماں، بڑی امی اور چچی جان کی محبت جیسی نہیں ہوتی تھی۔ کھڑے کھڑے پوچھ لینا کسی چیز کی کمی تو نہیں کہہ کر دریافت کر لینا، اسے اب لگ رہا تھا وہ احساس نہیں تھا، احساس کیا ہوتا ہے؟ تو اسے اس گھر میں قدم قدم پر محسوس ہوا تھا۔ خالص محبت، اپنائیت اور خلوص و توجہ کے کہتے ہیں اس چھت تلے ڈیڑھ ماہ گزار کر ہی پر وہ جان پائی تھی۔

بڑے ابو ان جہانگیر احمد کی ایک بیٹی اور تین بیٹے تھے۔ واحق سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس کے بعد جویریہ تھی، جس کی شادی پشاور اپنے ماموں زاد کے ساتھ ہو چکی تھی۔ جویریہ کے بعد مہران اور خرم تھے۔ چھوٹے چچا جان کے پانچ بچے تھے۔ بڑے شہروز احمد تھے اس کے بعد بالترتیب رجیہ اور سعدیہ تھیں۔ سعدیہ کے بعد دو بھائی ہارون اور زارون تھے۔

واحق کیا کرتا ہے۔ اس سارے عرصے میں اسے قطعی علم نہ تھا۔ بلکہ وہ ڈیڑھ ماہ سے یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ بڑی امی کے واحق نامی کوئی صاحبزادے بھی ہیں۔ البتہ شہروز احمد کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ بڑے ابو اور چچا جان دونوں بھائی مل کر مشترکہ کاروبار کرتے تھے۔ ریشمی کپڑا تیار کرنے کے پانچ چھ کارخانے تھے۔ اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ بہت خوشحال و خوش اطوار ملنسار گھرانہ تھا۔ ابھی تو سوائے جویریہ کے، کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ یہاں رہتے ہوئے اس نے محسوس کیا تھا کہ مہران کا جھکاؤ وجیہ کی طرف ہے۔ شاید بڑوں میں بھی کوئی بات طے تھی۔ البتہ شہروز اپنی کسی خالہ زاد میں انٹرسٹڈ تھا یہ بھی اسے جویریہ سے ہی علم ہوا تھا۔ جبکہ باقی سب ابھی پڑھ رہے تھے۔ ماسوائے واحق کے وہ باقی سب سے اچھی خاصی گھل مل چکی تھی۔ سب اسے بہن کا درجہ دیتے تھے۔ محبت اپنائیت سے پیش آتے تھے۔ وہ اسی پر شاکر تھی۔

* * *

کافی دن ہو گئے تھے اور بھیا بھابی اس سے ملنے نہیں آئے تھے۔ اس کا اپنا گھر سے باہر نکلنا کسی خطرے سے کم نہیں تھا۔ کہیں آ جا بھی نہیں سکتی تھی۔ بھیا بھابی سے ہی ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ مگر اب اس سارے ہفتے میں وہ بھی نہیں آئے تھے۔ وہ جو ان کی آمد کی شدت سے منتظر تھی اس درجہ تاخیر سے اندر ہی اندر پریشان ہو گئی۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ ان لوگوں نے اسے

اتنی محبت سے اپنے گھر میں جگہ دے رکھی تھی یہ کیا کم تھا کہ وہ مزید انہیں پریشان کرنے بیٹھ جاتی۔ وہ خود ہی اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔

سب اپنے اپنے معمول پر جا چکے تھے۔ گھر میں صرف پانچوں خواتین تھیں۔ دادی اماں بشیرن (کام والی ماسی) سے کام کروا کر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھیں۔ چھوٹی چچی کی کسی بہن کا اپینڈکس کا آپریشن ہوا تھا۔ وہ اور بڑی امی ان کی عیادت کو جانے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ وجیہ کا پرسوں ٹیسٹ تھا آج اس نے کالج سے چھٹی کی تھی۔ اور وہ فارغ ادھر سے ادھر چکر لگاتے بور ہو رہی تھی۔ اپنے گھر میں بہت زیادہ سوشل نہیں تھی مگر اتنی بھی قدامت پرست نہیں تھی کہ اپنے گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر زندگی گزار دیتی۔

چھوٹی چچی اور امی کے چلے جانے کے بعد وہ وجیہ کے پاس کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔

"کیا بات ہے آپی..... کچھ پریشان ہیں؟" اسے مسلسل ایک ہی نقطے کو گھورتے دیکھ کر وجیہ نے کتاب بند کر دی اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"مجھے بھلا کیا پریشان ہونا ہے۔ میں تو خود ایک پریشانی ہوں۔" انتہائی دل گرفتگی و یاسیت سے کہتے اس نے کروٹ بدلی تو وجیہ نے فوراً اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"گھر والے یاد آ رہے ہیں؟" بہت محبت سے پوچھا تو اس نے بے اختیار سر ہلا دیا۔

"تو فون کر لیں۔" اس نے معقول مشورہ دیا۔

"بھیا نے اب فون کرنے سے بھی منع کر دیا ہے۔"

"چلیں کوئی بات نہیں۔ ایک دو دن میں وہ دونوں خود آ جائیں گے۔" اس نے ونیزے کو تسلی دی۔

"پتا نہیں کب آئیں گے..... کہیں یہ انتظار طویل نہ ہو جائے۔" دل کی صدا زبان پر آئی تو ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو بھی مچل اٹھے۔

"اللہ نہ کرے۔ انشاءاللہ وہ ایک دو دن میں چکر لگا لیں گے۔ کہیں بزی ہوں گے ورنہ ضرور آتے۔ آپ پلیز ریلیکس ہو جائیں۔" محبت سے اس کے سلکی بالوں میں انگلیاں پھیرتے اس نے ہمت دلائی تو وہ سر ہلاتی خاموش ہو گئی۔ دل اندر ہی اندر بھرا جا رہا تھا۔

"آرام کریں بلکہ سو جائیں۔ میں چھت پر جا کر ٹیسٹ یاد کرتی ہوں۔"

ونیزے کا خیال کرتے محبت سے کہتے وہ اپنی کتابیں سمیت کر لائٹ آف کر کے دروازہ بھیڑ کر چلی گئی تو اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ تنہائی میں دل کھول کر رونا چاہتی تھی۔ اب یہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اچھی طرح کمبل میں قلعہ بند ہو کر رونا شروع کر دیا تھا۔

"وجیہ..... وجیہ..... ارے کہاں ہو؟" ابھی سے اپنا پروگرام شروع کیے چند سو منٹ بھی نہیں گزرے تھے جب کمرے کے قریب واصق کی آواز گونجی۔ وہ شاید دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔ وہ کمبل کے اندر ٹھٹک گئی۔ اپنی سانسیں تک روک لیں۔

"لو یہاں محترمہ استراحت فرما رہی ہیں اور میں سارے گھر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔" اسے چت بستر پر لیٹے، سر تک کمبل تانے سوتے دیکھ کر وہ با آواز بلند بڑبڑایا۔ ونیزے کو اپنے وجود میں سنسناہٹ سی ہوتی محسوس ہوئی۔

"وجیہ ایک منٹ میں اٹھو۔ میرا ایک کام کر دو۔" وہ اب بستر کے قریب آ گیا تھا۔ ونیزے نے جیسے ہی اتنے قریب سے اس کی آواز سنی تو سختی سے مٹھیوں میں کمبل جکڑ لیا۔

"وجیہ! بہری ہو گئی ہو کیا..... خدا کی پناہ..... جب بھی یہ لڑکی سوتی ہے، کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ چاہے کوئی اس کے

سر پر کھڑا آوازیں لگاتا جان سے ہی گزر جائے۔" سخت جھنجلائی ہوئی آواز تھی۔ وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔

"وجیہ!" اب کے واصق نے آگے بڑھ کر بستر پر گرتے ہوئے اس کے پاس جگہ پکڑی تو ونیزے کو اپنے حواس کی طرح اپنا دل بھی مردہ ہوتا محسوس ہوا۔

"وجیہ!..... اٹھو....." واصق نے دونوں ہاتھوں سے کمبل پکڑ کر سختی سے کھینچا تھا۔ اگلا ہی لمحہ اس کے لیے حیرت کا تھا۔ کمبل میں سے وجیہ کے بجائے ونیزے کو برآمد ہوتے دیکھ کر وہ بدک کر کمبل چھوڑتا بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ!" وہ حیران تھا۔

ونیزے واصق سے اس حرکت کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ ایک دم اٹھ کر اس نے ایک طرف دھرے اپنے دوپٹے کو گھسیٹا۔ نہایت ناگواری سے اسے دیکھا اور دوپٹہ کندھوں پر لپیٹا۔

"ایم سوری....." وہ خاصا شرمندہ دو قدم مزید پیچھے ہٹا۔ ونیزے نے انتہائی بے بسی سے اپنے آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو بے دردی سے خشک کیا۔

"رئیلی سوری..... میں سمجھا وجیہ ہے....." ونیزے کے آنسو بہتے ہوئے چہرے کو دیکھتے اس نے پھر ایکسیوز [illegible] دل ہی اندر ٹھٹکا۔ ونیزے کی آنکھ سے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔ چہرے کی سرخی سے یہ واضح محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کافی دیر سے یہ شغل فرما رہی ہے۔ وہ اپنی حرکت کو بھولے اس کی آنسو بھری آنکھوں میں دیکھے گیا۔ مسلسل آنسو بہانے سے [illegible] سرخ ہو گیا تھا اور بے دردی سے دوپٹے سے ناک رگڑتے وہ سرخ انار کی طرح دہک رہی تھی۔ آنکھیں علیحدہ سوج چکی تھیں۔ [illegible] وہ کب سے رو رہی تھی۔ حیرت کے ساتھ ساتھ فکرمندی نے بھی آ گھیرا۔

"کیا بات ہے۔ آپ کیوں رو رہی ہیں؟" اتنا تو اسے یقین تھا کہ یہ آنسو اس کی نادانستگی کے سبب آنکھوں سے نہیں بہے تھے۔ وجہ اور تھی۔ وہ قطعی لاعلم تھا۔

ونیزے نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ دوپٹہ کندھوں پر سیٹ کرتے وہ بستر سے نیچے اتر گئی۔

"پلیز ونیزے..... بتائیں..... کیا ہوا؟..... آئی کین ہیلپ یو۔" اس کے آنسوؤں کے ساتھ ساتھ اپنا دل بھی پانی پانی ہوتا محسوس ہوا۔ وہ بہت خلوص و خاص فکرمندی سے کہہ رہا تھا۔ ونیزے نے مطلق دھیان نہ دیا۔ اسے صاف اگنور کیے وہ دروازے کی طرف بڑھی مگر واصق کے ایکدم راستے میں آ جانے سے رک گئی۔ انتہائی ناگواری اور ناپسندیدگی سے اسے دیکھا جو اسے وہ دن سے انتہائی ناقابل برداشت اور غیر مہذب لگ رہا تھا۔

"ونیزے..... وات ہیپنڈ....." فکرمندی بدستور واصق کی آواز میں موجود تھی۔

"میرا راستہ چھوڑیں۔" وہ دیوار کی طرح سامنے ایستادہ تھا۔ اس کی بات کے جواب میں وہ ایکدم غرائی۔ اب واصق کی نظروں میں الجھن بھی سمٹ آئی۔

"کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟" ایک طرف ہٹنے کے بجائے وہ پوچھ رہا تھا۔ ونیزے کا دل چاہا کہ وہ یا تو سامنے کھڑے شخص کو شوٹ کر دے یا پھر اپنا سر دیوار پر دے مارے۔ لسوڑا ہی بنتا جا رہا تھا یہ شخص۔

"پلیز، میں نے کہا نا کہ میرا راستہ چھوڑیں۔" وہ سختی سے کہہ گئی۔ واصق فوراً راستے سے ہٹا تھا۔ وہ ایک منٹ ضائع کیے بغیر دروازے کی طرف بڑھی۔

"ایک منٹ ونیزے..... اتنا تو بتا دیں..... رو کیوں رہی تھیں؟" اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے باہر نکلتی اس نے پھر تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھاما۔

ونیزے تو پوری جان سے کانپ گئی۔ اب تک کسی کے اندر اتنی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ اسے انگلی سے بھی چھو سکے اور یہ شخص جب سے آیا تھا اسے مسلسل ناگواریوں اور برداشت کے سمندر میں دھکیلتا جا رہا تھا۔ آنکھیں پھاڑے واحق کو دیکھتے اس نے اپنا بازو اس کی گرفت سے ایک دم کھینچا۔

"شٹ اپ..... حد میں رہو اپنی......" غصے سے برا حال ہو گیا تھا۔ خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔

"مگر ونیزے....." واحق نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے انگلی اٹھا کر اسے روک دیا۔ پھر چبا چبا کر کہا۔

"میں بہت مختلف لڑکی ہوں۔ آئندہ میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کرنا۔ میں کوئی گری پڑی لڑکی نہیں ہوں، نہ ہی کوئی روشانے ہوں۔ میں ونیزے جواد حسن ہوں سن لیا تم نے۔ اور یہ اپنے دماغ میں بھی فیڈ کر لو۔" وہ اپنا سارا غصہ، ساری کوفت، انتہا ناپسندیدگی و ناگواری چند لفظوں میں اس پر انڈیل کر دروازے کی دہلیز پار کر گئی تھی۔ پیچھے تو صرف اس کے جملوں کی بازگشت ہی باقی تھی۔

جو کچھ بھی ہوا تھا وہ لاشعوری اور انجانے میں ہی سرزد ہوا تھا۔ اس میں واحق کی اپنی کسی شعوری کوشش یا خواہش کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ پہلی ملاقات میں بھی وہ اسے مشکوک سمجھ کر نازیبا حرکت کر بیٹھا تھا۔ مگر جب وہ بے ہوش ہو گئی تو اپنی غلطی پر پشیمان بھی ہوا تھا۔ آج تو اس نے ایسی کوئی غلط حرکت نہیں کی۔ وہ تو اسے ونیزے کے آنسوؤں نے مضطرب کر دیا تھا۔ اسی لیے بہت شائستگی سے سب احتیاطیں فراموش کیے اس سے رونے کی وجہ جاننا چاہتا تھا مگر وہ یوں کہہ جائے گی اندازہ نہ تھا۔ پتا نہیں وہ کیا کہہ گئی تھی کسی روشانے کی بات کر گئی تھی اس کے تو فرشتوں کو بھی علم نہ تھا۔ اور وہ نجانے اس کے دماغ میں کیا فیڈ کروانا چاہتی تھی۔ وہ اس کے جملوں پر جھنجلاتا کمرے سے باہر نکل آیا۔ لاؤنج میں آیا تو وہ [illegible] کی کرسی پر بیٹھی اپنے دونوں بازوؤں پر سر رکھے رو رہی تھی۔ وہ پھر ٹھٹک گیا اندر بڑھنا چاہا مگر پھر نفی میں سر ہلاتے واپس پلٹ گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے انتہائی بے زاری و کوفت سے بستر پر رکھی شرٹ اٹھا کر [illegible] پر ہی اچھال دی۔ خود بھی منہ کے بل بستر پر گرا۔ اب کہیں بھی جانے کا موڈ نہیں رہا تھا۔ بری طرح ڈسٹرب ہو چکا تھا۔ اندر باہر ونیزے کے نام کی ہلچل مچ گئی تھی۔ بری طرح خود کو لعنت ملامت کر کے اس نے آنکھیں بھی میچ لیں۔ ہائے قسمت، آنکھوں کی اسکرین پر بھی پلکوں کی باڑ بچھی نگاہ جاندنی سا عکس جھلملاتا جگمگاتا چلا آیا۔

انار کی طرح دہکتی ناک، سرخ رخسار اور روتی ہوئی آنکھیں، مسلسل روانی سے بہتے موتی، واحق کو بہت واضح عکس لگا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول لیں۔

"یا خدا کیا کروں..... ضرور یہ بے حواس اور پاگل پاگل سی لڑکی مجھے بھی بے حواس اور پاگل کر دے گی۔" انتہائی بے بسی سے مکا بستر پر مارتے، دانتوں کو بے دردی سے کاٹتے سخت جھنجلا کر اس نے تکیہ سر کے نیچے سے کھینچ کر بغیر کہیں دیکھے سامنے دے مارا۔

"ہائے..... ہائے..... اوئی میرے اللہ......" نسوانی چیخ پر وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ سامنے ہی دادی اماں اپنا سر پکڑے ہول رہی تھیں۔ وہ فوراً بستر سے اٹھ کر ان کی طرف لپکا۔

"کیا ہوا دادی اماں؟" فوراً ان کو کندھوں سے تھاما، مبادا گر نہ جائیں۔

"کیا مار دیا ہے تو نے لڑکے..... ہائے میرا سر....." واحق کو دیکھتے انہوں نے پھر اپنا سر تھاما تو اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے جلدی سے انہیں بستر پر بٹھا دیا۔ اس نے تو بس یونہی کوفت زدہ ہوتے ہوئے تکیہ نکال کر دے مارا تھا۔ اسے کیا علم تھا کہ وہ سیدھی اندر داخل ہوتی دادی اماں کے سر کا نشانہ لے گا۔ آج اس سے غلطیوں پر غلطیاں ہو رہی تھیں۔ آج اسے اپنا یہ دن انتہائی منحوس لگا۔

"ایم سوری اماں! بس یونہی ہو گیا۔" دونوں ہاتھوں سے ان کے سر کو دباتے اس نے کہا تو دادی اماں نے اسے اپنا پ

درست کرتے دیکھا۔

"تم وجیہہ..... وجیہہ چلا رہے تھے۔ میں تو وہی معلوم کرنے آئی تھی کہ کیا کوئی کام تھا تمہیں اس سے مگر دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی یہ مو امر بانہ سر پر آ لگا۔"

وہ شرمندہ ہوا۔ وہ اتنا غیر مہذب نہیں تھا نجانے پچھلے چند دنوں سے اس سے ایسی کیا غلطیاں سرزد ہوئیں تھیں کہ گھر آتے ہی وہ غلطیوں پر غلطیاں کرتا جا رہا تھا۔

"وہ بس دادی اماں مجھے دوستوں کے ساتھ لنچ پر جانا تھا۔ ڈھنگ کے کوئی کپڑے نہیں مل رہے تھے۔ سوچا وجیہہ سے کہوں وہ کوئی اچھا سا سوٹ استری کر دے مگر وہ ہے کہاں..... وہ تو آج کالج نہیں گئی، اور کمرے میں بھی نہیں....."

"چھت پر بیٹھی کوئی سبق یاد کر رہی ہے۔ تم ونیزے یا مجھ سے کہہ دیتے۔"

"نہیں..... اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں کہیں نہیں جا رہا۔" اس نے صاف انکار کر دیا تو دادی اماں دیکھنے لگیں۔

"دادی اماں، یہ ونیزے ہمارے گھر کیوں رو رہی ہے۔ کوئی مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟" اچانک خیال آیا تو ان سے پوچھ لیا۔ وہ ابھی تک اس کی اپنے ہاں آمد کی وجہ سے بے خبر تھا۔

"کیا بتاؤں واحق! اللہ نے جیسی موہنی صورت دی ہے مقدر ایسے ہی....." وہ افسوس سے ہاتھ ملتے خاموش ہو گئیں۔ وہ بے قراری سے دیکھے گیا۔

پھر دادی اماں نے اسے ساری بات کہہ سنائی وہ تاسف و بے یقینی سے سر ہلاتا رہا۔ اسے ونیزے سے دلی ہمدردی بھی ہوئی۔

"ہمیں تو بڑی فکر ہے اس بچی کی۔ ایک طرف بیٹے بہو کا یہ ایک بوجھ لیے کندھوں پر۔ ہمیں تو ایک ہی فکر ہے۔ اللہ بچی کے مقدروں کو سنوارے، اسے سکھ دے۔ کم عمری میں ہی ماں باپ کا دکھ دیکھ لیا۔ ادھر وہ نحوست مارا لالچی شخص آسیب بن کر پیچھے لگا ہوا ہے۔ گھر سے بے گھر ہو گئی ہے۔ اسے دیکھتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اللہ ہدایت دے اس شخص کو بھی کہ وہ بچی کا پیچھا چھوڑ دے۔ اتنی فرشتہ صفت لڑکی ہے۔ زندگی میں کوئی پہلی دفعہ اتنی بھولی بھالی معصوم صورت لڑکی دیکھی ہے۔ آنکھوں میں ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔" وہ ان کی آواز سے اندازہ لگا سکتا تھا خاموشی سے سنتا رہا۔

"واحق! ہوتی تو تو کر اس بچی کے لیے۔ یونہی تو وہ شخص پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس کے بھائی نے مقدمہ تو کر رکھا ہے اس شخص پر مگر کچھ بن نہیں رہا اور ہاں تمہارے جاننے والے خاصے امیر خوشحال سلجھے ہوئے شریف لوگ ہیں کوئی بات تو چلاؤ۔" وہ ناسمجھی میں انہیں دیکھنے لگا۔ "بہت بڑی ذمہ داری ہے جو اس کے بھائی بھاوج نے ہم پر لاد رکھی ہے۔ شادی ہو جائے گی، اپنے گھر بار والی ہو، سر پر شوہر کے نام کی چادر ہو گی تو مجال ہے وہ شخص اس کا نام بھی لے لے۔" دادی اماں کہہ رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے سنتا رہا جبکہ ذہن کہیں اور تھا۔

"واحق!" دادی اماں نے اسے پرسوچ انداز میں سوچتے دیکھا تو کہا۔ "سن رہا ہے نا تو؟" انہوں نے پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔

"آپ فکر مت کریں۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے تسلی دی۔

"خدا کرے۔ بڑی پریشان ہے صبیحہ تو۔ بہت تنگ کر رہا ہے وہ ان دونوں کو۔ کاروبار پر تو موا سانپ بن کر بیٹھا ہی ہے بچی کو بھی کھانے کا سوچ رہا ہے۔ روز دھمکیاں دینے پہنچ جاتا ہے دو غنڈے پیچھے لگا رکھے ہیں۔ صبیحہ اور امجد تو ڈر کے مارے ادھر بھی نہیں آ رہے۔ ادھر سے یہ بچی فون کر کے خیر خیریت بھی معلوم نہیں کر سکتی۔ تیرے ابو نے ایک دو رشتے تو دکھائے تھے مگر وہ دونوں

کو پسند نہیں آئے۔ ہماری خواہش ہے کہ...... "وہ واحق کو دیکھتے فوراً چپ ہو گئیں۔ واحق یونہی مسکرا دیا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ آپ دل چھوٹا مت کریں۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ بہت جلد اپنے گھر جائے گی۔" اس نے تسلی دی تو دادی اماں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ بڑی حساس ہے یہ بچی، ہر وقت کڑھتی رہتی ہے۔ خدا وہ دن جلدی لائے جب وہ ساتھ خیریت کے اپنے گھر جائے۔" وہ کہتے کہتے کمرے سے نکل گئی تھیں۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

* * *

"میں واحق جہانگیر ہوں۔ جہانگیر کا بیٹا۔ آپ پلیز اندر خبر کر دیں۔" وہ اس شاندار آفس میں کھڑا ایک سک سے تیار خوبصورت انداز و اطوار کی مالک سیکرٹری سے مخاطب تھا۔ واحق کے انداز میں کوئی ایسی خاص بات ضرور تھی کہ اس نے فوراً سر اٹھا کر سرتاپا واحق کا جائزہ لیا۔

اس نے بہت سے مرد دیکھے تھے۔ وہ کچھ جدا سا تھا۔ لاتعلق سا، اجنبی مگر از بکنڈ۔

"یس...... " مرہانے ہونے اس نے انٹرکام پہ اطلاع دی۔

"آپ پلیز اندر چلے جائیں۔" دوسری طرف سے اجازت ملتے ہی وہ اٹھ کر دروازے کی طرف اشارہ کر گئی۔

"شکریہ۔" اسی لاتعلق انداز میں کہتا وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا سیکرٹری کرسی پر بیٹھتے ہی بڑبڑائی۔

"بندہ تو شاندار ہے مگر ہے خاصا مغرور۔"

"السلام علیکم!" اس قدر شاندار آفس میں داخل ہو کر سامنے کرسی پر براجمان امجد جواد حسن کو اس نے سلام کیا تو وہ ایک دم اٹھ کر اپنی کرسی چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا۔

"وعلیکم السلام۔ اچھا تو آپ ہیں واحق۔ جہانگیر انکل کے صاحبزادے۔" بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے امجد نے کہا۔ پھر اسے لے کر دوسری طرف رکھے صوفوں پر آ بیٹھا۔

"آپ تو شاید پشاور گئے ہوئے تھے۔ کسی اہم مشن پر۔" امجد بھائی نے پوچھا تو واحق اندر ہی اندر خاصا جھنجلایا۔

"آپ کو کس نے بتایا؟" تھوڑا سا تکلف میں بیٹھتے اس نے بغور انہیں دیکھا۔

"آپ کے والد محترم نے۔" ابو کے متعلق جان کر اسے مزید غصہ آیا۔ "ایک تو میرے گھر والے کسی بات کو راز نہیں رکھ سکتے۔"

وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا مگر بظاہر مسکرا دیا۔

"بس جیسے ہی کام ختم ہوا میں واپس آ گیا۔"

"پھر کیسا رہا آپ کا مشن۔" انہوں نے مزید دریافت کیا۔

"بہت اچھا۔ میری توقع سے بہت بڑھ کر۔" اسے اب سب بتانا مجبوری تھا۔ ورنہ اتنی پرسنل گفتگو وہ کسی سے بھی نہیں کرتا تھا۔ ایک تو یہ کہ یہ شخص ونیزے کا بھائی تھا۔ دوسرے وہ خود چل کر اس کے پاس آیا تھا۔

"کیا لیں گے آپ؟ چائے یا کولڈ ڈرنک۔" سائیڈ ٹیبل پر رکھے انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے انہوں نے پوچھا تو اس نے چائے کا کہہ دیا۔

"میں تین روز پہلے ہی اپنے گھر لوٹا تھا وہاں آپ کی بہن کو دیکھا۔ ساری صورتحال جان کر از حد دکھ ہوا۔ آج کسی کام سے ادھر گزر ہوا تو سوچا لگے ہاتھ آپ سے بھی مل لوں۔" اس نے اپنی آمد کے متعلق بتا با وہ مسکرا دیئے۔

"ونیزے کیسی ہے خوش تو ہے وہ وہاں؟"

"ٹھیک ہیں۔ جہاں تک خوش رہنے کی بات ہے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں وہ کافی اداس ہیں، شاید آپ کی منتظر بھی۔" اس نے جلدی اصل بات کہہ دی۔ ابھی وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتے تھے جب ملازم اندر داخل ہوا۔ انہوں نے ویٹ بھیج لئے۔ ملازم برتن رکھ کر چلا گیا تو انہوں نے چائے کا کپ تھام کر واحق کو پکڑایا۔

"شکریہ۔"

"یاد تو مجھے بھی اس کی بہت آتی ہے۔ فی الحال ابھی ہم نہیں آسکتے۔ وہ اگر وہاں خوش نہیں تو ناخوش بھی نہیں ہے۔ اتنا تو مجھے آپ لوگوں پر یقین ہے۔ یہاں کے حالات سنورنے کے بجائے روز بروز بگڑتے ہی جا رہے ہیں۔ محبوب رحمانی روز کوئی نیا شوشہ لے چلا آتا ہے۔ پھر یہ بھی ڈر ہے کہ وہ کہیں ہمارا پیچھا کرواتے ہوئے آپ لوگوں تک نہ پہنچ جائے۔ ونیزے کے ساتھ ساتھ مجھے آپ لوگوں کی بھی فکر ہے۔ ہماری خاطر آپ لوگوں کو کافی زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔"

"ارے نہیں...... زحمت کیسی۔ رشتے دار ہونے کے ناطے یہ تو ہمارا فرض ہے۔ اچھا کیا آپ نے ہم پر بھروسہ کیا۔ بے فکر رہیں۔ ونیزے وہاں محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ میں ہر طرح سے تعاون کرنے کی کوشش کروں گا۔ اسے آنچ تک نہیں آئے گی۔ بلیو می۔" اس نے پرعزم لہجے میں یقین دلایا۔ امجد نے بغور واحق کا جائزہ لیا۔ یکدم انہیں اپنا مسئلہ کافی حد تک حل ہوتا محسوس ہوا۔ واحق جہانگیر کی پرسنالٹی نظر انداز کر دینے والی نہ تھی۔ بلو فری پیس سوٹ میں ملبوس وہ بہت زیادہ بارعب، سنجیدہ، پروقار اور ذہین لگ رہا تھا۔ انہیں ونیزے کے لئے کسی ایسے ہی مضبوط، پرعزم، ذہین اور شریک سفر کی ضرورت تھی۔ جو حالات سے لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ حالات سے آگاہی رکھتا ہو۔ نہ صرف ونیزے کے لئے ایک مضبوط قلعہ ثابت ہو بلکہ انہیں بھی محبوب رحمانی کی چالاکیوں کے چنگل سے نکالنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ ان کے ذہن نے لمحوں میں ایک فیصلہ کیا تھا۔ اسے عرصے کی پریشانی یکدم مفقود ہوگئی تھی۔

"آپ ونیزے کو تسلی دیجئے گا ہم انشاءاللہ دو ایک روز میں آپ کے ہاں چکر ضرور لگائیں گے۔"

"ضرور۔" اس نے بھی خوش دلی سے ہامی بھری۔

وہ مزید کچھ دیر کا نفرنس یا دور محبوب رحمانی کے متعلق دریافت کرتا رہا پھر وہ محبوب رحمانی کے متعلق ضروری کاغذات لے کر ان سے اجازت لیتا باہر نکل آیا۔

گھر لوٹا تو سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ ابھی لیٹا ہی تھا کہ امی بھی پیچھے چلی آئیں۔

"کہاں تھے تم؟" اسے اٹھ کر بیٹھتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

"بس یونہی ادھر ادھر گھومتا رہا تھا۔" کوٹ اتار کر ٹائی کی گرہ کھول کر اس نے شرٹ کے بٹن بھی کھولنا شروع کر دیئے تھے۔

"کھانا لاؤں تمہارے لئے۔" کف لپیٹتے اسے دیکھا تو انہوں نے پوچھا۔

"ضرور مگر ابھی نہیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد۔" مسکراتے ہوئے کہا تو امی قریب ہی بیٹھ گئیں۔ محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں جبکہ وہ جھک کر اپنے پیروں کو جوتوں اور جرابوں سے آزاد کروانے لگا تھا۔

"تمہاری چھٹیاں کب ختم ہو رہی ہیں؟" اگلا سوال ہوا۔

"پتا نہیں۔" جوتے بیڈ کے نیچے کھسکاتے وہ سیدھا ہوا۔

"کیوں؟"

"میرے افسران کا حکم ہے کہ عید تک میں تو ٹلی فارغ ہوں۔ آرام سے خوب موج مستی کروں۔ شاید عید کے فوراً بعد مجھے کسی اور مشن پر بھیجنا چاہتے ہیں۔ لیکن کہاں یہ نہیں بتایا۔ بس یہ دو ماہ کا دورانیہ مجھے آرام کے لئے ہی دیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم دو ماہ تک گھر پر ہی رہو گے۔" اس کا انداز پُرسوچ تھا۔ اس نے سر ہلا دیا۔ "شکر ہے میری بھی دلی مراد بر آئی۔ ورنہ جب سے تم نے یہ جاب شروع کی ہے مہینوں بعد تمہاری صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔" پھر مسکراتے ہوئے ان کا انداز معنی خیز ہوا۔ "اب میں اپنی خواہش بھی پوری کروں گی۔ تمہاری اپنی کوئی پسند ہے تو بتا دو۔ ورنہ خود ہی کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔" امی نے کہا وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ وہ واقعی سنجیدہ تھیں۔ وہ ہنس دیا۔

"نہیں امی..... ابھی نہیں۔ ابھی تو مجھے بہت کام کرنا ہے۔" صاف بہانہ تھا۔

"ساری عمر تمہیں یہی کام ہی کرنے ہیں۔ بس اب میں کچھ نہیں سنوں گی۔ ہمارے لئے یہ دو ماہ ہی بہت ہیں۔ پہلے تو تمہارے فارغ ہونے کی منتظر تھی۔ اب کوئی بہانہ نہیں لے گا۔ بس اتنی رعایت ہے کہ اگر کوئی لڑکی دیکھ رکھی ہے تو ہمیں بتا دو ورنہ ہم خود دیکھ کر رہیں گے۔"

"پسند....." وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ جھٹکے سے ذہن کی سطح پر کانچ سے وجود والا آنسوؤں سے تر چہرہ آ گیا۔ یکدم اس کے ہونٹوں پر ایک دلربا سی خوبصورت مسکراہٹ ابھری تھی۔ الوہی جذبوں سے مزین۔

امی جو اسے بغور دیکھ رہی تھیں بدلتے اس کے چہرے پر دم بدم گہری ہوتی مسکراہٹ کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"کون ہے وہ؟" نجانے انہوں نے اس کے تصور تک رسائی حاصل کر لی تھی یا نہیں، پوچھا ضرور تھا۔ وہ ایکدم چونکا پھر نفی میں سر ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ مقصد امی سے بچنا تھا۔

"ابھی تک تو کوئی نہیں۔" کوٹ اٹھا کر الماری میں رکھتے واسق نے کہا۔ "اور پلیز امی! ابھی اس ٹاپک کو رہنے دیں۔ ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر مجھے کوئی پسند آ گئی تو پہلی فرصت میں آپ کو ہی بتاؤں گا۔" اس کا مقصد فی الحال امی کو ٹالنا تھا۔ وہ سب سمجھ رہی تھیں۔ اس کے گریز میں چھپا مفہوم ان کی سمجھ میں آ رہا تھا مگر تصور واضح نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ٹھیک ہے۔ مگر یہ بھی سن لو میں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کروں گی۔ کوئی پسند ہے تو بتا دو دوسری صورت میں لڑکی دیکھ چکی ہوں۔ پھر مت کہنا کسی نے مجھ سے پوچھا نہیں۔" انہوں نے دوٹوک انداز میں کہتے فیصلہ سنایا تو وہ چونک کر امی کو دیکھنے لگا۔

"کون ہے وہ لڑکی؟" بے اختیار پوچھا، چہرے پر چھائی پریشانی واضح تھی۔ امی ایکدم مسکرا دیں۔

"تم نے مجھے بتایا ہے جو میں بتا دوں۔ اچھی طرح پہلے سوچ لو۔ بعد میں بتا دینا۔"

خوشگوار لہجے میں کہتی اس کے بالوں کو چھیڑتے وہ باہر نکل گئی تھیں۔

* * *

وہ ٹی وی آف کر کے زینہ طے کرتے اوپر ٹیرس پر آ گیا۔ آج بہت دنوں بعد اس کا دل یہاں ٹہلنے کو چاہ رہا تھا۔ رات گیارہ بج رہے تھے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے جا چکے تھے۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پہلے ٹی وی لگا کر بیٹھا مگر دل نہ مانا تو یہاں آ گیا تھا۔ شعبان کا مہینہ چل رہا تھا۔ آج شاید شعبان کی ساتویں یا آٹھویں تاریخ تھی۔ آسمان پر چاند آدھا تھا اس کے باوجود ارد گرد کافی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ ٹھنڈی میٹھی معطر پھوار برس رہی تھی۔ آج کل جو آگ اس کے اندر لگی ہوئی تھی وہ بھی ٹھنڈی میٹھی پھوار بن کر اس کے پورے وجود کو بھی معطر کر دیتی تھی اور کبھی پورے وجود میں بھڑک کر اس کو بھی بھڑکانے لگتی تھی۔

وہ جو خود کو ہمیشہ سے ہی ناقابلِ تسخیر سمجھتا آیا تھا۔ اس قدر اچانک غیر متوقع طور پر اس بے حواس پاگل سی لڑکی کے ہاتھوں تسخیر ہو چکا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت بھی اس بات پر ہو رہی تھی کہ وہ جو چھوٹی چھوٹی خلافِ فطرت بات پر چڑ جاتا تھا ہنگامہ کھڑا کر دیتا تھا اب ان چند دنوں میں اس قدر بدل گیا تھا کہ اپنے اندر ہونے والی یہ واردات بھی اچھی لگ رہی تھی۔ مگر وہ لڑکی ونیزے، وہ ابھی تک سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ واسق کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کی واضح لہر چھا جاتی تھی کہ وہ خواہ مخواہ وہم ہونے لگتا تھا کہ جیسے وہ واقعی کوئی غلط کریکٹر کا حامل شخص ہے۔ واسق کو اس کی نظروں کی کاٹ سے اب الجھن ہونے لگی تھی۔ دوسری طرف امی نے اسے الجھا دیا تھا۔ جو بار بار اسے اس کی پسند کے متعلق پوچھتے اسے زچ کئے دے رہی تھیں۔ کتنی دفعہ لبوں پر ونیزے کا نام آ کر رہ گیا تھا۔ اسے اب خود پر بھی غصہ آنے لگا تھا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے وہ یونہی کھڑا رہا اسے سوچتا رہا کہ اچانک ماحول میں کچھ ارتعاش سا پیدا ہوا تھا۔ اس نے یونہی آنکھیں کھول کر دیکھا تو بے یقین ہوا گرین سوٹ میں ملبوس وہ بلاشبہ ونیزے ہی تھی۔ آہستہ آہستہ زینہ طے کر کے اوپر آ رہی تھی۔ اس کا سر اچھا خاصا جھکا ہوا تھا۔ وہ صرف اپنے پیروں پر نظریں جمائے چل رہی تھی یا پھر زمین پر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ وہ بغیر ادھر اُدھر دیکھے، کسی طرف دھیان دیے، ناک کی سیدھ پر چلتی بالکونی کے دوسرے سرے پر رکھی کرسیوں میں سے ایک پر جا بیٹھی۔ چونکہ وہ اچھے خاصے اندھیرے میں کھڑا تھا۔ اس لئے ونیزے نے سر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنے کے باوجود اسے نہیں کھوجا تھا۔ ایک سرسری نظر ڈال کر وہ دوبارہ اپنی جھولی میں رکھے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے باہر دیکھتی رہی۔

واسق کا دل چاہا اس سے جا کر پوچھے کہ وہ رات کے اس پہر یہاں کیوں آئی ہے۔ کیا اسے بھی اس کی طرح کسی کی یاد تنگ کر رہی ہے مگر وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہل سکا۔ ٹک ٹک بغیر پلکیں جھپکائے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ بغیر اس بات کا خیال کئے یہ ایک بہت ہی غیر اخلاقی حرکت ہے۔

ابھی وہ اسے دیکھ ہی رہا تھا جب اچانک ہی ونیزے نے ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ دونوں گھٹنوں پر سر رکھ کر وہ شاید پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ واسق کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے ہلا تھا۔ یہ سوچے بغیر اس کی طرف بڑھا کہ اس نے اسے اس وقت اپنے سامنے دیکھ لیا تو کیا ری ایکشن ہو گا۔

"ونیزے....." وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے سر پر جا پہنچا تھا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا۔ بے اختیار اس کی بلند ہوتی سسکیاں بند ہو گئیں۔ ایکدم سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے واسق کو دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا ونیزے..... کیوں پریشان ہیں؟" بہت اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔ شاید ہی زندگی میں کبھی اس کے لہجے میں اتنی اپنائیت اور محبت بسی ہو جتنی آج۔ وہ یہ محبت و خلوص چاہت صرف اور صرف ونیزے کے لئے محسوس کر رہا تھا۔

"آ..... آ..... پ" ایکدم وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے اپنا گھر یاد آ رہا تھا۔ بھیا بھابی اور بچوں کی یاد ستا رہی تھی۔ دل بہت دکھا ہوا تھا مگر وہ جیہ کے سامنے آنسو بہا کر اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے اس کے سونے کے بعد خاموشی سے ادھر آ گئی تھی دل کھول کر رو دینے کے لئے۔ اپنی قسمت کو وہ اپنے مقدروں کو مگر آج پھر یہ شخص اس کے آنسوؤں کے درمیان رکاوٹ بن کے آ کھڑا ہوا تھا۔

"جی ٹھیک ہوں میں۔" ہمیشہ کی طرح اب بھی اس کے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ اب بھی خاصی ناگواری سے ایک چبھتی نظر ڈال اس نے پیچھے واپس جانے کے لئے قدم اٹھایا تو وہ پھر سامنے آ گیا۔

"تو پھر رو کیوں رہی تھیں؟" واسق جہانگیر کو ونیزے کی کاٹ دار نگاہ اپنے اندر تک اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اسے روک بیٹھا تھا۔

"دماغ خراب تھا میرا۔ میں نے آپ کو پہلے بھی وارن کیا تھا کہ آپ اپنی حد میں رہیں۔ میں نے کہا بھی تھا کہ میں چیپ لڑکی ہوں۔ آئندہ میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کیجئے گا۔" اپنے چہرے کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے غصہ بھری آواز میں کہا۔ "یہ ٹھیک ہے میں اپنی مجبوری کی وجہ سے آپ کے در پر پڑی ہوئی ہوں مگر کوئی گری پڑی نہیں ہوں نہ ہی ان لڑکیوں جیسی ہوں جن سے آپ کا واسطہ ہوتا ہوگا۔ پھر بھی آپ یہاں آ گئے۔ کم از کم اپنے والدین کا ہی تو خیال کر لیتے۔"

وہ اس کے یوں راستہ روکنے پر پھٹ ہی تو پڑی تھی۔ بہت ہی بری طرح گھورتے اس نے واسق کو سب سنا دیا تھا۔ سن کے تو مانو چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ کتنا غلط سوچ اور سمجھ رہی تھی وہ اسے۔ کتنی غلط رائے رکھتی تھی وہ اس کے بارے میں۔ اس کے الفاظ سن کر واسق کو انتہائی افسوس ہوا۔ وینیزے پر نہیں اپنی پسند پر۔

دل کی اس انوکھی جسارت پر جسے ساری دنیا میں اس لڑکی کے سوا کوئی اور ملی ہی نہیں تھی۔ انتہائی دکھ وملامت بھری نظر اس پر ڈالتے، جب بولا تو اس کو اپنی آواز انتہائی سپاٹ لگی۔

"بہت غلط ہے۔ مردم شناسی کی صلاحیت تو موجود ہی نہیں آپ میں۔ کیا سمجھ رہی تھیں آپ مجھے، اور کیا ہیں آپ صرف ایک جسم..... " واسق کی نظروں میں واضح تمسخر اتر آیا تھا۔ سر تا پا وینیزے کا جائزہ لیا۔ وہ تو ان الفاظ سے شپٹا ہی گئی۔ "بے جسم بھی بھی میری طلب نہیں بنا اور نہ میرے فیورٹ لسٹ میں حسن کی کمی تو نہیں۔ پتہ نہیں کیوں آپ نے اتنی غلط بات میرے حوالے سے کہہ دی۔ آپ خود بتائیں۔ کیا میں نے گندی نظر سے آپ کو دیکھا ہے۔ میں بہت اونچا سمجھتا تھا آپ کو۔ بہت منفرد، بہت منفرد، مگر افسوس، آپ کی سوچ بھی ان عام لڑکیوں جیسی ہے۔ سطحی۔ بہت ہی عام سی نکلی ہیں آپ تو۔ عام سوچ رکھنے والی ذہنیت کی حامل، عام سی لڑکی کے فکر رکھتے۔ تیزے جواد حسن، مجھے اپنے والدین کا بہت خیال ہے۔ اینڈ یوکین گو فرام ہیئر۔" درشتی سے کہتے اس نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ جیسے کسی سحر سے آزاد ہوئی۔ کتنا کچھ سنا دیا تھا واسق نے اسے، تمام الفاظ کے اندر اترے تھے۔ ایک کرب سی لہرائی، ناگواری تو پہلے بھی تھی اب آنکھوں میں بے یقینی بھی تھی۔ دو قدم بڑھائے تو اپنے عقب میں آئی واسق کی آواز پر رک گئی مگر مڑی نہیں تھی۔

"آئندہ جب بھی کوئی قدم اٹھائیں تو اپنے گرد و پیش کا بھی جائزہ لے لیا کریں۔ یہاں آ کر بیٹھنے سے پہلے اچھی طرح دیکھ اور سمجھ لینا چاہئے تھا کہ یہاں کوئی پہلے سے موجود تو نہیں۔ یہ ہمارا گھر ہے۔" کتنا توہین آمیز لہجہ تھا، وینیزے کا جی چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ بے اختیار پلٹ کر اسے دیکھا وہ رخ موڑے کھڑا تھا۔ اسے صرف اس کی لمبی چوڑی پشت دکھائی دی۔ وہ جھلملاتی آنکھوں سمیت تیزی سے تقریباً بھاگتے ہوئے نیچے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

"کاش میں اس وقت یہاں نہ آتی یا وہ نہ تلی باچھراتی باتیں ہی نہ ہوتیں، یوں اپنی سوچ، اپنی پسند سے دل اچاٹ نہ ہوتا۔" اسی کرسی پر گرتے جس پر چند منٹ پیشتر وہ بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو اپنی مٹھیوں میں جکڑتے انتہائی دل گرفتگی سے سوچا۔

اگلا سارا دن وہ اپنے کمرے میں بند رہی۔ واسق کی باتیں یاد آتیں تو مزید اذیت سے دوچار ہو جاتی۔ یہ نہیں تھا کہ اس کا دل واسق کی جانب سے صاف ہو گیا تھا بلکہ وہ اور زیادہ دل گرفتہ ہو گئی تھی۔ پہلے تو وہ اسے صرف فلرٹ، نظر باز اور دھوکے باز لگتا تھا اب وہ اسے ڈرامے باز بھی لگنے لگا تھا۔

"کتنی اچھی ایکٹنگ اور ڈائیلاگ بازی کی تھی۔ صرف اور صرف مجھے متوجہ کرنے کو۔" وہ اب بھی تنفر سے یہی سوچ رہی تھی۔ خاص طور پر اس کی رات والی باتیں، جسم، عام سی سوچ والی عام ذہنیت کی حامل عام سی لڑکی کہنا اسے پوری رات اذیت کی آگ میں جھلساتا رہا تھا۔ اس نے کب کسی سے اتنا کچھ سنا تھا۔ کوئی موقع ہی نہیں ملا بطور خاص کسی سے بات کرنے اور اس کے بارے میں رائے قائم کرنے کا۔ وہ شروع سے ہی خاصی ڈرپوک اور گم صم واقع ہوئی تھی اسی لئے اس کی دنیا گھر، اسکول و کالج بھیا بھابی، بچوں

بھی بھار کی جانے والی آؤٹنگ تک ہی محدود تھی۔ اس کا حلقہ احباب بہت محدود تھا۔ دوست تو گنتی کی تھیں۔ چند ایک لڑکوں سے دوستی کرنے کا نہ تو اسے شوق تھا نہ ہی اشتیاق بلکہ وہ اس صنف سے ہی دور بھاگتی تھی۔ جب سے محبوب رحمانی نے آ کر زندگی اجیرن کر دی تھی، اس صنف سے اعتبار ہی اٹھ گیا تھا اور اب واسق جہانگیر نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ اگر وہ اس کے متعلق اچھی طرح نہ جانتی ہوتی تو شاید اس کی سوچ پازیٹو ہوتی مگر اب مثبت انداز میں سوچنے کی تو گنجائش ہی نہ تھی۔ یہی بات اسے بے چین کئے ہوئے تھی۔

"مگر شاید وہ نہیں جانتا میں عام سی ذہنیت رکھنے والی عام سی لڑکی ضرور ہوں مگر ہر ایک پر مر مٹنے والی نہیں ہوں۔ مانا کہ اس کی پرسنالٹی بہت اٹریکٹو ہے۔ مقابل کو مسحور کر دینے والی ہے مگر میں واقعی مختلف ہوں۔ مجھے اپنے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں۔ وقت اور حالات نے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ باپ کے غلط فیصلوں کی بدولت دوسروں کے در پر زندگی ضرور گزار رہی ہوں مگر بے غیرت نہیں ہوں۔ واسق جہانگیر احمد میں نے تو تمہیں پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔ بعد کی باتیں تو بے معنی ہیں۔ میں راہ میں پڑا وہ روڑا نہیں ہوں، جسے تم اٹھا لو، کچھ دیر اپنے پاس رکھو اور پھر کہیں پھینک دو۔ باحیثیت و باوقار جیتا جاگتا وجود ہوں۔ محبوب رحمانی جو بھیڑیے کی طرح میرے پیچھے لگا ہوا تھا اب ایک ایسا ہی انسان تم بھی بن گئے ہو۔ کاش بھیا بھابی آ جائیں اور میں یہاں سے چلی جاؤں۔" آنکھوں پر بازو لپیٹے وہ مسلسل یہی سوچ رہی تھی۔

بڑی امی کمرے میں داخل ہوئیں تو اچھا خاصا اندھیرا تھا، انہوں نے لائٹ آن کی۔

"کیا بات ہے وینیزے بیٹی! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" بڑی امی نے بستر پر بیٹھ کر اس کی آنکھوں سے بازو ہٹا کر پوچھا۔ انہیں ایکدم اپنے سامنے دیکھ کر اس نے اپنی بھیگی پلکیں جھپکیں، بمشکل مسکرانے کی کوشش کی۔

"جی۔" اس نے کہا۔ بڑی امی اس سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ اگر انہیں اپنے بیٹے کی اصلیت کا علم ہو جائے تو شاید نظر ملا کر بات بھی نہ کر سکیں اس نے آزردگی سے سوچا۔

"تو پھر باہر کیوں نہیں نکلیں۔ دادی اماں بھی کئی بار پوچھ چکی ہیں۔" انہوں نے اس کے بستر پر بکھرے دراز سلکی آبشار ایسے بالوں کو سمیٹتے ایک اور وجہ۔ بھری کارروائی کی تو وہ بے دلی سے اٹھ بیٹھی۔

"بس دل ہی نہیں چاہا۔" وہ اب بھی اس کے کھلے دراز بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ اس کا جواب سن کر بغور دیکھا۔

"کسی سے لڑائی ہوگئی ہے، وجیہ نے کچھ کہا ہے؟"

امی کی نظر اندر تک اترتی ہوئی تھی۔ اس نے بے اختیار ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"ارے نہیں آنٹی بس ویسے ہی گھر یاد آ رہا ہے۔ کتنے دن ہو گئے ہیں بھائی بھیا سے ملے ہوئے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" انہوں نے پرزور تائید کی۔ "چلو اٹھو باہر چل کر بیٹھو سب لان میں اکٹھے بیٹھے ہوئے ہیں، موسم بہت خوبصورت ہو گیا ہے بس تمہاری ہی کمی ہے۔" بازو سے پکڑ کر اسے اٹھاتے انہوں نے کہا تو وہ خاموشی سے دوپٹہ سنبھالتی سینڈل اڑس کر ان کے ساتھ لان میں آ گئی۔

باہر کا موسم واقعی میں بہت خوبصورت تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے تقریباً سبھی تھے ماسوائے بڑے ابو اور چچا کے۔ اس کی نظر بلا ارادہ دادی اماں کے پہلو میں بیٹھے واسق جہانگیر پر جا پڑی۔ اس نے بھی ایک پل کو دیکھا تھا پھر نظر پھیر گیا۔ وہ کسی بات پر مسکرا رہا تھا اسے دیکھتے ہی مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔ پہلی دفعہ وینیزے کو اندازہ ہوا کہ ظاہری طرح اس شخص کی مسکراہٹ بھی بہت خوبصورت تھی۔

"آ گئی میری بیٹی۔" وہ جیسے ہی قریب پہنچی، دادی اماں نے محبت سے کہتے بازو بھی وا کر دیئے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی

ان کی طرف بڑھ گئی۔ اس پر ان لوگوں کی محبتوں کا ایک بہت بڑا قرض تھا وہ نہ ہی تو خود غرض تھی اور نہ ہی احسان فراموش، البتہ مصلحت آمیز ضرور تھی۔ بس ان کی محبتوں کے جواب میں کبھی خاموش رہتی تھی اور کبھی مسکرا دیتی تھی۔ وہ صرف ایک شخص کی وجہ سے ان سب کو غلط نہیں کہہ سکتی تھی۔

''لگتا ہے، ونیزے جی آج آپ کو اپنا کمرہ بہت ہی بھا گیا تھا۔ صبح سے اب آپ کی شکل دیکھنے کو ملی ہے۔'' شہروز نے کہا تو وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

''آپ کے لئے ایک خوشخبری ہے۔'' مہران نے کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ''آج رات آپ کے بھیا بھابی آئیں گے۔ خوش ہو جائیں۔''

''رئیلی..... اتنی اچھی خوشخبری سن کر وہ کھل اٹھی تھی۔ بے اختیار دادی اماں سے تصدیق چاہی تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ خوشی کے احساس سے نہال ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی واثق بول اٹھا۔

''دادی اماں مجھے ایک ضروری کام ہے، جلدی آجاؤں گا۔'' ان کے برابر سے اٹھتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

''اس وقت۔'' واثق نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ''شام ہونے والی ہے، باہر گئے لوگ گھر لوٹتے ہیں اور تم جا رہے ہو۔ آؤ گے کب؟'' دادی اماں نے مزید پوچھا۔

''جلدی ہی آجاؤں گا۔''

''کوئی ضرورت نہیں باہر جانے کی۔ بلیاں بندھی ہوئی ہیں تمہارے پاؤں میں تو۔ آج سارا دن باہر تو گزارا ہے۔ آدھا گھنٹہ نہیں ہوا تمہیں گھر آئے ہوئے اور جناب ہیں کہ پھر چل دیے ہیں۔'' امی نے اٹھتے دیکھا تو اچھی خاصی جھاڑ پلا دی۔ وہ سمجھاتے ان کے کندھوں پر جھک گیا۔

''اچھی امی، ایک کام ہے بس جلدی آجاؤں گا۔ جانے دیں ناں۔''

''کیا کام ہیں ذرا مجھے بھی تو بتاؤ۔'' انہوں نے پوچھا تو وہ ایک نظر ونیزے پر ڈال کر چپ ہو گیا۔ کیسے بتاتا کہ وہ گھر سے فرار چاہتا ہے۔

''امی! میرا خیال ہے بھائی نے باہر کوئی بیوی رکھی ہوئی ہے۔'' یہ مہران تھا۔ اس نے اسے گھور اگر اثر کسے تھا بلکہ اس کی بات پر سب ہی ہنس پڑے تھے۔

''ارے یہ مانے تو سہی۔ ایسی بیوی لاؤں گی، کبھی گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکال پائے گا۔'' امی نے فرط محبت واثق سے اس کا ماتھا چوم لیا۔ وہ یوں اچانک ذکر پر تھوڑا سا کنفیوز ہو گیا تھا جبکہ سامنے ہی تو وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ سب ہی جانتے تھے وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس ذکر سے کتنا بھاگتا ہے اسی لئے سب اکثر اسے دبوچے رکھتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح تو وہ آمادہ ہو ہی جائے گا۔

''امی میرا خیال ہے واثق کبھی نہیں مانے گا اسی لیے کسی اور کے متعلق بھی سوچ لیں۔''

شہروز نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا تو وہ یونہی مسکرا دیا۔

''اوروں کی بھی باری آجائے گی پہلے جس کی باری ہے اسے تو نبٹنے دو۔'' دادی اماں نے اسے چپ کرا دیا تھا وہ بسورنے لگا۔

''ہائے ظالم سماج..... '' شہروز نے دھیمی آواز میں ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ واثق کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

''اتنی ٹھنڈی آہیں مت بھرو۔ تمہاری'' ان کو'' ٹھنڈ لگ جانے کا احتمال ہے۔'' واثق نے اس کے کان کے قریب جھک کر کہا تو وہ اسے گھورنے لگا۔

''جب مرد تمہاری باری کے انتظار میں دادی اماں سب کو باندھے رکھیں گی۔''

''اچھی بات ہے بیٹا! ذرا اور انتظار کر لو۔ شاید دس سال بعد میرا دماغ چل جائے اور شادی کر ہی لوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تو مہران اور شہروز دونوں گھورنے لگے۔

''بڑے زاہد بنتے ہو مگر سن لو بڑی امی اور دادی اماں نے لڑکی پسند کر لی ہے اب تمہاری ایک بھی نہیں سنیں گی۔ چند ایک دنوں میں تمہیں کوئی خوبصورت کھونٹا نصیب ہونے والا ہے۔'' شہروز نے کن انکھیوں سے دادی اماں کے پہلو میں بیٹھی ونیزے کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بنا ان سنی کرتا ہاتھ ہلاتا اپنی بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

رات کے کھانے کے بعد بھیا اور بھابی آگئے جنگل سے دونوں نے خوش تھے۔ بھابی بھی کافی مطمئن دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ جو کتنے دنوں سے ان کی آمد کی منتظر تھی ایک دم ان سے لپٹ گئی۔ وہ کافی دیر تک ان کے پاس سب کی موجودگی میں بیٹھی رہی۔ بھیا کے چھوٹے رمیض نے رونا شروع کیا تو وہ ان کے کہنے پر اسے اٹھا کر باہر لے گئی۔ وہ جب رمیض کے لیے فیڈر تیار کرنے باہر نکلی تو بھابی نے بھی بات شروع کی۔

''ہم نے ونیزے کے لیے ایک رشتہ پسند کر لیا ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ یقیناً آپ کو بھی پسند آئے گا۔'' امجد کی طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھتے انہوں نے بڑی اماں اور دادی اماں کو بتایا۔ تو ابھی سب ہی متوجہ ہو گئے۔ بڑے ابو، چچا جان، شہروز، مہران وغیرہ جبکہ بڑی امی کچھ گھبرا گئیں۔ دادی اماں کو دیکھنے لگیں۔ آج ان کا بھی ارادہ واثق کے لئے ونیزے کو مانگنے کا تھا مگر اتنی غیر متوقع بات سن کر وہ پریشان ہو گئیں۔ دادی اماں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں تسلی دی۔

''صبیحہ! امجد نے ... کو بھی پسند کیا ہے وہ یقیناً اچھا ہو گا مگر ہمارے پاس بھی ان کے لئے ایک رشتہ ہے سوچ سمجھ کر پھر جواب دینا۔''

''آپ کہیے خالہ جان! کونسا پرپوزل ہے؟'' امجد بھیا پوری طرح متوجہ تھے۔ فوراً پوچھا۔

''ہماری تو شروع سے ہی خواہش تھی مگر زبان پر لانے سے ڈرتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ واثق یہاں نہیں تھا۔ تم نے تو اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اسی لئے بے بس ہے۔ اب تو تم اس سے مل چکے ہو۔ جانتے بھی ہو۔ صبیحہ سامنے بیٹھی ہے تم اس سے اس کی شرافت اور نیک سیرتی کے بارے میں پوچھ سکتے ہو۔ ہمارے بارے میں بھی سب جانتی ہے۔ ہم تمہاری طرح بہت پیسے والے نہیں مگر شرافت ہے، عزت ہے۔ ہم محبت، خلوص کو ہی سب سے بڑی دولت سمجھتے ہیں۔ اسی خلوص کی بنیاد پر ہم واثق کے لئے ونیزے کو مانگ رہے ہیں۔ اگر تم لوگوں کو منظور نہ ہو تو پھر بھی ہماری چاہت و محبت میں کمی واقع نہیں ہوگی۔ آگے تم دونوں کی مرضی۔'' دادی اماں نے بہت سلیقے اور رکھ رکھاؤ سے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ بھیا اور بھابی دونوں حیرت سے ایک دوسرے کے منہ تکنے لگے۔ پھر دونوں ہی ہنس دیئے۔

''جی خالہ جان! ہمیں واقعی کوئی اعتراض نہیں کیونکہ آج ہم ونیزے کے لئے واثق کی ہی بات کرنے آئے تھے۔'' بھیا نے بھی بتایا تو وہاں موجود سب افراد حیرانگی کے ساتھ خوش بھی ہو گئے۔

''تو پھر بیٹا! یہ رشتہ پکا سمجھیں ناں۔'' دادی اماں نے بے پناہ خوشی سے پوچھا۔ امجد بھیا نے سر ہلا دیا۔

''ارے جہانگیر کسی کو بھیج کر مٹھائی منگواؤ۔ میں ابھی دونوں کا منہ میٹھا کروانا چاہتی ہوں۔'' دادی اماں نے فوراً کہا۔

''میں لاتا ہوں۔'' مہران فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

واثق شام سے پہلے کا گیا ہوا تھا اور ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔

وئیزے رمیض کو چپ کرا کر واپس لوٹی تو محفل کا رنگ ہی اور تھا۔ سب ایک دوسرے کے گلے مل رہے تھے۔ مبارک سلامت کے مظاہرے ہو رہے تھے۔ وہ ناسمجھی کے عالم میں حیران کھڑی رہی۔ دادی اماں کی نظر پڑی تو اس کا ہاتھ تھام کر پاس بٹھا لیا۔

''خدا جوڑی سلامت رکھے۔'' اس کی پیشانی چومتے انہوں نے دعا دی۔ وہ ہونق بنی کبھی انہیں اور کبھی باقی لوگوں کو دیکھے گئی۔

''جاؤ بہو، انگوٹھی لے آؤ۔ ابھی رسم کریں گے۔'' آناً فاناً انہوں نے بڑی امی کو حکم دیا۔ وہ فوراً اپنے کمرے کی طرف چل گئیں۔ واپسی میں ان کے ہاتھ میں ایک بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ جسے لا کر انہوں نے دادی اماں کو تھما دیا وہ اس افراتفری کو نہیں سمجھ رہی تھی۔

''تم نے تو ہفتہ ہو گیا تھا منوالی تھی۔ شکر ہے آج پہنانے کا موقع تو ملا۔'' وہ بھابی کو بتا رہی تھیں۔ دادی اماں نے بسم اللہ پڑھ کر اسے انگوٹھی پہنا دی تو تب بھی خالی خالی نظروں سے دیکھے گئی۔ نہ چہرے پر شرم کی لالی تھی نہ ہی آنکھوں میں حیا کا رنگ اترا بلکہ وہ تو سراپا حیرت بنی ہوئی تھی۔

''اور یہ واصق صاحب کہاں ہیں نظر ہی نہیں آ رہے؟'' بہن کی طرف سے مطمئن ہو کر امجد بھیا نے شہروز سے پوچھا۔ آخر کو سالے تھے پوچھ سکتے تھے۔ واصق کے نام پر اس کے سوئے حواس بھی ایکدم جاگ اٹھے۔ اندر کرب کی لہر جاگی۔

''تو کیا یہ سب واصق کے لیے .....نہیں۔'' نجانے شہروز نے بھیا کو کیا جواب دیا تھا وہ تو اپنے اندر اٹھنے والے بھپرے طوفان سے نبرد آزما تھی۔ جی چاہا ابھی ''نہیں نہیں'' کہہ کر سب سے لڑ پڑے۔ مگر اس کے ہونٹوں کے قفل جوں کے توں برقرار رہے۔ بہت چاہنے کے باوجود وہاں سے اٹھ نہ سکی۔ میران مٹھائی لایا تو بھابی نے اٹھ کر سب کا منہ میٹھا کرایا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں وہ واصق بھیا ہی ہیں جن سے آپ کی منگنی ہوئی ہے۔'' وہ یہ سوچ بیٹھی تھی کہ شاید اس کا خیال غلط ہو۔ اسی لیے سب کے چلے جانے کے بعد جیہ کے ساتھ اس کے کمرے میں آئی تو اسے روک کر پوچھ لیا۔ جواباً اس نے اس کے خیال کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ بے یقینی سے دیکھتی رہی۔

''یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ سب غلط ہوا ہے۔'' وجیہ کو بے یقینی سے دیکھتے اس کا دل رو رہا تھا۔ آنکھیں ضبط کے مراحل طے کر رہی تھیں۔ وجیہ انکشاف کے پہاڑ توڑ کر چلی گئی تو وہ بستر پر گرتے تنہا اس انکشاف کے بوجھ تلے دبی روتی رہی۔

''بھیا کیوں کیا آپ نے ایسا۔ ماں باپ کا سایہ سر سے کیا اٹھا کہ اتنی بھاری ہو گئی تھی بہن آپ پر۔ کم از کم پوچھ تو لیا ہوتا۔'' پھوٹ پھوٹ کر روتے وہ بھیا کی بے اعتنائی پر شکوہ کناں تھی۔

''اچھا نہیں کیا آپ نے میری کم سخنی، خاموش طبعی اور مصلحت آمیزی کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ کبھی معاف نہیں کروں گی آپ کو۔'' وہ ان کے تصور سے لڑ رہی تھی۔

''باپ نے جو کیا ابھی تو اس کا زخم بھی مندمل نہیں ہوا تھا اور آپ نے بھی وار کر دیا۔'' کمبل میں منہ دیئے وہ اور شدت سے روئی۔ ماں کی کمی کا احساس اور شدت سے جاگا۔

''میں اس شخص کی شکل بھی دیکھنے کی روادار نہیں، کجا کہ ساری زندگی اسے برداشت کروں۔ اگر اس کی اصلیت کا علم نہ ہوتا تو شاید بخوشی آپ کی رضا کی خاطر یہ زہر نگل لیتی مگر اب یہ ممکن نہیں۔ آپ کو اپنا فیصلہ بدلنا ہوگا۔'' وہ اب بھی بھیا سے مخاطب تھی۔ پھر اسی طرح نیر بہاتے رات دھیرے دھیرے سرکنے لگی۔ وجیہ کمرے میں آ کر سو بھی چکی مگر ساری رات اس کی آنکھوں میں جھڑی لگی رہی تھی۔ ایک پل کو بھی نیند نہ آئی۔

✠ ✠ ✠

''واصق یار اب اٹھ بھی جاؤ اور کتنا سوؤ گے۔ اگلے دن کے گیارہ بج رہے ہیں۔'' ابھی اس کی نیند پوری بھی نہیں ہوئی تھی جب شہروز نے اس کے کمرے میں آ کر اس کے اوپر سے کمبل کھینچ لیا۔ جواباً وہ اس حرکت پر تلملاتا غصے سے اس کی طرف پلٹا تھا مگر وہ اس کی پہنچ سے دور تھا۔ دونوں ہاتھوں میں کمبل پکڑے باز وادوں پر اٹھائے دانت نکال رہا تھا۔

''کیا مصیبت ہے یار! ابھی نیند بھی پوری نہیں ہوئی اور سے کہ تم نے اٹھا دیا۔'' سخت جھنجلاتے آنکھیں ملتے اسے دیکھا تو وہ اس کے پاس آ بیٹھا۔

''کہاں تھے تم سارے رات؟ دو بجے تک تو ہم تمہارا انتظار کرتے رہے اور پھر تھک ہار کر سو گئے۔ بڑی امی بتا رہی تھیں کہ تم صبح تین بجے گھر لوٹے ہو۔ یہ رات ساری باہر گزار کر آخری پہر گھر لوٹنا شریفوں کا تو کام نہیں۔'' شروع میں تو وہ سنجیدہ تھا آخر میں پھر آؤٹ ہو گیا۔ واصق نے اسے صرف گھورا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں سے کمبل چھین کر دوبارہ سر تک لپیٹا اور لیٹ گیا۔

''اتنے بیزار کیوں ہو۔ کہیں بڑی امی نے تمہیں کچھ بتا تو نہیں دیا۔ ویسے بار رات کو میں نے انہیں کافی پکا کیا تھا کہ میرے علاوہ تمہیں کوئی کچھ نہ بتائے۔'' وہ دوبارہ اس کے منہ سے کمبل ہٹاتے کہہ رہا تھا۔ اس دفعہ واصق نے ذرا کمبل نہیں چھینا تھا۔ بس سوالیہ دیکھا تھا۔ واصق کے چہرے پر الجھن دیکھ کر شہروز سمجھ گیا کہ ابھی تک اسے کچھ علم نہیں ہوا۔

''راز کی بات ہے یار! رات دادی اماں نے تمہاری بات پکی کر دی ہے۔''

''کیا.....؟'' واصق کو بے پناہ حیرت ہوئی۔ فوراً سیدھا ہوا۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو۔'' اب کے وہ جھنجلایا۔

''بکواس نہیں سو فیصد پکی خبر ہے۔ بابدولت اس موقع پر بنفس نفیس پیش پیش تھے۔'' شہروز نے کہا تو وہ اسے دیکھے گیا۔

''مگر میں نے تو ان کو منع کیا تھا کہ ابھی میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ مجھ رہا تھا کہ شہروز اسے چڑا رہا جب یقین ہو گیا کہ خبر واقعی پکی ہے تو وہ فوراً آؤٹ ہوا۔

''بڑی امی نے بتایا تھا مگر یار ایسی بھی تو ان لو بات طے کس سے ہوئی ہے۔ لاکھوں میں ایک ہے وہ لڑکی۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو خوشی سے بھنگڑا ڈالتا۔''

''وہ جو بھی ہے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں اگر تم لوگوں کو اتنا ہی شادی کا شوق ہے تو تم ہی کرا لو اس سے۔ مجھے تو بخشو ہی۔'' غصے سے کہتے اس نے کمبل دور پھینکا تھا۔ جھنجناتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔

شہروز سہولت سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ باتھ روم سے برآمد ہوا تو تب بھی غصے میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے نظر انداز کر کے باہر نکلتا اس نے فوراً آگے بڑھ کر اس کا بازو دبوچا۔

''اتنے غصے میں کیوں ہو یار! سب کی شادیاں ہوتی ہیں۔ تمہارے ساتھ دنیا سے کچھ انوکھا نرالا معاملہ تو نہیں ہونے جا رہا جو یوں سیخ پا ہو رہے ہو۔''

''یار میرا باز، چھوڑو، بس کہہ دیا نہ مجھے کہیں بھی شادی نہیں کرنی، کسی سے بھی نہیں۔''

''چاہے وہ لڑکی وئیزے جواد حسن ہی کیوں نہ ہو۔''

شہروز نے سنجیدگی سے پوچھا، وہ تو یوں بدکا گویا کرنٹ لگ گیا ہو۔ بے پناہ حیرت ہی حیرت تھی۔

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' دکھ کے ساتھ ساتھ حیرت سے آواز پھٹی ہوئی تھی۔

''سچ ہے یہ۔ وہ لڑکی یہی ہے یار اتنی زبردست لڑکی ہے جس کا بھی مقدر بنے گی کائنات رشک کرا ٹھے گی۔ ایک تم ہو کہ ناشکری کر رہے ہو۔''

واصق بس ساکت آنکھوں سمیت اسے دیکھتا رہا۔ "ونیزے جوادحسن۔" اس کے ہونٹوں نے بے آواز حرکت کی۔ "میں بہت مختلف لڑکی ہوں۔ آئندہ میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کرنا۔ میں کوئی گری پڑی نہیں ہوں۔" ونیزے جوادحسن اس کے کان کے قریب کہہ رہی تھی۔ وہ صرف شہروز کو دیکھتا رہا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ایمان سے بتاؤ اگر درمیان میں زرینے نہ ہوتی تو میں جی جان سے راضی ہو جاتا۔" وہ صرف اسے چھیڑ رہا تھا۔

"تو پھر تم دادی اماں سے بات کرلو۔ میں اس لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔ وہ بہت مختلف لڑکی ہے مجھے بہت خاص لڑکی چاہئے عام نہیں۔" بہت ہی سپاٹ لہجے میں انکار کرتے وہ باہر نکل گیا۔ شہروز کے تو کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔

"پاگل ہے یہ تو۔" وہ بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ واصق امی کو ڈھونڈنے کچن میں گیا وہ وہاں نہیں تھیں۔ تیزی سے راستے میں گزرتی ونیزے کو بھی نظرانداز کئے وہ امی کے کمرے کی طرف لپکا۔ تو شہروز نے درمیان میں راستہ روکا۔

"پلیز شہروز! اس وقت کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ بہتر ہے تم خاموش ہو جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا۔ اسے یونہی چھوڑ کر امی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہ اپنے کمرے کی بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔ اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر مسکرائیں پھر اس کے عقب میں شہروز کو دیکھا تو فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی بات سے ہو جانے سے باخبر ہو گیا ہے۔

"امی! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔" وہ خاصے جارحانہ روپ میں ان کے سامنے آیا تھا۔ وہ مسکرادیں۔ اندازہ تھا کہ کسی ایسے ہی رویے کا مظاہرہ ہوگا۔

"سچ سن رہے ہو۔" انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے بھنا کر ہاتھ جھٹک دیا۔

"واٹ از دس نان سینس۔ آپ کو ساری دنیا میں کوئی اور لڑکی نہیں ملی تھی۔ کیا کال پڑ گیا تھا دنیا میں لڑکیوں کا جو یہ لڑکی میرے سر تھوپ دی ہے۔" واصق کا انداز خاصا توہین آمیز تھا امی تو خاصی حیران ہوئیں۔ شہروز فوراً اندر آیا۔

"آہستہ بولو اور مت بھولو کہ اس گھر میں وہ لڑکی بھی رہ رہی ہے۔" شہروز نے احساس دلایا تھا وہ مزید بھڑک اٹھا۔

"آئی ڈونٹ کیئر ہر۔ امی آپ نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ لوگ تو لڑکیوں سے بھی پوچھ لیتے ہیں اور آپ نے مجھ سے پوچھنا کیا بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔ تف ہے مجھ پر لعنت ہے ایسی زندگی پر۔" وہ غصے میں چراغ پا ہو رہا تھا۔

"میں نے تم سے پوچھا تھا۔ تم نے خود ہی کہا تھا کہ مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں جو کچھ بھی ہوگا میری ہی مرضی سے ہوگا۔ بس تم کچھ عرصہ شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔"

"ہاں تو اس ساری بات میں یہ لڑکی کہاں سے نکل آئی۔ ٹھیک ہے میں فوراً شادی پر بھی آمادہ ہوں مگر اس لڑکی سے نہیں۔" کچھ دھیما پڑتے اس نے کہا تو وہ حیران ہوئیں۔

"کیا اس لڑکی، وہ لڑکی لگا رکھا ہے۔ ونیزے نام ہے اس کا۔ کیا کمی ہے اس میں؟" ونیزے کے متعلق واصق کا اتنا شدید ری ایکشن دیکھ کر وہ حیران تھیں۔ اب بھی پوچھتے ہوئے ان کی آواز دکھ سے پھٹی ہوئی تھی۔

امی اس میں کچھ کمی نہیں وہ بہت ڈیفرنٹ لڑکی ہے۔ میں خود کو اس کے قابل نہیں سمجھتا۔" امی کی دکھ سے پھٹی آنکھیں دیکھ کر وہ کچھ دھیما پڑ گیا جبکہ ذہن میں ونیزے کی کہی گئی تمام باتیں گھوم رہی تھیں۔ وہ کیسے بھول جاتا جو اس نے کہا تھا۔

"یہ ٹھیک ہے میں اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے آپ کے در پر پڑی ہوئی ہوں مگر کوئی گری پڑی نہیں ہوں۔ نہ ہی ان لڑکیوں جیسی ہوں، جن سے آپ کا واسطہ ہوتا ہوگا۔" ابھی تو وہ اپنے دل کو سمجھا رہا تھا کہ گھر والوں نے یہ نیا انکشاف کر دیا تھا۔

"امی وہ ہمارے گھر صرف اس مقصد کے لئے تو نہیں ٹھہری تھی کہ ہم اس اپنے ہی گھر رکھ لیں۔ امی اس رشتے کو اس کی مجبوری مت بنائیں۔ ہم ویسے بھی تو اس کو تحفظ فراہم کر سکتے ہیں۔ کیا یہ سب کرنا بہت ضروری ہے۔ آپ خود سوچیں کتنی ناشائستہ بات ہے۔"

"تم اپنی یہ فلاسفی اپنے پاس رکھو۔ یہاں رہنا اس کی کوئی مجبوری نہیں۔ اس کا بھائی سے تم سے بہتر تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔ بات ساری حقیقی رشتے کی ہے۔ جو تم نہیں سمجھ رہے اور مجھے شائستہ و ناشائستہ کے قاعدے مت پڑھاؤ۔ میں نے اسے بیٹی کہا ہے اور ماں اپنی بیٹی کو کن ہاتھوں میں محفوظ دیکھ سکتی ہے تم نہیں سمجھ سکتے۔ اگر تمہیں یہ قبول ہے کہ تم میری بیٹی سے شادی کرو گے تو مجھ سے کوئی تعلق رکھنا ورنہ کوئی ضرورت نہیں مجھے ماں کہنے کی۔ جو جی چاہے کرو، اور جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ میں سمجھوں گی میرا کوئی بیٹا ہی نہیں ہے۔" آہ ایک جذباتی بلیک میلنگ۔

"امی..... "اتنی بڑی بات کتنی آسانی سے انہوں نے کہہ دی تھی۔ اپنے سب سے لاڈلے اور چہیتے بیٹے کو۔ وہ بے یقینی سے دیکھتا رہا۔

"امی پلیز آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔" وہ بے چارگی سے بے بس ہو گیا۔

"بس میں نے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔" امی کو ابھی تک واصق کا ونیزے کے متعلق توہین آمیز لہجہ نہیں بھول رہا تھا۔ انہیں بھی ضدی ہو گئی اسے کچھ بھی کہنے سے ٹوک دیا۔

"ٹھیک ہے جو جی چاہتا ہے کریں بعد میں مجھے کچھ مت کہیے گا اور ہاں اس لڑکی سے بھی پوچھ لیں یہ نہ ہو کہ وہ بھی مجبوری میں پھنسی ہو۔" ہارے ہوئے جواری کی طرح شکست خوردہ لہجہ تھا۔

وہ خاموشی سے دروازے سے ہٹی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

بڑی امی، واصق اور شہروز کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو اس نے حرف بہ حرف سن لی تھی۔ پہلے اسے یقین تھا کہ یہ رشتہ طے کرنے کا شوشہ ضرور واصق کا چھوڑا ہوا ہے۔ اب حقیقت جان کر اور زیادہ دلبرداشتہ ہو گئی۔ واصق اسے اس بری طرح ناپسند کرتا تھا اسے توقع نہیں تھی۔

"کیا کروں.....؟" دونوں ہاتھوں میں سر دیے وہ اپنی کنپٹیاں سہلاتے وہ بری طرح الجھ گئی۔

"اتنی بے عزتی اور بے توقیری، اللہ کبھی بھی کسی کو کسی کے در کا محتاج نہ کرے۔" وہ دکھ سے سوچتی رہی۔

بڑی امی کی محبت، بھیا بھابی کی مجبوری اور واصق جہانگیر کی ناپسندیدگی نے اسے خاصا الجھا دیا تھا۔ بے یقینی و بداعتمادی کے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ وہ کس کس بات پر یقین کرتی۔ وہ جو اس کے کانوں نے ابھی سنی تھیں یا وہ جو ایک سال پہلے روشانے نے کہی تھی کہ یہ شخص اس کا فیانسی ہے۔ چلو وہ روشانے کی بات کو بھی جھٹلا دیتی اگر اس نے اپنی آنکھوں سے خود نہ دیکھا ہوتا۔ وہ روز واصق کا روشانے کو پک اینڈ ڈراپ کرتا کیا تھا۔ اسے اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"یا اللہ کیا کروں؟" اس نے بہت الجھتے ہوئے خود کو بستر پر گرا لیا۔

❊ ❊ ❊

رشتہ طے ہونے کے اگلے دن سب نے مل کر مشورہ سے شادی کی تاریخ فکس کردی تھی۔ رمضان سے دو دن پہلے شادی تھی۔ درمیان میں صرف بیس دن ہی بچے تھے۔ وہ اس افراتفری اور عجلت میں طے ہونے والی ڈیٹ پر بھونچکا ہی تو رہ گئی۔ وہ جو بھیا بھابی سے ملنے اور بات کرنے کی سوچے بیٹھی تھی اس نئی افتاد پر ہراساں ہو گئی۔ شادی سے انکار کی حسرت تو دل میں رہ گئی بلکہ آنے

والے دنوں کی فکر ستانے لگی۔

جویریہ اپنی نندوں اور ساس کے ساتھ کوئٹہ آ گئی تھی اور رشتہ دار ابھی اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ خوب زور و شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ گھر کی سب خواتین، گھر اور بازاروں کے چکروں میں بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف بھیا اور بھابی کا بھی یہی حال تھا۔ جب بھی آتے کھڑے کھڑے ہی حال چال دریافت کر کے چلے جاتے اور وہ ان سے تنہا سہولت سے بات کرنے کا سوچتی ہی رہ جاتی تھی۔

واصق سے اس کا سامنا بہت کم ہوتا تھا۔ جب بھی سامنا ہوتا وہ یوں نظر انداز کر کے گزر جاتا تھا جیسے سرے سے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ وہ اس رویے سے اور الجھ جاتی تھی۔

سب خواتین بازار گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں کچھ مہمان لڑکیاں دادی اماں اور وہ خود تھی۔ جب سے تاریخ طے ہوئی تھی دادی اماں اسے باقاعدہ کمرے میں بند کیے ہوئے تھیں۔ اب بھی اکتا کر باہر نکل آئی۔ دادی اماں تخت پر براجمان تھیں وہ ان کے پاس جانے کی بجائے بڑی امی کے کمرے میں گئی۔ آہستگی سے دروازہ بھیڑ کر ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر وہ بیڈ پر ٹک گئی۔

رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف بھابی تھیں۔

''السلام علیکم بھابی کیسی ہیں آپ؟''

''وعلیکم السلام، تم... میں ٹھیک ہوں۔ کیسے فون کیا'' بھابی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ جیسے بہت عجلت میں ہوں۔

''وہ بھابی میں کتنے دنوں سے آپ سے بہت ضروری بات کرنا چاہ رہی تھی۔''

''ہاں کہو۔''

''وہ.... وہ بھابی! میں واصق سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' کچھ جھجکتے ہوئے اس نے کہہ دیا۔

''دماغ تو درست ہے تمہارا، ہوش میں تو ہو، کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔''

''بھابی پلیز بھیا کو سمجھائیں ناں۔ مجھے نہیں شادی کرنی اس سے۔'' وہ ایک دم رو پڑی تھی۔

''وعلیکے! بہت نان سینس ہو تم۔ خبردار آئندہ جو تم نے یوں الٹا سیدھا بولا تو بہت برا کروں گی۔ ہم تمہاری خاطر دن رات پریشان ہو رہے ہیں اور تمہاری رٹ ہے کہ تمہیں شادی نہیں کرنی۔ کیا محبوب رحمانی کے ساتھ زندگی گزارو گی؟'' انہوں نے تو اچھی خاصی سنا ڈالیں۔

''پلیز بھابی، میں زبردستی اور مجبوری کا سودا نہیں بننا چاہتی۔''

''کس نے کہہ دیا تمہیں ایسا۔ مجبوری کیوں بھئی۔ اتنی محبت سے تو وہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ ہمیں تو عزت کے لالے پڑے ہوئے تھے، یہاں تو عزت کے ساتھ ساتھ جان بھی محفوظ ہے اور کیا چاہیے تمہیں۔''

''بس مجھے واصق پسند نہیں ہیں۔'' اس نے اپنے آنسو صاف کرتے عذر بتایا جو سچ بھی تھا۔

''ہیں..... '' بھابی دوسری طرف حیران ہوئیں۔ ''تمہارا واقعی دماغ چل گیا ہے۔ ایسے ہمسفر کی تو لڑکیاں خواب دیکھتی ہیں۔ بس اب اپنی زبان بند رکھنا۔ خبردار کسی سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی وہ ناپسند ہے شادی ہو گی تو خود بخود ہی پسند کرنے لگو گی۔ جتنے بھی دن باقی ہیں خود کو تیار کرو۔ خود بھی خوش رہو اوروں کو بھی رہنے دو۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔ کل آؤں گی پھر بات کروں گی۔'' بھابی نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ ریسیور کو گھورتی رہ گئی۔ ابھی وہ فون رکھ کر پلٹی ہی تھی جب کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ واصق کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہوئی۔

''آپ اس رشتے پر راضی نہیں تھیں تو پھر چھپایا کیوں؟'' آتے ہی اس نے پتھر پھوڑے۔ وہ واصق کے سرخ چہرے کو

دیکھنے لگی۔

''میں نے کچھ نہیں چھپایا۔ مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں تھا۔'' اس نے بھی صاف بات کہہ دی۔

''اب کیا چاہتی ہیں آپ؟'' وہ سپاٹ چہرہ لیے پوچھ رہا تھا۔

''وقت اور حالات کے تقاضے کبھی بھی میری سوچوں اور خواہشوں کے محتاج نہیں رہے۔ اگر بھیا اور بھابی کی زبان کا پاس نہ ہوتا تو انکار کرنے میں ایک دن بھی نہ لگاتی۔'' اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ واصق نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''ٹھیک ہے میں امی سے انکار کر دوں گا۔ زبردستی اور مجبوری کے سودے کا میں بھی قائل نہیں ہوں اور آپ کو بھی امی سے بات کر لینی چاہیے۔''

''کیا بات کروں؟'' اس نے تلخی سے پوچھا۔ تو واصق نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔

''یہی کہ آپ رشتے پر خوش نہیں اور میں آپ کو پسند نہیں۔'' چبا چبا کر اس نے کہا۔

''بات ساری پسند کی نہیں اعتماد اور یقین کی بھی ہے۔'' ناگواری سے کہتے وہ دروازے کی طرف بڑھی جہاں وہ دیوار بنا کھڑا تھا۔ ''میں نے جو کہنا تھا وہ میں بھابی سے کہہ چکی ہوں اور جو انہوں نے جواب دینا تھا وہ دے دیا۔ اب نہ مزید کچھ کہنے سننے کی خواہش ہے اور نہ ہی ضرورت۔'' صاف اکھڑے لہجے میں کہتے وہ اس کے قریب سے نکل گئی تھی۔

واصق یونہی کھڑا رہا۔ مطمئن تو وہ پہلے بھی نہیں تھا۔ اب یہ جان کر کہ وہ تو سرے سے راضی ہی نہیں۔ دل پر آرے چلنے لگے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے خوددار دل کو سمجھایا تھا۔ اب جس طرح ان کی بھابی سے فون پر ہونے والی تمام باتیں سن کر پھر از لی ضد کی طرح باغی ہونے لگا تھا۔ اس نے تو یونہی گھر آتے ہی فون کرنے کے لیے ریسیور کان سے لگایا تھا تو امی کے کمرے میں رکھے فون پر ہونے والی اس کی اور بھابی کی تمام باتیں اس کے کانوں میں پڑ گئی تھیں۔ یہ سب باتیں اسے پھر اک نئی اذیت سے دوچار کرنے لگی تھیں۔ امی تو کبھی بھی انکار کو نہیں مانیں گی اور درمیانی جو صورت تھی وہ بھی سمجھوتے کی راہ ہموار کرنے والی تھی۔

* * *

وقت رکنے سے کبھی رکتا ہے۔ اس کی تو سرشت میں رکنا ہی نہیں ہے۔ بات طے ہونے اور شادی ہونے تک کا دورانیہ بہت ہی تیز رفتاری سے گزر رہا تھا۔ واصق نے اپنی پوری کوشش کر لی تھی کہ کسی نہ کسی طرح امی کو یہ بات ہی ختم کر دینے پر راضی کر لے۔ اس کی تمام کوششیں بے کار گئیں۔ امی کی دھمکی جوں کی توں برقرار تھی۔ آخر کار تھک ہار کر اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ دوسری طرف کم و بیش وعلیزے کی بھی یہی حالت تھی۔ واصق ساری شادی کے دوران بہت ہی چپ چاپ اور سنجیدہ رہا تھا۔ ہر رسم میں یوں شریک رہا گویا سر پر پڑا ہوا بوجھ اتار رہا ہو۔ ادھر وعلیزے نے بھی بالکل خاموشی و ناپسندیدگی و ناگواری کو اندر دبائے اس نئے بندھن کو قبول کر لیا تھا اور پھر وہ ہوٹل سے رخصت ہو کر واصق کے ہمراہ قدم اٹھاتی دوبارہ اس گھر میں ایک نئی اور پر استحقاق حیثیت سے داخل ہوئی۔

حجلہ عروسی میں بیٹھے اس نے سرسری ایک نظر اس کمرے پر ڈالی وہ اس کمرے میں پہلے بھی جا چکی تھی تب مگر اندازہ نہ تھا کہ کبھی دلہن بنی اس نئی حیثیت سے بھی اس کمرے میں بیٹھی ہو گی۔ بھابی اور بھیا نے اسے بہت سمجھایا تھا۔ محبوب رحمانی کے ڈراوے دیتے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی آئندہ زندگی کے متعلق بہت ساری باتیں سوچ ڈالیں۔ اب بھی آنے والے وقت اور حالات کا خیال کر کے اس نے خود کو ریلیکس کرنا چاہا مگر اندر جو بھی کھلبلی مچی ہوئی تھی وہ کسی بھی طور پر کم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے خود واصق سے جو کچھ بھی کہا تھا جواباً اس نے جن الفاظ میں اس کی عزت افزائی کی تھی وہ اب بھی نہیں بھولی تھی۔ اس کے الفاظ جب بھی یاد آتے وہ تنفر سے

اتنا سید ھا سوچنے لگی۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو حالات کے حوالے کر کے اس رات کے لئے تیار کیا تھا۔ اب بغیر کسی اشتیاق یا بے تابی کے واحق کی منتظر تھی۔ ونیزے نے خاموشی سے بیڈ کے کراؤن سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اس حالت میں بیٹھے ہوئے ابھی اسے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جب دروازے پر کھٹکا ہوا۔ وہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

واحق جس آہستگی سے کمرے میں داخل ہوا تھا اسی آہستگی سے اس نے اپنے پیچھے دروازہ بھی لاک کیا۔ آہستہ روی سے چلتے وہ بستر کے قریب آ کھڑا ہوا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ ونیزے سے کچھ فاصلے پر بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔ جب بولا تو آواز بہت ہموار تھی۔

"مجھے افسوس ہے ونیزے کہ آپ کو انتہائی ناپسندیدگی و ناگواری کے باوجود مجھ سے شادی کے لئے آمادہ ہونا پڑا۔ میں آپ کی مجبوری سمجھتا ہوں اور یہ بھی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ آپ بخوشی اس بندھن پر آمادہ نہیں ہوئیں۔ اس مجبوری کے پیچھے وجوہات ہیں میں ان سے بھی بخوبی آگاہ ہوں۔ آپ میرے بارے میں اچھے جذبات نہیں رکھتیں۔ مجھے پسند کیا، آپ تو اعتبار اور یقین تک نہیں کرتیں، جبکہ یہ رشتہ سب سے پہلے اعتبار اور یقین اور محبت کی ڈیمانڈ کرتا ہے۔ ایم سوسوری، یہ تینوں چیزیں ہم دونوں کے درمیان نہیں پائی جاتیں۔ آپ کی ناپسندیدگی جان لینے کے بعد میں نے امی سے دوبارہ انکار کیا تھا مگر انہوں نے میرے انکار کی جو سزا مجھے سنائی تھی وہ میرے لئے ناقابل قبول تھی۔ یقیناً آپ یہاں ہیں۔ بہرحال کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا میری سرشت نہیں اور یقیناً آپ بھی پسند نہیں کریں گی کہ میں آپ کی خواہش کے برعکس اپنا کوئی حق استعمال کروں جبکہ میں پہلے بھی واضح کر چکا تھا کہ خالی خولی جسم کبھی بھی میری ڈیمانڈ نہیں رہا۔ آپ تھک گئی ہوں گی پلیز کپڑے چینج کر کے آرام سے سو جائیں اور میری طرف سے فکر مند مت ہوں۔ میں اپنے قول و فعل کا بہت پکا ہوں۔"

وہ جو کچھ اور سوچے بیٹھی ہوئی تھی اس کی غیر متوقع گفتگو سن کر حیران گئی تھی اسے دیکھے جا رہی تھی۔ واحق نے ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ واحق کے خاموش ہو جانے پر بھی وہ بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو واحق نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

کئی لمحے نظر پلٹنا بھول گئی۔ دیوانہ دل ایکدم بے قابو ہوا۔ ساری تقریب میں وہ اپنی نظر بچا تا رہا تھا۔ اپنے دل کو سمجھاتا رہا کہ کہیں بھول کر بھی نگاہ اس دشمن جان کی طرف نہ اٹھ جائے مگر اب اٹھی تو ساری احتیاطیں بے کار گئیں۔ دل و ذہن کو سب سمجھانا بجھانا رائیگاں ٹھہرا۔ واحق کو اس کے نیون سائن کی طرح جگمگاتے چہرے پر بے خودی کی کیفیت میں نظریں جمائے اسے یوں محسوس ہوا جیسے آج قدرت نے اسے کائنات کے سارے حسن سے نواز دیا ہے۔ حسین تو وہ بے تحاشا پہلے بھی تھی مگر اب چودھویں کے چاند کی طرح جگمگاتے حسن کی چھب ہی نرالی تھی۔ بیوٹیشن کی کمال مہارت سے کی گئی تیاری نے اسے شعلہ جوالہ بنا دیا تھا اور اب وہ ناحق ناشکری کر رہا تھا۔

"کیا آج رات روئے زمین پر اس سے زیادہ حسین وجود کہیں اور ہوگا؟" اس کے دل نے اسے ورغلایا۔ اس نے نظر پھیری بستر سے اٹھنا چاہا تو کچھ یاد آ گیا۔ پھر دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے مخملی ڈبیہ نکالی۔ شادی کے دوران وہ اس قدر اپ سیٹ رہا تھا کہ دلہن کے لئے کوئی گفٹ کے متعلق لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا۔ وہ خاصا برہم ہوا اور پھر اسے لے کر پہلے اسے گفٹ خرید کر دیا تھا بعد میں امی سے شکایت کر کے خوب سنوائی تھیں۔

"سب کی خواہش تھی کہ آپ کو یہ گفٹ دے دوں۔ لائیں پہنا دوں۔" مخملی ڈبیہ سے کنگن نکال کر اس نے یونہی رسم نبھانے کو اس کا ہاتھ تھاما۔ آہستگی سے کنگن پہنا کر اس کے ہاتھ کو دیکھا۔ گجروں کی بھینی بھینی خوشبو اور نرمی سے سجا اس کا ہاتھ پہلے ہی زیور سے بھرا ہوا تھا بلکہ وہ پوری کی پوری اچھی خاصی زیور سے لدی ہوئی تھی۔ ان دو کنگنوں سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ خاموشی

سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ڈریسنگ کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے پہلے کوٹ اور پھر ٹائی بھی اتاری۔ الماری سے اپنا سلیپنگ سوٹ نکال کر باتھ روم میں گھس گیا۔ وہ جو بت بنی سب دیکھ رہی تھی۔ باتھ روم کا دروازہ بند ہوتے ہی اپنے ہاتھ کی جانب دیکھنے لگی۔ واحق کی تمام باتیں اس کے دل میں ترازو ہو گئی تھیں۔ اس نے نا چاہتے ہوئے بھی خود کو سمجھانے بہت کچھ سوچ رکھا تھا اور اب اپنی اس طرح کی عزت افزائی پر دل چاہا دل کھول کر رو دے۔ دل مطمئن ہونے کے بجائے اور کملانے لگا تھا۔ وہ گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ واحق لباس بدل کر واپس آ گیا تھا۔ ونیزے کو جیسے کسی بھی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ واحق نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا وہ بغیر حرکت کیے بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک دل میں کسی خیال نے سر ابھارا تو فوراً بستر کی طرف آ گیا۔ اس کے قریب رک کر اس کو آواز دی۔

"ونیزے۔" واحق کی پکار پر اس نے اپنا سر اٹھایا۔ خاموشی سے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور اسی خاموشی سے اٹھ کر اس کے قریب سے گزرتی ڈریسنگ کے سامنے کھڑی ہو کر ایک ایک زیور اتارنے لگی جو بھابی صبیحہ نے بڑے ارمانوں سے پہنایا تھا۔

واحق نے رخ موڑ کر ونیزے پر ایک سرسری مطمئن نگاہ ڈالی پھر وقت دیکھا رات کا ایک بج رہا تھا۔ الماری سے دوسرا کمبل نکال کر وہ بیڈ آ گیا۔ بستر پر بیٹھتے ہی اس نے کمبل کھولا۔ لیٹتے ہی اچھی طرح اوڑھا۔

"سونے سے پہلے پلیز لائٹ آف کر دیجئے گا۔"

کمبل میں سر دینے سے پہلے اس نے خاص ہدایت کی۔ وہ روٹین کے مطابق ہی بیدار ہوا تھا۔ آنکھیں کھلتے ہی اس کی نظر بیڈ کی جائے نماز پر بیٹھی ہاتھ اٹھائے دعا مانگتی ونیزے پر پڑی۔ وہ بلا ارادہ ہی اسے کئی لمحے تک دیکھتا رہا۔ دعا مانگ کر وہ قرآن مجید لے کر صوفے پر بیٹھ کر تلاوت کرنے لگی تھی بہت آہستہ آواز میں۔ اسے قرآن مجید پڑھتے دیکھ کر واحق جہانگیر کے اندر ایک عجیب سا احساس جاگا تھا۔ گھڑی دیکھا ابھی نماز کا وقت تھا۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ بغیر ادھر ادھر دیکھے وہ فوراً باتھ روم میں گھس گیا۔ جلدی سے وضو کر کے باہر کی راہ لی۔ اس کا ارادہ نماز ادا کرنے کا تھا۔

ابھی ونیزے تلاوت قرآن سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھی کہ کمرے میں وجیہہ، جویریہ اور ان کی پھوپھی زاد بہنیں اندر آ گئیں۔

"بہت جلد اٹھ گئے تھے دونوں۔" جویریہ نے اس کے پاس بیٹھتے اردگرد طائرانہ نظر ڈالتے پوچھا۔

"جلد آنکھ کھل گئی تھی۔"

"مشکل سے ہی کھلتی ہے۔ میں تو ساری رات جاگنے کی وجہ سے صبح گیارہ بجے اٹھی تھی۔ وہ بھی بعد میں جھولتی رہی۔"

جویریہ کے ہنس کر بتانے پر وہ مسکرا دی۔

"یہ دلہا میاں کہاں ہیں؟" اس کا اشارہ واحق کی طرف تھا۔

"پتہ نہیں۔ میں نماز ادا کر رہی تھی۔ جب وہ باہر نکل گئے۔"

"اچھا..... ہم تمہیں تیار کرنے آئے تھے۔ تھوڑی دیر میں تمہارے گھر سے ناشتہ آ جائے گا۔" وہ اس کے قریب سے اٹھ کر الماری کھول کر اس کے لئے کپڑوں کا انتخاب کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں جویریہ، وجیہہ اور دوسری کزنوں نے مل کر اسے تیار کر دیا تھا۔ ہلکا پھلکا میک اپ کرنے کے بعد ایک ہلکا سا گولڈ کا سیٹ بھی پہنا دیا تھا۔

بازوؤں میں وجیہہ کانچ کی چوڑیاں ڈالنے لگی تو اس نے منع کر دیا۔

"میں یہ کنگن پہن لیتی ہوں۔" پہلی دفعہ اس نے خود سے کوئی رائے دی تھی۔

"لگتا ہے یہ واحق بھیا کی طرف سے گفٹ ملا ہے۔" اس کے کنگنوں پر ہاتھ پھیرتے جویریہ کی کزن نے کہا تو اس جھینپتے ہوئے سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر تک وہ سب کے ساتھ باہر بیٹھی رہی پھر ناشتہ کے لئے جویریہ اسے دوبارہ کمرے میں لے آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد واسق بھی آ گیا تو اس نے ٹرالی اپنی طرف کھسکا کر چائے بنائی۔ کپ اس کی طرف لے جاتے ہوئے وہ فورا رکی تھی کہ شاید وہ لے گا نہیں۔

"پلیز یہ چائے لے لیں۔" واسق باہر سے اخبار لے کر آیا تھا۔ اب وہ ناشتے کے بجائے اخبار کو چاٹ رہا تھا جب اس کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ چائے لئے منتظر تھی۔ اس نے جلدی سے کپ تھام لیا۔

"شکریہ۔"

وہ دوبارہ صوفے پر جا بیٹھی۔

"میں صرف چائے ہی پیوں گا کھانے کی طلب نہیں۔ پلیز آپ تکلف مت کریں۔" اسے سلائس پر جیم لگاتے دیکھ کر اس نے کہا تو ونیزے کے ہاتھ رک گئے۔ اسے دیکھا مگر وہ دوبارہ اخبار میں گم ہو چکا تھا۔ بے دلی سے اس نے تنہا ہی ناشتہ زہر مار کیا تھا۔

شام کو ولیمہ ہوٹل میں ہی منعقد ہوا تھا۔ چونکہ اگلی صبح پہلا روزہ تھا اسی لئے سب نے ہی شام میں ہی ولیمے کی تقریب رکھنے پر اصرار کیا تھا۔ بھیا بھابی کی بھی یہی رائے تھی۔

ولیمے کی تقریب میں بھی وہ کسی مہاراجا کی شہزادی سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ لوگوں کی نظروں کے ساتھ ساتھ آئینے نے بھی کہا تھا کہ وہ آج پہلے دن سے زیادہ حسین لگ رہی ہے مگر دل کے اندر کوئی لہر نہیں اٹھی تھی۔ اندر کا سمندر جوں کا توں ساکن تھا۔ تھک آ کر اس نے خود کو حالات کی گرفت میں چھوڑ دیا۔

سارے دن کی تھکن سے برا حال تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ بھی اتارے بغیر یونہی سو جائے جبکہ دوپہر میں بڑی امی اور جویریہ نے اسے نیند کی گولی دے کر سلا دیا تھا۔ پھر وہ ولیمے سے کچھ دیر پہلے بیدار ہوئی تھی مگر اب نرم و گرم بستر دیکھ کر اس خواب آگین ماحول میں اس کا دل اسے ایک گہری نیند لینے کو بار بار اکسا رہا تھا۔ پھر وہ خود کو زیادہ دیر تک نہ بہلا سکی۔ کپڑے اور زیور اتارے بغیر ہی وہ بستر پر گر گئی تھی۔ واسق کمرے میں سے باہر تھا جب تک وہ اندر آتا وہ تھوڑا سا آرام کر لیتی یہی سوچ کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

صبح پہلا روزہ تھا وہ بچپن سے سارے روزے رکھتی آئی تھی اس دفعہ بھی سب روزے رکھنے کا پکا ارادہ تھا اور ابھی تو اسے نماز تراویح بھی ادا کرنا تھیں۔ نیند آنے تک وہ یہی سوچتی رہی پھر جب نیند نے غلبہ پا لیا تو وہ اپنی آنکھیں بند ہونے سے نہ روک پائی۔

واسق کمرے میں آیا تو وہ بغیر زیور اتارے، لباس تبدیل کیے محو خواب تھی۔ پتا نہیں وہ کتنا تھکی ہوئی تھی جو اسی حلیے میں بے خبر ہو گئی تھی۔ واسق کے اندر آپوں آپ اس وجود کی بھرپور تھکن کا احساس جاگا تھا۔ دل چاہا لمحوں میں آگے بڑھ کر اس بے خبر وجود کی ساری تھکن خود میں سمیٹ لے۔ اتنا تو وہ کر سکتا تھا مگر وہ دل کو روک گیا۔

صبح جلدی اٹھنا تھا خیال آتے ہی اس نے لباس بدل کر بستر پر اپنی جگہ سنبھالی۔ لائٹ یونہی جلتی رہنے دی تھی۔ ورنہ اسے ہمیشہ لائٹ آف کر کے سونے کی عادت تھی۔ چونکہ وہ خود بھی خاصا تھکا ہوا تھا نرم و گرم بستر پر دراز ہوتے ہی لمحوں میں غافل ہو گیا تھا۔ سوتے سوتے ونیزے کو سخت گھبراہٹ ہوئی تھی اس نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ بے اختیار بستر پر اٹھ بیٹھی۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے اس نے اپنے اردگرد ایک نگاہ کی۔ جہاں اپنے حلیے کا احساس ہوا وہاں یہ بھی یقین ہو گیا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔

"کیا خواب دیکھا ہے میں نے؟" اپنے ذہن پر زور دیتے وہ بستر سے اتر گئی۔ ایک ایک زیور اتارتے وہ خواب کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔

اسے یاد آیا کہ اس نے دیکھا تھا وہ اور واسق ایک ایسی جگہ پر کھڑے ہیں جو پہلے تو بالکل سنسان اور ویران تھی پھر تھوڑی

دیر بعد وہاں اکا دکا لوگ نظر آنے لگتے ہیں۔ چند لمحوں بعد وہ اس سنسان جگہ پر چہل قدمی کر رہی ہوتی ہے کہ اچانک کہیں سے کوئی پرندہ تیزی سے اڑتا اس کی طرف آنے لگتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس پر حملہ کرتا وہ جلدی سے واسق کی طرف بڑھنے لگتا ہے کہ وہ واسق پر حملہ کرتا، ونیزے کی چیخیں نکل جاتی ہیں ساتھ ہی اس کی آنکھ بھی کھل جاتی ہے۔

"او میرے خدا اتنا بھیانک خواب۔" خواب کی تمام جزئیات یاد کرتے ہی اس کی پیشانی پھر تر ہو گئی۔ دل کی دھڑکن معمول سے زیادہ تیز تھی۔ خوف و دہشت سے سارا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ تیزی سے گلے سے اتار از یور ڈریسنگ پر پٹختے واسق کے قریب جا رکی۔ وہ کمبل اچھی طرح لپیٹے سو رہا تھا۔ ونیزے کا شدت سے جی چاہا کہ وہ اسے جھنجوڑ کر اٹھائے اور پھر پوچھے کہ وہ ٹھیک تو ہے۔ وہ ایک دومنٹ کھڑی رہی پھر اپنی سوچ پر عمل کرنے کے بجائے دوبارہ ڈریسنگ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ سارا زیور سنبھال کر اپنا نائٹ ڈریس نکال کر پہلے دلہنوں والا لباس اتارا پھر وضو کر کے جائے نماز بچھائی۔

✠ ✠ ✠

رمضان المبارک کا بابرکت رحمتوں والا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ روز صبح سحری کے وقت اٹھ جاتی تھی۔ بڑی امی، چھوٹی چچی اور وہ جب سحری تیار کرتیں تو وہ چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ ایک دو دفعہ ہاتھ بٹانا چاہا تو دادی جان نے اچھی خاصی ڈانٹ پلا کر بٹھا دیا کہ ان کے گھر میں نئی دلہن دو ماہ تک کسی چیز اور کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ ان کی محبتوں کی وہ پہلے ہی گرویدہ تھی اب بھی نہال ہو گئی۔

افطاری کے وقت وہ اور واسق اور دیگر اہل خانہ کہیں نہ کہیں افطار پر مدعو ہوتے تھے۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی روز کوئی نہ کوئی دعوت دیئے چلا آتا تھا۔

آج چوتھا روزہ تھا وہ سب بڑی امی کی بہن کے ہاں افطار پر مدعو تھے۔ امی کی خاص تاکید تھی کہ دونوں افطاری سے دو تین گھنٹے پہلے ہی چلے جائیں۔ باقی سب بعد میں آ جائیں گے۔ چونکہ امی کا حکم تھا سو دونوں تین بجے ہی تیار ہو گئے۔ جویریہ کی ہر روز فرمائش اور پھر جھڑکیوں پر اس نے بلیک ساڑھی پہنی تھی۔ موسم کی مناسبت سے کندھوں پر گرم شال لپیٹ لی تھی۔ جویریہ نے ہی اسے تیار کیا تھا۔ سج سنور کر وہ اور بھی خوبصورت لگنے لگی تھی۔ واسق بھی بالکل تیار تھا وہ جویریہ کے ہمراہ نکلی تو بڑی امی اسے اس روپ میں دیکھ کر نہال ہو گئیں۔

"ماشاءاللہ اللہ نظر بد سے بچائے۔" انہوں نے والہانہ پیار کرتے اس کا ماتھا چوما تو دادی اماں نے بھی اسے گلے لگا لیا۔

"جیتی رہو، خدا سدا سہاگن رکھے۔ امی کی طرح پیار کرتے انہوں نے بھی دعا دی۔ وہ جھینپ سی گئی ایک دم بلش ہوئی تھی۔ واسق دونوں کی کیفیت سے بے خبر یہ سب مظاہرے دیکھ رہا تھا۔ دیر ہو جانے کے احساس سے چڑ گیا۔

"اب چلیں بھی..... اور کتنا وقت لگتا ہے۔" اپنی ناگواری چھپاتے اس نے کہا تو امی نے اسے گھورا۔

"تمہیں بڑی جلدی ہے دومنٹ انتظار کر لو۔" انہوں نے اسے جھڑکا تھا۔ امی کا صاف جواب سن کر وہ پاؤں پٹختے باہر نکل گیا۔ ونیزے اپنی جگہ سہم سی گئی نجانے رو اب اسے کیا کہے۔

"لو..... اسے کیا ہوا۔" دادی اماں کے لئے یہ سب نیا تھا وہ حیران ہوئیں۔ امی جو کہ واسق کے رویوں، انکار اور اب خاموش پالیسی اور چڑچڑے پن سے اچھی طرح باخبر تھیں، انہوں نے فوراً بات بدلی۔

"کچھ نہیں..... بس یونہی چڑچڑا ہو رہا ہے۔ چلو جاؤ ونیزے! وہ باہر گاڑی میں انتظار کر رہا ہو گا۔" اماں کو کہتے انہوں نے اسے بھی اشارہ کیا۔ وہ بے دلی سے اٹھ آئی۔ اسے واسق کے یہ تیور اندر ہی اندر بہت تکلیف دیتے تھے۔ اب بھی وہ کچھ غمگین سی ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتی وجیہہ نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

"وینز ے بھابی! آپ کی بھابی کا فون ہے آ کر سن لیں۔"

بھابی کا سنتے ہی وہ فوراً ٹیلی فون کی طرف لپکی جلدی سے ریسیور کان سے لگایا۔

"ہیلو بھابی! السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ اچھی ہونا۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی۔"

"واحق کہاں ہے؟ ذرا اس سے بات تو کراؤ۔"

"وہ تو باہر ہیں۔ ایک منٹ رکیں میں بلواتی ہوں۔" انہیں کہہ کر اس نے اپنے پاس کھڑی وجیہ کو اشارے سے واحق کو بلانے کا کہا۔

"بھابی بھیا کہاں ہیں؟ وہ ٹھیک ہیں؟" اس نے دوبارہ کان سے ریسیور لگایا۔

"ہاں..... نہیں....." بھابی کی سوجی سوجی ابھرتی آواز پر وہ چونک گئی۔

"بھابی! کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے نا؟" ان کے انداز سے اسے غیر معمولی صورت حال کا اندازہ ہوا تو بے قراری سے پوچھا۔

"خیریت نہیں ہے وینز ے! میں بہت پریشان ہوں۔ پلیز واحق سے بات کراؤ۔" بھابی ایک دم رونے لگی تھیں۔ وہ حیران رہ گئی۔ واحق بھی آ گیا تھا اس نے اٹھتے ہوئے فون اس کی طرف بڑھا یا خود بے چینی سے اسے دیکھنے لگی۔

"السلام علیکم بھابی۔" وہ ٹھہرا ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام! پلیز واحق جلدی آ جاؤ، امجد کا محبوب رحمانی سے بری طرح کلیش ہو گیا ہے۔ وہ خاصے زخمی ہو گئے ہیں۔ میں ہاسپٹل سے بات کر رہی ہوں۔ وینز ے کو لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم خود ہی آ جاؤ۔" ایک اچٹتی نظر پریشان وینز ے کے بے چین چہرے پر ڈالی اور پوچھا۔

"کون سے ہاسپٹل میں ہیں؟" وینز ے ہاسپٹل کا لفظ سن کر اور پریشان ہو گئی۔

"جی اچھا میں فوراً پہنچتا ہوں۔ آپ فکر مت کریں۔" بھابی نے جیسے ہی ہاسپٹل کا نام بتایا اس نے فون بند کر دیا۔ وینز ے کی طرف دیکھے بغیر وہ جانے لگا تو اس نے فوراً روکا۔

"سنیے کیا ہوا ہے؟ بھابی کیا کہہ رہی تھیں اور ہاسپٹل میں کون ہیں؟" وہ روہانسی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ واحق نے ایک گہری سانس لی۔

"کوئی نہیں، بس ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ آپ گھر والوں کے ساتھ ڈنر پر چلی جایئے گا۔"

"جھوٹ مت بولیں۔ بتایئے کیا ہوا بھیا کو؟" اس کے یوں بہلانے پر وہ ایک دم رو پڑی۔

"کچھ نہیں ہوا۔ بس ہلکا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں اس وقت وہیں جا رہا ہوں۔" واحق نے اسے اصل صورت حال بتانے سے پھر بھی احتراز کیا تھا۔ وہ کتنے کمزور دل کی مالک تھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایکسیڈنٹ کا لفظ سن کر اس کے حواس باختہ ہو گئے۔ ہونٹوں پر ہاتھ رکھے اس نے دیوار کا سہارا لیا۔

"نہیں....." ہونٹوں سے بمشکل نکلا۔

"پلیز وینز ے! وہ ٹھیک ہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" اسے تسلی دینے کو اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میں بھی جاؤں گی آپ کے ساتھ۔" بچوں کا سا ضدی انداز تھا۔ واحق نے وقت دیکھا اور پھر اس پر نظر ڈالی۔ اس حلیے میں وہ اسے کہاں لے کر جاتا۔

"نہیں، آپ کسی اور کے ساتھ بعد میں آ جایئے گا۔ میں فون کر دوں گا۔" اسے عجلت میں کہتے وہ اندر کچن میں امی کو بتانے چلا گیا۔

واحق رات گئے لوٹا تو وینز ے نے رو رو کر بری حالت کر لی تھی۔

اسے دیکھتے ہی وہ دادی اماں کی گود سے نکل کر بے اختیار اس کی طرف بڑھی۔

"کیا ہوا بھیا کو؟ کیسے ہیں وہ؟ اور آپ نے فون کیوں نہیں کیا تھا۔" واحق کا بازو پکڑ کر جھنجوڑتے وہ بے اختیار رو رہی تھی۔ نہ ہی اسے اپنا ہوش تھا نہ ہی ارد گرد موجود لوگوں کا۔

"ٹھیک ہیں وہ۔ صبح لے جاؤں گا آپ کو بھی۔" اس کا بازو تھام کر اسے دوبارہ دادی اماں کے تخت پر لا بٹھایا۔ پھر خود بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

ابو چھوٹے چچا شہروز، مہران، امی، دادی جان، وجیہ وغیرہ سب ہی اصل صورت حال جاننے کے منتظر تھے۔ اس نے چیدہ چیدہ ساری بات کہہ سنائی ساتھ یہ تسلی بھی دی کی امجد بھائی ٹھیک ہیں۔ تشویش والی کوئی بات نہیں۔ وینز ے تو محبوب رحمانی کا نام سن کر ہی کانپ گئی تھی اور شدت سے رونے لگی۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔" یہی سوچ اسے مزید ڈس رہی تھی۔

صبح وہ واحق کے ساتھ ہی بھیا کو دیکھنے ہاسپٹل گئی تھی۔ وہ ہوش میں تھے۔ زخم بھی نارمل تھے۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائے بھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟" کوشش کے باوجود آنسوؤں کو چھلکنے سے روک نہیں پائی تھی۔

"ٹھیک ہوں بہنا۔" اس کے سر پر اپنا پر شفقت ہاتھ رکھتے انہوں نے تسلی دی۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے نا۔" ان کے ہاتھ کو ہونٹوں سے لگاتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ارے نہیں میری جان، ایسا کیوں سوچتی ہو۔ بس بزنس کی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ سنبھالو خود کو، واحق پلیز تم ہی اسے سمجھاؤ....." اسے چپ کراتے کراتے انہوں نے واحق کو بھی دیکھا تو وہ آگے بڑھ آیا۔ بھیا کے بستر پر بیٹھی وینز ے کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"وینز ے بھیا کو کیوں پریشان کر رہی ہو۔ پلیز سنبھالو خود کو۔" کندھے پر دباؤ ڈالتے نہایت تحکم بھرے لہجے میں کہا گیا۔ تب وینز ے نے فوراً اپنے آنسو صاف کیے۔

وہ کافی دیر تک ان کے پاس ٹھہری تھی۔ اس دوران واحق بھی وہیں رہا تھا۔ پورے تین گھنٹے بعد اس نے اس کو چلنے کو کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

"مجھے نہیں جانا، میں بھیا کے پاس رہوں گی۔" بھیا ابھی آدھ گھنٹہ پہلے ہی سوئے تھے۔ واحق کو اس کے یوں منہ اٹھا کر انکار کر دینے سے غصہ بہت آیا۔ بھابی کی موجودگی کا خیال کرتے پی گیا۔

"یہاں بھابی ہیں، گھر سے امی اور دادی جان بھی آ جائیں گی۔ آپ میرے ساتھ واپس چلیں۔" بھابی کو دیکھتے ہی اس نے تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر لے آیا۔ باہر آتے ہی وینز ے نے سختی سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

"میں یہیں رہوں گی۔ مجھے نہیں کہیں جانا۔"

دماغ تو ٹھیک ہے آپ کا۔ جانتی ہیں کتنا خطرہ ہے آپ کو۔"

"تو کیا ہوا، مجھے ہی خطرہ ہے نا، آپ کو تو نہیں۔" بدتمیزی سے جواب دینا اور بحث کرنا اس کی عادت نہیں تھی مگر واثق کے رویے نے اسے بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انتہائی بے خوفی سے واثق کی آنکھوں میں دیکھتی کہہ رہی تھی۔

"دماغ چل گیا ہے آپ کا۔ وہ شخص جو آپ کے بھائی کو زخمی کروا سکتا ہے آپ کو بھی کوئی تکلیف پہنچا سکتا ہے۔ ان کو اسے یہ سب علم ہے کہاں رہتی ہیں، کہاں جاتی ہیں، کب جاتی ہیں اور کس کے ساتھ جاتی ہیں۔"

"تو ہونے دیں۔ آپ کو اس سے کیا۔ اگر مروں گی تو میں ہی نا۔ آپ کا یہ دردِ سر نہیں ہے۔" انتہائی بدتمیزی سے اس نے کہا تھا۔ واثق تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"آپ میری بیوی ہیں آپ کی حفاظت کرنا میری ذمہ داری ہے۔"

"ہونہہ...... کس نے کہا ہے میں آپ کی بیوی ہوں یا مجھے آپ کی حفاظت کی ضرورت ہے۔" آج واقعی دنیزے کا دماغ چل گیا تھا جو اس قدر بدتمیزی کرتی جا رہی تھی۔

"شٹ اپ دنیزے! میں مزید کچھ نہیں سنوں گا۔ آرام سے گھر چلیں۔"

"ہونہہ...... مجھے کہیں نہیں جانا۔ یہ ڈر ڈر کر اب مجھ سے نہیں جیا جاتا۔ تنگ آ گئی ہوں اس قیدیوں کی سی زندگی سے۔" اس کے لہجے میں کہہ کر وہ واپس بھیا کے گھر کے اندر جانے لگی تو اتنی دیر سے اس کی لن ترانیاں برداشت کرتا واثق حقیقت میں آؤٹ ہو گیا۔ فوراً اس کا بازو دبوچا اور تیز تیز قدم اٹھاتا پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف لے آیا۔ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیلا، دروازہ لاک کر کے دوسری طرف گھوم کر خود بھی آ کر بیٹھ گیا۔ واثق نے یہ سب اتنی جلدی کیا تھا کہ وہ کوئی بھی مزاحمت نہیں کر سکی تھی۔ بے بسی سے باہر دیکھنے لگی۔ گھر آ کر گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد واثق نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔

"میں آج تو آپ کی بدتمیزی برداشت کر گیا ہوں، آئندہ نہیں کروں گا۔ آپ کو اپنی جان کی پروا نہیں مگر اور بہت لوگوں کو ہے۔ میں اس لب و لہجے کا عادی نہیں ہوں۔ عزت کرتا بھی ہوں اور کرواتا بھی ہوں۔ مائنڈ اٹ......"

دو ٹوک انداز میں اسے بازو کراتے وہ باہر نکل گیا تھا۔ بستر پر گرتے ہی اس کا جی چاہا کہ اپنے نصیبوں کو پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

وہ صرف ایک دفعہ ہی بھیا کو دیکھنے گئی تھی۔ اس کے بعد اسے خطرہ ہے کہہ کر واثق نے اسے کہیں بھی لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور بدقسمتی یہ تھی کہ دوسرے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ کسی اور کے ساتھ تو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس روز کے بعد واثق کے تیور ہی بدل گئے تھے۔ جب بھی بات کرتا تھا خاصا جارحانہ موڈ ہوتا تھا۔ شائستہ اطوار ناشائستگی میں بدل گئے۔ کچھ اس ٹینشن کی وجہ سے روز بروز دنیزے کے اندر بھی برداشت کم ہوتی جا رہی تھی۔ ہر وقت خود بھی کڑھتی رہتی تھی اور کوئی نہ کوئی ایسی بات یا حرکت کر جاتی تھی کہ اچھا خاصا کول مائنڈ واثق بھی جھنجلا اٹھتا۔

بھیا ہاسپٹل سے گھر شفٹ ہو گئے تھے۔ اس کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ وہ انہیں گھر جا کر دیکھ آئے۔ عرصہ ہو گیا تھا اسے اپنے گھر گئے ہوئے۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ کوئی اسے وہاں لے کر نہیں جا رہا تھا۔

"جویریہ کو واپس اپنے سسرال پشاور جانا تھا۔ واثق بڑی امی اور چچی جان اسے ایئر پورٹ تک چھوڑنے گئے تھے۔ باقی سب اپنے اپنے کاموں پر نکل گئے تھے۔ گھر میں سوائے اس کے وجیہ اور دادی اماں تھیں۔ تھوڑی دیر بعد دادی اماں بھی سو گئیں تو اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کرنے لگا۔

"وجیہ مجھے بھیا کے ہاں جانا ہے میرے ساتھ چلو گی۔"

"کیا......؟" وہ حیران ہوئی یوں دیکھا جیسے واقعی دنیزے کا دماغ چل گیا ہو۔ "اس وقت تو گھر پر کوئی نہیں ہے۔ واثق بھیا تھوڑی دیر میں آجائیں تو پھر چلی جایئے گا۔"

"تمہارے بھیا تو قیامت تک وہاں نہیں لے کر جائیں گے اور اب میں مزید اپنے گھر سے دور نہیں رہ سکتی۔ یہ سارا رسک میں نے اسی لئے لیا تھا ورنہ میرا دماغ خراب نہیں تھا کہ میں اس جیسے سر پھرے شخص سے شادی کرتی۔" وہ بہت برداشت کر رہی تھی۔ اب مزید چپ نہیں رہ سکتی تھی۔ سارا غصہ وجیہ کے سامنے نکلا وہ تو حیران ہو کر صرف اسے دیکھتی رہ گئی۔

بغیر کچھ سوچے سمجھے دنیزے نے کمرے میں آ کر پہلے اپنا بیگ لیا پھر تیزی سے ڈرائنگ روم میں آ کر وجیہ کو بتایا۔

"میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔ دادی اماں وغیرہ کو بتا دینا۔" وہ ہر طرح کے ڈر خوف سے بے نیاز تھی۔ وجیہ تو پریشان ہو گئی۔

"اکیلے؟"

"تو کیا تم ساتھ چلو گی؟" اس نے الٹا اسی سے سوال کر دیا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"گھر میں اس وقت کوئی نہیں۔ دادی اماں تنہا ہیں۔ آپ کچھ دیر رک جایئے سب آ جائیں گے تو پھر چلی جایئے گا۔" وجیہ کا ارادہ اسے سمجھانے کا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلا کر باہر نکل آئی۔ وجیہ اس کے پیچھے گیٹ تک آئی تھی۔ ہر ممکن طریقے سے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ راضی ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"آپ اس وقت جائیں گی کس پر۔ گاڑی تو واثق بھیا لے گئے ہیں۔" اس نے اسے منانے کو آخری حربہ استعمال کیا۔

"اس کو نٹہ جیسے بڑے شہر میں ٹیکسیوں کا کال نہیں ہے۔ جلدی امی آئیں تو انہیں بتا دینا۔ میں بھیا کے ہاں ہوں۔" دو ٹوک انداز میں جواب دے کر وہ گیٹ عبور کر آئی۔

یہ شہر تو نہیں البتہ یہ علاقہ اس کے لئے بالکل ہی انجان تھا اس کے باوجود اس نے رسک لے لیا تھا۔ بس اسٹینڈ پر کافی وقت کھڑے ہو کر انتظار کرنے کے باوجود کوئی ٹیکسی نہ ملی تو اس نے دور تک لگے بند رکشے کو ہاتھ دے کر روکا۔ آج ہر حال میں اسے اپنے گھر جانا تھا۔ ایسی ضد پہلی دفعہ اس کے اندر پیدا ہوئی تھی کہ وہ نتائج کی پروا کئے بغیر چلی آئی تھی۔ وہ سارا راستہ واثق کے رویے پر کڑھتی رہی۔ رکشے نے بھی خاصی دیر لگا دی تھی۔ خوامخواہ میٹر بڑھانے کے چکر میں تھا۔

اللہ اللہ کر کے وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی بھابی بے چینی سے کاریڈور میں ٹہلتی مل گئی تھیں اسے دیکھتے ہی بھاگی ہوئی قریب آئیں۔

"السلام علیکم بھابی۔" انہیں دیکھ کر وہ بے پناہ خوش ہو گئی تھی۔ فوراً سلام کیا اور گلے سے لپٹ گئی مگر انہوں نے اسے خود سے جدا کر دیا۔

"کس کے ساتھ آئی ہو؟" بہت غصیلہ انداز تھا پوچھنے کا۔ وہ چونکی۔

"اکیلی۔"

"میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں تمہیں کھینچ کر طمانچہ رسید کروں۔ جانتی ہو پورے دو گھنٹے پہلے تم گھر سے نکلی تھیں اور اب آ رہی ہو۔ اب تک تمہاری ساس کے کوئی دس فون آ چکے ہیں۔ ایک دفعہ واثق خود بھی چکر لگا گیا ہے۔ سارا گھر پریشان ہو رہا ہے تمہارے لئے، کچھ تو خیال کر لیا ہوتا۔ کتنی انسلٹ ہوئی ہے تمہاری وجہ سے۔ ایسی کونسی مصیبت آ گئی تھی جو یوں تمہارا منہ اٹھائے چلے آنا بہت لازمی تھا۔" غصے سے انہوں نے اسے اچھی خاصی سنا ڈالیں۔ وہ جو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی ایک دم رو پڑی۔

"سب ڈانٹ لیں مجھے۔ میں ہی بری ہوں۔ اب میں اپنے گھر بھی نہیں آسکتی۔"

"اپنے گھر آنے ملنے ملانے کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں وجیزے! سسر شوہر کوئی گھر پر نہیں، کسی سے اجازت نہیں لی، کچھ بتایا نہیں اور چلی آئیں تم، کچھ تو خیال کیا ہوتا تمہارے اس فعل پر انہوں نے کیا سوچا ہوگا۔"

"ایسا کون سا گناہ کرلیا ہے میں نے۔ صرف اپنے گھر ہی تو آئی ہوں۔ میں اب قید ہوں کی سی زندگی نہیں گزار سکتی۔ مجھے بھی تھا نہیں کرنی مجھے شادی، ترس گئی ہوں اپنے گھر کو، لوگوں کے گھر رہتے ہوئے اب شرم آتی ہے۔"

"وجیزے....." بھابی نے دکھ سے دیکھا۔ "تم کسی غیر کے گھر میں تو نہیں ہو، اپنے سسرال میں ہو، شوہر کے گھر میں۔"

"ہوتا ہوگا..... مجھے نہیں پتا۔" اس نے ایک دم سر جھٹکا۔ "میں اس لئے تو شادی پر راضی نہیں ہوئی تھی کہ اب بھی اپنے گھر میں آنا نصیب نہ ہو۔"

"وجیزے! میری جان، میری بہن، تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ وہ محبوب رحمانی کیسا زخمی شیر بنا ہوا ہے، دھمکیاں دیتا ہے کہ ہم نے تمہاری شادی کر کے اچھا نہیں کیا۔ اپنے بھائی کی ہی حالت دیکھو۔" انہوں نے مصالحانہ انداز میں سمجھانا چاہا، کچھ بات اس کی عقل میں آئی تھی تو چپ رہی۔

"بھیا کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں۔" وہ خاموشی سے ان کے پاس آگئی۔ وہ سوئے ہوئے تھے انہیں بغیر ڈسٹرب کئے وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں آئی تو وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ اسے بھی اشارے سے پاس بلایا۔

"تمہاری ساس ہیں۔" انہوں نے اس کی سوالیہ نظروں کے جواب دیتے اسے ریسیور تھمایا۔

"ہیلو۔"

"وجیزے! میری بیٹی ٹھیک ہو نا۔ بھلا یہ کیا حرکت تھی؟" انہوں نے اس کی آواز پہچان کر فوراً کہا۔

"میں ٹھیک ہوں آنٹی! کتنی دفعہ تو میں نے یہاں آنے کو کہا تھا مگر آپ بھی تو۔"

"ہم بھی تو تمہارے بھلے کے لئے منع کر رہے تھے۔ اب تم گھر سے مت نکلنا میں واسق کو بھیج رہی ہوں اس کے ساتھ فوراً گھر آؤ۔" انہوں نے فوراً حکم سنایا تو وہ سٹپٹا گئی۔

"مگر آنٹی....."

دوسری طرف سے انہوں نے بغیر کوئی بات سنے فون رکھ دیا تھا۔ اس نے بھی ریسیور پٹخا۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ جو بھی آئے بتا دیجئے گا اسے۔" بھابی سے کہتے، پاؤں پٹختے وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"بری بات وجیزے! تم تو بہت اچھی لڑکی ہو، کبھی ضد نہیں کی۔ اب ایسی حرکتیں کیوں کر رہی ہو۔ ابھی تو صرف تمہاری شادی کو دس دن ہی ہوئے ہیں اور تم یوں منہ اٹھائے بغیر کسی سے اجازت لئے یہاں چلی آئیں۔" انہوں نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے کہا۔ وہ رو پڑی۔

"میں کیا کروں، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ صرف میری وجہ سے بھیا زخمی ہو گئے۔ واسق کو بھی صرف میری وجہ سے شادی پر راضی ہونا پڑا تھا۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے میں سب پر بوجھ ہوں۔"

"نہیں میری جان کیوں سوچتی ہو تم ایسے۔ تم تو ہم سب کی جان ہو۔ واسق نے کچھ کہا ہے۔" انہوں نے بہت ہی پیار سے اس کے اشک صاف کرتے ساتھ لگاتے پوچھا تو بے اختیار اس کا سر نفی میں ہل گیا۔ دل تو چاہ رہا تھا بھابی کو سب کہہ سنائے، کسی ہمدرد، ہمراز کی اشد ضرورت تھی مگر وہ پھر بھی نفی کر گئی۔

"واسق بہت ہی اچھا اور سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ ہم نے بہت ہی دیکھ بھال کر اسے تمہارے لئے منتخب کیا ہے۔ تم جس طرح کی سیدھی سادی اور بے وقوف ہو ان کے لئے واسق جیسے شوہر ہی سوٹ کرتا ہے۔ بہت چھان پھٹک کر ہم نے یہ شخص ڈھونڈا ہے۔ بہت ہی ذہین ہے۔ تمہیں پتا ہے وہ خود ہی محبوب رحمانی کو اس کے اوچھے ہتھکنڈوں سے باز رکھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔ اپنے خفیہ ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے وہ اس کے اگلے پچھلے سارے کالے کرتوت کھول رہا ہے۔ دیکھنا صرف چند دن کی بات ہے پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ۔ پھر تم جب چاہے، جس وقت چاہے روز آنا مگر ابھی جب حالات نارمل نہیں ہیں خود پر تمہیں کنٹرول کرنا ہوگا۔ ہم تو صرف اس لئے منع کر رہے ہیں کہ تمہاری شادی اور اپنے تمام راز کھل جانے کے خوف نے اسے بہت نڈر کر دیا ہے کسی بھی وقت وہ کچھ بھی کر سکتا ہے اسی لئے احتیاط لازمی ہے۔" بھابی نے اسے بہت اپنائیت و رسانیت سے سمجھایا تو اس نے سر ہلا دیا۔

یہ واسق کیوں بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔" ان کی یہ بات اس کے پلے نہیں پڑی تھی۔

"ارے سیدھی ہو تم۔ بھئی وہ اس گھر کا داماد ہے۔ اب ہم سب کے دکھ سکھ سانجھے ہیں پھر وہ خفیہ انٹیلی جنس میں ہے تو کیا اس کے اس عہدے کا ہم فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔" بھابی نے بہت ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ تعجب میں دیکھے گئی۔

"انٹیلی جنس میں۔" یہ خبر اس کے لئے بالکل نئی تھی۔ اس نے تو کبھی نظر اٹھا کر واسق کو خاص انداز سے دیکھا بھی نہیں تھا کجا کہ اس کے متعلق معلومات اکٹھی کرتی۔ جس طرح اچانک بہ حالت مجبوری وہ اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا اسی طرح وہ ابھی تک اس بات سے بھی بے خبر تھی کہ وہ کیا کرتا ہے؟ کہاں جاتا ہے؟ کیوں جاتا ہے؟ اگر رات کو دیر سے لوٹتا ہے تو کیوں لوٹتا ہے؟

"ہاں بھئی انٹیلی جنس میں۔ کیا تمہیں نہیں علم۔" اب بھابی نے حیرت کا مظاہرہ کیا تھا۔ "ارے تم تو واقعی بدھو ہو۔" اس کے نفی میں سر ہلانے سے بھابی نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ اس خطاب پر خفا بھی نہ ہو سکی۔

"وہ کوئی عام نہیں، اسپیشل انٹیلی جنس کا آفیسر ہے۔ انڈر گراؤنڈ لوگوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اب تک تو وہ کتنے اہم کیس سر انجام دے چکا ہے۔ پچھلے دنوں وہ پشاور سائیڈ میں ایک بہت بڑے مافیا گروپ کو پکڑ وا کر آیا ہے چونکہ اسے کسی نئے کیس کے لئے آرام دینے کے لیے دو ماہ کی چھٹی دی گئی تھی اسی لئے وہ آج کل محبوب رحمانی پر کام کر رہا ہے۔" بھابی نے کافی تفصیل سے بتایا تو اس کا دل چاہا اپنی عقل پر ماتم کرے۔ وہ اتنے عرصے سے بے خبر تھی اور کبھی نے اسے کسی بات کی بھنک بھی تو نہیں پڑنے دی تھی۔

بعد میں بھابی اس سے واسق کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔ واسق اسے لینے آیا تو بھابی نے اسے بھیا کی طرف سے مطمئن کر کے رخصت کیا۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے وہ اندر کے بجائے باہر کے نظاروں میں غرق رہی۔

"جب میں نے آپ کو منع کر دیا تھا کہ فی الحال میں آپ کو یہاں نہیں لا سکتا تو یہ حماقت سر انجام دینے کی کیا ضرورت تھی؟" واسق بہت دیر تک اپنا غصہ کنٹرول کرتا رہا تھا۔ مگر اس کی یوں بے توجہی اور باہر کے نظاروں میں دلچسپی دیکھ کر کہے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ رخ موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"میرا دل چاہ رہا تھا بھیا بھابی سے ملنے کو، اپنا گھر دیکھنے کو، آپ کون سا میری بات مان رہے تھے۔" بہت ہی معصوم اور سادہ سے انداز میں اس نے جواب دیا تھا۔ واسق کا جی چاہا کسی چیز سے گاڑی دے مارے، یعنی "اندھے کے آگے رونا، اپنے نین کھونا" والی مثل فٹ آ رہی تھی۔

وہ جویریہ کو چھوڑ کر امی اور چچی کے ہمراہ گھر لوٹا تو وجیہ سے علم ہوا کہ وہ تنہا ہی اپنے گھر جانے کو نکل گئی ہے۔ وہ بے انتہا پریشان ہو گیا تھا۔ بے حد اسپیڈ سے گاڑی دوڑاتے وہ وہاں پہنچا تھا مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ اسی پریشانی میں وہ واپس گھر لوٹا تھا شاید گھر واپس چلی گئی ہو۔ پچھلے تین گھنٹوں سے وہ کس قدر پریشان ہوا تھا یہ وہی جانتا تھا۔

بہت ہی ناشائستہ حرکت کی ہے۔ کم از کم اپنی حیثیت کے متعلق ہی سوچ لیا ہوتا۔

"میں اپنی حیثیت اچھی طرح جانتی ہوں۔" حیثیت کے لفظ نے وینزے کے اندر مرچیں سی بھر دی تھیں۔ "آپ نے ہی تو کہا تھا، میں بہت ہی عام سی لڑکی ہوں، عام سی سوچ والی، عام سی ذہنیت کی حامل ایک سطحی لڑکی تو پھر کس حیثیت کی بات کر رہے ہیں آپ جبکہ میں تو پہلی نظر سے لے کر اب تک کچھ بھی نہیں جان پائی۔ یہ تک نہیں کہ آپ جاب کیا کرتے ہیں۔ اگر آج بتا دیں تو بتا دیں۔" بہت ہی سنجیدگی سے کہتے اس نے دوبارہ چہرے کا رخ باہر کی طرف کر لیا۔ کہنا تو وہ اور بھی بہت کچھ چاہتی تھی باتیں تو بہت تھیں جو دل و دماغ کو الجھائے ہوئے تھیں خاص طور پر وہ پریشانی والی گرہ جس نے دل کے ساتھ ساتھ دماغ کے بھی دروازے بند کر دیے تھے۔ وہ کہنا بھی چاہتی تھی، سب کچھ کلیئر کرنا چاہتی تھی مگر اس کی خودداری وانا نے اسے روک دیا تھا۔

✠ ✠ ✠

عصر کی نماز کے بعد وہ نہا کر اوپر ٹیرس پر آ گئی۔ الجھے بالوں کو برش سے سلجھاتے وہ ادھر سے ادھر ٹہلتی رہی۔ پھر تھک کر کرسی پر بیٹھ کر یونہی ورد کرنے لگی۔ دادی اماں عصر کی نماز کے بعد اپنا زیادہ تر وقت جائے نماز پر وظیفے کرتے اور قرآن پڑھتے گزار دیتی تھیں۔ جب سے رمضان شروع ہوا تھا ان کی عبادت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اکثر اس کی زبان پر بھی کوئی نہ کوئی ورد جاری رہتا تھا۔ اسے وہاں بیٹھے کافی وقت گزر گیا تو مغرب سے کچھ پندرہ منٹ پہلے وہ نیچے اتر آئی۔ ارادہ کمرے میں جانے کا تھا کہ راستے میں پڑے فون کی بیل بج اٹھی۔ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے اس نے آگے بڑھ کر فون اٹینڈ کیا۔

"ہیلو۔" بالوں میں انگلیاں پھیرتے اس نے ریسیور کان سے لگایا۔

"یہ واسق جہانگیر احمد کا گھر ہے نا۔" دوسری طرف سے پوچھا گیا تھا۔ وہ قدرے چونک کر پوری جان سے متوجہ ہوئی۔

"آپ کے لیے ایک بری خبر ہے۔ ان کا کار ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ آخری خبر ہے کہ ان کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" اطلاع دینے والا جو کوئی بھی تھا اس نے اس کے حواسوں پر گویا بم پھوڑا تھا۔

"واٹ؟" وہ بے اختیار چیخ اٹھی۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ "نہیں۔" اسے اپنے ہونٹوں پر سختی سے ہاتھ جماتے ہوئے اس نے اپنی بلند ہوتی چیخوں کو روکنا چاہا۔ مگر آواز اس کے اعصاب کو منتشر کرتی جا رہی تھی۔

"کار ایکسیڈنٹ۔" اس نے نفی میں بری طرح سر ہلایا۔ "واسق کی ڈیتھ۔" وہ قالین پر گھٹنوں کے بل گری اور سر زمین پر ٹیک گئی۔

"آنٹی....." ضبط کھوتے ہی وہ بے اختیار چیخیں مارنے لگی۔ اس کی دلدوز چیخیں سن کر سب کے سب بھاگے آئے تھے۔ افطاری سے صرف پندرہ منٹ پہلے کا وقت تھا سب ہی گھر پر تھے۔

"وینزے..... کیا ہوا۔ میری جان؟" سب سے آگے امی تھیں اسے یوں گھٹنوں کے بل اوندھے منہ گرے دیکھ کر انہوں نے جھنجوڑ ڈالا۔ شاک کی سی کیفیت میں وینزے نے اپنا سر اٹھایا۔ بے یقینی سے امی کو دیکھا۔

"آنٹی..... وہ....." فون کی طرف اشارہ کرتے وہ بول نہیں پائی تھی۔ سب نے فون کی طرف دیکھا۔ ریسیور لٹک رہا تھا۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"آنٹی! فون..... واسق" اس کے نیلے سا کن ہونٹ پھڑپھڑائے اور پھر ساکت ہو گئے۔ وہ بے ہوش ہو کر امی کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔

✠ ✠ ✠

وہ صبح نو بجے گھر سے نکلا تھا۔ سب ضروری معلومات اکٹھے کرتے رپورٹس کرتے کرواتے مختلف لوگوں سے ملتے جلتے اس کو وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ عصر سے کچھ پہلے وہ ایس ایس پی قیوم شکیلن کے دفتر میں آ گیا۔ ساری معلومات اسے مہیا کرتے اسے بریفنگ دیتے، کچھ وقت وہاں لگ گیا تھا۔ قیوم شکیلن کے آفس سے باہر آ کر اس نے ایک سکون بھری سانس لی۔ گویا سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ اب اس کا ارادہ گھر جانے کا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ موبائل پر امجد بھیا کی کال آ گئی۔ انہوں نے اسے اپنے آفس بلوایا تھا۔ اس نے وقت دیکھا ساڑھے تین بج رہے تھے۔ ابھی افطاری میں کافی وقت تھا وہ بغیر تاخیر کیے ادھر آ گیا۔

"امجد صاحب اندر ہیں۔" آفس میں ایک دم داخل ہونے کے بجائے اس نے سیکرٹری سے پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا۔ وہ ایکسکیوز کہتا اندر داخل ہو گیا۔ امجد بھائی کے پاس محبوب رحمانی بیٹھا ہوا تھا۔ شاید کوئی بات ہو رہی تھی۔ وہ امجد بھیا کو سلام کرتا آہستگی سے کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ خاموشی سے امجد اور محبوب رحمانی کی باتیں سنتا رہا۔ دونوں ہی غصے میں تھے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو برے نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔

"میرا خیال ہے محبوب رحمانی صاحب آپ کو جو بھی منہ زبانیں کرنی ہیں وہ کورٹ میں جا کر دیں۔ اب وہ پہلے والی صورتحال نہیں رہی کہ آپ کے اثر و رسوخ کے آگے ہم چپ ہو جائیں گے۔ جس کو یہ آفس آپ کو آنے کا ہے اس طرح کا ایک اور نوٹس کل خود چل کر آپ کے پاس آئے گا۔ برائے مہربانی اب آپ جا سکتے ہیں جو کچھ کہنا ہے اپنے وکیل کے ذریعے عدالت میں کہیے گا۔ پلیز۔" وہ کافی دیر سے سنتا رہا تھا۔ جب اس نے وینزے کا نام لیا تھا تو وہ مزید برداشت نہیں کر سکا تھا۔ یکدم اسے ٹوک گیا۔ وہ اسے دیکھنے لگا۔

"تم کون ہوتے ہو ہمارے معاملے میں بولنے والے؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے واسق جہانگیر احمد کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ نے پہچان لیا ہے۔ وینزے میری بیوی ہیں ان کے متعلق کچھ بھی کہنے یا غلط سوچ بھی ذہن میں لانے کی کوشش کی تو بھی آپ کے لیے خطرناک ثابت ہو گی۔ آپ کے پاس میری بیوی کے متعلق انکل جواد حسن کی جو بھی وصیت ہے وہ کورٹ میں پیش کیجیے گا۔ اس کے غلط ہونے کو ہم ثابت کریں گے اور اب آپ دیکھ کیا رہے ہیں یہاں سے چلے جائیں۔ ویسا تو آپ کو یہاں آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر اتنی جرأت کر لی ہے تو حد میں رہیے ورنہ میری ایک کال کرنے کی دیر ہے اور آپ کے وارنٹ جاری ہو جائیں گے۔" بہت ہی ٹھوس ٹھہرے لہجے میں خاص تحکم تھا۔ وہ محبوب رحمانی تو کچھ بول ہی نہ سکا۔ ایک دم باہر جانے کو مڑا اور دروازے کے قریب رک کر اس نے واسق کو گھورا۔

"دیکھ لوں گا میں تجھے بھی۔ میں بھی کوئی عام آدمی نہیں ہوں۔ فی الحال ایک پانسہ تمہارے نام سہی۔ فیصلہ میرے ہی حق میں ہو گا۔ دیکھ لینا۔ یہ نفس پرست شیئرز کسی بھی قیمت پر بھی تم لوگوں کے حق میں نہیں دوں گا۔ ایسا مزا چکھاؤں گا کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔" دھمکی دیتے ہی وہ باہر نکل گیا تھا۔

واسق سر جھاڑتے امجد بھائی کو مطمئن کرنے لگا۔

"کچھ نہیں کرے گا یہ شخص۔ آپ پلیز ریلیکس ہو جائیں۔"

"ہوں۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"میں آج سب قانونی کارروائی مکمل کر آیا ہوں۔ ایس ایس پی قیوم شکیلن سے بھی مل چکا ہوں۔ انشاء اللہ وہ کل صبح تک گرفتار ہو جائے گا۔ اینڈ ڈونٹ وری۔"

''تھینک یو سو مچ واصق۔ رئیلی آئی ایم ویری گریٹ فل ٹو یو۔'' نہایت تشکر بھری آواز میں انہوں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔

''او کے..... یہ میرا فرض تھا۔ یقیناً آپ بھی قبول کریں گے۔''

''بیٹھو۔'' ان کے برجستہ جملے پر وہ مسکرا دیے پھر کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں امجد بھائی، میں صبح سے گھر سے نکلا ہوا ہوں۔ اب چلوں گا۔ کافی دیر ہو گئی ہے گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''اچھا۔''

واصق ان سے اجازت لے کر آفس سے نکل آیا۔

آہستہ روی سے گاڑی چلاتے وہ آئندہ پیش آنے والی صورتحال کی پلاننگ کرنے لگا تھا۔ راستے میں پھولوں کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی نظر بلا ارادہ پھولوں کے ہار اور گجروں پر ٹھہر گئی۔ ذہن میں چاندنی سا نکھرا دنیزے کا خوبصورت سراپا ابھر آیا۔ شادی کی رات اسے کنگن پہناتے ہوئے اس نے اس کی کلائیوں میں سجے گجرے تھے جو بھینی بھینی مہک دیتے دنیزے کے لئے ڈھیر سارے گجرے خریدنے کو خود بخود دل چاہا۔ اس نے وہ یہ بالکل نہیں سوچنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے کس حد تک بدگمان ہے۔ بس دل کہہ رہا تھا کہ اس کے لئے ڈھیر سارے پھول گجرے خریدے۔

وہ ایک گاڑی پارک کرتے دوسری طرف کی سڑک کے سرے پر واقع دکان کے اندر چلا گیا۔ اپنی پسند کے پھول، گجرے اور موتیوں کے ہار لے کر وہ باہر نکل آیا۔ اسے سڑک پار کر کے دوسری طرف کی سڑک کی سائیڈ پر پارک کی گئی کار کی طرف جانا تھا۔ سڑک پر کافی رش تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سڑک پار کرنے لگا۔ اتنی احتیاط کے باوجود ایک گاڑی بہت اسپیڈ سے اس کی طرف بڑھتی آ رہی تھی۔ اس نے بھاگ کر خود کو گاڑی کی پہنچ سے دور ہونے کی کوشش کی تھی مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ گاڑی اسے بری طرح اچھالتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ شاپنگ بیگ سے پھولوں کا گلدستہ، گجرے اور موتیوں کے ہار نکل کر ادھر ادھر سڑک پر بکھر گئے تھے۔

* * *

''دنیزے! کیسی ہے اب؟'' امجد بھائی فون سنتے ہی پہنچ گئے تھے۔ ساتھ میں صبیحہ بھابی بھی تھیں۔ دونوں ہی آدھ گھنٹہ پہلے ہونے والے فون پر بھاگے چلے آتے تھے۔

''ڈاکٹر چیک کر کے گیا ہے۔ کہتا ہے، کوئی شاک پہنچا ہے جس کی وجہ سے یہ بے ہوش ہو گئی ہیں۔ انجکشن لگا گیا ہے شاید گھنٹے کے اندر ہوش میں آ جائے۔'' شہروز نے بتایا۔ بے ہوش بستر پر لیٹی دنیزے کو دیکھتے سب ہی پریشان تھے۔

''واصق کو کئی دفعہ فون کیا ہے مگر اس کا سیل کوئی رسپانس ہی نہیں دے رہا۔ بیل جا رہی ہے اور وہ ریسیو ہی نہیں کرتا۔'' اچھی جان نے بھی بتایا سب کے چہرے کسی ان ہونی کے خوف سے اترے ہوئے تھے۔

''انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ فکر مت کریں۔'' دنیزے کا ہاتھ تھام کر اسے ایک نظر دیکھ کر بھابی نے بھی تسلی دی۔

''افطاری سے کوئی پچاس منٹ پہلے وہ میرے پاس تھا۔ پھر جلدی گھر جانے کا کہہ کر نکل آیا تھا۔ حیرت ہو رہی ہے وہ گیا کہاں گیا ہے۔ وہ بھی بغیر انفارم کیے۔'' بھیا بھی متفکر تھے۔

ابھی وہ سب بیٹھے آنے والی گمنام کال پر ہی گفتگو کر رہے تھے کہ خرم بھاگا آیا۔

''امی! وہ واصق بھیا آ گئے ہیں۔'' آتے ہی اس نے حواس باختگی سے بتایا گویا سب کو نئی زندگی ملی تھی۔ سب سنتے ہی تیزی سے باہر بھاگے تھے۔

واصق سامنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ امی، دادی کی تو اسے دیکھتے ہی چیخیں نکل گئیں۔

''واصق۔'' امی تڑپ کر آگے بڑھیں۔ ایکدم اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھر لیا۔ ''یہ..... یہ کیا ہوا واصق؟'' اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ گلے میں بھی رسی لٹک رہی تھی جس میں واصق کا بازو تھا۔ ہاتھ بھی زخمی تھا۔ شرٹ بری طرح خون سے رنگی اور پھٹی ہوئی تھی۔ چہرے، ہاتھوں گردن پر جا بجا خون جما ہوا تھا۔

''بس ایک ہلکا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ شکر کریں، وہ تو میری نظر پڑ گئی تھی کار پر۔ پاؤں فوراً آگے بڑھا لیا۔ ورنہ کار نے تو اچھا خاصا اچھال کر پھینکا تھا۔ شاید زندگی تھی جو دوسری طرف سڑک پر کنکری بجریوں کی ریڑھی پر جا گرا تھا اور بچت ہو گئی۔ ورنہ.....''

بات ادھوری چھوڑ کر وہ ہنس پڑا تھا۔ دادی اماں نے بے اختیار اسے ساتھ چمٹا لیا۔ کتنے حوصلے کا وہ مظاہرہ کر رہا تھا۔

''میرا تو دل ہول رہا تھا۔ دو گھنٹے پہلے ایک فون آیا تھا۔ دنیزے نے ہی ریسیو کیا تھا۔ پتا نہیں کس کا تھا؟ کیا کہا تھا؟ دنیزے تو ابھی تک بے ہوش پڑی ہے۔'' امی نے بتایا۔

''کیا..... ٹھیک تو ہے وہ؟'' بے اختیار اچاور بجھاتے انداز سے پوچھا۔

''ہاں..... تھوڑی دیر تک ہوش میں آ جائے گی۔'' اس نے سکون بھرا سانس لیا۔

امی گیلے تولیے سے اس کے چہرے گردن اور بازوؤں پر سے خون کے دھبے صاف کرنے لگی تھیں۔ اسے پھولوں کا یاد آ گیا۔ پہلی دفعہ خود سے اس کا دل کوئی چیز لانے کو چاہا تھا مگر..... واصق کو بہت افسوس ہونے لگا مگر وہ فون کس نے کیا تھا۔ وہ الجھنے لگا۔ کچھ وقت اسی طرح سب کے درمیان بیٹھے گزر گیا۔

''مجھے اپنے کمرے میں جانا ہے بابا۔'' اسی طرح بیٹھے رہنے کے لئے اپنی دکھتی ٹانگ میں درد کی مزید ٹیسیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ شہروز کو اشارہ کر کے کہا تو وہ اسے سہارا دیتے اس کے کمرے کے باہر چھوڑ گیا۔ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے اس کی ٹانگ پر بھی چوٹ لگی تھی۔ اور بھی نجانے کہاں کہاں اندرونی چوٹیں آئی تھیں۔ لڑکھڑاتی ٹانگ سمیت وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ دنیزے کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ پیروں کو جوتوں سے آزاد کر کے تھوڑا سا اوپر کی طرف کھسکتے اس نے تکیے سے ٹیک لگا لی۔

کار تو اسے اچھال کر اس تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی کہ وہ دوسری طرف ریڑھی پر گرتے اچھل کر سڑک پر گر گیا تھا۔ سر اور ٹانگ کی چوٹ گہری لگی تھی۔ بازو بھی خاصا زخمی ہوا تھا۔ سڑک پر گرنے کے بعد چند لمحوں تک تو اسے اپنا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ پانچ دس منٹ بعد حواس بحال ہوئے تو لوگوں کے ہجوم کو چیرتا اپنی گاڑی لئے پہلے ہاسپٹل پہنچا تھا۔ وہاں زخموں کی ڈریسنگ کروانے میں کافی وقت لگ گیا تھا۔ بار بار گھر سے کال آ رہی تھی۔ مگر وہ جان بوجھ کر اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ اصل میں وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہاں آ کر وہ دنیزے کی طرف سے خود پریشان ہو گیا تھا۔

''لو یہ دودھ پی لو اور یہ شرٹ بھی لاؤ اتار دو۔'' امی دودھ کا گلاس لیے اندر چلی آئیں۔ پھر اس کی پھٹی خون آلود شرٹ کے بٹن کھولنے لگیں۔ الماری سے ایک سادہ سوٹ نکال کر صوفے پر رکھا۔

''دیکھو یہ دنیزے ابھی تک حواس میں نہیں آئی۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ کسی شاک سے بے ہوش ہوئی ہے روزے کی حالت میں تھی، جب بے ہوش ہوئی تھی۔ دس منٹ بعد ہی روزہ افطار ہو گیا تھا۔ اور یہ اسی طرح پڑی ہوئی ہے۔'' دوسری طرف آ کر اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے امی نے کہا۔

''تم دودھ پی کر کپڑے بدل لینا پھر میں کھانا بھی لاتی ہوں۔'' پریشانی سے کہتے وہ باہر نکل گئیں اس نے بہت آہستگی سے دنیزے کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"وینزے....." چند منٹوں بعد اس کی پلکوں میں ہلکی سی لرزش ہوئی تو اس نے بے اختیار پکارا۔

"وینزے! پلیز آنکھیں کھولو، دیکھیں یہ میں ہوں..... واسق....." اس پر جھک کر اسے پکارتے اس نے اس کا بازو ہلایا۔ وہ پوری آنکھیں کھول کر اسے یک ٹک دیکھے گئی۔

"واسق....." اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی، پھر آنکھوں سے قطرہ قطرہ دل پگھلنے لگا۔ واسق اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ باقی کچھ اور اسے نظر نہیں آیا۔ یونہی لیٹے لیٹے اس نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر بندھی پٹی پر پھیرا۔

"کیا ہوا ہے؟ کیسا فون تھا؟" اسے روانی سے آنسو بہاتے ہونٹ کچلتے دیکھ کر اس نے دوبارہ پوچھا تو وہ با آواز پھوٹ پھوٹ کر مزید رونے لگی۔

"پلیز وینزے..... کیا بات ہے؟" واسق نے اس کا بازو ہلایا تو وہ اٹھ بیٹھی۔

"یہ..... یہ..... کیسے ہوا؟" اس کے سر کی طرف دیکھتے وینزے نے پوچھا تھا۔ آنکھیں بدستور بہہ رہی تھیں۔

"یہ..... بس یونہی....." اس نے بے پروائی سے کہا۔ "جھوٹ بولتے ہیں آپ۔" اب اسے سب یاد آ گیا تھا۔ وہ کال اور اس پر دی جانے والی اندوہناک خبر اور اب واسق کی موجودہ حالت۔ وہ سب شاک تھا تو اس نے سنا تھا یا یہ سب جھوٹ تھا جو وہ کہہ رہی تھی۔ وہ اندازہ نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے ولیمے کے بعد رات کو نیند میں دیکھا جانے والا خواب بھی یاد آ گیا۔ اسی لئے چیخ کر کہا۔ "وہ فون پر کوئی کہہ رہا تھا کہ آپ کا کار ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ آپ کی ڈیتھ ہو گئی۔" ٹھہر ٹھہر کر بتاتے وہ واسق کے سینے پر سر ٹکاتے رو پڑی تھی۔ اس کے سینے پر سر تھا، پتا کیا خبر تھی۔ بس یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے اس کے جسم سے جان کھینچ لینے کی کوشش کی ہو۔ بری طرح رو رہی تھی کہ واسق پہلے تو ڈر گیا پھر اس کے گرد اپنا بازو پھیلا دیا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ جس نے یہ خبر دی ہے وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بلیوی..... دیکھیں میں ٹھیک ہوں۔ بس ہلکا سا کار ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور تو کچھ نہیں۔" گہرے ہلوسوٹ میں وہ بغیر دوپٹے کے تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے۔ ساری پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ واسق نے آہستگی سے اس کے بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ آج تو وہ اپنی بھی کیفیت نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ شاید موت کو بہت قریب سے دیکھنے کا اثر تھا۔

"فون پر کس نے اطلاع دی تھی؟" یونہی روتے اس نے پوچھا تو اس نے ایک طویل سانس لی۔ "پتا نہیں۔ ہو گا کوئی مہربان ہی۔ آپ پریشان مت ہوں۔ پتا کروا لوں گا میں۔"

امی ٹرے میں کھانا سجائے داخل ہوئیں تو اس نے بہت آہستگی سے وینزے کو خود سے جدا کیا۔

"امی آ گئی ہیں انہیں کچھ بتانے یا پریشان کرنے کی ضرورت نہیں، خاص طور پر کال کے بارے میں۔" آہستگی سے اس کے کان میں سرگوشی کے سے انداز میں اس نے باور کرایا۔

"شکر ہے وینزے کو ہوش آیا....." ٹرے بستر پر رکھ کر انہوں نے وینزے کے قریب جگہ پکڑی۔ "وہ فون کیا تھا جو بے ہوش کیوں ہوئیں؟" بڑی فکرمندی سے اس کا ہاتھ سہلاتے انہوں نے پوچھا تو وہ واسق کو دیکھنے لگی جس نے اسے کچھ بھی بتانے سے منع کر دیا تھا۔

"ایکسیڈنٹ کے وقت میں وینزے سے ہی بات کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے میرے بے اختیار بلند ہونے والی چیخ انہوں نے سن لی ہو گی۔ کیوں وینزے....." بات بناتے اس نے ٹرے اپنی طرف گھسیٹی۔ وہ ناسمجھی میں سر ہلا گئی اور کیا کر سکتی تھی بھلا جبکہ ذہن اب کال کرنے والے کی طرف الجھا ہوا تھا۔

"وینزے! چلو تم بھی کھانا کھانا شروع کرو۔ کچھ نہیں کھایا تم نے اسی لئے بے ہوش ہو گئی تھی۔" امی نے واسق کی سالن والی پلیٹ اس کے آگے رکھی اور ساتھ میں دوسری چیزیں بھی۔ "باہر تمہارے بھیا بھابی آئے ہوئے ہیں۔ تمہاری بے ہوشی کا سن کر آئے تھے۔ کھانا کھا لو پھر تم دونوں ان سے مل لینا۔" اس کی پشت پر بکھرے سلکی بال سمیٹ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس نے خاموشی سے سر ہلایا تو وہ باہر نکل گئیں۔

"پلیز کھانا کھائیں۔" واسق نے اس کی طرف روٹی بڑھاتے اسے متوجہ کیا تو وہ چپ کر کے عمل کرنے لگی۔ شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ پہلی دفعہ بطور خاص ایک ہی جگہ پر بیٹھی ایک پلیٹ میں کچھ کھا رہی تھی۔ واسق کے روئیے پر اور اس کو زندہ سلامت دیکھ کر اس کے اندر ایک گہری طمانیت کا احساس جاگا تھا۔

* * *

واسق کی تمام تر کوششیں رنگ لے آئی تھیں اس نے محبوب رحمانی کی کرپشن کے دھوکہ دہی اور غبن کے متعلق اکٹھی کی جانے والی تمام معلومات پولیس کے حوالے کر دی تھیں۔ وہ گرفتار ہوا تو سب نے ہی سکھ کا سانس لیا۔ خاص طور وینزے نے۔ جس کی جان صرف اسی وہم میں اٹکی رہتی تھی کہ ابھی کچھ نہ ہو جائے۔ واسق جب سے ایکسیڈنٹ کے بعد تو وہ ہر وقت اچھی خاصی ڈری سہمی رہنے لگی تھی۔ یہ خوشخبری ملی تو بے حد پرسکون ہو گئی۔

رمضان ویسے ہی چل رہا تھا۔ دوسرا عشرہ ختم ہونے میں ابھی تین چار روزے باقی تھے۔ اتنے بڑے گھر میں اتنے لوگوں کی موجودگی میں رمضان کے روزے رکھنا اسے بہت زیادہ دل پرور عمل لگتا تھا۔ سحری اور افطاری کے اوقات میں خوب ہلچل مچی ہوتی تھی۔

وہ نماز تراویح ادا کر کے باہر دادی اماں کے تخت پر آ بیٹھی۔ روزانہ وہ نماز کے فوراً بعد سو جاتی تھی مگر آج نیند نہیں آ رہی تھی۔ واسق آج رات ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ عشاء کی اذان کے بعد نکل گیا تھا اور اب رات کے گیارہ بج رہے تھے اور اس کی واپسی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ باقی سب اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے تھے۔ ان سب کو صبح جلدی اٹھنا تھا۔ وہ کمرے میں جانے کے بجائے تخت پر ہی لیٹ گئی۔

ادھر ادھر کی باتوں کو سوچتے اس کے ذہن میں پھر روشانے کا خیال در آیا۔ ساتھ ہی واسق کا تصور بھی جاگا۔ ایکدم اس کا دل اچاٹ ہوا تھا۔ ایک عجیب احساس سے بھر آیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اب وہ پہلے کی طرح خود کو "آئی ڈونٹ کیئر" کہہ کر کنونس نہیں کر سکتی تھی۔ اب تو معاملہ ہی اور تھا۔ پہلے تو اس نے بھی واسق جہانگیر کو قابل توجہ ہی نہیں سمجھا تھا اسی لئے اس کا دوسرا تعلق تکلیف نہیں دیتا تھا مگر جب سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اسے اپنے اندر کے موسموں کی بھی خبر ہو گئی تھی۔ ساتھ یہ احساس بھی کہ وہ اسے کبھی ناپسند نہیں رہا تھا۔ دل کو تو شروع سے ہی اچھا لگتا تھا بس اگر درمیان میں یہ روشانے نام کا کانٹا نہ ہوتا تو وہ مطمئن ہو کر ایک پرسکون ازدواجی زندگی کا لطف اٹھا رہی ہوتی۔ اب تو محبوب رحمانی بھی گرفتار ہو چکا تھا کسی قسم کی کوئی فکرمندی نہیں تھی۔ جب سے اسے واسق کی اپنے اور بھیا کے لئے کی جانے والی تمام کوششوں کا علم ہوا تھا تو دل میں موجود ہلکی سی ناگواری و ناپسندیدگی کی لہر بھی اتر چکی تھی۔ وہ شاید اپنی اس بدلتی کیفیت کا ذکر واسق کے سامنے بھی کر دیتی اگر درمیان میں روشانے کی گرہ نہ ہوتی۔ ایک دو دن سے تو یہ احساس اور زیادہ ستانے لگا تھا۔ جب بھی کوئی ایسا خیال آتا آنکھیں بھر آتی تھیں۔ مزید ستم یہ تھا کہ واسق نے جب سے محبوب رحمانی گرفتار ہوا تھا اس سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ گفتگو بھی بس برائے نام ہی ہوتی تھی۔ وہ یونہی سوچتے سوچتے سو گئی۔

باہر ہلکی سی آہٹ ہوئی تو وہ خاموشی سے ڈپلی کیٹ چابی سے داخلی دروازے کا لاک کھول کر وہ اندر داخل ہوا تھا۔ جب سے محبوب

رحمانی والا کیس اس نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا یونہی رات گئے لوٹنا پڑتا تھا۔ چابی جیب میں ڈالتے وہ بے دھیانی میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا مگر تخت پر وشیزے کو سوتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ یہ خلاف توقع بات تھی ورنہ روز ہی جب وہ گھر لوٹتا تھا تو وہ اپنے کمرے میں سو چکی ہوتی تھی۔ اندر بڑھنے کے بجائے وہ تخت کے قریب چلا آیا۔

اس کے کھلے سیاہ لمبے گیسو تخت پر بکھرے اس کے وجود کو بھی ڈھانپے ہوئے تھے۔ دوپٹے کا ایک پلو بازو سے لپٹا ہوا تھا تو دوسرا زمین پر گرا ہوا تھا اور اتنی بے خبر سوئی ہوئی تھی کہ گرد و پیش کی کوئی خبر نہ تھی۔ رات کے اس پہر جب سب لوگ سو چکے تھے اس وقت گھر کے مردوں میں کوئی باہر نکل آتا اسے یوں اس طرح بے خبری کی نیند لیتے دیکھ لیتا تو کتنا عجیب لگتا۔ واصق جہانگیر کو اس خیال سے ہی کوفت ہوئی۔

اس نے تیزی سے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ارادہ اسے اٹھانے کا تھا مگر جب نظر اس کی دراز پلکوں میں اٹکے آبی موتیوں پر پڑی تو ہاتھ خود بخود کندھے کے بجائے چہرے کی طرف بڑھا۔ بہت آہستگی سے اس کے قریب بیٹھا تھا۔ بہت نرمی سے پلکوں میں اٹکے شفاف چمکتے آبدار موتی چن لیے۔ بے اختیار اسے بغور دیکھتا رہا۔ بے خبری کی نیند لیتے وہ کچھ اور سے لگ رہی تھی۔ حسین اتنی کہ نظر اس کے شفاف چہرے پر سے پھسلی جا رہی تھی یا شاید وہ بہت دنوں بعد اسے یوں بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ سوچتے سوچتے سوئی تھی اسی لیے چہرے پر کچھ کرب ناک تنا ؤ بھی رقم تھی وہ اندازہ نہ کر سکا۔

رات کے اس پہر موسم خنک ہو گیا تھا۔ نومبر کا مہینہ چل رہا تھا۔ سردی بہت زیادہ تو نہیں مگر اچھی خاصی تھی کہ اب بغیر لحاف اور ہیٹر کے سونا مشکل تھا جبکہ وشیزے نے صرف اتنی کی گرم کپڑے اور شال کے تھی بلکہ اس نے جو سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا وہ تو باریک ریشمی تھا کہ اس سرد موسم کی مناسبت سے موزوں نہیں تھا۔

وہ پتھر نہیں تھا کہ اسے اس حالت میں دیکھ کر کچھ محسوس نہ کرتا۔ یہ پری تو اس کے دل میں دھڑکتی تھی رگ رگ میں اتری ہوئی تھی مگر بات ساری پسند، اعتبار اور یقین کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس نے اپنے لیے جو بد اعتمادی، ناپسندیدگی و بے یقینی کی گہری چھاپ دیکھی تھی وہ اسے ہمیشہ اپنی ایک حد میں رہنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس بات سے قطع نظر کہ میاں بیوی کا جو ریلیشن شپ دونوں کے درمیان ہے وہ کیا تقاضا کرتا ہے۔ اس نے اس سے اول روز اس جو باتیں کہی تھیں ان پر ابھی بھی قائم تھا۔ جسم واقعی کبھی بھی اس کی ضرورت نہیں رہا تھا پھر تو یہ وشیزے تھی اس کے دل کی پہلی خواہش، محبت، عزت و آبرو۔ اسے اس کی رضا سے دلی آمادگی و خود سپردگی کے جذبے سے مخمور ہو کر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اعتماد، یقین، محبت و اعتبار کے جذبوں کو بنیاد بنا کر اس کے ساتھ ساری زندگی بتانے کی خواہش رکھتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی دھمکی کے آگے فوراً ہار گیا تھا۔ اپنی محبت کا یقین اسے سونپ کر اس کی محبت و اعتماد کا یقین خود کو بخشنا چاہتا تھا یوں کہ درمیان میں کوئی خلش باقی نہ رہے۔ کسی ناپسندیدگی و ناگواری کی چبھن دل کو نہ تڑپائے۔ اب وہ یہ سب کیسے برداشت کر لیتا۔ اس کی ناپسندیدگی و بے توجہی اس کے لیے ایک کڑا امتحان بنی ہوئی تھی۔ واصق نے ایک گہرا سانس لیا۔ نیچے گرا دوپٹے کا پلو اٹھا کر اس پر ڈال دیا۔

رات بتدریج ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ ہاتھوں کو آپس میں ملتے اس نے اس کا کندھا ہلایا۔

”وشیزے۔“ ساتھ میں آواز بھی دی۔

وہ کسمسائی تھی، کروٹ بدلی تھی کہ اس کا سر تکیے سے ڈھلک کر اس کی گود میں آ گیا۔ ریشمی کالی گھٹا نے ایکدم اس کی گود میں بسیرا کیا تھا۔ خوشبو کے جھونکے واصق کو اپنے اندر اترتے محسوس ہوئے۔ نرم و نازک ڈال کے اس ساحر وجود کے قرب کی آنچ واصق کے وجود کو جھلسانے لگی تھی۔ دل کی انہونی خواہش انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی۔

”وشیزے......“ بمشکل خود کو سنبھالتے اس نے اسے دوبارہ آواز دی۔ اس پکار پر اس نے آنکھیں کھولیں تو بے دھیانی

میں اسے دیکھے گئی۔ اس کے ذہن میں صورتحال واضح نہیں ہوئی تھی۔

”آپ یہاں کیوں لیٹی ہوئی ہیں...... پلیز اندر کمرے میں چلیں۔“ واصق کی آواز اسے غفلت کی دنیا سے باہر کھینچ لائی تھی۔ لمحے میں اپنی موجودہ حالت کا احساس ہوا۔ یکدم جھٹکے سے اپنا سر اس کی گود سے نکالا اور اٹھ بیٹھی۔ واصق کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر دل کی دھڑکن یوں آؤٹ ہوئی کہ سنبھلنا بھول گئی۔ رخسار دہک اٹھے تھے۔ حیا کی لالی نے گہری لپیٹ میں لے لیا تھا۔ فوراً اپنے سینے پر دوپٹہ پھیلاتے اس نے واصق کی طرف سے رخ بھی بدلا تھا۔

”آ...... آ...... آپ...... کب آئے؟“ دل کی طرح زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

واصق جو اسے بغور دیکھ رہا تھا اس کے لیے یہ سارا منظر بالکل نیا تھا۔ گھبرایا گھبرایا سا یہ وجود سرخ چہرہ، اور حیا کی ردا میں لپٹا یہ خوبصورت انداز۔ یہ سب چند روز پہلے والی وشیزے کے اندر تو نہیں تھا۔

”بس ابھی......“ واصق نے ایک گہری سانس لی۔ ”آپ اتنی دیر باہر مت رہا کیجیے۔“ وہ نیچے جھک کر جوتا پہن رہی تھی۔ سفید کبوتر جیسے پاؤں کالی سینڈل میں خوب جچتے تھے۔ جھکنے سے اس کے لمبے گھنے ریشمی بال آگے آ گئے تھے۔ چہرہ چھپ گیا تھا۔ جیسے اچانک چاند کالے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں ہو جائے۔ انداز لوٹنے والا تھا۔ وار بھی دل پر پڑتا۔ ایک ایک نقش جذب کرتا، ایک ایک ادا قوت کرتا واصق تو پہلے ہی دل ہارا ہوا تھا۔ اس کی اس ظاہری ہویوں والی ہدایت بھی بہت دھیان سے سنی تھی۔ وہ ایک گہرا سانس خارج کرتے اٹھ کھڑا ہوا۔ وشیزے نے بھی مزید کچھ نہیں پوچھا تھا پھر دونوں خاموشی سے آگے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئے۔

دھیرے دھیرے رمضان کا عشرہ بھی گزر گیا۔ وہ تقریباً اب ہر دوسرے دن بھابی بھیا سے ملنے گھر چلی جاتی تھی۔ ادھر سے وہ دونوں اور تینوں بچے بھی آ جاتے تھے۔ محبوب رحمانی والا معاملہ اچھا خاصا حل ہو گیا تھا۔ کیس عدالت میں چل رہا تھا۔ بھیا اور واصق پوری طرح کیس اپنے حق میں ہو جانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے جس کے ۸۰ فیصد چانسز بھی تھے۔ واصق کے اکٹھے کیے گئے ثبوت و شواہد اس قدر ٹھوس قابل قبول اور جامد تھے کہ وہ کسی بھی صورت نہیں بچ سکتا تھا۔

آخری عشرے کا چوبیسواں روزہ بھی گزر گیا۔ واصق کو کچھ بخار تھا۔ اس کے باوجود اس نے سارا دن روزے کی حالت میں گزارا۔ دو دن پہلے ہونے والی تیز بارش کا اثر تھا یا پھر آدھی آدھی رات تک باہر رہنے کی وجہ تھی جو اسے ہلکا سا ٹمپریچر ہو گیا تھا۔ نماز تراویح کے بعد وہ باہر رہنے کے بجائے وہ جلدی ہی گھر لوٹ آیا تھا۔ لاؤنج میں سب ہی نماز کے بعد پھلوں اور خشک میوہ جات سے ہاتھ صاف کرتے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ یہی تو رات کا وقت ہوتا تھا۔ جب سے مرد حضرات اپنے کام دھندوں سے فراغت پاتے ہی ایک جگہ اکٹھے بیٹھتے تھے۔ ایک دوسرے کو سارے دن کی روداد سنائی جاتی تھی۔ کچھ اس کی سنتے کچھ اپنی کہتے، وہ ہر قسم کی ذہنی ٹینشن و پریشانی سے آزاد ہو جاتے تھے۔ اور شاید یہی اپنائیت اس گھر کی پر امن فضا کو قائم رکھنے کا اصل راز تھی۔ جب سے اس نے یہ جاب اسٹارٹ کی تھی ہر طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ سب کے درمیان بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔

”ارے واصق، آؤ یار، شکر ہے آج تم جلدی گھر لوٹ آئے۔“ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر شہروز نے کہا تو وشیزے بھی اسے دیکھنے لگی۔ وہ دادی اماں کے پاس آ بیٹھا۔ دادی اماں کے دوسری طرف امی تھیں اور امی کے ساتھ وہ دشمن جان بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ واصق نے ایک سرسری نگاہ ڈالی اور پھر سب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”شادی کروا کر جگری یار کیسے آنکھیں پھیر لیتے ہیں واصق کو دیکھ کر پتا چل گیا ہے۔“ شہروز نے اس پر بھرپور چوٹ کی تو وہ

ہنس دیا۔

"تم کیوں چیچے ہو تم بھی کروالو۔ تمہیں بھی دیکھ لیں گے کیسے آنکھیں پھیرتے ہو۔" اس نے بھی برجستگی سے کہا تو سب کے بے اختیار قہقہے ابل پڑے تھے۔ وہ بھی مسکرا دی۔

"میں تو راضی ہوں تم دادی اماں سے سفارش کردو۔" شہروز نے کافی آہستگی سے کہا تھا کہ صرف وہی سن سکا۔

"دادی اماں! میرا خیال ہے اب اسے بھی کھونا نصیب کردیں۔ خوامخواہ ہاتھ سے نکلتا جارہا ہے۔" شہروز کی بات پر اس نے دادی اماں کو کہا تو وہ اسے گھورنے لگیں۔

"چپ کر کے سب بیٹھے رہو۔ بڑوں کے معاملات میں مت بولا کرو۔" انہوں نے یوں اس کے اور شہروز کے سب کے درمیان اس طرح کی باتیں کرنے پر ٹوکا۔ شہروز نے منہ بنالیا۔

"اب تو اس کی ترقی ہوگئی ہے دادی اماں۔ بیوی والا ہے۔" شہروز نے خاصے چڑچڑے لہجے میں کہا تو سب پھر ہنس پڑے تھے۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ان سب کو یونہی مسکراتے ہنستے چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"جاؤ ونیزے، واسق کمرے میں گیا ہے۔ شاید سارا سارا دن ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے تھک گیا ہے۔ تم دیکھو تو۔" بڑی امی نے واسق کا یوں اٹھ کر چلے جانا بہت محسوس کیا تھا۔ وہ ماں تھیں، نظروں میں ہی تاڑ لیا کہ صاحبزادے کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ اپنے قریب بیٹھی ونیزے کے کان میں آہستگی سے کہا تو وہ اٹھ گئی۔ انہوں نے مزید ہدایت کی۔

"میں نے کیتلی میں چائے بنا کر رکھ دی ہے۔ گرم کر کے لے جانا اور ساتھ میں سر درد کی کوئی ٹیبلٹ بھی۔" وہ سر ہلا کر کچن میں چلی آئی۔ گرم چائے اور ٹیبلٹ لے کر وہ جب کمرے میں پہنچی تو وہ ہیٹر آن کیے گرم لحاف میں لیٹا ہوا تھا۔ لائٹس آف تھیں اور بیڈ سائیڈ کے دونوں لیمپ روشن تھے۔

اس نے جیسے ہی لائٹ جلائی واسق کی خاصی ناگوار سی آواز ابھری۔

"پلیز لائٹ آف رہنے دیں۔ آنکھوں میں چبھ رہی ہے۔"

اس نے ایک سیکنڈ بھی ضائع کیے بغیر حکم کی تعمیل کی تھی۔ چائے لئے اس کی سائیڈ پر آ گئی۔

"یہ چائے لے لیں۔" وہ کپ بڑھائے کھڑی تھی۔ "مگر میں نے تو آپ کو کہا ہی نہیں۔" نائٹ لیمپ کی مدھم سی روشنی میں ونیزے اس کے چہرے کی حیرت یا شاید ناپسندیدگی اچھی طرح محسوس کر سکی تھی۔

"آنٹی نے بھیجی ہے۔" وہ جتائے بغیر نہ رہ سکی۔

"اوہ..... اچھا لائیے۔" وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ سے کپ لے کر وہ پینے لگا تو اس نے ہتھیلی پر رکھی ٹیبلٹ بھی آگے کی۔ اب وہ واقعی چونکا تھا۔ ونیزے سے تو اس عنایت کی تو اسے امید نہیں تھی۔

"کیا یہ بھی امی نے بھیجی ہے؟" چبھتا ہوا سوالیہ انداز تھا وہ کلس کر رہ گئی۔

"جی۔" صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ واسق نے ٹیبلٹ اٹھالی۔ وہ خاموشی سے بیڈ کی طرف آ کر بیٹھ گئی۔ اسے واسق کی اس حرکت اور بات نے دکھ پہنچایا تھا۔ وہ ہونٹوں کو کچلتی اپنے بالوں سے ہیئر پن اتار کر انگلیاں پھیرتے لیٹ گئی۔

"میری امی اب آپ کی ساس بھی لگتی ہیں۔ انہیں آنٹی مت کہا کریں۔ وہ آپ کو اپنی بیٹی کہتی ہیں تو پھر آپ بھی انہیں ماں کا درجہ دینا چاہئے۔" کیا تحکم بھرا اسٹائل تھا۔ ونیزے کی تو جان ہی جل گئی۔ واسق پر ایک نظر ڈال کر رہ گئی۔

پرسوں کی بارش کی وجہ سے سردی بڑھ گئی تھی مگر وہ ابھی تک کمبل ہی استعمال کر رہی تھی جبکہ کمرے میں صرف ایک ہی لحاف تھا جو دو دن سے واسق کے استعمال میں تھا۔ اس نے خاموشی سے کمبل اوڑھا لحاف میں سر دینے سے پہلے اس نے اپنی سائیڈ کا لیمپ

بھی آف کر دیا۔ جس کی وجہ سے کمرے میں موجود نیلگوں روشنی اور مدھم پڑ گئی تھی۔

سحری کے وقت وہ واسق اب سے پہلے اٹھ گئی تھی۔ واسق سو رہا تھا جب اس نے منہ ہاتھ دھونے کے بعد باہر کی راہ لی۔ باہر اچھی خاصی چہل پہل ہو رہی تھی۔ تقریباً سبھی اٹھ چکے تھے لیکن دسترخوان پر ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ بھی خاموشی سے اماں کے تخت پر بیٹھ گئی۔ وہ وظیفہ کر رہی تھیں وہ انہیں دیکھتی رہی۔

"واسق اٹھ گیا؟" ہال کمرے کی طرف برتن لے جاتے بڑی امی نے پوچھا تو اس نے یونہی گردن ہلا دی جس نے ہاں یا ہاں کی تصدیق نہیں ہوتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دسترخوان بھی سج گیا تھا۔ سب بیٹھ گئے تھے تو وہ بھی بیٹھ گئی۔ ابھی اس نے لقمہ ہی لیا تھا جب دادی اماں کی پکار سنی۔

"ونیزے بیٹی! واسق نہیں آیا۔ کیا اٹھا نہیں ابھی تک۔"

"پتہ نہیں..... میرا مطلب ہے جب میں باہر آئی تھی تو وہ سو رہے تھے۔"

"عجب نیند ہے اس کی۔ بے وقتی، جاؤ شاباش اسے اٹھا کر لاؤ۔ سحری کا وقت کم پڑتا جا رہا ہے اور وہ سو رہا ہے۔" وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اسی طرح سو رہا تھا۔ وہ جھجکتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ اسے اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا پھر کھینچ لیا۔ فیصلہ نہ کر پائی کہ کیسے اٹھائے۔ کبھی خود سے مخاطب کرنے کی ضرورت ہی نہیں آئی تھی ایک دو دفعہ نام لینے کی زحمت کرنا پڑی تھی تو "سنئے" کہہ کر کام چلا لیا تھا۔

"سنئے۔" اب بھی وہی کہتے اس کے قریب کھڑے ہو کر پکارا مگر سے اٹھنا۔ اب ہاتھ سے ہلائے بنا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے اس کا کندھا ہلا دیا۔ اس کے ہاں ..... ہلکی سی کھنچا۔

"سنئے پلیز..... اٹھ جائیں..... روزہ رکھ لیں۔" اسے پھر ہلاتے اس نے کافی نحیف آواز میں پکارا۔ جس انداز میں وہ پکار رہی تھی شاید ہی وہ اٹھتا پھر بھی واسق نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر بند کر لیں۔

"سنئے پلیز! باہر سب سحری کر رہے ہیں روزہ رکھ لیں۔ بہت کم وقت رہ گیا ہے۔" واسق کے آنکھیں کھول کر بند کر لینے سے وہ اچھی خاصی جھنجھلا گئی تھی۔ اب کچھ اونچی آواز میں کہا۔ آواز میں جھنجھلا گئی تھی۔ اب کچھ اونچی آواز میں کہا۔ آواز میں جھنجھلاہٹ بہت نمایاں تھی پہلے والی نرمی مفقود تھی۔

واسق پر کچھ اثر نہ دیکھ کر وہ اسے ارادے سے پلٹ کر امی کو بھیجتی ہے وہ خود ہی اپنے لاڈلے کو اٹھالیں گی۔ ابھی وہ قدم بھی نہ اٹھا پائی تھی جب بے اختیار پلٹنا پڑا۔ اس کا ہاتھ واسق کے ہاتھ میں تھا۔ آنکھیں بدستور بند تھیں۔ وہ اس جسارت پر کچھ نہ سمجھ سکی۔ البتہ پریشان ضرور ہوئی۔ واسق کا ہاتھ بہت گرم تھا۔ انگلیاں جل رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کسی آگ کے دہکتے انگارے نے اس کے ہاتھ کو چھو لیا ہو۔ یکدم اس کے ذہن میں سرسراہٹ ہوئی۔ فوراً بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔ لاشعوری طور پر اس پر جھکی۔

"واسق! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ جو ہاتھ لگانے پر جھنجھلا رہی تھی۔ انتہائی پریشانی سے اس کا نام پکارتی اس کی دہکتی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھے پوچھ رہی تھی۔ دوسرا ہاتھ اس کے سینے پر دھرا ہوا تھا۔ واسق نے پوری کی پوری آنکھیں کھول لیں۔ آنکھوں کی رنگت بہت سرخ ہو رہی تھی۔

"ہوں..... " اپنی پوری آنکھیں ونیزے کے چہرے پر جمائے اس نے ہنکارا بھرا۔ وہ بے چین ہو اٹھی۔

"آپ کی طبیعت خراب ہے؟" اس کا بازو ہلاتے اس نے دوبارہ پوچھا۔

"نہیں..... ٹھیک ہوں میں۔" اس کا ہاتھ ہٹاتے لحاف ایک طرف کر کے اس نے کہا تو وہ فکرمندی سے اسے دیکھ کر
"مگر آپ کو تو تیز بخار ہے۔" اسے اٹھ کر بستر سے نیچے ٹانگیں لٹکاتے دیکھ کر اس نے کہا۔ کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ دونوں
ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنے گھنے بالوں کو پیچھے کرتے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دنیزے بھی کھڑی ہو گئی۔

"آپ پلیز لیٹ جائیں۔ آرام کریں، آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔" اسے باتھ روم کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ کہے بغیر
رہی۔ وہ سنی ان سنی کرتا اندر گھس گیا۔ وہ وہیں ٹہلنے لگی۔

واصق تولیے سے منہ ہاتھ صاف کرتا باہر نکلا تو اسے وہیں دیکھ کر رک گیا۔

"آپ روزہ مت رکھیں اس طرح تو طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔" وہ بہت ڈرپوک اور چھوٹے چھوٹے دل کی مالک تھی۔ وہ
تو دشمن کو بھی بیمار نہیں دیکھ سکتی تھی یہ تو پھر اس کا اپنا شوہر تھا۔ کیسے برداشت کر لیتی۔

"آپ بھول رہی ہیں یہ فرض روزے ہیں، کسی صورت معاف نہیں۔" تاول صوفے پر پھینکتے واصق نے کہا تو وہ چڑ گئی۔

"مگر بیماری کی حالت میں کچھ رعایت تو ہے نا۔" وہ خواہ مخواہ اس سے الجھ پڑی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی باہر کسی سے میری طبیعت کے متعلق ذکر کرنے کی۔"
بہت ہی زیادہ کھردرے الفاظ میں کہہ کر وہ باہر نکل گیا تھا۔ پیچھے وہ کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

صبح سحری کے وقت واصق نے کوئی میڈیسن نہیں لی تھی۔ سارا دن روزے کی حالت میں ہوتے ہوئے طبیعت مزید خراب
ہو گئی تھی۔ سارا دن کمرے میں بے سدھ لیٹا رہا۔ دنیزے جو سارا دن اندر باہر آتی جاتی اسے دیکھ کر ہولتی رہی تھی۔ افطاری کے بعد
برداشت نہ ہوا تو امی سے خراب طبیعت کا ذکر کر دیا۔ وہ ان کے ساتھ ہی کمرے میں آ گئی۔

"تم نے صبح ہی ذکر کیوں نہیں کیا تھا۔" واصق کے سرہانے بیٹھ کر واصق کا سر اپنی گود میں رکھتے انہوں نے اس سے پوچھا۔
وہ اپنی جگہ چور سی بن گئی۔

"انہوں نے منع کر دیا تھا۔" واصق کی طرف دیکھتے بتایا۔

"حد ہوتی ہے واصق بے پروائی کی بھی۔" انہوں نے اب واصق کو جھڑکا۔

"امی ٹھیک ہوں میں۔ لڑکی تھوڑی ہوں میں جو آپ اس پریشان ہو رہی ہیں۔" اب بھی وہ سخت جھنجلا گیا تھا۔ انہوں نے
ڈانٹا۔

"عجیب عادت ہے تمہاری، بے پروائی والی۔ کبھی اپنا خیال نہیں کیا تم نے۔ روزہ بھی افطار کیا تھا یا یونہی بے سدھ لیٹے
ہو۔" افطار کو تو کافی وقت گزر گیا تھا۔ ان کے پوچھنے پر اس نے سر ہلا دیا۔

"کس نے؟" ان کی جرح جاری تھی۔

"آپ کی بہو نے دودھ لا دیا تھا۔" بہت جھنجلا کر اس نے کہا تھا۔ امی نے پروا نہ کی۔

"میں بلواتی ہوں کسی کو۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔"

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں تو وہ اس پر الٹ پڑا۔

"کیا ضرورت تھی امی کو پریشان کرنے کی۔"

"آپ کو اتنا ہائی ٹمپریچر ہے۔ مجھ سے نہیں دیکھی جا رہی تھی آپ کی یہ حالت۔"

واصق نے ہونٹ بھینچ لیے۔ امی شہروز کو بلوا لائی تھیں۔ ان دونوں کو زبردستی ڈاکٹر کی طرف بھیجا۔

"میں بہت اچھی طرح دیکھ بھی رہی ہوں اور محسوس بھی کر رہی ہوں۔ تمہاری دادی اماں نے بھی مجھے کتنی دفعہ ٹوکا ہے کہ تم

دونوں کی جب سے شادی ہوئی ہے تب سے تم دونوں کو چپ سی لگ گئی ہے۔ شادی شدہ جوڑوں والی کوئی بات نہیں تم میں۔ چلو واصق
تو اس شادی پر تیار ہی نہیں تھا اس کا رویہ تو سمجھ میں آتا ہے مگر تم کیوں ایسا کر رہی ہو۔ وہ سارا دن گھر سے باہر گزار دیتا ہے۔ رات گئے
لوٹتا ہے تو تم جو سارا دن اچھی بھلی ہوتی ہو۔ کبھی مل بیٹھ کر بات کرتے تم دونوں کو دیکھا نہیں۔ دیکھو، اگر کوئی مسئلہ ہے، کوئی بات ہے تم
دونوں میں تو بلا جھجک مجھے کہو۔ واصق نے اگر کچھ کہہ دیا ہے تو بھی کہو اگر اس کا قصور ہوا تو ضرور ٹوکوں گی۔ ایسی زندگی گزارنے کی
اجازت بالکل نہیں دوں گی۔ میں تو تم دونوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں میری جان!" مسکراتے ہوئے ایک ساتھ۔

رات کو سب ہی ہال کمرے میں نماز ادا کر رہی تھیں۔ نماز پڑھ کر ایک ایک کر کے سب اٹھ گئیں تو آخر میں وہ اور امی تنہا رہ
گئی تھیں۔ تبھی دعا مانگ کر انہوں نے یہ ذکر چھیڑ دیا تھا۔ ان کی اس محبت بھری پھوار پر دنیزے کا دل چاہا اپنا دل کھول کر ان کے
سامنے رکھ دے۔ سب کچھ کہہ دے۔ چھ سال بعد اس کو ان کے روپ میں ماں ملی تھی۔ بلکہ ماں سے بھی بڑھ کر محبت کرنے والی شفیق و
مہربان ہستی تھیں۔ وہ کیسے ان سے کچھ چھپا سکتی تھی۔ جبکہ اب وہ خود اس مسئلے کا حل چاہتی تھی۔ واصق کی اچانک خراب ہو جانے والی
طبیعت پر وہ الگ پریشان تھی اور بدگمانی جس کا کوئی اختتام نہیں ہو رہا تھا وہ اب مزید نہیں برداشت کر سکتی تھی۔ اب امی نے یہ قصہ خود
چھیڑا تو وہ انہیں سب بتاتی گئی۔ اپنے دل کی ساری باتیں واصق کے متعلق دل میں پیدا شدہ سارے گلے شکوے، سارے شکوک و
شبہات، واصق کی کہی گئی تمام باتیں، سب کچھ امی خاموشی سے سب سنتی رہیں۔

"یہ جو تمہارے دل میں خلش ہے کسی دوسری لڑکی کے متعلق اسے باہر نکال دو۔ واصق کی گواہی میں تمہیں دیتی ہوں۔ وہ
اس قسم کا لڑکا نہیں ہے۔ جہاں تک اس لڑکی کی بات کا تعلق ہے تو میں واصق سے پوچھوں گی۔ شاید دوستوں میں مذاق میں کوئی الٹی
سیدھی بات کہہ دی ہو۔ واللہ علم۔ میں اسے پوچھوں گی تم دل چھوٹا مت کرو۔" انہوں نے شفقت سے اس کا کندھا تھپکا۔

"دنیزے یہ رمضان کا اتنا برکت والا مہینہ ہے، رحمتوں و نوازشوں والا۔ اللہ تعالیٰ سے اپنی خوشیوں کی بقا مانگو نہ کہ دل کو
کدورتوں کا گھر بنا کے اپنی نیکیوں کو ضائع کرو۔ کل چھبیسواں روزہ ہے۔ عید آنے میں بھی صرف ماشاءاللہ چار دن باقی ہیں۔ اگر اسی طرح
ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے، کھنچے ہوئے، بے بنیاد غلط سلط خدشات میں گھرے ہوئے یہ دن بھی گزار دیے تو کیا فائدہ ہوا ایسی
عبادت کا، خلوص دل سے رکھے روزوں کا، عقیدت سے کی جانے والی تلاوت کا، جب تم دونوں میاں بیوی ہونے کے باوجود اس
بندھن کو نبھانے سے پہلو بچا رہے ہو۔ صرف اور صرف اپنی اپنی ذات میں قلعہ بند ہو کر کتنا بڑا گناہ کر رہے ہو تم دونوں۔ اپنے دل کے
اندر چھپی ہوئی رنجشوں، غلط فہمیوں کو سینچتے ہوئے شکوک و شبہات کو پروان چڑھا رہے ہو۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ تم نے اپنے دل
کی بات پہلے ہی دن مجھ سے کیوں نہ کہی۔ اگر کہہ دیا ہوتا تو آج صورت حال کچھ مختلف ہوتی۔ بہرحال تمہیں اب پریشان ہونے کی
ضرورت نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ واصق کی طرف سے بھی دل صاف کر لو وہ اب تمہارا شوہر ہے۔ تمہاری پہلی ترجیح، اس کی
ضمانت تمہیں میں دیتی ہوں۔" اس کے ہاتھ کو تھپکتے انہوں نے کہا تو وہ ان کی آغوش میں منہ چھپا کر رو دی۔

"ایم سوری امی! مجھے احساس ہے یہ جو کچھ بھی ہوا ہے، اس میں میرا بھی قصور ہے۔ مگر میں کیا کرتی، میں جن حالات سے
گزر کر آئی ہوں اور جو دریں تھے انہوں نے مجھے کم حوصلہ، کم فہم، اور خوفزدہ کر دیا تھا۔ ہر شخص مجھے محبوب رحمانی ہی لگتا تھا۔ ایسے میں
واصق کو دیکھ کر انہیں بھی ہرٹ کر گئی۔ اس میں میری کسی شعوری کوشش کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ حالات ہی ایسے تھے پھر میرے دل میں
روشانے کے متعلق بھی بے اعتباری تھی اور اس حد تک تھی کہ میں محبت و یقین اعتماد و اعتبار کے درمیان معلق ہو کر رہ گئی تھی۔ دل میں
بے اعتباری تھی بے اعتباری تھی۔" اس نے اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے اس کا چہرہ اٹھا کر اشک صاف کیے۔

"اب نہیں رونا..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جاؤ اپنے کمرے میں اور آرام کرو۔ واصق کا بھی خیال رکھنا۔ اب تک تو وہ
ڈاکٹر کے پاس سے آ گیا ہوگا۔" وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ واصق صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

آنسو بہانے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ "سوں سوں" کرتی وہ بستر میں دبکی تو واسق نے بغور دیکھا
دھیان دیے بغیر کمبل سر تک تان گئی۔

* * *

عید کی تیاریاں کرتے، افراتفری میں سب کام نبٹاتے آخری روزہ بھی آپہنچا۔ اس نے واسق سے بات کی یا نہیں
نہیں جانتی تھی نہ انہوں نے خود ذکر کیا تھا۔ واسق کا رویہ جوں کا توں برقرار تھا۔ اور خود سے کوئی پیش رفت کرتا اسے بہت
انتظار ہی کرتی رہی کہ واسق شاید اپنے اور اس کے لئے منتخب کی گئی سزا کو ختم کردے مگر انتظار انتظار ہی رہا اور سارا رمضان گزر گیا۔
وہ سارا دن خود ہی جھنجلاتی رہی۔ اس نے تو نہ ہی عید کی تیاری کی تھی، نہ کپڑے، نہ جیولری کچھ بھی نہیں لیا تھا
حیرانگی یہ تھی کہ گھر کے کسی فرد کو بھی اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ واسق سے تو اس نے یہ توقع رکھی ہی نہیں تھی۔ ستائیسویں روزے
دن ہی صبا بھابی اس کے لئے عیدی لے آئے تھے۔ آج بھی سارا دن خود سے لڑتے الجھتے وہ یہی سوچتی رہی کہ ان کے لائے
جوڑوں میں سے کوئی ایک پہن لے گی۔ چونکہ آج آخری روزہ تھا اسی لئے افطاری پر صبا بھابی اور بچے بھی ان کے ہاں انوائٹڈ
افطاری کے بعد وہ تین گھنٹے بیٹھ کر وہ نے گئے تو وہ پھر خود سے الجھنے لگی۔
چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کے اوپر ٹیرس پر آگئی۔ باہر مسجد میں سے تکبیر کی آوازیں آرہی تھیں۔ سڑک پر
گاڑیوں کا کافی رش تھا۔ ہر طرف چاند رات کی خوشیاں منائی جارہی تھیں اور ایک وہ خود تھی جو ویران دل لئے رونے کو بے تاب
اس کا دل بھر بھر آنے لگا۔
"ونیزے..... حیرت ہے کہاں ہوتی ہیں آپ، ذرا بھی گردوپیش کا خیال نہیں ہوتا۔ میں نے کتنی دفعہ آپ کو پکارا
مجال ہے جواب ملا ہو۔ وہ ابھی بھی خود میں غرق تھی، جب واسق کی جھنجلائی ہوئی آواز سنی۔ اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو اس نے
خاصی جہاز پلادی۔
"آ..... آ..... آپ" وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھی اپنی جگہ کنفیوز ہو گئی۔
"مجھے ایک کپ چائے چاہئے۔ لیکن آپ....." اس نے اسے دیکھتے بات ادھوری چھوڑ دی۔
"بنانا آتی ہے نا چائے آپ کو؟" وہ پوچھ رہا تھا بلکہ ونیزے کے اندر اسے واسق کا بار بار آپ، آپ کہنے پر غصہ
آنے لگی۔ خاموشی سے سر ہلا کر نیچے اتر کر کچن میں چلی آئی۔
کیتلی چولہے پر چڑھا کر دودھ نکالنے فریج کی طرف بڑھی۔ جب وہ دودھ کا پیکٹ نکال کر پلٹی تو واسق بھی کچن میں چلا آیا
ہوا تھا۔ پہلے تو چونکی پھر سر جھٹکتے چائے بنانے لگی۔
"ایک بات تو بتائیں۔ آپ اپنے گردوپیش سے اتنی بے خبر کیوں رہتی ہیں یہ اچھی بات تو نہیں۔" انتہائی بے تکلف
میں کہتے وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھا تو وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔
واسق کا چہرہ کیسا کھلا کھلا سا تھا۔ آنکھوں کی معنی خیز سی چمک کچھ اور افسانے سنا رہی تھی۔ اس نے پزل ہو کر رخ موڑ لیا
تھا اور چولہے کی آگ کم اور زیادہ کرنے لگی۔
"کیا بات ہے، کوئی مسئلہ ہے جو اتنے غور سے سوچا جارہا ہے۔" وہ جو اتنی پوری توجہ اور دھیان چائے پر رکھے ہوئے
تھی۔ اس کل افشانی پر چڑ گئی۔
"آپ کو کون سا وہ مسئلہ حل کر دینا ہے۔" صاف بڑبڑاہٹ تھی۔ واسق محظوظ ہوا۔ ونیزے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی
اور واسق کی نظروں کی تپش اپنی پشت پر اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر جھنجلانے لگی کہ یا تو وہ یہاں سے اٹھ کر

دور کردے۔ یہ شاید جھنجلاہٹ ہی تھی یا پھر ہاتھ چھلکا تھا۔ کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے کیتلی سے چائے
چائے یا پھر اس کی الجھن
اچھل کر اس کے دوسرے ہاتھ پر گرتے گرتے بچی۔ پھر بھی گھبراہٹ میں ہاتھ کیتلی سے چھو گیا تھا۔ بے پناہ تکلیف کا احساس جاگا۔
ہلکی سی سسکی ہونٹوں سے آزاد ہوئی۔ اس نے جلدی سے کیتلی رکھ کر اپنا بایاں ہاتھ تھاما۔ واسق جو سب دیکھ رہا تھا وہ بھی یکدم قریب آیا
تھا فوراً اس کا ہاتھ پکڑا۔
"دھیان کہاں تھا آپ کا..... ابھی جل جاتا تو۔" روئی کے گالوں جیسے نرم و نازک شفاف ہاتھ کی تھوڑی سی انگلی جل گئی
تھی۔
"بہت بے خبر رہتی ہیں آپ اگر چائے بنانا نہیں آتی تھی تو انکار کر دیا ہوتا۔"
وہ غصے ہو رہا تھا۔ وہ کچھ بے یقینی سے دیکھنے لگی۔ وہ تو اس بے قراری سے ہاتھ پکڑنے پر ہی حیران تھی۔ ان الفاظ پر چونکا
روئی مگر اگلے ہی لمحے اتنے دنوں کی بے قراری، دل کی الجھن چڑچڑا پن بن کے باہر آگئی۔
"چھوڑیں میرا ہاتھ۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہتے سختی سے کھینچا مگر گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس نے کچھ غصے سے کچھ
گھبرا کر دیکھنا چاہا مگر نظریں اگلے ہی لمحے جھک گئیں۔ کیا کچھ نہیں تھا ان آنکھوں میں۔ اسے اپنی روح فنا ہوتی محسوس ہوئی۔ دل کی
دھڑکن تو حد سے بڑھ گئی تھی۔
"کیا ہے..... چھوڑتے کیوں نہیں۔ چائے ڈالنی ہے مجھے۔" ذرا سے روہانسی ہو گئی تھی۔ واسق نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اسی
طرح بدستور ہاتھ پکڑے، گھر میں دوسرا باز و والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
"کیا کرتے ہیں..... وہ چائے۔" وہ تو پہلے ہی گھبرائی تھی۔ اب خوب ناخوش بھی ہو گئی۔
"وہ بھی آجائے گی تم چلو۔"
"او میرے اللہ۔" ونیزے کو تو اپنے ہی سے جوان کی چائے محسوس ہوئے۔ واسق کی نظریں، لہجہ، انداز یہ کیا طرز
تخاطب بھی بدلا ہوا تھا۔ "تم" دماغ اسی پر الجھ گیا اور واسق اسے اپنے کمرے میں لے گیا اور اسی طرح پکڑے بیڈ پر بٹھا رہا۔
"ایک منٹ، میں ابھی آیا۔"
وہ فوراً باہر نکل گیا تھا۔ جب لوٹا تو ہاتھ میں چھوٹی ٹرے تھی۔ جس میں چائے کے دو کپ تھے ایک کپ اسے تھمایا تو اس
نے لرزتے ہاتھوں سے تھام لیا۔ دوسرا کپ لے کر وہ بھی اس کے پاس ہی ٹک گیا۔ یوں کہ اپنا بایاں بازو اس کے کندھے پر رکھ دیا تھا
وہ اس قرب پر مزید سٹپٹائی۔
"یار ناراض ہوئی ہو۔ بیویاں کیسے مناتے ہیں، مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں کیونکہ یہ میری زندگی کا پہلا واقعہ ہے۔" چائے کا
سپ لیتے اس نے ابتدا کی۔
"میں کوئی روٹھی ہوئی نہیں ہوں۔" بڑی آہستہ آواز میں وہ منمنائی۔ چائے کا کپ تو یوں بھی ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ واسق
نے ہاتھ نہ جلا لینے کے ڈر سے کپ تھام کر ٹرے میں رکھ دیا۔ اس کی منمناہٹ بھی سن لی تھی۔
"ہاں تو پھر میں کیا کہہ رہا تھا۔" واسق نے تھوڑا سا جھک کر اس کا چہرہ دیکھا جو سرخ ہو رہا تھا۔ ونیزے نے سر اس قدر
جھکایا ہوا تھا کہ بس سجدہ کرنے کی کسر رہ گئی تھی۔ ایک بے اختیار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر سرائیت کرتی گئی پھر اس نے اپنے ہاتھ
میں اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے جو انتہائی ٹھنڈے ہو رہے تھے۔
"کوئی اور بات کرنے سے پہلے میں اپنی جاب کے متعلق اچھی طرح بتا دوں تا کہ تمہارے دل و دماغ میں موجود
پریشانی اور آئندہ کی خلش بھی مٹ جائے جو سارے قصے کی اصل وجہ تھی۔ مجھے ہرگز ہرگز علم نہیں تھا کہ تم میری جاب کے متعلق اتنی
بے خبر ہو۔ میں انٹیلی جنس میں خاص گروپ میں کام کرتا ہوں۔ میرے کام میں احتیاط، راز داری بہت ضروری ہوتی ہے۔ ہر کام بہت

خاموشی سے خفیہ پیمانوں پر کیا جاتا ہے۔" وہ تیزی سے ان باتوں پر حیران ہوئی۔ بھلا ان سب باتوں کا روشانے سے کیا تعلق ہے۔

"تم یقیناً حیران ہو رہی ہو کہ روشانے اور میری جاب کا کیا تعلق مگر جب تم میری ساری بات سنو گی تو خود بخود جان جاؤ گی۔ بس اتنا بتا دوں کہ میری جاب کے متعلق بہت کم لوگ باخبر ہیں صرف خاص دوست احباب، رشتہ دار اور گھر والے ہی جانتے ہیں۔ ورنہ عام لوگوں کو میں ہمیشہ یہی بتاتا ہوں کہ صرف پولیس میں ہوں۔ صرف اس لئے کہ ہم جو کام کرتے ہیں اس میں رازداری سب سے اہم شرط ہے۔" وہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا اس کے تو کچھ بھی پلے نہیں پڑا تھا۔ الجھن زدہ انداز میں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ پہلے والی گھبراہٹ مفقود تھی۔ واصق نے چائے کا کپ اٹھا کر اسے دوبارہ تھمایا۔

"لو اب یہ پیو۔" وہ خاموشی سے تھام کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

"پچھلے دنوں پورے پانچ ماہ میں جس پراجیکٹ پر کام کر رہا تھا وہ دہشت گردوں کی ایک تنظیم تھی جب اپنا کام نمٹا کر واپس لوٹا تو تصور میں بھی نہیں تھا کہ میری زندگی میں بھی کوئی انہونی ہو جائے گی۔ پہلے ہی مرحلے پر تم سے سامنا ہونا کسی انہونی سے کم نہ تھا۔ میں تو صرف یہ سمجھا تھا کہ کوئی انجان لڑکی ہمارے گھر میں گھس گئی ہے اور اب نجانے اس کے کیا ارادے ہیں اسی لئے میں ایسے پیش آیا تھا۔ نتیجہ برعکس نکلا اور تم بے ہوش ہو گئی۔ بعد میں تمہیں دیکھا تو الجھتا رہا کہ یہ چہرہ کہیں دیکھا بھالا ہے مگر کہاں؟ بہت سوچنے کے باوجود یاد نہ آیا۔ میں ایک سال قبل نمٹائے گئے کیس کے متعلق بالکل بھول چکا تھا۔ پھر انہی لمحوں میں جب تم امی کے بلانے پر تخت پر آ کر بیٹھی تھیں تو میں چاہنے کے باوجود اپنی نظریں اور سوچیں تمہارے وجود پر سے نہ ہٹا سکا اور لمحوں میں تمہارے سحر میں کھو گیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں مگر تمہارے مقابل تو میرا دل مجھے ہی دھوکہ دے گیا اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔" اب کے واصق کے لہجے میں خاصی بے چارگی اور محبت کی پھوار تھی۔ وہ جو مسلسل اسے دیکھ رہی تھی اس کے بے چارگی اور معنی خیز انداز میں مسکرانے پر فوراً نظریں جھکا گئی۔ واصق تھوڑا سا شریر ہوا۔

"یار اس میں بھی میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ تمہاری یہ ناگن سی زلفیں میرے سینے پر لوٹ پوٹ ہوئیں مجھے حقیقت میں ڈس ہی گئی تھیں۔" اس نے تیزی سے اس کے بالوں سے بینڈ کیچر اتار کر سارے بال بکھرا دیئے تھے۔ سارا وجود لمبے گھنے سیاہ بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ واصق نے اتنا غیر متوقع کیا تھا کہ وہ مزاحمت بھی نہ کر سکی۔

"پلیز......" وہ معنی خیز الفاظ سے زیادہ نظروں کی بے باکی پر روہانسی ہو کر اس کے ہاتھوں کو دھکیلتے پیچھے ہٹی تو واصق کا بلند قہقہہ فضا میں گونجا۔ اسے مزید منتظر ہو گیا پھر اس کے ہاتھ سے خالی کپ لے کر دوسرے کپ کے ساتھ ٹرے میں رکھا۔ اسے کندھوں سے تھام کر خود سے قریب کر لیا۔

"تمہارے بارے میں دادی اماں سے علم ہوا پھر امجد بھائی سے ملا اور ساری صورتحال کو خود اپنے طور پر ہینڈل کرنے کی اجازت لی۔ وہ فوراً رضامند ہو گئے۔ اس دوران تمہاری ناپسندیدگی و بے اعتباری مجھ پر بہت اچھی طرح واضح ہو چکی تھی مگر وہ کیا کہ میں بے خبر تھا یہ مسئلہ صرف تم سے بات کرنے سے ہی حل ہو سکتا تھا مگر تم نے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس رات جب تم نے مجھے اچھی خاصی سنا ڈالی تھیں تو میں وہاں ٹیرس پر پہلے سے ہی موجود تھا۔ تمہیں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ جب تم رونے لگی تو مجھے خود پر اختیار نہ رہا اور سب باتیں بھلائے تمہاری طرف لپکا تھا جواباً تم نے جس طرح کی عزت افزائی کی تھی اپنی بے یقینی و بے اعتباری کو جو نام دیا تھا میرا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ ویسے سچ بتاؤ کیا میں تمہیں شکل سے چور، فراڈ اور لوز کریکٹر کا شخص لگتا ہوں۔" اس کی بات پر وہ شرمندہ ہوتی سر جھکا گئی۔

"اس میں میرا کیا قصور تھا۔ آپ بھی تو میرے ساتھ ایسی مشکوک حرکتیں کر رہے تھے۔ پھر اچانک رات کو آپ کو اپنے سامنے دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ جو منہ میں آتا گیا، میں کہتی گئی، جواباً آپ نے بھی رعایت نہیں کی تھی۔ بری طرح ذلیل کر دیا۔ عام سی ذہنیت والی سطحی سوچ کی حامل عام سی لڑکی کہہ کر۔" شکوہ اس کے لبوں سے بھی پھسل گیا تھا۔ واصق ایک دم ہنس پڑا تھا۔

والی عام سی لڑکی ہوتیں تو امی کے بے پناہ اصرار اور دھمکیوں کے باوجود بھی شادی کے لئے ہامی نہ بھرتا۔ کچھ دل کی خواہش بھی تھی اور کچھ امی کی محبت کہ میں خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ کر اس رشتے پر آمادہ ہو گیا۔"

"ڈاکٹرز کے پاس سے گھر لوٹا تو وجیہہ کے بتانے پر کہ تم اور امی ہال کمرے میں ہو۔ میں یونہی ادھر آ گیا اور پھر تمہاری امی کی ساری باتیں سن لیں۔ حیرت بھی ہوئی اور ساتھ یہ انکشاف بھی کہ روشانے بی بی کون ہیں اور میں نے تمہیں پہلی بار کہاں دیکھا۔ تم دونوں پر ظاہر کیے بغیر میں واپس کمرے میں آ گیا تھا۔ ارادہ تم سے فوراً بات کرنے کا تھا اسی لئے صوفے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ بعد میں جب تم آئیں تو یہ سوچ کر بات کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا کہ کیا پتا یہ بے قراری، یہ الجھن، صرف اور صرف بیوی ہونے کے ناتے ہو۔ جبکہ شادی کی رات میں نے کہا تھا کہ اعتماد اور یقین کے ساتھ ساتھ مجھے محبت بھی چاہئے۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ روشانے کے متعلق میری ذات کی بے اعتباری و بے یقینی تمہارے دل میں موجود چھپی محبت ہے یا پھر صرف ایک بیوی کی رقیبانہ سوچ۔"

واصق کی ان باتوں پر اس کے دل نے پھر غیر معمولی دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ نظریں جھک کر رہ گئیں۔

"روشانے نامی لڑکی میری جاب کا ایک حصہ تھی، وہ اس طرح کہ وہ ہمارے ہی ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتی ہے۔ اس کا اصل نام رومینا ہے۔ ہم دونوں کو بطور خاص اس کام پر مامور کیا گیا تھا کہ مختلف کالجز اور اسکولز میں سے ہونے والی بھولی بھالی خوبصورت لڑکیوں کے اغوا کرنے والے گروہ اور اس گھناؤنے مافیا کے اصل مہروں کو بے نقاب کریں۔ تم لوگوں کے کالج میں بھی ایک ایسی ٹیچر تھی۔ روشانے وہاں طالبہ کے طور پر گئی تھی۔ میں اسے روز چھوڑنے اور لینے جاتا تھا۔ اس طرح ہم نے بہت احتیاط اور رازداری سے یہ سارا کیس حل کیا تھا۔ روشانے کے توسط سے ہی یہ سب پتا چلا تھا۔ کیونکہ اس ٹیچر نے جن جن لڑکیوں کو ہدف بنایا تھا ان میں ایک تم بھی تھیں۔ ہمارا پلان کامیاب ہوا تھا۔ وہ ٹیچر گرفتار کر لی گئی تھی ساتھ میں اس کا پورا گروپ بھی پکڑا گیا تھا۔ چونکہ یہ تعلیمی اداروں کی بہتر ساکھ کا سوال تھا والدین یہ جاننے کے بعد کہ اب ان تعلیمی اداروں میں کیسے کیسے لوگ داخل ہونا شروع ہو گئے ہیں کبھی بھی اپنے بچوں کو نہ بھیجتے اسی لئے ہمیں اسکولز اور کالجز کے نام مخفی رکھنے پڑے۔ بغیر روشانے اور اس گروپ کو مجرم کے طور پر اخبار میں پیش کرنا پڑا تھا۔ یہی وہ لڑکی تھی جس کی وجہ سے تم میرے متعلق انتہائی مشکوک رہی ہو۔ روشانے کی شادی ہو چکی ہے اب تو اس کے دو بیٹے بھی ہیں۔" وہ انکشاف پر انکشاف کر رہا تھا آخر میں انتہائی ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ شرمندہ ہوتی فوراً کہہ گئی۔

"آئی ایم سوری۔"

"اٹس اوکے یار! ہم جیسے لوگوں کو ہر کوئی مشکوک نظروں سے ہی دیکھتا ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے، اب خیال کرنا۔ جہاں محبت ہو وہاں شکوک و شبہات بھی ہوتے ہیں۔ کوشش کرنا بے یقینی و بے اعتمادی ہمارے درمیان نہ آنے پائے۔" اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے اس نے کہا تو وہ فوراً سر ہلا گئی۔ اگلے ہی لمحے اپنی بے اختیاری پر جھینپ بھی گئی۔

"تمہیں اصل بات تو بتائی ہی نہیں۔ تمہارے وجہ سے مجھے امی کی اچھی خاصی جھاڑ سننے کو ملی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے جب بھیا بھابی کے جانے کے بعد افسردہ ہو گئی تھیں تو مجھے فوراً تمہارے پیچھے دوڑایا اور یہ بھی سن لو میرے کار ایکسیڈنٹ اور گھر آنے والی گمنام کال کے پیچھے محبوب رحمانی کا ہاتھ تھا۔" واصق نے ہلکے پھلکے انداز میں بتایا۔ وہ دیکھتی رہی۔

"اور ہاں یاد آیا، چاند رات مبارک تو میں نے کہا ہی نہیں۔" اس کا جھکا چہرہ اوپر اٹھاتے اس نے کہا تو وہ بے اختیار بلش ہو گئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

"بہت جلد یاد آ گیا...... وہ بھی اگر امی نہ کہتیں۔" ساری گرہیں کھلیں تو یہ احساس بھی جاگا کہ وہ چار دن سے کس قدر الجھن میں تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے کیوں جھنجلا رہی تھی۔ دل بار بار کیوں بھر آ رہا تھا۔

واصق نے اس خفگی بھرے وجود کو فوراً کندھوں سے تھام کر اس کا رخ اپنی طرف کر لیا تھا۔

"بھولا ہی کب تھا۔ اگر ای نہ کہتیں تو تب بھی مجھے تمہارے پاس ہی آنا تھا۔ آؤ تمہیں تمہاری عید کی شاپنگ دکھاؤں۔" وہ اسے لئے بیڈ کے دوسری طرف رکھی بے تحاشا چیزوں کی طرف بڑھا جن کی طرف ابھی تک اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

"جب تمہارے دل میں موجود جذبہ رقابت اور محبت کے درمیان میں سے میں نے محبت کو اخذ کرلیا تو یہ سب سامان بھی لے لیا۔ ارادہ تمہیں صبح سرپرائز دینے کا تھا مگر تمہاری صورت ایسی جھنجلائی اور روہانسی ہو رہی تھی کہ مجھے تم پر ترس آ گیا۔" ایک ایک چیز اس کے سامنے رکھتے وہ کہہ رہا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھے گئی۔ چہرے پر بے پناہ جھلاہٹ و اشتیاق در آیا تھا۔ واصق مسکرا دیا۔

پربل رنگ کا خوبصورت کامدانی، جوڑا، مہندی، چوڑیاں، جیولری پھولوں کی لڑیاں، گجرے، پازیبیں، پرفیوم اور بھی نجانے کیا کیا تھا وہ مسحور دیکھتی رہ گئی۔

"مجھے خاص زنانہ شاپنگ کرنے کا کوئی تجربہ نہیں۔ پہلی دفعہ کی ہے اگر کوئی چیز مس ہو گئی ہے تو آئی ایم سوری۔ اگلی عید پر ہم دونوں خود جائیں گے شاپنگ کرنے۔" آخر میں آنکھ دبا کر اس نے کہا تو وہ شرم سے سرخ ہوتی پوری جان سے کانپی۔ خوا مخواہ چیزیں ادھر ادھر کرنے لگی۔ تبھی واصق نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے مقابل کھڑا کرلیا۔ جھکی پلکیں جھکی ہی رہ گئیں۔

"میری طرف دیکھو ونیزے۔" وہ سرگوشیانہ انداز میں کان میں بولا۔ اس نے لرزتی گرتی پلکیں اٹھا کر ایک لمحہ کو مقابل کو دیکھا۔ نگاہوں میں والہانہ پن اور بے خودی تھی۔ وہ تاب نظارہ لا سکی۔ بے اختیار سر جھکایا تو اس کے سینے سے ٹکرایا۔ گھبرا کر پیچھے ہٹنا چاہا تو گرفت سخت ہو گئی۔ وہ صرف کسمسا ہی سکی۔

"پلیز....." وہ اس کے قرب کی تپش سے گھبرا کر بس اتنا کہہ سکی۔

"اوں..... ہوں۔ آج پہلی دفعہ تو تم خود میرے قریب آئی ہو۔ مکمل خود سپردگی کے ساتھ۔ کیسے چھوڑ دوں۔ پہلی دفعہ کوئی اپنا حق استعمال کر رہا ہوں۔"

محبت کے نشے میں ڈوبی آنکھیں اور مخمور لہجہ تھا۔ ونیزے کو آج اپنا آپ بچ نکلنا بہت ناممکن لگا۔ مقابل تو بن پیئے ہی بہک رہا تھا۔

"آج رات روئے زمین پر میری بیوی سے زیادہ اور کوئی حسین نہیں ہوگا۔"

"بہت، بہت برے ہیں آپ۔" اس کی فولادی گرفت سے جب نکلنے میں ناکام رہی تو ہارے ہوئے لہجے میں بے اختیار کہہ کر اس کے سینے پر سر ٹکا گئی۔ جواباً واصق کا بے اختیار برجستہ قہقہہ ونیزے کے ساتھ ساتھ پوری فضا کو بھی گلنار کر گیا تھا۔

"جیسا بھی ہوں یار! اب خوش قسمتی سے تمہارا ہی ہوں۔" بلور کی طرح نازک، نگینے کی طرح خوبصورت اور چاندنی کی طرح چمکتے دمکتے ونیزے کے معطر وجود کو اپنے آپ میں سمیٹے اس نے خوش کلامی کی تھی۔

"نئی زندگی اور نئی زندگی کی خوبصورت شروعات مبارک ہوں میری جان!" پیار بھری سرگوشی بھی ہوئی تھی۔ اس کے دل کی طرح ونیزے کا دل بھی خوش آئند تصورات میں کھو یا تھا۔ وہ بے اختیار اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائی کہ جس نے سب حالات سنوار دیے تھے۔ یوں کہ اب صرف!

محبت ہی محبت تھی!
یقین ہی یقین تھا!
اور اعتماد ہی اعتماد تھا!

پاگل سا میرا ڈھول ماہیا

اپنی پلکوں کے دریچوں میں چھپا لے مجھ کو
حسن تدبیر سے تقدیر بنا لے مجھ کو
مجھ کو محسوس کرے گا نہ کوئی تیرے سوا
عشق کی لاج ہوں سانسوں میں بسا لے مجھ کو

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو سیدھی نظر بستر پر آڑے ترچھے لیٹے بیٹے پر جا پڑی جو کشن میں سر دیے دنیا مافیہا سے بے خبر نیند کی وادیوں میں غرق تھا۔ بایاں بازو نیچے لٹک رہا تھا جب کہ کمبل تو تقریباً زمین بوس۔ صرف ایک کونا اس کے بازو کے نیچے دبا ہوا تھا۔

"تو بہ ہے یہ لڑکا اتنا بڑا ہو گیا ہے مگر ابھی تک اسے سونا نہیں آیا۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔ اپنے بیٹے سے نظر ہٹا کر اب انہوں نے ایک تفصیلی نگاہ چاروں طرف دوڑائی۔ کل دوپہر سے لے کر اب تک صرف چوبیس گھنٹوں سے بھی کم وقت میں کمرے کی حالت بدل چکی تھی۔ کتابیں ریک کے بجائے سینٹرل ٹیبل بستر اور قالین پر رونق افروز تھیں۔ گیلا استعمال شدہ تولیا صوفے پر گولا بنا ہوا تھا۔ ایک جوتا بستر کے قریب تھا اور دوسرا باتھ روم کے دروازے میں الٹا پڑا ہوا تھا۔ رات کو بدلا جانے والا لباس صوفے کے ہتھے پر دھرا ہوا تھا۔ ان کی طبیعت پر یہ پھیلاوا بہت گراں گزرا۔ بعض اوقات اکلوتا بیٹا ہونا بھی عادتیں بگاڑ دیتا ہے۔ وہ خود تو اچھی خاصی سلیقہ مند تھی۔ سگھڑ اور نفیس طبیعت کی مالک تھیں۔ صفائی پسند بھی بے انتہا تھیں بلکہ ان کی دو بڑی بیٹیاں تو ان ہی کا پرتو تھیں۔ شوہر عالم صاحب بھی انہیں جیسے تھے مگر یہ داؤد عالم نہ جانے کس پر چلا گیا تھا۔ مجال تھی جو طبیعت میں نفاست ہو۔ بے انتہا لاپروا تھا۔ اس وقت بھی دن کے بارہ بجے وہ اپنے گدھے گھوڑے کیا بلکہ لگتا تھا جیسے پورا اصطبل بیچ کر سویا ہوا ہو۔ کل ہی دس بجے کے قریب کوئٹہ سے لوٹا تھا۔ شام کو دونوں بہنیں بھی اپنے شوہروں اور بچوں سمیت اپنے بھائی کو ملنے آ گئی تھیں۔ رات گئے تک وہ لاؤنج میں محفل جمائے بیٹھے رہے تھے۔ دو بجے کے قریب سب سونے کو اٹھے تھے اور ابھی تک غافل پڑے ہوئے تھے۔ عالم صاحب کو تو آفس جانا تھا وہ صبح سویرے ہی چلے گئے تھے۔

جبین اور حنا دونوں کے شوہر بھی اپنے کاروبار والے تھے۔ وہ بھی نو بجے کے قریب چلے گئے تھے جب کہ دونوں بہنیں بچوں سمیت دو دن کے لیے اپنے اپنے سسرال آئی ہوئی تھیں رات سے وہ یہاں تھیں۔

کچھ دیر پہلے ہی وہ دونوں اپنے بچوں سمیت رخصت ہوئی تھیں۔ اس وقت وہ گھر پر تنہا تھیں۔ کتنی دیر تک داؤد کے بیدار ہونے کا انتظار کرنے کے بعد انہوں نے خود اس کے کمرے کا چکر لگایا تھا مگر کمرے کی حالت دیکھ کر وہ حقیقتاً چکرا کر رہ گئی تھیں۔

"داؤد! اب اٹھ جاؤ...... بہت سولیا۔ جلدی کرو اٹھو شاباش....." کمرے میں بکھری کتابیں سمیٹنے کے بعد وہ اس کے سر پر آکھڑی ہوئیں۔

"کیا ہے امی.... سونے دیں ناں..... اتنے دنوں بعد تو گھر کی نیند میسر آئی ہے۔" نیند کی بوجھل آواز میں کہتے اس نے کمبل سر تک لینا چاہا مگر تجمل بیگم نے ایک دم کمبل اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔

"بہت بری بات ہے داؤد! تمہاری تو سب عادتیں ہی بگڑ چکی ہیں اور تمہاری بہنوں نے مجھے ذرا تنگ نہیں پڑنے دیا تم وہاں بھی یقیناً یہی سب کرتے رہے ہو گے......" انہوں نے سخت آواز میں کہا تو وہ نیند سے بوجھل آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنے لگا۔ لبوں پر خود بخود دلفریب مسکراہٹ ابھر آئی۔ کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے بیڈ کی کراؤن سے پشت ٹکائی۔

"او پیاری امی جی! جانے دیں وہاں کا پوچھیں ہی نہیں..... وہ تو حنا ہر ہفتے چکر لگا لیتی تھی تو سہولت ہو گئی تھی ورنہ..... آپ اور ابو کے بغیر وہ فلیٹ مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ بس جی چاہتا تھا کہ اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ بڑی مشکل سے بھاگ دوڑ کر کے افسران سے مل کر اپنا یہاں ٹرانسفر کروایا ہے۔" تجمل بیگم نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر کمبل تہہ کرنے لگیں۔

"چلو وہاں سے تو جان چھوٹی۔ کب سے چارج لے رہے ہو یہاں کی برانچ کا؟" تیزی سے ہاتھ چلاتے کشن زمین اور بستر سے سمیٹتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"ایک ہفتے کے بعد۔ چھٹیاں بھی منظور کروا کے لی ہیں۔ قسم سے امی وہ کوئٹہ کی برانچ کا آفیسر بڑا اخرانٹ ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ اتوار تو ایک طرف عید بقر عید پر بھی آفس میں ہی بلا لے۔" ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنے گھنے مگر بکھرے بالوں کو سمیٹتے وہ بستر سے اترا۔

"کپڑے نکالوں.....؟" اسے باتھ روم کا رخ کرتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا تو وہ سر ہلا گیا۔ انہوں نے کپڑے نکال کر اسے تھمائے اور اس کے میلے کپڑے اٹھا کر ہاتھوں میں لیے۔

"ناشتے میں کیا لو گے؟" وہ بہت خوش خوراک تھا پھر کتنے مہینوں بعد یہاں دوبارہ شفٹ ہونے کے بعد شاید پہلی دفعہ اس کا ناشتے کا پوچھ رہی تھیں۔ وہ مسکرا دیا۔

"پراٹھا اور وہ بھی آلو والا۔ قسم سے بہت دن ہو گئے ہیں آپ کے ہاتھوں کی کوئی چیز کھائے ہوئے۔ فریج میں رکھے باسی کھانے کھا کھا کر طبیعت بھی باسی ہو گئی ہے۔" وہ ہنس دیں۔

"ٹھیک ہے تم نہا لو اتنی دیر میں تمہارے لیے پراٹھے بناتی ہوں۔" وہ کمرے سے نکل گئی تھیں جتنی دیر میں وہ نہا کر تیار ہو کر باہر آیا تھا۔ وہ گرما گرم خستہ کرارے پراٹھے لاؤنج میں لے آئی تھیں۔

"واہ! ماں ہو تو ایسی۔ جیسی امی جی! ایسی خوشبو بھلا حنا کے پکے باسی کھانوں میں کہاں تھی۔" خوشبو سونگھتے ہی اس کا معدہ ایک دم متحرک ہوا تھا۔ امی ہنس دیں۔ وہ قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے وہیں چھوٹی تپائی پر ٹرے رکھی۔

"جانتی ہوں میں کتنے ندیدے ہو تم..... خاص طور پر ماں کو بنانا تو تمہیں خوب آتا ہے۔" انہوں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے پاس کی جگہ بنائی۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا۔

"خدا کی قسم امی! میری کیا اوقات کہ میں آپ کو بناؤں۔ واہ واہ! تعریف تو اس ہستی کی ہے جس نے آپ کو بنایا ہے اتنے لذیذ کھانے بنانے والی والدہ محترمہ کو..... واہ۔" نوالہ توڑ کر منہ میں رکھتے وہ چہک رہا تھا۔ وہ مسلسل مسکراتی رہیں۔ آج کتنے دنوں بعد اسے اپنے سامنے یوں ناشتہ کرتے دیکھ کر ان کا سیروں خون بڑھا تھا۔ ابھی ایک مہینہ پہلے ہی تو دل کر گیا تھا مگر وہ آمد بھی صرف دن کی تھی۔ اگلی صبح سویرے ہی بغیر ناشتہ کیے اس نے رخت سفر باندھ لیا تھا اور اب وہ مستقل یہاں سیٹل ہو گیا تھا۔ ان کی آدھی

فکر تو ختم ہو گئی تھی۔ جب سے وہ یہاں عالم صاحب کے ساتھ آئی تھیں ہر وقت سر پر سوار رہتی تھی۔ روز فون کر کے اسے ہدایات دیتی تھیں۔ وہ تو شکر تھا کہ حنا وہاں قریب ہی رہتی تھی۔ روز وہاں کا چکر لگا لیتی تھی مگر جیسا خیال وہ خود رکھتی تھیں وہ حنا سے اپنی گھریلو ذمہ داریوں میں کہاں ممکن تھا۔ اب انہوں نے شکر ادا کیا تھا کہ اس کا ٹرانسفر یہاں ہو گیا تھا۔ ناشتے کے بعد انہوں نے اسے چائے بنا کر دی تھی۔ وہ ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا تو وہ کچن کا پھیلاوا سمیٹنے لگیں تب ہی فون کی بیل بجی۔

"داؤد! دیکھنا ذرا کس کا فون ہے؟" انہوں نے وہیں سے صدا لگائی تھی۔ داؤد آواز دھیمی کر کے فون کی طرف بڑھ آیا۔

"ہیلو۔" ریسیور کان سے لگاتے اس نے کہا۔

"السلام علیکم۔" بھاری نسوانی آواز تھی۔ اس نے ریسیور کو گھورا۔

"وعلیکم السلام۔ جی آپ کون اور کس سے بات کرنی ہے؟"

"مجھے تجمل سے بات کرنی ہے۔ پلیز انہیں بلوا دیں۔ میں نسرین بول رہی ہوں۔" دوسری طرف سے کافی مہذب انداز میں کہا گیا تھا۔

"جی اچھا ہولڈ کریں۔ میں انہیں بلاتا ہوں۔"

"امی! آپ کا فون ہے۔ کوئی نسرین صاحبہ ہیں آپ کو بلا رہی ہیں۔" اس نے وہیں ریسیور رکھ کر امی کو آواز دی تو وہ نسرین کا نام سن کر فوراً باہر نکل آئی تھیں۔

"ارے نسرین! تم..... تم نے کیسے زحمت کر لی میرے گھر فون کرنے کی۔" امی نے دوبارہ صوفے پر بیٹھ کر اپنی آنکھیں ٹی وی اسکرین پر جما دیں۔ آواز مدھم ہی رکھی کہ امی فون کر رہی تھیں۔

"نہیں۔ میں تو آنا چاہ رہی تھی مگر عالم صاحب ہی فارغ نہیں ہوتے پھر گھر کی سیٹنگ میں ہی کہیں نکلنے کی فرصت کہاں ملتی ہے۔ اب تو ماشاء اللہ داؤد بھی یہیں آ گیا ہے۔ میں کسی دن وقت نکال کر آؤں گی۔ تم سناؤ گھر میں سب تو خیریت ہے نا۔ ماریہ کا کیا حال ہے۔" بہت محبت سے وہ گفتگو فرما رہی تھیں۔ داؤد کا لاشعوری طور پر دھیان امی کی جانب تھا۔

"ارے جانے دو۔ اس عمر میں سب لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں لا پرواہ۔ تم خوامخواہ ہی پریشان ہو رہی ہو۔ بچی ہے جب شادی ہو گی سنبھل جائے گی۔ اللہ نے عورت کی فطرت میں بڑی لچک رکھی ہے۔ وہ ہر طرح کے ماحول میں ڈھلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جب ذمہ داریاں کندھوں پر آ پڑتی ہیں تو سارا بچپنا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاتا ہے۔" وہ بہت چاہنے کے باوجود کوامی کی گفتگو سننے سے باز نہیں رکھ پایا تھا۔ اسے دوسری جانب کون شخصیت ہیں؟ کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا اور کن محترمہ کا ذکر ہو رہا ہے وہ اصل نکتے تک پہنچ گیا تھا۔ ایک گہری سانس لی۔ "یا اللہ خیر۔" اندر ہی اندر اس نے دعا مانگی۔

"رہنے دو۔ ابھی اس کو تعلیم سے تو فارغ ہو جانے دو پھر تمہیں جلدی کا ہے کو ہے۔" اب کے امی نے کچھ جھنجلا کر کہا تھا۔ داؤد نے بغور انہیں دیکھا۔ ایسی ہی جھنجلاہٹ ان کے چہرے سے بھی ہویدا تھی۔

"وہ نہیں مانتی تو رہنے دو۔ دیکھو نسرین میں تم سے ذکر کر چکی ہوں۔ تم جانتی ہو میں کیا چاہتی ہوں۔ چلو فی الحال خاموش رہو۔ میں ایک دو دن میں چکر لگانے کی کوشش کرتی ہوں۔ ہاں..... ٹھیک ہے..... بالکل ٹھیک۔ جو میں نے کہا تھا ضرور سوچنا۔ ہاں بھئی داؤد کا انتظار تھا ماشاء اللہ وہ بھی کل سے یہاں مستقل آ گیا ہے۔ بات کروں گی۔ بس تم ان لوگوں کو انکار کر دو۔ بس میں نے کہہ دیا ناں۔ اچھا اللہ حافظ۔" وہ اس کے قریب صوفے پر آ ٹکیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

"کون نسرین آنٹی..... کیسا ذکر؟" وہ سن رہا تھا۔ امی نے اسے گھورا۔

"داؤد! میں سنجیدہ ہوں۔ نسرین کے گھر ایک رشتہ آیا ہوا ہے۔ قطب الدین بھائی کے دوستوں میں سے کوئی ہے۔ وہ

ماریہ کی شادی کرنا چاہتی ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا چاہتی ہوں۔" انہوں نے بلا تمہید فوراً بات کی تھی۔ وہ اندر ہی اندر کلس کر رہ گیا۔ بعض اوقات امی بھی حد کر دیتی تھیں۔ "اور میں نے آپ سے جو کہا تھا آپ وہ بھی جانتی ہیں۔ میں کسی ایسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر لوں..... وہ بھی بتا دیجیے مجھے..... تو امی جی پلیز آپ سے میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ آپ اس موضوع کو یہیں بند کر دیں۔" اس نے اب کے کچھ بیزاری سے انہیں ٹوک دیا۔

"تم نے اسے دیکھا نہیں اس بہانے کو تو رہنے ہی دو۔" جواباً انہوں نے بھی کچھ بیزاری سے کہا تو وہ زچ ہوا۔

"ہاں دیکھا تھا اس وقت جب بچہ تھا۔ آپ کے ساتھ نسرین آنٹی کے ہاں جایا کرتا تھا اور وہ موٹی تازی بھیڑ جب بھی کم نہ تھی۔ آفت کی پڑیا تھی۔ اس کی اوپری منزل میں انسان کا نہیں بلکہ شیطان کا دماغ فٹ تھا۔ پوری بی جمالو تھی وہ۔ عمر کے حساب سے اگر میں اسے بی جمالو کہوں تو زیادہ بہتر ہے..... اور آپ بھول گئیں پچھلی دفعہ اس نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر میرا کیا حشر کیا تھا۔ حنا اور جبین سے کیسے وہ مار کھاتی تھی۔ مجھے تو معاف ہی رکھیں۔ میں باز آیا ایسی لڑکی سے۔" اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ امی حیران ہوئیں اسے تو سب یاد تھا جب کہ وہ تو سب بھول بھال گئی تھیں۔

"بچپن میں تو سب ہی ایسی ہوا کرتی ہیں۔ تم نے خوامخواہ اسے موٹی تازی بھیڑ بنا دیا ہے۔ وہ تھوڑی صحت مند تھی بیٹا، تم دیکھو ذرا۔ اتنی اسمارٹ اور خوب صورت ہو گئی ہے وہ ماشاء اللہ۔ وہ کچھ شرارتی سی ہے مگر بدتمیز ہرگز نہیں۔ بچپن میں اگر وہ شرارتیں کرتی تھی تو تم بھی بدلہ لیا کرتے تھے۔ نسرین سے شکایت لگا کر اسے پٹوا کر۔" انہوں نے تو گویا پوری سائیڈ لے ڈالی تھی اس کی۔ وہ زچ ہو کر بیٹھ گیا۔

"امی جی پلیز! خدا کے لیے اس موضوع کو یہیں چھوڑ دیں۔ وہ بچپن میں کیا تھی یا اب کیا ہو گئی ہے مجھے غرض نہیں ہے۔ شادی کروں گا تو میں اپنی پسند سے..... بس یہ طے ہے۔" وہ ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی بند کر کے ریموٹ کنٹرول کو ٹیبل پر پٹخ کر لاؤنج سے نکل گیا۔ پیچھے وہ ہکا بکا رہ گئیں۔

"یا اللہ نسرین کو کیا منہ دکھاؤں گی میں۔ یہ لڑکا تو کسی بھی طرح پروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دے رہا۔" وہ نہایت فکرمندی سے سوچنے لگیں۔

* * *

وہ نہا کر نکلا تو کال بیل ہو رہی تھی۔ امی شاید کسی کام میں مصروف تھیں وہ عجلت سے باہر نکلا۔ امی کچن میں آٹا گوندھ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا تو وہ باہر نکل آیا۔ دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا تو وہ باہر نکل آیا۔ دروازہ کھولا تو وہاں دروازے پر موجود شخصیت کو دیکھ کر اس کا منہ ضرور کڑوا ہوا تھا۔

"السلام علیکم بیٹا! کیا حال ہے؟" اندر کی جانب قدم بڑھاتے انہوں نے اس کے گیلے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ عقب میں ان کے نوعمر سا لڑکا تھا جو دلچسپی سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ بائیک پر سوار تھا شاید ان کو چھوڑنے آیا تھا۔ داؤد کو متوجہ دیکھ کر فوراً بائیک سے اتر آیا تھا۔

"السلام علیکم! میں حمزہ ہوں اور آپ یقیناً داؤد بھائی ہیں۔" اس سے ہاتھ ملاتے وہ پوچھ رہا تھا۔ داؤد نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ نسرین بیگم دونوں کو کھڑا دیکھ کر اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

"آؤ اندر آؤ بلکہ بائیک بھی لے آؤ۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔ حمزہ بائیک اندر لے آیا تو وہ دونوں بھی ٹی وی لاؤنج میں چلے آئے۔ امی بھی ادھر ہی آ گئی تھیں۔ بہت اپنائیت سے نسرین ملیں۔

"میں ادھر سے گزر رہی تھی۔ سوچا کتنے دن ہو گئے ملاقات کیے ہوئے ملتی چلی جاؤں..... اور سناؤ بیٹا آپ کا کیا حال ہے؟" انہوں نے امی کو اپنے آنے کی وجہ بتاتے ہوئے اس بھی گھسیٹا۔ وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ امی کا احساس نہ ہوتا تو شاید سامنے بھی نہ آتا۔

"میں ٹھیک ہوں..... آپ سنائیے؟"

"بس بیٹا! اللہ کا شکر ہے۔" انہوں نے محبت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

خوب صورت توانا وجود کا مالک، سوبر سی شخصیت لیے شلوار سوٹ میں صوفے پر بیٹھا انہیں کافی بھلا لگا۔ آخری بار جب انہوں نے دیکھا تھا تو وہ بارہ سال کا کھلنڈرا سا دبلا پتلا لڑکا تھا پھر کبھی موقع ہی نہ ملا۔ وہ اور تجمل اکثر فون پر رابطہ رکھتی تھیں جب ان کے شوہر کا انتقال ہوا تو وہ ملنے آئی تھیں پھر اکثر جب بھی یہاں آنا ہوتا وہ اکثر ملنے آتی رہی تھیں۔ ساتھ میں عالم بھائی بھی ہوتے تھے۔ بچے تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے بہت کم آتے تھے۔ یہاں ان کا ددھیال تھا لیکن ایک دو دن میں واپس چلے جاتے تھے۔ ایسے میں نسرین تجمل بیگم کو دعوت دینے کا سوچتی رہ جاتیں مگر بچوں سمیت گھر پر بلانے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ اب برسوں بعد وہ دوبارہ یہاں سیٹل ہوئے تھے تو ان کو اپنی دعوت کا خیال آیا تھا مگر داؤد پھر بھی نہیں تھا۔ ان کی بیٹیاں آئی ہوئی تھیں۔ تجمل، عالم صاحب، جبین اور حنا اپنے بچوں سمیت دعوت پر آئی تھیں نہ اب آنا جانا لگا رہتا تھا کبھی وہ آ جاتی تھیں اور کبھی تجمل ان کے ہاں چلی جاتی تھیں مگر آج پہلی بار اتنے برسوں بعد وہ داؤد سے مل رہی تھیں۔ وہ انہیں اچھا لگا تھا۔ وہ اور حمزہ باتوں میں مصروف ہو گئے تو وہ تجمل کے ساتھ لگ گئیں۔

"میں تو پریشان ہوں ماریہ کی حرکتوں کی وجہ سے..... ابھی کل ہی کی بات ہے سب لوگ گھر سے گئے ہوئے تھے۔ بس زویا، نازیہ اور ماریہ ہی گھر پر تھیں۔ اتنے میں حمزہ نے دونوں کے ساتھ مل کر جو کیا اور اس سے پہلے جو تمہیں بتایا تھا کہ قطب صاحب کے دوست کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا۔ وہ بھی اس نے اوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے بھگا دیا۔ لوگ سلجھے ہوئے تھے۔ لڑکا بھی قابل اور صاحب روزگار تھا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ رشتہ ہو جائے مگر جب وہ لوگ دیکھنے آئے تو انہوں نے جو بھی پوچھا۔ الٹا سیدھا ہانکتی گئی۔ وہ پوچھتے الف تھے اور ماریہ بتاتی "ی" تھی۔ خدا کی قسم بہت شرمندہ ہوئی میں۔ گھر بھر کی لاڈلی ہے اور اسی لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ تم میری اپنی ہو۔ بہت قریب ہو میرے اسی لیے سب بتا رہی ہوں پھر تم نے جو خواہش کی ہے میں تو ابھی تک حیران ہوں۔ ماریہ تمہاری بہو بننے کے قابل نہیں ہے۔ وہ کسی اچھے گھر میں جائے یہ میری سب سے بڑی خواہش ہے مگر تمہارے گھر آئے ایسا تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا۔ داؤد تمہارا اکلوتا بیٹا ہے۔ یقیناً بہو بھی تم ایسی ہی چاہتی ہو جو سلجھی ہوئی سگھڑ اور سلیقہ شعار ہو اور اس گھر کو ایسی ہی لڑکی کی ضرورت ہے جب کہ ماریہ تو اس کے بالکل متضاد ہے۔ پڑھائی میں وہ بالکل صفر ہے اور گھر داری کی الف ب سے بھی بالکل ناواقف۔ میں نہیں چاہتی کہ ہماری آپس کی دوستی و محبت ختم ہو۔ تم آنا چاہ رہی تھیں مگر میں نے سوچا پہلے ہی تم سے بات کر لوں۔ مجھے بہت افسوس ہے۔"

وہ بہت دھیمی آواز میں تجمل بیگم کا ہاتھ پکڑے کہہ رہی تھیں۔ داؤد ان دونوں سے کافی دور کونے میں موجود صوفے پر براجمان تھا بہت کوشش کے باوجود بھی ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی اس کے پلے نہ پڑا۔

"میرا خیال ہے۔ یہ اتنی بڑی وجہ نہیں ہے کہ تم انکار کر دو اگر تم ابھی راضی نہیں تو میں انتظار کر لوں گی۔ ویسے بھی ماریہ کا فائنل سمسٹر ہے۔ وہ ہو جائے تو پھر بات ہو گی مگر میں انکار نہیں سنوں گی۔ ابھی اس میں بچپنا ہے جب کندھوں پر ذمہ داری پڑے گی تو خود بخود سلجھتی جائے گی۔ حنا بھی شادی سے پہلے ایسی ہی تھی مگر اب ایسی بدل گئی ہے کبھی میں سوچتی ہوں کہ وہی حنا ہے جس نے شادی سے پہلے کبھی جھاڑو کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور کبھی کچن کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اب اسی کی طرح جب تک گھر کی صفائی ستھرائی نہ کرے

اسے چین نہیں آتا۔" انہوں نے فوراً کہا تو نسرین ہنس دیں۔

"ہاں مگر حنا اور ماریہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسے دنیا کی ہر چیز سے دلچسپی ہو سکتی ہے سوائے گھر کے کام اور پڑھائی کے۔ ڈنڈا سر پر ہو تو کتاب کو ہاتھ لگائے گی ورنہ ایک لفظ بھی نہیں پڑھتا۔ سو سوجتن کر کے اسے بی۔ اے تک لائی ہوں۔ بڑی خواہش تھی کہ اسے پڑھاؤں گی لکھاؤں گی، کسی مقام تک پہنچاؤں گی مگر واہ ری قسمت۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ ایک انڈہ وہ بھی گندا، مجھ پر تو یہ ضرب المثل فٹ آتی ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو تجمل بھی ہنس دیں۔

تجمل نے ان کی کولڈ ڈرنکس اور فروٹس کے ساتھ تواضع کی تھی۔ وہ دونوں مزید ایک گھنٹہ بیٹھ کر چلے گئے تھے۔ انہیں رخصت کرتے ہوئے داؤد نے شکر ادا کیا تھا۔

"یہ خاتون..... میرا مطلب ہے آپ کی یہ ہمشیرہ صاحبہ خیریت سے ہی آئی تھیں؟" ان کے جاتے کے بعد اس نے کہا جو [illegible] رہی تھیں وہ بھی ادھر ہی آ گیا۔

"ہوں....." انہوں نے ہنکارا بھرا۔ اس نے بغور دیکھا وہ کچھ سوچ رہی تھیں۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟" فریج سے پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ تم بتاؤ تم نے اپنی شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" بوتل نیچے رکھتے انہوں نے اسے دیکھا تو اس کا منہ بن گیا۔

"پلیز امی جی! آپ باقی ماؤں کی طرح مجھے اس سلسلے میں مجبور مت کریں۔ شادی میں اپنی پسند سے کروں گا۔ مجھے نہیں پسند آپ کی یہ بہن اور نہ ہی ان کی بیٹی۔" اس نے صاف انکار کیا تھا۔ امی دیکھتی رہ گئیں۔ "اور ہاں آئندہ اس موضوع پر کوئی گفتگو نہ ہو۔ میں آپ کی خاطر یہاں آیا ہوں۔ اگر آپ نے مجھے اسی طرح زچ کیا تو میں اپنا ٹرانسفر دوبارہ کوئٹہ کرا لیتا ہوں پھر کر لیجیے گا میری شادی۔ خدایا جب سے آیا ہوں ایک ہی لفظ سن رہا ہوں۔ شادی..... شادی شادی۔" وہ غصے سے کہتا ہوا کچن سے نکل گیا۔ پیچھے وہ ہکا بکا دیکھتی رہ گئیں۔ اس طرح تو وہ کبھی بھی پیش نہیں آیا تھا مگر آج..... وہ سوچتی رہ گئیں۔

نسرین بیگم کو آج کل ماریہ کو ایک نیک، پرہیزگار اور پڑھاکو لڑکی بنانے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ ہر وقت اپنی نظریں اس پر گاڑے رکھتی تھیں۔ ماریہ جس کی گھر کے کاموں میں خاص طور پر کچن سے جان جاتی تھی۔ آج کل نسرین بیگم کے زیرِ عتاب آئی ہوئی تھی۔ اس کی غلطیاں سنگین ترین تھیں۔ رشتے سے انکار ایسا تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود نظر انداز نہیں کر پا رہی تھیں۔ انہوں نے اس کی پڑھائی کا بھی شیڈول ترتیب دے دیا تھا اور ساتھ ہی سختی سے وارننگ بھی کر دی تھی کہ وہ نازیہ، ثریا کے ساتھ دس سے ایک بجے تک لائبریری جایا کرے گی اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی پڑھائی پر توجہ دے ورنہ وہ کسی بھی ایرے غیرے کے ساتھ اس کی شادی کر کے چلتا کر دیں گی اور کبھی پلٹ کر خبر بھی نہ لیں گی۔ ماریہ واقعی ڈر گئی تھی۔ کچھ نسرین بیگم کے تیور بھی ایسے تھے کہ اس دفعہ وہ رعایت دینے کو تیار نہیں تھیں اور اس نے بظاہر خاموشی سے مان بھی لیا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ سخت جھنجلائی ہوئی تھی اور دوسری طرف انہوں نے حمزہ کی ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی کہ وہ ان تینوں کے علم میں لائے بغیر روزانہ ان کے بعد لائبریری جایا کرے گا اور سارا دھیان رکھے گا کہ وہاں جا کر وہ پڑھتی ہیں یا پھر باتیں کرتی ہیں۔ خاص طور پر ماریہ بی بی۔ اس حکمِ شاہی پر وہ اندر ہی اندر تلملایا ضرور تھا مگر چچی کے سامنے انکار کرنے کی مجال نہیں تھی۔ اسی لیے آج جب وہ تینوں لائبریری روانہ ہوئیں تو وہ بھی گھر سے نکلا۔

لائبریری کا ماحول، وہاں کی سنجیدہ پڑھاکو فضا ماریہ کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر اس کی دی گئی اس سزا پر بل کھا رہی تھی مگر بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتی۔ وہ کتابوں سے دس کوس دور بھاگنے والی لڑکی تھی مگر اب......

"یار یہ ماؤں کو اپنی نالائق بیٹیوں کو زبردستی پڑھاکو بنانے کا آخر خبط کیوں سوار ہوتا ہے؟" جیسے ہی اس کے ضبط نے

جواب دیا تھا اس نے تلملا کر بوریت سے کتاب ٹیبل پر پٹختے ہوئے انتہائی بیزاری سے منہ بنا کر کہا تو نازیہ اس کی صورت دیکھ کر گھورنے لگی۔ وہ نہایت سنجیدگی سے زبردستی کتابیں ہاتھ میں لیے پڑھنے کا موڈ بنا رہی تھی۔

"یار کتنی بور ہو تم دونوں۔ ان کتابوں کو دور کرو اور مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟ میں تو اس طرح سے مر جاؤں گی۔" مسکین صورت بنا کر اس نے ثریا کے ہاتھ سے کتاب لے کر ٹیبل پر زور سے پٹخ دی تھی جس سے لائبریری کی خاموش فضا میں واضح ارتعاش پیدا ہوا تھا۔ اردگرد بیٹھے لوگ ڈسٹرب ہو کر ان کی ٹیبل کی طرف ایک تنبیہی نگاہ ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

"ڈوب مرو تم۔ کیسی ڈھیٹ ہو تم۔ یہاں بھی چین نہیں ہے۔ اب اگر تم بولی ناں تو میں تمہاری گردن دبا دوں گی۔ یہ لائبریری ہے کوئی پارک نہیں۔" ثریا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اب تم میری دادی اماں بننے کی کوشش مت کرو۔ گھر میں ایک ہی دادی کافی ہے۔ حد ہوتی ہے یہ لائبریری نہ ہوئی گھر میں دادی جان کا کمرہ ہو گیا۔ یہ نہ کرو..... وہ نہ کرو..... چپ رہو..... ہنسو..... نہیں..... نگاہیں نیچی رکھو..... یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ گھر میں میری اماں ڈکٹیٹر کا رول ادا کرتیں، ہر وقت میرے سر پر سوار رہتی ہیں۔ اپنی نظروں سے میرا پوسٹ مارٹم کرتی رہتی ہیں۔ اور یہاں تم دونوں باڈی گارڈ..... یا اللہ میں کیا کروں؟ میری معصوم سیدھی سادی جان کہاں جائے؟"

ماریہ کا انداز دہائی دینے والا تھا جب کہ الماری کی دوسری طرف پشت کیے کتاب میں سر دیے بیٹھا حمزہ جس کی ساری توجہ ادھر ہی تھی، ماریہ کی ساری باتیں سن کر اس کا جی چاہا کہ اس سرپھری لڑکی کا گلا دبا دے۔ ایسے نہ تو گھر میں چین تھا اور نہ ہی یہاں۔ وہ تو بری طرح پھنسا تھا جو چچی کے حکم پر مجبوراً یہاں ان تینوں سے چھپ کر ان کی نگرانی کر رہا تھا۔

"ماریہ پلیز! تم اگر تھوڑا سا چپ رہ لو گی تو بہت نوازش ہو گی ہم پر..... بلکہ احسانِ عظیم۔ چچی جان نے یہ سب ہانکنے کے لیے تمہیں یہاں نہیں بھیجا تھا بلکہ پڑھنے کے لیے بھیجا تھا اور تم ہو کہ مسلسل بکواس کیے جا رہی ہو۔ خدا کے لیے ہماری جان بخشو کچھ پڑھ لو۔ آخری سمسٹر ہے اور تمہیں ذرا بھی احساس نہیں۔" نازیہ نے غصے سے جھنجلا کر کہا تو وہ کلس کر رہ گئی۔

"رہنے دو نازی! جب اسے خود ہی احساس نہیں تو ہم کیا کریں؟ بھیجے زیر سر پر ہیں اور یہ کہ......" بات ادھوری چھوڑ کر اس نے سر جھٹکا تو وہ تلملا اٹھی۔

"اچھا احساس کرنے کا شکریہ اور مائنڈ اٹ بی بی! میرے سر پر بھیجے نہیں بلکہ بال ہیں۔ وہ بھی ڈیڑھ گز لمبے۔ خاندان بھر میں دور دور تک اتنے خوب صورت بال کسی اور کے نہیں صرف میرے ہیں۔ کبھی تو مثال کا درست استعمال کر لیا کرو۔" وہ بجائے شرمندہ ہونے کے مزید ہانک رہی تھی۔ نازیہ اور ثریا کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لیں جب کہ حمزہ صرف دانت کچکچا کر رہ گیا۔

"واقعی یہ لڑکی لاعلاج ہے۔ چچی جان اس طرح اس پر اتنی محنت کرنے کے بجائے اپنا کچھ وقت اس کے لیے کوئی کان سے بہرا، عقل سے اندھا اور آنکھوں کا کانا ڈھونڈ کر اسے چلتا کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ سارے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے محترمہ کے۔" وہ انتہائی دل گرفتگی سے سوچ رہا تھا۔

"تم گھر چلو میں چچی جان کو تمہاری ساری کارستانی بتاؤں گی۔ وہی صرف تمہیں ہینڈل کر سکتی ہیں۔" ماریہ کے جواب میں نازیہ کی تلملاہٹ صاف سنائی دی۔

"ہوں..... جو مرضی کرو میری بلا سے تم تو ہو ہی شکایتی چوہیا۔ بڑی بسی شکل والی۔" وہ اسے مزید چڑا رہی تھی۔ نازیہ کا ضبط ایک دم چھلکا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی بھاری بھرکم کتاب اس کے کندھے پر دے ماری جو اس کو لگی بھی کچھ زور سے۔

"ہائے..... ہائے..... ہائے اللہ جی..... اوئی میں مر گئی..... کیا مار دیا ظالم..... کندھا توڑ دیا ہے میرا..... ہائے امی کی کتاب نہ ہوئی پتھر ہو گیا۔ اف اللہ تمہیں دیکھے۔ تمہاری پھولی غبارے کی صورت کو بھی کا سنڈیوں بھرا پھول بند جائے۔ تم اچھے

بری طرح کندھے کو سہلاتے ہوئے وہ اونچی آواز میں آہ و زاری کر رہی تھی۔ ساری لائبریری میں ایک دم بھونچال سا آ گیا تھا۔ کچھ لوگ تنقیدی اور کچھ دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ لائبریرین بھی متوجہ ہو گیا۔ اس کی دل خراش صلواتوں والی آواز سے گھبرا کر دونوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دوسری طرف حمزہ بھی تلملائے بغیر نہ رہ سکا۔

"پلیز! یہ کیا شور مچایا ہوا ہے ساری لائبریری میں آپ نے..... یہ پڑھنے کی جگہ ہے۔ اگر یوں ہی شور شرابہ کرنا ہے تو یہ تخریب کاری باہر بھی ہو سکتی ہے۔ پلیز آپ آرام سے بیٹھیں ورنہ میں آپ کے لائبریری کارڈ کینسل کر دوں گا۔" لائبریرین نے بری طرح جھڑک دیا۔ تینوں کے منہ لٹک گئے۔

"اب تم نے اگر لب کھولے یا زبان ہلائی تو میں گھر جا کر تمہارا کچا چٹھا کھول دوں گی۔ تیر بنا کر چیل کو دن کو کھلا دوں گی۔ آرام سے بیٹھی رہو بہت ہو گئی عزت....." زویا نے کہا تھا بلکہ بازو دبوچ کر کرسی پر بٹھایا تھا اور وہ اس بے عزتی پر چپ ہو گئی تھی۔

وہ اردگرد دیکھتی رہی۔ کتاب میں اس کا دل لگنے والا نہ تھا۔ زویا کتاب ایشو کروا کر اس میں سے کچھ پوائنٹ نوٹ کر رہی تھی جب کہ نازیہ انگلش کی ببلنگ کتاب سے کے ترولے سبق کا ترجمہ کر رہی تھی۔ وہ اکتا کر لوگوں کے چہرے پڑھنے لگی۔ اسے شروع سے ہی یہ کام نہایت دلچسپ لگتا تھا۔ کتابوں کی بجائے لوگوں کو پڑھنا۔ تب ہی اگلی رو میں دوسری ٹیبل پر بیٹھے خوش لباس و خوش شکل ایک نوجوان پر نظر پڑی تھی۔ وہ بڑے غور و دلچسپی سے ادھر ہی متوجہ تھا۔ ماریہ کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے اسمائل پاس کی تھی اور ہاتھ ہلا کر دور ہی سے سلام جھاڑا۔ ماریہ ایک دم سٹپٹا گئی۔ وہ سب ایک عرصے سے اس لائبریری میں آ رہی تھیں۔ اس لڑکے کو پہلے کبھی نہیں دیکھا جب کہ باقی سب جانے پہچانے چہرے تھے۔ شاید یہ کوئی نیا ممبر تھا۔ اس نے کچھ گھبرا کر ادھر دیکھا نظر ڈالی شاید وہ کسی اور کے لیے ہاتھ ہلا رہا ہو مگر نہیں اس لائبریری میں صرف وہی تین لڑکیاں تھیں۔ باقی سب ہی کتابوں میں غرق تھے۔ صرف وہی فارغ تھی۔ اب کی بار اس نے کچھ گھور کر موصوف کو دیکھا۔ "اس کی مجال کیسے ہوئی ماریہ قطب الدین کو سلام جھاڑنے کی؟" وہ اب بھی مکمل توجہ سے ادھر ہی دیکھ رہا تھا بلکہ اب کی بار تو اس نے انتہا کر دی۔ باچھیں پھیلا کر دو کلری کا نشان بنا کر اسے وش کیا تو ماریہ کا خاندانی جوشیلا خون کھول اٹھا بلکہ جوش میں آیا۔

"کمینہ۔ ذلیل۔ لڑکی جان کر اشارے کرتا ہے۔ اشارے باز، بدتمیز۔ ہمت کیسے ہوئی؟ ارے مائی کا لال ہے تو ادھر آئے۔ تمہیں پوچھوں میں۔" وہ ایک دم طیش میں آ چکی تھی۔ تلملا کر غصے سے پھنکارتے سانس پھلا کر بڑبڑا رہی تھی۔ زویا اور نازیہ دونوں نے اس کی بڑبڑاہٹ واضح طور پر سنی اور چہرے پر چھائے غصے کو دیکھا۔

"ہیں..... خیریت..... اب تمہیں یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے؟ اب کس بچھو نے کاٹ لیا ہے..... اب کون بے چارہ ہے جسے ان مہذب گالیوں سے نواز اجا رہا ہے؟ ذرا بتانا پسند فرمائیں گی؟" نازیہ نے حیران ہو کر پوچھا تو اس نے غصے سے اسے دیکھا وہ اب بھی زیر لب مسکرا رہا تھا۔ شاید وہ اس کا غصہ نوٹ کر چکا تھا۔ ایک دم کھلکھلا کر ہنسا تھا۔ ماریہ کو گویا آگ ہی لگ گئی۔

"یہ جو سامنے ٹیبل پر بیٹھا ہے۔ یہ لڑکا کب سے اشارے کر رہا ہے مجھے۔ دیکھو دیکھو ذرا اب کیسے مسکرا رہا ہے....." کر اس نے اشارے سے کہا تو وہ لڑکا فوراً کتاب پر مسکراتے ہوئے جھک گیا تھا۔ ماریہ کا غصہ مزید بڑھنے لگا۔

"اللہ خیر کرے۔ کس نے ہمت کر لی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی..... اور ایسا کیا اشارہ کر دیا موصوف نے.....؟" نازیہ نے طنزآمیز لہجے میں پوچھا تو وہ اس کا طنز محسوس کر کے کلس کر رہ گئی۔

"کیسی کزن ہو تم میری۔ ذرا پروا نہیں میری۔ غیرت نام کو نہیں۔ ایک شخص تمہاری معصوم، باحیا شریف، عزت دار کزن

کو دن دیہاڑے اشارے کر رہا ہے اور بجائے اس کے کہ محترمہ اس کا گریبان پکڑیں الٹا طنز کے تیروں سے میرا جگر چھلنی کر رہی ہو۔ بڑی بری بات ہے۔" وہ افسوس سے سر ہلا رہی تھی۔ زویا طنزاً ہنس دی۔

"اس خوش فہمی میں مر نہ جائے کوئی۔ سنا تم نے نازیہ؟ معصوم..... باحیا..... شریف اور عزت دار۔ وہ بھی انگلش وانڈین فلمیں دیکھنے والی محترمہ..... کیا شان ہے اس حیاداری کی..... ایسی باحیا عزت کی....." نازیہ نے تو حد ہی کر دی تھی۔ اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ لاپروائی سے دوپٹہ اوڑھے ایک بازو کرسی کی پشت پر رکھے دوسرا ٹیبل پر پھیلائے نہایت لاپروا انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے کالے بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ دوپٹہ آدھے سر سے ڈھلک گیا تھا۔ ایسے میں محترمہ کا عزت دار باحیا ہونے کا دعویٰ نازیہ کے حلق سے نیچے نہیں اترا تھا۔

"نازیہ تم حد سے بڑھ رہی ہو۔ دیکھنا گھر جا کر میں تائی امی سے تمہاری شکایت کروں گی۔ بالکل اپنے بھائی پر گئی ہو۔ جیسا مینڈک بھائی ویسی ہی مینڈکی بہن۔" اس طنز پر وہ کہہ رہی تھی۔ دوسری طرف الماری کی اس جانب بیٹھا حمزہ اس لقب پر تلملا اٹھا۔

"آج ماریہ بی بی تمہاری خیر نہیں۔ گھر چلو ذرا ساری کسر نکالتا ہوں۔ میری الماری سے فلم نکال کر دیکھنے پر تو کبھی معاف نہیں کروں گا۔" ایک ایک لفظ کہتے اپنے غصے کو بمشکل دبا رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ضرور ماریہ کی دہائی پر غور کرتا لیکن اس وقت تو غصے سے برا حال تھا۔

"چلو اب واپس چلتے ہیں۔ بہت ہو گئی پڑھائی..... بھوک سے میرے پیٹ میں چوہوں کا میچ شروع ہو چکا ہے۔ تم دونوں کتابیں ایشو کروا لو۔ باقی کا کام گھر جا کر کر لینا۔" اب کے اس کا انداز صلح جو تھا۔

"ہاں ماری! اب چلتے ہیں۔ تمہارے کھلنے تھے نہیں یہاں آ گئے ہو لیے۔ اب تو مجھے بھی بھوک لگنے لگی ہے۔ آج اتنا ہی کافی ہے باقی بعد میں۔" زویا نے بھی قلم بند کیا تو نازیہ نے بھی کتابیں سمیٹیں۔

"ٹھیک گاڈ تم لوگوں کو مجھ پر ترس تو آیا۔" وہ بھی مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔

"تم اب ذرا ٹھیک ہو جاؤ۔ کل بھی اگر تم نے یہی حرکتیں کی نا تو چچی جان کو تمہیں اپنے ساتھ لانے سے منع کر دوں گی پھر جو تمہاری شامت آئے گی وہ تم جانو اور چچی جان۔" نازیہ نے تنبیہ کی تھی۔ اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"ویسے نازیہ! بعض اوقات چچی جان بھی حد کر دیتی ہیں۔ اب یہ نہیں پڑھنا چاہتی تو رہنے دیں۔ ان کا بس چلے تو اس کے دماغ میں کتابیں گھول کر ڈال دیں چاہے عقل آئے نہ آئے۔" زویا نے بھی رائے دی۔ وہ اسے گھورنے لگی۔

"ساری عقل جیسے صرف تمہارے دماغ میں ہی تو ہے۔ امی کو بھی پڑھائی فوبیا ہو گیا ہے۔ ان کا بس چلے تو صبح دوپہر شام بلکہ وقت کھانے میں بھی مجھے کتابیں اور نوٹس ہی تناول فرمانے کو دیں۔ اپنا سارا علم مجھ پر ہی جھاڑنے کے درپے رہتی ہیں۔ بس نہیں دل چاہتا میرا پڑھنے کو تو زبردستی کا ہے کو ہے۔ اب تک تو گھسیٹ گھسات کر یہاں تک پہنچی ہوں۔ اس دفعہ میں نے سوچ لیا ہے کہ پکا فیل ہو جانا ہے اور تب تک ہونا ہے جب تک امی میرے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر لیتیں۔" اس نے بھی اپنے نیک و زریں خیالات کا اظہار کیا تھا۔ وہ دونوں تو سر جھٹک کر رہ گئیں مگر حمزہ تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا۔

"کاش چچی جان اپنے کانوں سے اپنی دختر نیک اختر کے خیالات ملاحظہ فرما سکیں۔" وہ تینوں وہاں سے نکل گئی تھیں۔ وہ خاموشی سے انہیں جاتا دیکھتا رہا۔ جب وہ وہاں موجود کھلے پر بیٹھیں تو وہ بھی ہاتھ جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"شکر ہے اس عذاب سے جان چھوٹی۔ کبھی کبھار تو یہ ماریہ بھی حد کر دیتی ہے۔" کتابیں لائبریرین کو تھما کر وہ لائبریری سے نکلا وہاں اپنی بائیک پر سوار ہوتے وہ عالم کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔

''ارے داور بھائی..... یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' وہ صرف ایک لمحے کو ہی سوچ سکا تھا۔ اگلے ہی پل وہ ان کی طرف بڑھ گیا۔

''السلام علیکم رازر بھائی! کیسے ہیں آپ؟ اور یہاں کیسے؟'' کل ہی تو وہ نسرین چچی کے ساتھ ان کے ہاں ملا تھا۔ اتنی جلدی وہ انہیں کیسے بھول جاتا۔ انہوں نے بھی حیران ہو کر دیکھا۔

''وعلیکم السلام۔ حیرت ہے تم اور یہاں.....'' مصافحہ کرتے وہ خوش دلی سے ہنس دیا۔

''بس کسی سزا کا نتیجہ ہے۔ آپ بتائیں آپ کیسے آئے یہاں؟''

''بس یوں ہی۔ یہ لائبریری گھر کے قریب ہے پھر جب تک چھٹیاں ختم نہیں ہوتیں سوچا ادھر ہی آجایا کروں۔ بور بھی ہو جاتی ہوں اور ...''

''ہوں۔ صحیح کہہ رہے ہیں آپ؟ کسی دن آیئے نا ہمارے ہاں۔ چچی جان تو کل سے آپ کا مسلسل ذکر کر رہی ہیں بلکہ تو باقاعدہ آپ کو گھر بلانے کا بھی پروگرام بنا رہی ہیں۔'' اس نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ داور عالم کے مسکراتے لب ایک دم بھینچ گئے۔

''اچھا دیکھیں اس وقت میں چلتا ہوں۔ ایک دوست کے ہاں بھی جانا ہے۔''

''ضرور میں بھی چلوں گا۔ گھر جا کر چچی جان کو آپ سے ملاقات کا ضرور بتاؤں گا۔ وہ بہت خوش ہوں گی۔'' وہ چپ رہے پھر وہ ان سے ہاتھ ملا کر خدا حافظ کہہ کر وہاں سے نکل آیا تھا جب کہ داور عالم نے کافی ناگواری سے اسے ایک ٹک دیکھا تھا۔

''ایک تو تمہاری والدہ محترمہ بھی نا...'' اس نے جھنجھلا کر بانیک اسٹارٹ کی۔

گھر جا کر وہ بااور ناویہ نے اس کی سب حرکتوں کی رپورٹ گھر والوں کے گوش گزار دی تھیں۔ امی دو کشاپ اٹینڈ کرنے گئی ہوئی تھیں جو چپ ہو گئی تھیں۔ اس نے شکر ادا کیا مگر رات کو جب انہوں نے اپنے کمرے میں بلا کر ساری کسر نکالی تو وہ سر جھکائے سب سنتی رہی کہ بولنے میں مزید شامت کا احتمال تھا۔ جب وہ بول کر خوب ڈانٹ کر تھک گئیں تو وہ کرسی پر گر گئی۔

''تم آج مجھے ایک بات صاف بتا دو۔ سدھرنے کے تم قائل نہیں ہو۔ پڑھنے سے تمہاری جان جاتی ہے۔ اب صرف ایک حل ہے کہ تمہاری شادی کر دوں۔ تجمل مجھے بہت دفعہ کہہ چکی ہے مگر میں نے ہر دفعہ انکار کیا صرف اور صرف تمہاری حرکتوں کی وجہ سے..... میں نہیں چاہتی تھی کہ میں اتنی خود غرض بن جاؤں مگر اب مجھے کچھ سوچنا پڑے گا..... اور یہی مجھے ایک حل نظر آتا ہے۔ کہتی ہے تجمل سسرال جا کر بڑے بڑوں کی عقل ٹھکانے آجاتی ہے۔ مگر تم.....''

''امی..... امی! میں نے کیا کر دیا ہے۔ آپ کے کہنے پر لائبریری جا تو رہی ہوں پھر مزید کیا کروں.....؟'' اتنی زور سے پڑی تھی کہ وہ ایک دم رو دی۔ نسرین بیگم کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

''بس بی بی! اب مجھ پر احسان مت کرنا۔ جتنے تمغے پڑھ پڑھ کے تم نے میرے سینے پر سجا دیے ہیں وہی کافی ہیں کیوں تمہارے تایا اور راباجی کو۔ اب تم میرے ہاتھوں سے نکلتی جا رہی ہو۔ تجمل کا لڑکا نہیں تو کہیں بھی..... کیسا بھی..... جو بھی ملا بس تمہیں چلتا کریں۔ میں نہیں کر سکتی تمہاری رکھوالی۔''

وہ جز بز ہو گئی۔ یہ تجمل آنٹی اسی لیے آئے دن آکر ڈھیروں پیار کرتی ہیں اور اب امی۔ کیسے وہ انہیں سمجھائے شادی کا مطلب ہے کہ ساری زندگی کو جہنم بنانا۔

''امی پلیز! دیکھیں آئندہ جو بھی کہیں گی کروں گی۔ بس شادی کی بات نہ کریں۔'' وہ باقاعدہ روہانسی ہو گئی۔ آگے بڑھ کر امی کے کندھوں کو تھاما۔

''شادی یا پڑھائی..... جو آسان لگتا ہے سوچ لو۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ کم از کم تمہیں ماسٹرز تو کروا ہی لوں گی لیکن بی اے میں تمہارا یہ حال ہے۔ سارے ارادے ملیامیٹ کر دیے ہیں تم نے۔ بس بی اے مکمل کرو۔ بہر حال شادی تو کرنی ہی ہے۔'' انہوں نے جیسے اسے باندھ دیا تھا۔ نہایت بے چارگی سے اس نے انہیں دیکھا۔ ''تمہارے پاس سوچنے کو وقت ہے۔ اگر پڑھائی چھوڑ دی تو گھر سنبھالنا ہو گا یہ بھی ذہن میں رکھنا۔'' وہ اسے فیصلہ سنا کر کمرے سے نکل گئیں تو وہ بے بسی سے خالی کمرے کو دیکھتی رہ گئی۔

✠ ✠ ✠

ماریہ سے بڑی نور باجی جن کی شادی پھوپو کے بیٹے زواد بھائی کے ساتھ لاہور میں ہوئی تھی۔ زواد بھائی جو کہ کسی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ ان کے کام کی نوعیت فیلڈ ورکنگ کی تھی۔ آج وہ اس شہر میں تو کل کسی اور شہر میں۔ ایسے میں نور باجی، پھوپو اور فیملی کے ساتھ لاہور رہتی تھی۔ نور باجی کی جب سے شادی ہوئی تھی۔ وہ ہر بار آکر اپنی شادی کا رونا روتی رہتی تھیں۔ زویا اور نازیہ پر اس قدر اثر نہیں ہوا تھا جس قدر ان کی باتوں کا اثر ماریہ نے لیا تھا۔ اسی لیے وہ نور باجی کی دہائیاں سن کر اندر ہی اندر ہولتی رہتی۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا اتنی جلدی شادی نہیں کروانی۔ اگر کروانی ہے تو بھی شوہر کی خدمت نہیں کرنی سسرال کے جھنجٹ نہیں پالنے۔ کوئی کام نہیں کرنا۔ کچھ نور باجی کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی عادت تھی۔ بظاہر اپنے گھر میں خوش باش نظر آتی تھیں مگر اس کا اثر ماریہ پر کچھ زیادہ ہی تھا۔

ماریہ کے نزدیک پھوپو ہونے کے باوجود نور باجی کی ساس صرف ساس تھیں جو کہ نور باجی جیسی نازک مزاج لڑکی سے سارے گھر کے کام کرواتی تھیں اور ان کے شوہر زواد بھائی بھی ایسے ظالم تھے کہ اپنی پیاری سی خوبصورت نازک مزاج دلہن کو گھر والوں پر چھوڑ چھاڑ کر خود سیر سپاٹے کرتے رہتے تھے جنہیں اپنی بیوی کا ذرا بھی احساس نہیں۔ ماریہ کے نزدیک تو نور باجی دنیا کی مظلوم ترین لڑکی تھیں جن کے نازک کندھوں پر سارے گھر کی ذمہ داری تھی اور یہ ان پر بہت بڑا ظلم تھا۔ آج کل وہ امید سے تھیں بلکہ ان کے ہاں بچے کی ولادت تھی۔ رات کو فون کر کے اپنی ذمہ داریوں کا رونا رو کر انہوں نے دادی جان اور تائی جان سے پرزور التماس کی تھی کہ نازیہ باجی اور کو ان کے ہاں بھیج دیں۔ تائی امی کا خون فوراً جوش میں آیا تھا۔ وہ سارے گھر کی ذمہ داری نسرین بیگم اور عذرا چچی پر ڈال کر نازیہ کو ساتھ لیے فوراً روانہ ہو گئی تھیں۔ اب گھر میں وہ اور زویا تھیں۔ بڑی بھابی بھی اپنے میکے پرسوں سے جا چکی تھیں۔ چھوٹی تو پہلے ہی گئی ہوئی تھیں۔ ایسے میں گھر کا سارے کا سارا کام چچی کے ذمے تھا۔

صبح کا سارا چارج انہوں نے ہی سنبھالا ہوا تھا جب کہ رات کی ذمہ داری نسرین پر تھی اور باقی ذمہ داریاں تائی جان پر تھیں۔ ان کے جانے سے یہ کام اس پر اور زویا پر آ پڑے تھے۔ دادی جان تو حکم چلانے کے علاوہ پہلے بھی کچھ نہیں کرتی تھیں۔ اب بھی کچھ نہیں کرتی تھیں۔ ایسے میں ماریہ کی شامت آئی ہوئی تھی۔ اسے کچھ نہیں کرنا آتا تھا۔ اب پھنسی ہوئی تھی۔ جھاڑو لگاتی تو کوڑا پیچھے اور جھاڑو آگے ہوتی تھی۔ جھاڑ پونچھ کا بھی یہی حال تھا۔ زویا کو وہی کام دوبارہ کرنا پڑتا تھا لیکن وہ مجبور تھی۔ نسرین چچی کی سختی سے تاکید تھی کہ اسے عادت ڈالنی چاہیے چھوٹے موٹے کام کرنے کی۔ اب بھی اسے کچھ نہ سکھایا گیا تو وہ ساری زندگی کچھ نہیں کرے گی۔ ماں کی کڑی نظریں ہر وقت ماریہ پر ہوتی تھیں۔ ماں کا بس چلتا تو وہ سب کچھ گھول کر اسے پلا دیتیں۔

اس دن بھی کام سے فارغ ہو کر دونوں تیار ہو کر لائبریری چلی آئی تھیں۔ اب وہ لڑکا روزانہ تو نہیں البتہ ایک دو دن بعد ضرور آتا تھا۔ اسٹائل اس کا اب بھی وہی ہوتا تھا۔ حرکتیں بھی رہی تھیں۔ اشاروں سے ابھی تک آگے نہیں بڑھا تھا۔ ماریہ کو یقین تھا جس دن بھی اشاروں سے زبان تک آیا اسی دن اس کا ضبط چھلک جائے گا۔ وہ دن سے ور نہیں آیا تھا۔ آج ہی آرہا تھا اور حیرت کی

بات تھی اس بار بغیر کوئی اشارہ کیے سلام جھاڑتے یا اسٹائل پاس کیے آرام سے بیٹھا رہا تھا۔ ماریہ کی نظر جب بھی اٹھی اسے اپنی طرف متوجہ مگر سوچتا ہی پایا۔ ماریہ اور زوبا دونوں کو اس کا یہ انداز دیکھ کر شدید حیرت ہوئی۔

''مجھے تو یہ چوڈرا ڈا بالگتا ہے۔'' زوبا نے رائے دی۔

''اور مجھے لگتا ہے آج کہیں سے پٹ کر آیا ہے۔ ایسے لڑکوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ ویسے زونی! موصوف کا ذرا طرز ملاحظہ کرو۔'' اس کا رف سا حلیہ دیکھ کر ماریہ نے اسے کہا تو وہ سر ہلا گئی۔

''واقعی آج تو یہ معمول سے ہٹ کر آیا ہے ورنہ وہ تو یہ سوٹڈ بوٹڈ ہوتا تھا۔ شاید یہ بھی اس کا اسٹائل ہو، تمہیں متاثر کرنے کا...... ویسے ایمان سے ماریہ اس حلیے میں بھی کسی ہیرو سے کم نہیں۔'' وہ آخر میں اسے شرارت سے دیکھنے لگی تو اس نے آنکھیں دکھائیں۔

''اب آنکھیں تو نہ دکھاؤ۔ بالکل جنگلی لگ رہی ہو۔ تم مانو یا نہ مانو بندہ ہے بڑا ہینڈسم۔'' اسے نظروں سے بغور جانچتے ہوئے وہ رہی تھی۔ ماریہ کا جی چاہا زوبا کا سر پھوڑ دے۔

''جب بھی بات کرنا میرے خلاف ہی کرنا۔ بندہ ہینڈسم ہے تو میری بلا سے۔ مجھے تو زہر لگتا ہے یہ شخص۔'' وہ دانت پیسنے لگی۔ زوبا سے اپنی ہنسی روکنا محال ہو گیا۔

''اب تم زیادتی کر رہی ہو۔ بالکل پیر دلگتا ہے ویسے بھی اس بے چارے کا قصور اتنا بڑا بھی نہیں۔ تمہیں صرف سلام جھاڑتا ہے، مسکرا رہتا ہے یا پھر دیکھ لیتا ہے۔ یہاں روز آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے دسیوں لوگ مسکرا کر سلام لے لیتے ہیں۔ وہ بے چارہ بھی لے لیتا ہے تو کیا جرم کر لیتا ہے۔ اس پر اتنا غصہ کرنے کی ضرورت کیا ہے......'' اسے مسلسل شرارت سوجھ رہی تھی۔ ماریہ کو شدت سے تاریہ کی یاد آئی۔ ایسے میں اس کی ایک ہلکی سی تنبیہ ماریہ کا سارا غصہ ختم کر دیتی تھی جب کہ یہ زوبا اس کا جی چاہا کتاب اس کے سر پر دے مارے۔

''اب تم مجھے یہ مت سکھاؤ کہ وہ کیا کر رہا ہے کیا نہیں...... بس میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ غلط حرکت کر رہا ہے۔ یہاں آنے والے اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو خود سلام لیتے ہیں یا مسکراتے ہیں۔ ان کا انداز مہذبانہ ہوتا ہے۔ اس کی طرح اشارے نہیں کرتے۔ وہ بھی صرف ایک کو ہی، سب پر مشترکہ سلامتی بھیجتے ہیں۔'' ماریہ نے جل کر کہا تھا۔

''مروتم میں جا کر کہہ دیتی ہوں۔ بھائی صاحب...... یہ لڑکی آپ پر کچھ زیادہ ہی فدا ہو گئی ہے۔ اس پر بھی نظر کرم کیجیے۔ آپ کے سلام کی منتظر ہے۔ اس کو بھی سلام سے نوازو دیا کریں۔''

''ہائے۔ اپنی ایسی قسمت کہاں؟ اور پھر ہو سکتا ہے صرف ایک ہی اس کی نظر میں جچتی ہو اور وہ صرف ایک ہی کو سلامتی کے قابل سمجھتا ہو۔'' وہ مسلسل اسے چھیڑ رہی تھی۔

''میں اب لائبریری نہیں آؤں گی۔ امی کو بھی سب بتا دوں گی...... سمجھیں تم......؟'' اس نے چیخ کر کہا تھا اور کئی موجود لوگ فوراً متوجہ ہوئے اور وہ بھی ہوا تھا پھر ماریہ کو دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔ ماریہ جھلس اٹھی۔ ایک دم غصے نے آلیا۔ زوبا کا خیال کیے بغیر فوراً کتابیں اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

''بری بات ہے۔ اتنی بڑی ہو کر بھی بالکل بچوں کی طرح جھگڑتی ہیں آپ تو...... میرا خیال ہے لائبریری میں ایسی تخریب کاری اچھی نہیں لگتی...... سنا آپ نے......''

زوبا ہائے ہائے کر رہی تھی جب وہی لڑکا اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس سے گزرتے کہہ رہا تھا۔ دونوں نے حیران ہو کر دیکھا۔ ماریہ گھورنے لگی۔ ''اس کی اتنی جرأت۔''

''اے مسٹر!'' اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتا اس نے اسے پکارا تھا۔

''تھینک گاڈ آپ کی چپ تو ٹوٹی۔'' وہ بھی بلا کی چیز تھا۔ وہ پکار کر پلٹا تھا۔

''جی کہیے کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟'' ہونٹوں پر مچلتی مسکراہٹ بمشکل روکے کہہ رہا تھا۔

''ہونہہ تم میری خدمت کرو گے۔ اتنے دنوں سے سب برداشت کر رہی ہوں تو یہ میری شرافت ہے۔ ورنہ تمہیں پہلے دن ہی بتا دیتی کہ تم جیسے لوگوں کا انجام ہوتا ہے اور اس وقت تمہیں کیا تکلیف ہوئی ہم جھگڑیں یا مریں تمہیں اس سے کیا...... تم کون ہوتے ہو ہمیں ٹوکنے والے......؟'' وہ اونچی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ارد گرد کے لوگ بھی متوجہ تھے۔ زوبا تو ایک دم پریشان ہو گئی۔

''میرا خیال ہے ہم باہر چل کر بات کر لیتے ہیں۔ یہ زیادہ بہتر ہے۔ میں باہر ہوں آ جائیے گا۔'' وہ کہہ کر لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہ بکا بکا دیکھتی رہ گئی۔

''بدتمیز۔'' وہ کڑھ رہی تھی پھر کتابیں اٹھا کر لائبریری بن کو تھام کر باہر نکل آئی تھیں۔ وہ ادھر ہی لائبریری کے باہر ٹہل رہا تھا۔ اس نے ایک زہریلی نگاہ اس پر ڈالی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھتیں وہ خود ہی ان کی راہ میں آ گیا۔

''جی اب کہیے...... کیا فرما رہی تھیں آپ اندر......؟'' سینے پر بازو لپیٹے وہ کھڑا تھا۔ ماریہ نے بے بسی سے زوبا کو اور پھر اسے گھورا۔

''دیکھو مسٹر! تم جو بھی ہو، جو بھی چاہتے ہو...... زیادہ ہینڈسم بنے کی تمہیں ضرورت نہیں۔ میں اگر برداشت کر رہی ہوں تو یہ میری بڑائی ہے ورنہ روز روز جو تم حرکتیں کر رہے ہو میری جگہ کوئی اور ہوتی تو کب تک تمہارے حواس ٹھکانے آ چکے ہوتے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ شاید تم صرف انجوائے منٹ کے لیے یہ کر رہے ہو مگر...... میں تمہارے منہ تک نہیں لگنا چاہتی۔ سیدھی طرح سے اپنا رستہ ناپو سمجھے......'' اس کے یوں ڈھٹائی سے اکڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہونے پر برداشت نہیں کر پائی تھی تو اسی لیے جو منہ میں آیا کہتی گئی۔ جواباً وہ مسکرا رہا تھا۔

''محترمہ! میں ہینڈسم بننے کی کوشش نہیں کر رہا...... میں واقعی ہوں اور اگر میں اپنا رستہ نہ ناپوں تو......؟'' مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر عیاں تھی ماریہ کا جی چاہا کہ اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ نوچ لے۔

''ایسے لوگوں کے منہ لگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خوامخواہ تماشا بنانے والی بات ہے۔'' زوبا نے اس کا بازو پکڑا تو وہ گھور کر رہ گئی۔

''اسی وجہ سے تو میں اب تک خاموش تھی اور یہ شخص حد سے بڑھتا چلا گیا۔'' وہ کہے بغیر نہ رہی۔

''دیکھیں مس ماریہ! اب کے آپ ناانصافی کر رہی ہیں۔ آپ کو صرف میں اسی تماشے سے بچانا چاہتا تھا جو خاموش تھا ہنڈ کب کا کلام کر چکا ہوتا۔'' وہ اب ایک دم سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''تم...... تم...... میرا نام کیسے جانتے ہو؟'' وہ ایک دم ٹھٹکا گئی۔ ''آخر کون ہو؟ اور ہمارے ہی پیچھے پڑ گئے ہو کیوں؟'' وہ کہے بغیر نہ رہی تھی۔

''ہاں یہ سوال کیا عقل مندوں والا۔'' وہ ایک دفعہ پھر مسکرا دیا۔

''میرا نام داؤد عالم ہے۔ پہلے دن یوں ہی ادھر آیا تھا۔ آپ تینوں کو دیکھا۔ آپ کی حرکتیں مجھے اچھی لگیں۔ مجھے ایسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں جو ہر وقت دادی اماں کا رول ادا کرنے کے بجائے نیچرل ہوں اور ماریہ آپ بالکل ایک نیچرل لڑکی لگی تھیں مجھے۔ اسی لیے آپ کو دیکھ کر سلام کر لیا تھا اور پھر مجھے اس میں مزا آنے لگا۔ میرا مقصد صرف آپ لوگوں کے تاثرات نوٹ کرنا تھا اور جس طرح آپ تینوں مل کر مجھ پر تبصرے کر رہی ہوتی تھیں، مجھے اچھا لگتا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ مزید کچھ ہو مگر آپ لوگوں کی احتیاط دیکھ کر

میں نے مزید کوئی حرکت نہ کی..... مگر آج یوں ہی ماریہ بی بی کو دیکھ کر زبان پھسل گئی تھی اور آپ لوگوں نے بھی حد کر دی۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ ماریہ اسے گھور بھی نہ سکی۔

"میں اتنی بے وقوف نہیں جو آپ کی باتوں میں آ جاؤں۔" ماریہ کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنسا تھا۔

"ارے واقعی۔ میں تو یہ بھول گیا تھا کہ میں ایک عقل مند خاتون سے مخاطب ہوں۔" ماریہ جز بز ہوئی۔ وہ بظاہر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا لیکن لہجے کا اتار چڑھاؤ، آنکھوں کی شرارت اور ہونٹوں سے چھلکتی مسکراہٹ دونوں سے مخفی نہ تھی۔ وہ اب بھی کھل کر انہیں زچ کر رہا تھا۔

"شٹ اپ۔ بھاڑ میں جاؤ تم۔ آئندہ تم نے ایسی حرکت کی نا تو میں تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔ سنبھال کر رکھو اپنا سامان مگر یہ اور دوادو بنا۔ سمجھے تم جلوز دیا۔" اسے کینہ توز نظروں سے گھورتی زویا کا بازو تھام کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے راستے پر ہو لی جب کہ دائم ان دونوں کو رکشے میں بیٹھ کر نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔

"لڑکی واقعی بہت تیز ہے۔" مسکرا کر وہ اپنی بائیک کی جانب ہولیا۔

* * *

حنا کوئٹہ واپس چلی گئی تھی۔ دراصل اس کے یہاں سسرالی رشتے دار تھے۔ ویسے تو اس کی شادی کوئٹہ میں ہوئی تھی اور وہیں رہتی تھی۔ چھٹیاں گزارنے کے یہاں آئی ہوئی تھی۔ اب چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں تو وہ چلی گئی تھی جب کہ جبین یہیں بیاہی گئی تھی۔ ہر دوسرے دن آ جاتی تھی اور جب بھی آتی۔ "شادی کب کرو گے؟" کی گردان کرتے داؤد کا دماغ کھاتی رہتی تھی۔ تنگ آ کر اس نے گھر سے باہر وقت گزارنا شروع کر دیا تھا۔ امی تو باقاعدہ ناراض تھیں جو اس نے نسرین آنٹی کی بیٹی کے لیے صاف انکار جو کر دیا تھا۔ وہ امی ناراضی کے تاثر سے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش میں تھیں مگر اس نے سوچ لیا تھا۔ وہ بلیک میل نہیں ہوگا۔

صبح وہ آفس چلا جاتا۔ درمیان میں کچھ وقت نکال کر وہ لائبریری کا چکر ضرور لگاتا تھا۔ اس نے جو مذاق دل لگی شروع کی تھی اب واقعی دل لگی بن گیا تھا۔ آج کل وہ روز چکر لگا رہا تھا مگر وہ تینوں نہیں آ رہی تھیں۔ اس دن جب دونوں کی آمنے سامنے ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد وہ صرف ایک ہفتہ دونوں آئی تھیں مگر اس کے بعد انہوں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔ شروع میں وہ سمجھا کہ وہ اس کی وجہ سے نہیں آ رہی ہیں مگر اب جیسے ہی اگلا ہفتہ شروع ہوا تھا ان کے نہ آنے پر داؤد کو تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ وہ کیوں نہیں آ رہی ہیں؟ کئی بار دل چاہا تھا کہ وہ لائبریرین سے ان کے متعلق معلومات حاصل کر کے کم از کم گھر کا ایڈریس ہی لے لے مگر ہر بار یہ سوچ کر ٹال جاتا تھا کہ شاید وہ آج آ جائیں مگر ہر بار ناکامی ہو رہی تھی۔

تاہم اس نے اب پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ آج کل میں ضرور معلومات حاصل کرے گا۔ آج بھی آفس سے آنے کے بعد ہاتھ لے کر جیسے ہی لاؤنج میں آیا۔ امی نے اسے دیکھ کر منہ پھلا لیا۔

"یا اللہ یہ میری زندگی میں 'م' نام کی لڑکی ہی کیوں آ گئی۔ کوئی اور کیوں نہیں آئی۔ ایک 'م' نے جان عذاب میں کی ہوئی ہے تو دوسری نے دل کی حالت میں انقلاب برپا کیا ہوا ہے۔ بندہ جائے تو جائے کہاں؟" وہ سوچ کر رہ گیا۔

"میری پیاری امی! کیا کر رہی ہیں؟" وہ جبین کے ساتھ کچن میں تھیں۔ وہ بھی وہیں آ گیا۔ انہوں نے اسے دیکھ کر رخ بدلا تو وہ مسکرا کر آگے بڑھا۔

"بات نہیں کرو مجھ سے۔" انہوں نے اس کے بازو ہٹائے جو داؤد نے ان کے کندھے پر رکھے ہوئے تھے۔

"تو پھر کس سے کروں؟ میرا خیال ہے بابا سے کہہ دیتا ہوں۔ میرے لیے ایک امی کا انتظام کر دیں۔ آپ تو خفا ہو گئی ہیں۔ شاید ان کو ہی ترس آ جائے۔" بھولی صورت بنا کر کہا گیا تھا۔ جبین قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔ امی نے ہاتھ پکڑا چمچہ اس کے کندھے پر دے مارا۔

"اپنے لیے تو راضی نہیں ہوتے۔ باپ کی کروانے کے لیے تیار ہو۔" انہوں نے خفگی سے دیکھا۔

"میں تو دل و جان سے بالکل تیار ہوں مگر شرط یہ ہے کہ لڑکی میری مرضی کی ہو۔" اس نے ایک دم کہا تو امی اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگیں۔ جبین بھی متوجہ ہو گئی۔

"لگتا ہے کوئی نظر میں ہے.....؟" جبین نے پوچھا تھا۔ وہ ہنس دیا۔

"ہاں مگر ابھی مجھے خود بھی مکمل معلومات نہیں۔ جیسے ہی علم ہوا آپ کو پہلی فرصت میں اطلاع دوں گا۔ باقی کا کام تو آپ ہی کریں گی بلکہ امی خود جائیں گی اس لڑکی کے گھر....." اگلے ہی پل وہ سنجیدہ ہو کر بتا رہا تھا۔ امی نے ایک گہری سانس لی۔

"تمہیں ماں کی کیا ضرورت ہے؟ جب ماں کی خواہش کی کوئی اہمیت نہیں تو پھر اس کے وجود کی بھی ضرورت نہیں۔ مالک ہو خود مختار ہو۔ سب کر سکتے ہو تم۔" وہ بھری بیٹھی تھیں۔ وہ ایک دم پریشان ہوا۔

"امی پلیز! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ! کیا آپ زبردستی کرنا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر اس کے بعد جو ہوگا اس کا الزام بھی مجھے مت دیجیے گا جب میرا دل نہیں مانتا تو زبردستی ہے نا؟"

وہ فوراً سنجیدہ ہو چکا تھا۔ جبین اور امی چپ ہو گئیں۔

"کون ہے وہ لڑکی جس کی خاطر تم یہ سب کر رہے ہو.....؟" انہوں نے پوچھا تو ان پر ایک شاکی نظر ڈال کر باہر کی جانب بڑھا۔

"کوئی نہیں ہے۔" اس کا انداز خفگی بھرا تھا۔ جبین فوراً سامنے آئی تھی۔

"کتنی بری بات ہے.....؟ اتنی سنجیدہ گفتگو اس انداز میں نہیں کرتے..... ادھر بیٹھو آرام سے بات کرو۔ تو بہ کتنے جھگڑالو ہو گئے ہو تم..... امی کو تمہاری خواہش عزیز ہے۔ بس وقتی غصہ ہے۔ تم تو عقل مند ہو۔" جبین نے زبردستی اس کا بازو پکڑ کر کچن کی کرسی پر لا بٹھایا۔

"میں دشمن نہیں ہوں اس کی۔ اگر یہ راضی نہیں تو نسرین نے بھی انکار کر دیا تھا مگر میری خواہش تھی کہ وہ لڑکی میری بہو بنے۔ ابھی پرسوں ہی میں اس کے گھر گئی تھی۔ یوں ہی بات چلی تو بتانے لگی کہ وہ ماریہ کا رشتہ رکھے رکھتی ہے۔ میں تو چپ رہی..... کتنی خواہش تھی میری..... مگر نسرین نے تو صرف اس لیے انکار کیا تھا کہ کہیں دوستی اور رشتہ داری میں فرق نہ آ جائے..... مگر میں..... " وہ چپ ہو گئیں تو داؤد کو احساس ہوا وہ تو خواہ مخواہ ان سے الجھ بیٹھا ہے۔ اس نے اندر ہی اندر خود کو لعنت ملامت کی۔

"ایم سوری امی! دیکھیے گا اس لڑکی کا نام بھی ماریہ ہے۔ وہ بھی بہت اچھی ہے۔ آپ اس سے جب ملیں گی تو بہت خوش ہوں گی۔" وہ ایک دم کہہ بیٹھا تھا۔

"کیسے لوگ ہیں وہ؟" انہوں نے پوچھا تھا۔

"مجھے زیادہ علم نہیں۔ بس آج کل میں پتہ کر لوں گا۔ دراصل لائبریری میں اسے دیکھا تھا۔ آج کل ہفتہ ڈیڑھ ہو گیا ہے وہ لائبریری نہیں آ رہی پھر جیسے ہی اس کے متعلق تفصیلی علم ہوا آپ کو بتا دوں گا بلکہ اس کے گھر لے کر جاؤں گا۔" وہ خوش تھا۔ امی نے ایک گہری سانس لی۔ وہ خوش تھا تو وہ پھر کیوں ناراض ہوتیں۔ زبردستی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی۔

"ٹھیک ہے تم جلدی معلومات حاصل کرو۔ اب میں دیر نہیں کرنا چاہتی۔" انہوں نے ہاں کر کے داؤد کا جیسے دل جیت لیا

تھا۔

''تھینک یو امی! تھینک یو سو مچ۔'' وہ ایک دم ان کے گلے لگ گیا تھا۔

* *

نور باجی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ دادی جان کے ساتھ ساتھ حمزہ اور ماریہ سب جا رہے تھے۔ ان سب کو تایا جان لے کر جا رہے تھے۔ بڑی پھوپو کے ہاں وہ لوگ بہت کم آتے تھے پھوپو ویسے تو اچھی تھیں مگر جب سے نور باجی کی ساس بنی تھیں ماریہ کے نزدیک مشکوک ہو گئی تھیں۔ اس لیے ماریہ کو ان کی بے تحاشا محبت بھی بناوٹ محسوس ہوتی تھی مگر ان کے ہاں آ کر اسے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ وہ نور بہت محبت کرنے والی ہستی تھیں۔ نور باجی کو زچگی سے پیچھے نہیں رکھنے دیتی تھیں۔ کھانا پینا، دھونا دھلانا سب انتظام خود کیا کرتی تھیں۔ ایسے میں وہ حیران ہو جاتی۔ نور باجی سچ کہتی تھیں یا پھر پھوپو ہی ڈرامہ باز ہیں جوان کے سامنے یہ سب کر رہی ہیں۔ زوار بھائی بھی آج کل اپنے شہر میں تھے۔ بہت زیادہ شوخ نہیں تھے، سنجیدہ متین تھے لیکن ان سب سے خوش دلی سے ملے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سچ ہے؟ نور باجی یا زوار بھائی......؟

''نور باجی! آپ تو کہتی تھیں کہ پھوپو بڑی ہٹلر ساس ہیں اور زوار بھائی بڑے ظالم شوہر ہیں جب کہ مجھے تو سب کچھ برعکس محسوس ہو رہا ہے۔'' ایک دن وہ انہیں کہہ بیٹھی۔ وہ ہنستی چلی گئیں اور وہ حیران ہو کر انہیں دیکھے گئی۔

''تم بھی بدھو ہو۔ میں تو تم لوگوں پر رعب جما رہی تھی تا کہ تم لوگ ذرا ہوشیار ہو جاؤ۔ دراصل جب شادی ہوئی تھی تب مجھے شادی کے بعد کی زندگی کا کوئی تصور نہیں تھا پھر میں تمہاری طرح نازک مزاج تھی۔ میرا خیال تھا کہ شادی کا مطلب ہے اچھے کپڑے پہننا، کھانا پینا، گھومنا پھرنا اور سیر سپاٹے کرنا۔ شادی کے شروع کے دنوں میں یہ سب چلا بھی مگر جیسے ہی دن گزرے گھر کی ذمہ داریاں کندھوں پر آ پڑیں تو میں بوکھلا گئی۔ زوار سنجیدہ مزاج شخص تھے۔ وہ پریکٹیکل بندے تھے۔ پھوپو بھی نارمل گھریلو خاتون تھیں اور مجھ میں سوائے ذہانت اور ڈگریاں اکٹھا کرنے کے اور کوئی خوبی نہ تھی۔ ایسے میں، میں لحہ لحہ پریشان ہوتی۔ جب میں پریشان ہو کر امی ابو کو فون کرتی تو وہ ڈانٹ دیتیں اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی نصیحت کرتی تھیں۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ تم لوگوں میں پریکٹیکل زندگی کا احساس پیدا ہو۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھریلو زندگی پر بھی توجہ دو اور تم تو ہو ہی میری طرح نازک مزاج اسی لیے میں تمہیں زیادہ ڈراتی تھی اور تم الٹا سمجھتی گئی۔'' انہوں نے مسکرا کر وضاحت کی تو وہ سر پکڑ کر رہ گئی۔

''آپ مجھے پہلے نہیں بتا سکتی تھیں۔ میں تو اتنا ڈر گئی تھی کہ مجھے تو شادی کے لفظ سے ہی خوف آنے لگا تھا۔ پچھلے دنوں ایک رشتہ آیا تھا۔ کچھ مت پوچھیں کیا کیا حرکتیں کر کے بھگایا تھا اور تو اور آپ کو یاد ہو گا امی کی کزن تجمل آنٹی ہیں نا، ان کا بیٹا، وہ تو اس کی بھی بات گھر چلی تھی مگر میں نے امی پر ایسا اثر ڈالا کہ انہوں نے خود انکار کیا تھا۔'' وہ منہ بنا کر بتا رہی تھی۔ نور باجی کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

''بری بات۔ جو لڑکی رشتہ بھگا سکتی ہے وہ اتنی بدھو نہیں ہو سکتی۔ ویسے مجھے تمہاری سب حرکتوں کی رپورٹ ملتی رہتی تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم یہ سب میرے تجربے سے سیکھ رہی ہو۔'' ان کے ساتھ ساتھ وہ بھی ہنس دی۔

''دیکھ لیں۔ آپ مت جھوٹ بولیں۔ مجھے ڈر تھا جب پھوپو بھی ہو کر اس قدر آپ پر ظلم کر سکتی ہیں تو دوسرے لوگوں سے امید ہی نہیں رکھنی چاہیے۔ اس میں بھی ہمارا ہی قصور ہے۔ میں تو بہت کم لاہور آئی ہوں۔ اسی لیے مجھے پھوپو کی فیملی کے بارے میں ہی انفارمیشن حاصل ہے۔''

''چلو اب تو حاصل ہو گئی نا۔ اب جو بھی رشتہ آیا پہلی فرصت میں ہاں کر دو۔ تم تو ویسے بھی پڑھائی سے جلتی ہو۔ ایک دماغ بھی لیے تمہارے ہاتھ جب ذمہ داری پڑے گی تو سب سیکھ جاؤ گی میری طرح۔''

''نہ بابا نہ۔ آج کل امی اسی سازش میں لگی ہوئی ہیں۔ ابھی چند سال تو بالکل بھی نہیں۔ پہلے ہی بڑی مشکل سے امی کا دماغ آنٹی تجمل کے بیٹے سے ہٹایا ہے لیکن آج کل وہ پھوپو رحمت کے ساتھ مل کر کوئی کھچڑی پکا رہی ہیں۔ اللہ نہ کرے انہیں کوئی لڑکا پسند آئے۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگی تھی نور باجی ہنس دی۔

نور باجی کے ہاں وہ بہت خوش تھی۔ پڑھائی سے جان چھوٹ ہوئی تھی۔ روز کہیں نہ کہیں جانے کا پروگرام بنتا تھا۔ وہ صرف ڈیڑھ ہفتہ وہاں رہ پائی تھی کہ حمزہ اور تائی جان نے واپسی کا ارادہ باندھا۔ امی نے فون کر کے اسے ان کے ہمراہ ہی واپس آنے کی سختی سے تاکید کی تھی۔ اس کا دل تو نہیں مانتا تھا مگر انکار کا کوئی سبب نہ تھا سو مجبوراً تائی اور حمزہ کے ساتھ ہی واپس آ گئی تھی۔ امی نے اسے لائبریری جانے کو نہیں کہا تھا۔ اس نے بھی تنہائی کا بہانہ کر کے خود کو گھر میں مصروف رکھا تھا۔

اس دن امی کے ورکشاپ میں چلے جانے کے بعد وہ لاؤنج میں میگزین لے کر بیٹھ گئی۔ چچی جان اور دادی جان دونوں سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں گھس گئیں تو گھر پر وہ بالکل تنہا تھی۔ کال بیل ہوئی تو مجبوراً اٹھنا پڑا۔ حمزہ تھا اس نے دروازہ کھول کر دیکھے بغیر کہ اس کے ساتھ اور کون ہے۔ وہ دوبارہ اندر کی طرف قدم بڑھا گئے اور دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر میگزین کھولتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ حمزہ تنہا نہیں اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے کیونکہ لاؤنج کے دوسرے حصے سے دونوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دراصل یہ ایک بڑا ہال کمرہ تھا۔ اتنی بڑی فیملی میں کمروں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے اس ہال کمرے کو درمیانی چھت سے لے کر زمین تک پردہ لگا کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصہ لاؤنج کے طور پر کام آتا تھا تو دوسرا ڈرائنگ روم کے طور پر اجنبی مہمانوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اکثر حمزہ کے دوست احباب آتے رہتے تھے۔ وہ نظر انداز کیے بیٹھی رہی۔

''ماریہ! ذرا اٹھو۔ میرا ایک اہم مہمان ہے۔ پلیز کھانے پینے کو کچھ لے آؤ۔''

وہ جو گھر کے کاموں سے پہلے ہی خار کھائے بیٹھی تھی۔ آج امی کی نگرانی میں ساری صفائی اسی نے کی تھی اور اس وقت سے مسلسل کڑھ رہی تھی۔ اب ذرا آہستہ آہستہ اسے صفائی کرنا بھی آنی جا رہی تھی۔ اب کہیں جا کر تھوڑا سکون ملا تھا لیکن اب حمزہ کی یہ فرمائش۔

''کیوں نوکرانی سمجھ رکھا ہے تم سب لوگوں نے مجھے۔ جس کا جب جی چاہتا ہے منہ اٹھا کر حکم شاہی عنایت کر دیتا ہے۔ ساتھی کرسی میں چائے کا کوئی رواج نہیں ہے۔ فریج میں کوک کی بوتل پڑی ہوئی ہے۔ کیبن میں بسکٹ، نمکو، پیسٹری اور دیگر چیزیں ہوں گی۔ خود جا کر نکالو۔ تمہیں بھی پتا چلے دوستوں کی خدمتیں کیسے ہوتی ہیں اور تمہارے دوستوں کو اس موسم میں تپتی دوپہر میں بھی اپنے گھروں میں چین نہیں جو منہ اٹھائے کھانے پینے کو آ جاتے ہیں۔'' حمزہ تو اسے کہہ کر پچھتایا۔ دوسرا اتنا اونچا والیم تھا کہ دوسری طرف آواز با آسانی سنی جا سکتی تھی۔ وہ تپ اٹھا۔

''تم سے تو کوئی بات کہنا ہی فضول ہے۔ نجانے سسرال میں جا کر کیا کرو گی؟ اور اس قدر اونچا والیم ہے کہ توبہ۔ ساری باتیں سنی ہوں گی دادو بھائی نے۔ پہلی دفعہ ہمارے گھر آئے ہیں۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ بھی.....'' وہ بہت دھیمی آواز میں اسے ڈانٹ رہا تھا۔

''ہاں تو کب کہا ہے میں نے کہ تم آ کر میری منتیں کرو۔ وہ دونوں وہاں جا کر بیٹھ گئی ہیں اور یہاں اکیلی میری جان شکنجے میں پھنسی ہوئی ہے۔ صبح سے کام کر رہی ہوں۔ اب پھر جت جاؤں۔ میں فارغ نہیں ہوں۔ میرا دماغ کھانے کے بجائے جا کر خود ہی اپنے دوست کے لیے اہتمام کر لو۔'' اس نے صاف لال جھنڈی دکھائی۔ وہ بھی اس پر لعنت بھیجتا رہا۔ وہ سر جھٹکتی میگزین پڑھنے لگی

w w w . p a k s o c i e t y . c o m

تھی۔ فون کی بیل بج اٹھی۔ وہ کلس کر کونے میں رکھے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھی۔

"نجانے اس بھری دوپہر میں کس کی جان عذاب میں آئی ہوئی ہے۔" بڑبڑا کر ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو۔" وہ سخت بیزار تھی۔

"کون...... ماریہ...... میں زویا ہوں۔ کیسی ہو تم۔ کیسی بے مروت ہو اُدھر جا کر فون تک نہیں کیا۔ حد کر دی۔" دوسری طرف سے وہ نان اسٹاپ شروع ہو گئی تھی۔ وہ جوان لوگوں کو بہت مس کر رہی تھی ایک دم ساری بیزاری اڑن چھو ہو گئی اور موڈ بھی ایک دم خوش گوار ہوا تھا۔ ساتھ میں آواز بھی اونچی ہو گئی تھی۔

"ہائے زویا! تم...... بڑی بے مروت ہو۔ اب فون کر رہی ہو۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بہت مزہ آ رہا ہے۔ پتا ہے دائم بھائی کی آج کل خوب شامت آئی ہوئی ہے۔ خوب ان کی جیب خالی کروائی جا رہی ہے۔ وہ بے چارے دہائی دیتے رہ جاتے ہیں مگر کسی کو اثر ہی نہیں ہوتا۔ تم تو آ گئی تھیں۔ نور بہت سب نے تمہیں بہت مس کیا ہے۔"

"ہاں میں بہت مس کر رہی ہوں۔ ذرا بھی دل نہیں لگ رہا۔ ای کی وجہ سے آنا پڑا تھا ورنہ......" اس نے بھی جواباً کہا۔

"تمہیں ایک راز کی بات بتاتی ہوں۔ دائم بھائی (زوار کا چھوٹا بھائی) نازیہ میں انٹرسٹڈ ہے۔ یہ بات نازیہ نے مجھے تو بتائی ہے۔ اب سے نہیں بہت پہلے سے...... ہے نا حیرت کی بات۔"

"کیا واقعی۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ ان دونوں کی کبھی بنی ہی نہیں۔ ہر وقت بچوں کی طرح تو جھگڑتے رہتے ہیں۔ نازیہ انہیں الو، بندر اور بھی نجانے کیا کیا کہتی رہتی ہے۔ مجھے تو ذرا بھی یقین نہیں آ رہا۔" وہ واقعی حیران تھی۔

"یقین کر لو۔ نازیہ کا اب بھی وہی رویہ ہے مگر بہت خوش ہے۔ پوری گھنی ہے۔ بس ہمارے سامنے بنتی ہے اور خود اور محترمہ کی محبت میں ڈوبی ہوئی ہے۔" زویا مزے سے بتا رہی تھی۔ "تم آ ملے یہ نازیہ کی بچی۔ جیسں کیسے ہر وقت جھگڑتی رہتی تھی اور خود کو دیکھو...... ایک دفعہ ہاتھ لگے دیکھنا کیا حشر ہے اس کا...... ہم سے چھپایا۔ یعنی ماریہ قطب الدین سے۔" دوسری طرف زویا کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی۔ وہ بھی ہنس دی۔

"اور تم سناؤ۔ لائبریری جا رہی ہو؟"

"نہیں۔ تم لوگوں کے بغیر بھلا میں کہیں جا سکتی ہوں...... خدا خدا کر کے تم لوگوں کا بہانہ کر کے میری اس مصیبت سے جان چھوٹی ہے۔ صبح ہوتی ہے تو امی ڈنڈا لے کر سر پر کھڑی ہوتی ہیں۔ سارے گھر کی صفائی کرنا پڑتی ہے۔ ان کے بعد امی چلی جاتی ہیں تو کچھ سکون ملتا ہے۔ ٹی وی دیکھ لیتی ہوں یا ایف ایم سنتی ہوں اگر حمزہ کا موبائل گھر پر ہو تو پھر اس کا آپریشن کرتی ہوں ورنہ اپنی تو یوں ہی بور گزر رہی ہے۔" اس نے آرام سے بتایا۔

"اور پڑھتی کب ہو؟ اور چچی جان تمہیں کچھ نہیں کہتیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ پتا ہے کل امی نجمل آنٹی کو فون پر بتا رہی تھیں کہ اب ماریہ سلجھنے لگی ہے۔ گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے امی کے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کا زیادہ خوف ہوتا ہے اور امی انہیں یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ میں سنجیدہ ہو کر پڑھ رہی ہوں وہ بھی گھر پر۔ امی کو تو یہ بھی نہیں پتا کہ میں پڑھ نہیں رہی ہوتی بلکہ تین بجے سے شام چھ بجے تک لان میں درخت کے نیچے بیٹھ کر واک مین سنتی ہوں۔" اس نے ہنس کر بتایا تو زویا چیخی۔

"کیا...... اور اب تک تم بچی کیسے ہو...... چچی کو پتا نہیں چلا......؟"

"بالکل نہیں...... دراصل کتاب لے کر گود میں رکھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ بغل میں ریڈیو ہوتا ہے۔ کانوں میں واک مین ہوتا ہے اور اس کے دوپٹہ اوڑھا ہوتا ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ میں ابھی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی ہوں اور اس وقت پڑھ رہی ہوں اس لیے کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا۔ امی دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی ہیں کہ میں پڑھ رہی ہوں۔ انہیں کیا علم کہ میں سر ہلا ہلا کر گانے کی لے پر ہونٹوں سے کتاب کے لفظ نہیں بلکہ گانے کے بول نکل رہے ہوتے ہیں۔" وہ خوش ہو کر اپنی ساری کارستانی بتا رہی تھی۔ دوسری طرف زویا نے اپنا سر پیٹا۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے ماریہ! تم چچی جان کو دھوکہ دے رہی ہو۔ نہیں بلکہ خود کو دے رہی ہو۔"

"تو بھلا اس میں دھوکے والی کون سی بات ہے...... انہیں بھی تو میرا مسئلہ سمجھنا چاہیے نا۔ بس نہیں چاہتا میرا دل پڑھنے کو تو پھر زبردستی کا ہے کو۔ وہ یوں کریں گی تو میں بھی اسی طرح کروں گی۔ تم جانتی ہو کہ کیسے نقل کر کر کے میں یہاں تک پہنچی ہوں۔ اگر امتحانوں کے دنوں میں تم دونوں ساتھ نہ دیتیں تو میں چھٹی کلاس سے آگے کبھی نہ بڑھ پاتی اور بی اے مجھے سب سے مشکل لگ رہا ہے۔ انگلش میرے سر سے گزر جاتی ہے۔ یہ سب تمہارا اور نازیہ کا قصور ہے۔ نہ تم بی اے میں داخلہ لیتیں نہ میری جان شکنجے میں آتی۔ اب امی کی خوشی کہ تمہیں پڑھنا ہے تو پڑھو نہیں تو وہ میری شادی کر دیں گی۔ یعنی دوسرے معنوں میں ایک عدد اُلّو میرے سر پر بٹھا دیں گی۔ شادی کا مطلب بربادی...... اور یہ بات امی نہیں سمجھ رہیں...... اور مجھے امی کی ضد بھی منظور نہیں۔ ان کے ڈنڈے کے خوف سے گھر داری سیکھ تو رہی ہوں مگر سسرالی داری نہیں کروں گی اور جو نہیں امی میرے لیے جب کریں گی اس کا تو ابھی سے ہی اللہ حافظ بلکہ ساتھ میں تم اُس بھی فاتحہ پڑھ لو۔ کسی کو بھی ذرا بھی مجھ سے ہمدردی نہیں ہے۔ امی نے تو باقاعدہ میرے لیے رشتے کی تلاش کی مہم چلائی ہوئی ہے۔ ذرا بھی مزا نہیں آتا۔"

"ارے ماریہ! وہ لائبریری والا لڑکا یاد آتا ہے تمہیں۔ مجھے تو وہ شخص بہت اچھا لگا تھا۔ میں جب بھی تمہاری شادی کا تصور کرتی ہوں۔ مجھے تمہارے ساتھ وہی شخص نظر آتا ہے۔"

"اچھا یاد دلایا تم نے۔ مجھے بھی تم سے یہ بات کرنی تھی۔ تم نے نازیہ اور نور باجی کو اس لڑکے سے متعلق آگاہ کیا تھا۔ سچ کہہ رہی ہو ناں۔"

"ہوں تم تو جانتی ہو کہ جب تک نازیہ سے ساری راز کی باتیں نہ کر لوں مجھے کوئی بات ہضم نہیں ہوتی پھر مجھے وہ لڑکا پسند بھی آیا تھا۔ میں نے جاتے ہی نازیہ کو بتا دیا...... اور تم لائبریری کیوں نہیں جا رہی...... وہ بے چارہ تو انتظار کرتا ہوگا تمہارا۔"

"تو کرے میری بلا سے۔ تم نے کیوں بتایا نور باجی کو وہاں۔ وہ ہر وقت مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتی رہتی تھیں بلکہ اکثر اسی لڑکے کی طرح سلام بھی جھاڑنے لگی تھیں۔" دوسری طرف زویا کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"بڑی بے مروت ہو تم...... تم سے جو بھی محبت کرے گا اپنا آپ کھوئے گا۔ ویسے ماریہ وہ لڑکا مجھے اچھا لگا ہے۔ کتنی زبردست شخصیت ہے۔ مجھے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں اور تمہارے ساتھ سجے گا بھی بہت۔ کیا خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

"زویا کی بچی...... پٹ جاؤ گی میرے ہاتھ سے۔ اپنے اس ہینڈسم کو تو گولی مارو...... ورنہ یہ کام میں کر دوں گا۔ اگر آئندہ تم نے اس اشارے باز، بدتمیز شخص کا ذکر بھی کیا تو پھر تمہیں مجھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں تمہیں بھی ہینڈسم بنا دوں گی۔"

"اتنا تو سچ ہے کہ وہ تمہارے ساتھ سجے گا۔" دوسری طرف وہ اب بھی سنجیدہ نہیں تھی۔

"زویا کی بچی...... میں تمہارا بھیجہ نکال دوں گی بلکہ اس بدتمیز شخص کے ساتھ تمہیں بھی گولی سے اڑا دوں گی۔ سمجھیں تم۔"

"ارے اتنا غصہ۔ ضرور گالوں پر لالی آئی ہوگی۔ آنکھوں میں کوئی مستی چھائی ہوگی اور ہونٹ اس کا نام گنگنا رہے ہوں

ہے۔ ویسے نام کیا ہے موصوف کا......؟"

"تمہارا سر......" اس نے جھنا کر ریسیور پٹخ دیا۔ "بدتمیز۔ اسٹوپڈ۔" اسے گالیوں سے نوازتی جوں ہی پچھلی لان کے حصوں کے درمیان پردا اٹھا سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر پتھر بن گئی۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟ آپ لائبریری آ نہیں رہی تھیں۔ سوچا میں ہی آپ سے مل لوں۔ مزاج بخیر ہیں نال۔" وہ پردہ ہٹا کر آگے بڑھ آیا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ ایک دم ہوش میں آئی۔

"تم...... تم...... تمہیں جرأت کیسے ہوئی یوں میرے گھر میں گھس آنے کی...... ؟ نکل جاؤ یہاں سے...... ورنہ میں شور مچا کر سارے گھر والوں کو اکٹھا کر لوں گی۔ میں عام لڑکی نہیں ہوں...... سمجھے تم......" وہ واقعی پریشان ہو گئی تھی۔ یہ شخص پیچھا کرتے کرتے اس کے گھر تک آ گیا تھا۔ نجانے آگے کیا ہو؟ اس کا دل خوف سے کانپنے لگا۔

"ابھی میرا ذکر ہو رہا تھا...... وہ بھی اس قدر اپنائیت بھرے انداز میں۔ سوچا میں خود ہی سامنے آ جاؤں۔ ویسے میرا ذکر کرنے کا...... مجھے یاد فرمانے کا شکریہ۔ کہیے بندہ حاضر ہے کیا خدمت کر سکتا ہوں...... ویسے پہلے یہ بتایئے لائبریری کیوں نہیں آ رہیں؟" وہ اس کے چہرے پر چھائے غصے کی پروا کیے بغیر بہت توجہ سے پوچھ رہا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔

"تم کون ہو...... کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟ وہاں لائبریری میں اتنے لوگ ہوتے ہیں۔ آخر میرے ہی پیچھے پڑنے کا مقصد کیا ہے؟" وہ جو کسی بھی خاطر میں نہ لاتی تھی اس وقت خوفزدہ پوچھ رہی تھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"تمہیں میرے گھر کا ایڈریس کہاں سے ملا؟" وہ اب پہلے سے زیادہ خوفزدہ تھی۔ داؤد عالم کو اسے اس حالت میں دیکھ کر لطف آ رہا تھا۔

"لائبریری سے۔" کوئی نے مزے سے بتایا۔ وہ لب بھینچ گئی۔

"دیکھو مسٹر! یہاں سے چلے جاؤ ورنہ......" وہ ایک دم پریشانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ایک دم یاد آیا حمزہ کا کوئی مہمان آیا ہوا تھا اور یہ شخص...... ایک دم الجھ کر اسے دیکھا۔

"اگر میں نہ جاؤں تو......؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ ماریہ کا غصہ ایک دم امڈنے لگا۔

"تو میں شور مچا کر اپنے گھر والوں کو اکٹھا کر لوں گی۔ اس کے بعد تمہاری جو درگت بنے گی وہ ملاحظہ کرنا۔" دانت پیچا کر کہا گیا تھا۔ داؤد عالم کو اچھا لگا۔

"واقعی...... پھر مچائیں شور...... میں بھی دیکھتا ہوں کون کون آتا ہے؟ لگے ہاتھوں آپ کے اہلِ خانہ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" وہ آگے بڑھ کر بڑے ریلیکس موڈ میں صوفے پر بیٹھا تو ماریہ کا سانس حلق میں اٹکنے لگا۔ عجیب شخص تھا۔

"دیکھیں۔ آپ میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور آپ اندر آئے کیسے؟ میں صرف دھمکی نہیں دے رہی میں آپ کا حشر نشر کر دوں گی۔"

"ضرور...... میں بھی تو منتظر ہوں۔ ویسے آپ دھان پان سی لڑکی ہیں۔ میرا حشر نشر کیسے کریں گی؟"

"تم...... تم...... دفعان ہو جاؤ یہاں سے......" بے بس ہو کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے اسے مارنے کو کوئی چیز ڈھونڈ رہی ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ کامیاب ہوتی حمزہ کی آواز ڈرائنگ روم سے آنے لگی۔

"داؤد بھائی...... داؤد بھائی...... کہاں گئے آپ...... داؤد بھائی۔" وہ اسے آوازیں دیتا ادھر ہی آ گیا تھا اور ماریہ حمزہ کے منہ سے ان کا نام سن کر ہکا بکا کھڑی تھی۔ یعنی یہ حمزہ کا وہی مہمان تھا جس کی خاطر مدارات کا وہ کہہ رہا تھا۔

"ارے داؤد بھائی! آپ یہاں..... میں آپ کو ادھر دیکھ رہا تھا۔ دراصل مجھے تواضع کے لیے چیزیں تلاش کرنے میں دیر

ہو گئی۔" وہ ہاتھ میں لوازمات پکڑے ہوئے تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی پھر اس کی ماریہ پر نظر پڑی تو ٹھٹک گیا پھر داؤد کو دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ فوراً سٹپٹا گیا پھر ماریہ کو دیکھا تو غصہ آنے لگا۔ کیسے تھوڑی دیر پہلے بری طرح انکار کر دیا تھا اور اب یوں کھڑی تھی گویا اس ریاست کی مہارانی ہو۔

"داؤد بھائی! ان سے ملیں یہ ماریہ ہے۔ میرے چچا قطب الدین اور نسرین چچی کی بیٹی۔" وہ مجبوراً اس کا تعارف داؤد سے کرا رہا تھا ورنہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ جتنی تیزی سے اونچی آواز میں اس کی زبان چل رہی تھی، صاف پتا چل رہا تھا کہ محترمہ کیا چیز ہے......

"اور ماریہ یہ تمہاری تحمل آنٹی کے بیٹے داؤد عالم ہیں۔ یہ پرسوں بھی آئے تھے آج ادھر سے گزر رہے تھے تو میں انہیں اندر لے آیا۔ تم جانتی ہو نا انہیں۔" وہ بتا رہا تھا اور وہ ہکا بکا کھڑی تھی۔

"کیا......؟" اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ داؤد عالم تحمل آنٹی کا بیٹا...... وہ جو کوئٹہ میں تھا جو حال ہی میں یہاں شفٹ ہوا تھا جس کا رشتہ اس کے لیے آیا تھا اور جس کی وجہ سے اس نے اسی پر غلط تاثر قائم کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے۔

"جی۔ میں ہی ہوں داؤد عالم۔ آپ کی تحمل آنٹی کا بیٹا۔" ماریہ کو لگا وہ صرف اسے زچ کر رہا ہے۔ وہ جان بوجھ کر اسے تکلیف دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک دم لب بھینچ کر اسے گھور کر ایک غصیلی نگاہ ڈالتے ہوئے وہاں سے چلی آئی تھی۔

"وہ تحمل آنٹی کا بیٹا ہے۔" وہ جوں جوں سوچ رہی تھی اس کے دماغ کی رگیں پھٹتی جا رہی تھیں اور کچھ دیر پہلے اپنا لاؤڈ اسپیکر فل والیم میں کر کے نجانے کیا کیا بک رہی تھی۔ اس نے سب سنا تھا۔ اف نجانے وہ کیا سوچے...... ؟ پہلے ہی انتہائی پریشان کیا ہوا تھا اس شخص نے۔

☩ ☩ ☩

زویا اور نازیہ واپس آ گئیں اور پھر جیسے ہی اس نے انہیں داؤد عالم کے متعلق بتایا اور ساری تفصیل گوش گزار کی تو دونوں ہی ہکا بکا رہ گئیں بلکہ چیخ اٹھیں۔

"بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ہینڈسم سا شخص تحمل آنٹی کا وہی سڑیل بدمزاج چڑچڑا سا بیٹا ہے جو بچپن میں آنٹی کے ساتھ ہمارے ہاں آتا تھا۔ نہیں...... یہ ہینڈسم سا بھلا اس کالے کلوٹے سے لڑکے کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے۔" نازیہ کی حیرت ختم نہیں ہو رہی تھی۔

"جب ہم نے اسے دیکھا تھا تب ہم خود بھی کالی موٹی پلی ہوئی بھیڑیں ہوا کرتی تھیں اور یہ تب کی بات ہے جب ہماری ناک بہتی تھی اور رال بھی ٹپکتی تھی۔ ویسے مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ اس شخص کا رشتہ ماریہ کے لیے آیا تھا۔ یقین نہیں آتا۔" نازیہ نے سوچتے ہوئے کہا تو ماریہ نے اسے گھورا۔

"تم لوگ اس کی تعریفیں کر رہی ہو یا میرے زخموں پر نمک چھڑک رہی ہو؟" وہ جھنجھلائی تھی۔

"دونوں کام۔" نازیہ نے آرام سے کہا تو وہ چیخ اٹھی۔

"کیا...... تمہارا دماغ تو درست ہے؟ بجائے یہ کہ میری مدد کرو۔ مجھے زچ کر رہی ہو۔ پتا ہے کل بھی تحمل آنٹی آئی تھیں۔ اپنی بڑی بیٹی جبین کے ساتھ۔ امی بھی بہت خوش تھیں۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ سارا ان کے بدتمیز بیٹے کا قصور ہے۔ بچپن میں کیسا بھیگی بلی بنا رہتا تھا ہر وقت اپنی ماں کے پلو پکڑے پیچھے پیچھے میں میں کرتا رہتا تھا مگر اب تو جیسے ساری ہوشیاری اس پر ختم ہوتی ہے۔ کتنا بدل گیا ہے وہ......"

واقعی نازیہ! ماریہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ بچپن میں تو وہ بہت چیچ تھا۔ تمہیں یاد ہوگا ماریہ ایک دفعہ وہ ہمارے ہاں آیا تو اس نے شرارت سے اسے مرغیوں والے ڈربے میں بند کر دیا تھا اور مرغیوں کا ڈربہ بھی اوپر چھت پر تھا۔ گرمیوں کے دن تھے دوپہر تھی۔ وہ روتا چیختا رہ گیا تھا مگر ہم بھی تین تھے۔ ایسا قابو کیا کہ اسے بند کر کے ہی نیچے اتریں پھر ہم بھول گئیں اور جب تجلی آنٹی [illegible] نکلیں اور اسے ڈھونڈا تو ہمیں یاد آیا تھا کہ ہم اس کا کیا حشر کر چکی تھیں پھر جب اسے ڈربے سے نکالا تو بے ہوش ہو چکا تھا [illegible] عرصے سے بتا رہی تھی۔ اسے بھی سب یاد آتا گیا۔ خاص طور پر اس واقعے کے بعد پڑنے والی مار۔

"واقعی امی سے بہت مار پڑی تھی کیونکہ اسے ڈربے میں بند کرنے کی تجویز میری ہی تھی۔" اس معصوم اور سادہ [illegible] مگر اب تو بہ توبہ...... "زویا نے رائے دی تو دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے۔

"اب سوچو۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ظاہر ہے وہ اب لائبریری والی حرکتیں تو نہیں کرے گا مگر اب آرام سے بھی بیٹھے گا پھر اب تو اور شیر ہو گیا ہوگا۔ جس طرح تاجی علم ہے کہ امی کس طرح مجھے پر اس رشتے کے لیے زور دے رہی تھیں یقیناً اس میں بات ہوئی ہوگی۔ وہ اتنا چھوٹا بچہ نہیں کہ میں نظر انداز کروں اور وہ آرام سے بیٹھا رہے۔" "یہ واقعی پریشانی والی بات تھی۔" [illegible] نے مل کر کافی دیر تک سوچا کہ کیا حل نکالیں مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تو تینوں نے حالات پر چھوڑ دیا۔ اہم ماریہ نے یہ ضرور فیصلہ کر لیا تھا [illegible] دو اس شخص کے منہ کم ہی لگے گی...... بلکہ کبھی بات ہی نہیں کرے گی۔ نجانے اسے کیوں شک سا رہنے لگا تھا کہ وہ یقیناً رشتے کی وجہ سے اس کے پیچھے پڑا ہے۔ پھر کالج کھل گئے اور ان کی روٹین ایک دم بدل گئی۔ صبح کالج وہاں سے واپس آ کر کھانا کھا کر آرام کرنا اور امی کے مجبور کرنے پر کبھی کبھار کچن میں بھی جھانک لینا۔ پہلے کی طرح وہ اب بھی پڑھتی کم ہی تھی بلکہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے سارا وقت پاس کرتی تھی۔ البتہ زویا اور نازیہ سنجیدہ ہو چکی تھیں۔ سب گھر میں ہی ہوتے تھے۔ وہ دونوں رات کے کھانے کا انتظام کرتی تھیں۔ ویسے تو وہ بھی ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی مگر وہ بجائے سنوارنے کے کام بگاڑتی ہی تھی۔ ایسے میں وہ دونوں غصے سے اسے کچن سے باہر کر دیتی تھیں بلکہ اکثر جب وہ ان کے ساتھ بیٹھی ٹی وی وغیرہ دیکھ رہی ہوتی تو ٹوکتی بھی نہ تھیں۔ یہ ماریہ کے لیے بھی حیرت کی بات تھی۔ پھر دن اوپر تلے گزرتے چلے گئے۔

زویا کمرے میں آئی تو وہ موبائل ہاتھ میں لیے مصروف تھی۔ یہ حمزہ کا موبائل تھا۔ رات کو جب وہ باہر کہیں جاتا تو موبائل گھر ہی چھوڑ جاتا تھا کہ راستے میں چھین نہ لیا جائے اور اکثر حمزہ کا موبائل ماریہ کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوتا تھا۔ اب بھی موبائل ماریہ کے ہاتھوں میں دیکھ کر نازیہ تپ گئی۔

"خدا کا واسطہ ہے بی بی! یہ تمہارا آخری سمسٹر ہے۔ کچھ تو خدا کا خوف کر لو۔ اپنی نہیں تو چچی جان کی عزت کا ہی خیال کر لو۔ کہاں وہ ایم۔ ایس۔ سی میتھ میٹکس اور کہاں تم سی نالائق لڑکی...... یہ تم ہر وقت موبائل کے ساتھ مت چمٹی رہا کرو...... فیل ہو جاؤ گی۔"

"بے فکر رہو، میں اتنی چھوٹی باتوں پر پریشان نہیں ہوتی۔ دنیا میں اور بھی غم ہیں پڑھائی کے سوا۔" اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر گنگنا کر ارشاد فرمایا گیا تھا۔ نازیہ کی جان جل کر رہ گئی۔

"رہنے دو نازی! اندھے کے آگے رونا اپنے نین کھونا اور بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہے۔ جب فیل ہو گی پر اماں کے جوتے پڑیں گے تو سب ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔" زویا نے کہا اور اپنی کتابیں لے کر بستر پر بیٹھ گئی۔ ماریہ ہنس پڑی۔

"تمہیں میرے غم میں دبلے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب پاس ہونا ہو تو محنت بھی کروں جب فیل ہی ہونا ہے تو کیوں جان کھپاؤں...... تم لوگ اپنی فکر کرو۔"

"مرو تم...... تم سے تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔" نازیہ نے بھی وہیں بیٹھے کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔ کالج جانا ماریہ کے

لیے شروع سے ہی تکلیف دہ تھا۔ اب بھی یہی حال تھا۔ اسی لیے وہ ایک دن اگر کالج جاتی تھی تو دوسرے دن چھٹی ضرور کرتی تھی۔ اسکول سے آنے کے بعد گھریلو کاموں میں الجھی رہتی تھیں۔ ایسے میں وہ اب اسے کم ہی جھڑکتی تھیں۔ نور باجی میکے آئی ہوئی تھیں۔ ماریہ کے ہاتھوں ان کا چھوٹا موٹا سا صحت مند آفاق ایک کھلونا تھا۔ کالج سے آتے ہی وہ اسے چمٹ جاتی تھی اور وہ بھی اس کے ساتھ بہت خوش رہتا تھا۔

تجلی آنٹی کے یہاں پارٹی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ دعوت دینے آئی تھیں بلکہ صبح ہی صبح زویا، نازیہ اور ماریہ کو آنے کی پرزور تاکید کی تھی۔ امی نے اور دادی جان نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ انہیں اور نور کے ساتھ صبح کو ہی بھیج دیں گے۔ ماریہ اس حکم شاہی پر تلملا کر رہ گئی۔ دعوت والے دن اس نے بہت کوشش کی تھی وہ نہ جائے مگر امی نے بھی اسے بھیج کر ہی دم لیا۔ سارا راستہ وہ کڑھتی رہی۔ وہ پہلے تجلی آنٹی کے ہاں اس وقت آئی تھیں جب وہ لوگ دوبارہ یہاں سیٹل ہوئے تھے تب پہلی مرتبہ تجلی آنٹی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور وہ پہلی ملاقات اس کی زندگی کا عذاب بن گئی، جسے وہ اب تک بھگت رہی تھی۔ نازیہ اور زویا خوب چہک رہی تھیں۔ نور باجی بھی مسکراتی رہی تھیں۔ جب کہ وہ اندر ہی اندر خوفزدہ ہوتی رہی۔ وہ خود بھی حیران تھی وہ ایسی تو نہ تھی پھر اسے کیا ہو گیا تھا کہ داؤد عالم کا نام سن کر ہی اس کے پسینے چھوٹنے لگتے تھے۔ نہ ہی وہ کوئی بھوت تھا پھر نجانے کیوں اب اسے دیکھ کر وہ ہولنے لگی تھی۔ اس کا دل اندر پسلیوں میں ہی دھڑ دھڑانے لگا تھا۔ اسی لیے وہ یہاں نہیں آنا چاہتی تھی۔ لائبریری کب کی چھوڑ چکی تھی۔ داؤد عالم ان کے ہاں بار بار آ چکا تھا اور ہر بار اسے اس طرح زچ کرتا تھا کہ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی تھی۔ اب تو وہ اس سے متوحش رہنے لگی تھی۔ یہاں آ کر بھی یہی حال ہوا تھا۔ وہ ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی رہی جب کہ وہ دونوں تو بہت خوش تھیں۔ گھوم پھر کر سارا گھر دیکھتی رہیں۔ تجلی آنٹی اور جبین دونوں اسے ایک طرف بیٹھے رہنے کے بجائے گھر دیکھنے کی آفر کر چکی تھیں، جنہیں وہ کئی بار مسکرا کر ٹال چکی تھی۔

"یہ تجلی آنٹی اور میری امی آخر چاہتی کیا ہیں...... ؟ اور یہ داؤد عالم آخر چیز کیا ہے؟ میں آج کل اس سے اتنی خوفزدہ کیوں رہنے لگی ہوں۔" وہ کڑھ کر رہ گئی۔

پھر شام تک وہ سب کے ساتھ ادھر سے ادھر گھومتی رہی اور حیرت کی بات ہے کہ داؤد عالم ایک دفعہ بھی اس کے سامنے نہ آیا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ گھر پر نہیں تھا بلکہ وہ گھر پر ہی تھا مگر اس طرح مہذبانہ انداز لیے ہوئے تھا کہ ماریہ کو اس کی سابقہ حرکات پر شبہ ہونے لگا۔

"پُراسرار سا ہے یہ شخص تو......" وہ سارا دن یہی سوچتی رہی۔ شام سے پہلے ہی امی، دادی جان اور تائی امی چلی آئی تھیں۔ باقی کے لوگ گھر پر ہی رک گئے تھے۔ پارٹی کے بعد چائے کا دور چلا تھا۔ ان لوگوں کے علاوہ ان کے اپنے کافی عزیز و اقارب تھے۔ داؤد عالم سب سے ملتا ملاتا ان کے پاس بیٹھا تھا۔ لاشعوری طور پر ماریہ کی نگاہوں کی زد میں رہا۔ وہ اس پر نظریں ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی مگر...... اس نے جب بھی خود کو ڈانٹا اس کا دل ہر بار باغی ہوتا چلا گیا۔

"یا اللہ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟" چائے پیتے ہوئے وہ مسلسل خود سے لڑ رہی تھی، جھگڑ رہی تھی۔ یوں ہی نظر اٹھا کر اس نے دیکھا تو داؤد عالم کی نظریں خود پر مرکوز دیکھ کر سٹپٹا گئی۔ اس نے ماریہ کو متوجہ پا کر جاندار انداز میں اسمائل پاس کی تھی۔ اس نے گھبرا کر رخ موڑا تو نظر زویا پر جا ٹھہری وہ شاید دیکھ چکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ تھی۔ وہ اندر ہی اندر سلگ اٹھی۔

"بدتمیز۔ جانتا ہے ناں میں اس وقت کچھ نہیں کر سکتی اسی لیے تو......" اس نے سر جھٹکا۔ زویا نے اشارے سے بلایا تو وہ اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔ وہ اس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر ہنس دی۔

"زویا! یہ شخص کسی دن میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔" وہ بھنائی ہوئی تھی۔

"اچھا۔ نئی بات ہے...... مگر مجھے لگتا ہے وہ قتل کریں گے...... تم کہاں گے۔"

"تم تو اپنی زبان بند ہی رکھا کرو۔ میرا دل جل رہا ہے اور تمہیں اٹھکیلیاں سوجھ رہی ہیں۔" وہ ایک دم ناراض ہو گئی۔

"ارے۔ تم عرض کرو..... بلکہ حکم کرو تو داؤد بھائی کو بلا دوں؟"

"زوئی! میں تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔" وہ ایک دم سٹپٹا کر چیخ اٹھی۔ کتنی بدتمیز ہو گئی تھی زویا پھر وہ دونوں وہاں سے نکل کر گھر کے اگلے حصے میں چلی آئیں جو قدرے اونچائی پر تھا۔

"کتنا پیارا گھر ہے تجمل آنٹی کا ہے ناں؟" زویا نے بالکونی میں کھڑے ہو کر نیچے جھانکتے ہوئے پوچھا تو وہ سر ہلا گئی۔ نجانے کیوں ایسا ہی ایک گھر اس کے تصور میں بھی تھا۔ اس نے کبھی خواب نہیں دیکھے تھے۔ خوابوں کے جزیروں میں بہت دور تک سفر نہیں کیا تھا مگر ایک ایسے ہی خوبصورت چھوٹے سے ہوادار گھر کا تصور اس کے خیالوں میں رہتا تھا اور آج اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس کا تصور اس کے خیالوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت میں اس کے سامنے تھا۔ ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

"گھر واپس کب چلیں گے؟" اس نے بمشکل اپنے آپ کو پہلے جیسا بہادر بناتے ہوئے کہا تو زویا نے سر ہلایا۔

"پتا نہیں۔ ابھی تک تو وادی جان وغیرہ کے اٹھنے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔" وہ ہنس رہی تھی۔

"اب میرا دل گھبرانے لگا ہے۔ تم پتہ کرو بلکہ امی کو کہو کہ اب چلیں۔ یہ کیا کسی کے گھر آ کر ہی بیٹھ جائیں۔ میں کہوں گی تو امی مزید پھیل کر بیٹھ جائیں گی جب کہ اب میرا دل یہاں سے بھاگ جانے کو چاہ رہا ہے۔" زویا سر ہلاتی اندر کی طرف بڑھ گئی تھی اور وہ وہیں کھڑی اس کی واپسی کی منتظر رہی۔

"خیریت..... یہاں کیوں کھڑی ہیں؟" وہ آسمان پر موجود چاند کو دیکھ رہی تھی جب وہاں سے گزرتے داؤد عالم کی نظر اس کی محویت سے دیکھتے سراپے پر پڑی تو وہ وہیں رک گیا۔

ماریہ نے اس کی آواز پر پلٹ کر دیکھا نظر بلا ارادہ تھی۔ وہ نظروں میں بے پناہ ستائش لیے دیکھ رہا تھا۔ ایک دو لمحے کو نظر ٹھہر گئی تھی۔ وائٹ کلف دار شلوار قمیض میں بھی وہ اپنے بھرپور وجود کے ساتھ سارے ماحول پر چھایا ہوا محسوس ہوا۔ وہ ہمیشہ اس سے لڑتی جھگڑتی ہی آئی تھی مگر آج..... اسے احساس ہوا کہ وہ اس کے یوں غور سے دیکھنے پر مسکرانے لگا ہے تو ماریہ نے فوراً نظر پھیری۔ دل میں ایک دم ہلچل ہونے لگی۔

"بدتمیز۔ دیکھ کیسے رہا ہے؟ نظر باز کہیں کا۔" اگلے ہی پل اپنے دل کو ڈانٹ کر اس نے اپنے سابقہ موڈ میں لوٹنا چاہا۔

"جی آپ کو میرے یہاں کھڑے ہونے پر اعتراض ہے کوئی۔" وہ جس طرح دیکھ رہا تھا ماریہ کا غصہ لوٹنے لگا۔ اس کی حرکت پر اس نے ٹوکنے کو طنزیہ پوچھا تھا۔ وہ ہنس دیا۔

"نہیں۔ ویسے مجھے خوشی ہو رہی ہے تمہیں یہاں دیکھ کر..... مجھے یقین نہیں تھا کہ تم آؤ گی......"

"چلیں۔ اب تو میں آ گئی ہوں۔ چاہے زبردستی ہی سہی۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟" وہ اپنے موڈ میں واپس لوٹ چکی تھی۔ سینے پر بازو رکھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔

"ہو سکتا ہے۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مستقل اس گھر میں آ جاؤ۔" ماریہ نے تو اسے پسپا کرنا چاہا تھا لیکن اس نے بھی اس کے اس انداز پر مسکرا کر ایک دم گویا توپ داغ دی تھی۔ وہ پہلے تو ہکا بکا ہوئی پھر نظریں پھیریں اور آخر میں جھنجلا کر رخ بھی موڑا۔

"آپ کا دماغ تو خراب نہیں۔ ہوش میں تو ہیں کیا فرما رہے ہیں؟" اپنے اتھل پتھل ہوتے دل کو زبردستی ڈانٹ کر اسے گھورا۔

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ سوچنا ضرور۔ امی وغیرہ کو بھیجوں گا۔ امید تو نہیں انکار ہوگا مگر تم جیسی سرپھری لڑکی سے نہ

جانے کچھ توقع کی جا سکتی ہے۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

ماریہ نے اسے یوں دیکھا جیسے کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے گی۔

"خوش فہمی ہے آپ کی۔ میں آپ جیسے اشارے باز شخص سے شادی کروں۔ کسی باؤلے کتے نے نہیں کاٹا..... مجھے اور آپ کو بہت کیسے ہوئی میرے متعلق ویسا سوچنے کی۔ میں آپ کو مسلسل نظرانداز کر رہی ہوں تو یہ صرف اسی کی وجہ سے ہے۔ آپ رشتہ بھیج کر تو دیکھیں میں لائبریری میں کی جانے والی آپ کی ساری حرکتیں سارے گھر والوں کو بتا دوں گی۔" اس نے گویا دھمکی دی تھی۔

"آپ سب لڑکیوں کے ساتھ آخر ایک ہی مسئلہ کیوں ہوتا ہے؟ شادی سے انکار کرتے کرتے آخر میں ہاں کہنے والی عادت..... آخر لڑکیاں چاہتی کیوں ہیں کہ لڑکے ان کے پیچھے خوار ہوں۔"

داؤد عالم نے اسے زچ کرنے کی حد ہی کر دی تھی۔

"بڑی خوش فہمی ہے آپ کو اپنے متعلق؟ چلیں آپ رشتہ بھیج کر دیکھیں؟ آپ اپنا حق استعمال کریں میں انکار کرتی ہوں۔ پتا چل جائے گا کون کس کے پیچھے خوار ہو رہا ہے..... اور کب تک ہوتا ہے؟"

وہ ایک دم چیلنج کے انداز میں اس کے سامنے تن کر کھڑی کہہ رہی تھی۔ داؤد کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو چکی تھی۔

"اوکے۔ پھر ڈن؟" اس نے ایک دم ہاتھ پھیلایا تو ماریہ ٹھٹکی۔ "میرا دعوہ ہے اب کی بار آپ خوار ہوں گی۔" جاندار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔

"شرم آنی چاہیے آپ کو۔" غصے سے ایک دم اس کا برا حال ہو گیا۔ "نجانے یہ شخص کیا ہے؟" وہ کڑھ کر رہ گئی۔

"ارے آپ تو ناراض ہو گئیں۔ بھئی چیلنج تو آپ کر رہی ہیں؟ میں نے تو صرف آپ کی ہاں میں ہاں ملائی ہے..... یا پھر میں سمجھوں آپ ابھی سے ہار مان رہی ہیں....." ماریہ کا جی چاہا اس کا مسکراتا منہ نوچ لے۔ گویا کوئی اثر ہی نہ تھا بلکہ "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔" والا حال تھا۔

"میں جتنا بھی آپ کا لحاظ کر رہی ہوں آپ اتنا ہی حد سے گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ اب کے مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" اسے انگلی سے تنبیہ کرکے وہ آگے بڑھنے کو تھی جب اس کی نمائندہ سے گزرتے داؤد عالم کی مضبوط گرفت میں ماریہ کی کلائی آ گئی۔

"بدتمیز انسان۔ میری کلائی چھوڑو۔" ماریہ کے لیے یہ کسی شاک سے کم نہ تھا۔ ایک دم پلٹ کر پھنکاری۔

"اگر نہ چھوڑوں تو......؟" داؤد عالم نے تو حد کر دی تھی۔ وہ مزاحمت کرتی اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ وہ جیسے آج اسے آخری حد تک زچ کرنا چاہتا تھا۔ ایک دم ماریہ مشتعل ہو گئی۔ کسی بھی نتیجے کی پروا کیے بغیر اس نے اپنے دانت اس کے ہاتھ پر گاڑ دیے۔ داؤد بلبلا کر ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ یوں بھاگی جیسے شکاری سے بچ کر کوئی جانور بھاگتا ہے۔

"پوری جنگلی ہے یہ لڑکی تو...... لگتا ہے اب انجکشن لگوانا پڑے گا۔" ہاتھ کی پشت سے خون کی بوندیں نکلتے دیکھ کر داؤد عالم بڑبڑایا پھر اپنی ہی حرکت پر وہ خفیف ہوتے ہنس دیا تھا۔

⊕ ⊕ ⊕

"کتنی پیاری نیند ہے ان دونوں کی اور ایک میں ہوں۔" رات کے دو بجے بستر پر کروٹ بدلتے تھک گئی تو ایک گہری سانس لے کر وہ بستر سے نکل آئی۔ ایک حسرت بھری نظر دونوں پر ڈال کر وہ درمیانی دروازہ کھول کر سائیڈ میں بنی بالکونی میں چلی آئی۔ وہ جب سے داؤد عالم کے گھر سے لوٹی تھی ایک عجیب بے چینی نے پورے وجود کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔

"اللہ تمہیں سمجھے داؤد عالم۔ کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ آخر کیا بگاڑا تھا میں نے تمہارا۔ اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی۔ ہر غم سے آزاد بے فکر...... مگر اب......" وہ وہیں ٹھنڈی زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کا دھیان خود بخود داؤد عالم کی طرف چلا گیا تو وہ پہلی نظر کے بعد مسلسل پیش آنے والے واقعات کو یاد کرتی چلی گئی اور پھر آخر میں آج اس کی، کی جانے والی حرکت۔

ماریہ کو کلائی دکھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے بازو پر اس جگہ انگلیاں پھیریں جہاں اب آگ کی لپٹیں سی محسوس ہو رہی تھیں۔

"یہ مجھے ہو کیا گیا ہے؟ کیوں میں نے اس چھوٹے سے واقعے کو اس قدر ذہن پر سوار کر لیا ہے...... بھول کیوں نہیں پا رہی میں......" اس نے بے بسی سے اپنی دکھتی کلائی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میرا وعدہ ہے اب کی بار آپ خوار ہوں گی۔"

ماریہ کا جی چاہا وہ رو دے۔ وہ تو دوسروں کو بے بس کرنے والی لڑکی تھی۔ کبھی کسی سے بے بس نہیں ہوئی تھی مگر داؤد عالم کیسے جان کی مصیبت بنتا چلا گیا..... کس قدر زعم سے اس نے کہا تھا وہ اس وقت کو کوسنے لگی جب وہ سامنے آیا تھا۔ کیا تھا میں وہاں جاتی ہی نہ اور اب..... ایک تو ان لوگوں کا گھر کتنا خوبصورت ہے اور ایک ہمارا ہے۔ بغیر نقشے کے بنایا ہوا سب کے کمرے ایک ہی سیدھ میں ہیں۔ نہ ہی لان ہے اور گیٹ کے نام پر ایک بڑا سا دروازہ..... اور ان کا گھر...... وہ ایک بار پھر وہیں جا پہنچی۔

"کتنا سکون تھا وہاں..... اگرچہ دعوت والا گھر تھا لیکن ذرا بھی افراتفری نہ تھی اور یہاں ہمارا گھر ہے۔ ایک آ رہا ہے ایک جا رہا ہے۔ دونوں بھابیوں کے بچے الگ شور مچاتے رہتے ہیں..... ذرا بھی تو پرائیویسی نہیں ہوتی۔" وہ جو اسی زندگی کو زندگی سمجھتی تھی۔ ہر وقت بلا گلہ کرتی رہتی تھی۔ ان لوگوں کی آمد و رفت سے خوش رہتی تھی۔ اب داؤد عالم کے گھر کا موازنہ کرتے ہوئے اپنا گھر عجیب سا لگا۔ یہ لوگ عالم صاحب سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ ان سے زیادہ خوشحال تھے مگر ان کی زندگی گزارنے کا ڈھب پرانا انداز تھا جب کہ ان کے ہاں سب کچھ نیا تھا اور شاید یہی کشش تھی جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ اتنی سطحی سی لڑکی نہیں تھی مگر اب کہ وہ خود بھی اپنی کیفیت کا اندازہ نہیں کر پا رہی تھی۔

"اور اگر داؤد عالم نے سچ مچ تجمل آنٹی کو بھیج دیا تو پھر کیا کروں گی میں؟ امی تو اب انکار کو بالکل نہیں مانیں گی..... اور کیا میں واقعی انکار کر پاؤں گی......" اچانک وہ اس نکتے پر آ کر جم ہی گئی۔ رات بیتی جا رہی تھی۔ رات کی شبنم اردگرد کے ماحول کو ٹھنڈا کر رہی تھی مگر ماریہ کو جیسے کچھ ہوش ہی نہ تھا۔ اپنی کیفیت کا تجزیہ کرتے کرتے صبح کا وقت آ گیا اور پھر اسے احساس ہوا کہ زندگی میں پہلی مرتبہ ہوش میں اس طرح پوری رات جاگی ہے..... اور اسی جاگنے نے اسے وہ بات سمجھا دی جو وہ ساری رات کڑھ کڑھ کر سوچتی رہی تھی۔ اس پر یہ انکشاف حیرت انگیز تھا کہ وہ داؤد عالم سے خار کھاتے کھاتے سنجیدہ ہو گئی ہے۔

زویا اور نازیہ کو اگر علم ہو گیا تو میری جان کو آ جائیں گی۔ نیچے چہل پہل ہونے لگی تھی۔ وہ بھی ایک گہری سانس لیتی واپس کمرے میں آ گئی۔ وہ دونوں اب بھی سو رہی تھیں۔ اسے رشک آیا ان کی نیند پر پھر آگے بڑھ کر اس نے زویا کو جھنجوڑ دیا۔

"کیا ہے بھئی..... سونے دو......" وہ جھنجلائی۔ "اٹھو زوئی! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے...... پلیز اٹھو۔" اس نے چادر کھینچ لی تھی۔ وہ آنکھیں ملتے اٹھ بیٹھی تھی۔

"کیا ہے۔ اب تمہیں کیا تکلیف ہو گئی؟" ہاتھ منہ پر رکھ کر اس نے جمائی روکی۔

"صبح کا وقت ہے نیچے شاید کچھ لوگ اٹھ گئے ہیں۔ سنو میں بہت پریشان ہوں۔ ساری رات نیند نہیں آئی۔" زویا نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے انداز میں کوئی بات تھی۔

"کیوں..... تم تو پریشان کرنے والی ہو تمہیں کیا پریشانی آ پڑی؟"

"پلیز! طنز نہیں کرو۔ میں سنجیدہ ہوں یہ سارا اس داؤد عالم کا قصور ہے۔ بڑے دعوے سے کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے خوار کرے گا..... بلکہ وہ تجمل آنٹی کو بھیجنے کا کہہ رہا تھا۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ میرے دل کی حالت بھی عجیب ہو رہی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بس رونا آ رہا ہے۔" وہ واقعی رو دینے کو تھی۔ زویا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ وہ جو کہہ رہی تھی واقعی سچ تھا۔

"کیا..... ؟ مجھے لگتا ہے تمہیں داؤد عالم سے محبت ہو گئی ہے۔" وہ ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔" جواباً وہ بغیر چونکے آرام سے بولی تو حیرت سے برا حال ہو گیا۔

"تم ہوش میں تو ہو نا......؟" زویا کو تو یہی لگا وہ نیند میں ہے۔ اکثر نیند میں وہ ایسی ہی حرکتیں کرتی تھی۔ جواباً اس نے شاکی نظروں سے دیکھا۔

"میں ساری رات سوئی نہیں۔" اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ وہ ہنس دی۔

"مجھے سب بتاؤ وہاں کیا ہوا؟" زویا نے سنجیدہ ہو کر پوچھا تو اس نے سب بتایا۔ اپنی حرکت سمیت۔

"ارے واہ داؤد بھائی تو بڑے چھپے رستم نکلے۔ میں تو سمجھی تھی انہیں صرف اشارے ہی آتے ہیں مگر وہ تو......" وہ رک گئی پھر شرارت سے اسے دیکھنے لگی۔ ماریہ نے کھینچ کر ہاتھ اس کی کمر پر دے مارا۔

"دفع ہو۔ میں بہت پریشان ہوں...... اور تم میری جان جلا رہی ہو۔"

"اس کا صرف ایک ہی حل ہے۔ تم آرام سے شادی کر کے داؤد بھائی کو پیاری ہو جاؤ۔ اس طرح تمہاری پڑھائی سے بھی جان چھوٹ جائے گی اور اس گھر سے بھی..... کتنے آرام سے اس نے کہہ دیا تھا۔ ماریہ نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ تو وہی بات ہوئی نا۔ اپنے ہی دام میں صیاد آ گیا۔ میں تم سے حل پوچھ رہی ہوں۔"

"لو...... اس میں کون سی عجیب بات ہے۔ شادی تو چچی جان کو تمہاری کرنی ہی ہے۔ آج نہیں تو کل اور کیا ہی بہتر ہو کہ وہ بندہ صرف داؤد بھائی ہی ہو۔ تجمل آنٹی کی طبیعت نہایت ہی مخلص اور ملنسار ہے۔ تم جیسی لڑکی صرف ان ہی کے ساتھ گزارہ کر سکتی تھی بیچارہ تمہیں سیدھا کرنے کے لیے داؤد بھائی جیسے لڑکے کو ہی ہونا چاہیے۔" وہ باقاعدہ خامیوں سمیت ذکر کر رہی تھی۔

"اور مجھے تو کچھ آتا ہی نہیں..... گھرداری میں تو بالکل کوری ہوں۔ ٹھیک سے چائے بنا نہیں سکتی..... مزید کیا خاک کروں گی......" اس نے ایک نیا مسئلہ اٹھایا۔ "اور تم مجھے شادی کا مشورہ دے رہی ہو۔"

"یہ اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں۔ تم کم عقل یا پھر سرے سے نااہل تو نہیں ہو۔ اب بھی سنجیدگی سے توجہ دو تو سب کچھ سیکھ سکتی ہو..... بلکہ ہم سے کئی گنا بہتر کارکردگی دکھا سکتی ہو۔ بس دھیان دو۔"

"اور وہ پڑھائی..... شادی کرنے سے کتابوں سے تو جان چھوٹ جائے گی ناں...... مجھے پڑھنا تو نہیں پڑے گا ناں؟" وہ بے چارگی سے پوچھ رہی تھی۔ زویا کا جی چاہا قہقہے لگائے۔ اسے محبت بھی ہوئی تھی تو اپنے مطلب کی۔ وہ شادی کا سوچنے پر آمادہ بھی ہوئی تھی تو صرف پڑھائی سے جان چھڑانے کے لیے۔

"نسرین چچی کی تو میں تمہیں گارنٹی دیتی ہوں لیکن داؤد بھائی کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔ چچی تو پہلے ہی تیار بیٹھی ہیں۔ کوئی ایسا رشتہ ملے جو تمہیں سب خامیوں سمیت قبول کر لیں تو وہ جھٹ منگنی پٹ بیاہ کریں۔ ایک دن کی دیر نہ لگائیں۔ اب انہیں موقع مل رہا ہے تو وہ کیوں دیر لگائیں گی..... بلکہ خوش ہوں گی ان کا دردِ سر ختم ہوا۔" وہ اس کے منہ پر اس کی خامیوں کا ذکر کر رہی تھی۔ ماریہ نے گھورنا چاہا مگر گھور نہ پائی۔

"اگر پڑھائی سے جان چھوٹتی ہے تو سودا برا نہیں۔ میں گھرداری سیکھ لوں گی..... بلکہ سب کچھ کر لوں گی..... بس داؤد عالم کو پتہ نہ چلے۔ میں اس کے لیے یہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔" ماریہ کہہ رہی تھی اور زویا اندر ہی اندر ہنس رہی تھی بلکہ جی تو چاہ رہا تھا

کہ اس کا باقاعدہ مذاق اڑائے۔ کل تک یہ لڑکی داؤد عالم سے خار کھاتی تھی۔ اس کا نام سننے کی روادار نہیں تھی اور اب اس سے محبت کر رہی تھی۔ وہ بھی اس انداز میں..... وہ خوب محظوظ ہوئی۔

اگلے دن تک وہ اسی کیفیت میں گھری رہی۔ زویا نے نازیہ کو بھی بتا دیا تھا۔ دونوں ہر وقت اس کا سر کھاتی رہتیں وہ دونوں کے الٹے سیدھے مشوروں پر عمل کرتی۔ اگلے تین چار دن تک ایسی حماقتیں کرتی رہی کہ سارے گھر والے اس کی اس کایا پلٹنے پر حیران ہوتے رہے۔ کہاں وہ کسی کے ہزار بار ٹوکنے کے باوجود کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی تھی۔ ان تین دنوں میں وہ بغیر کسی کے کہے ہی ہر کام کرنے کو تیار تھی۔

روز نت نئے تجربے کرتے کرتے کبھی ہاتھ جلاتے اور کبھی پیر پر گھی کے چھینٹے گراتے وہ کچھ نہ کچھ کرنے ہی لگی تھی۔ کالج سے آنے کے بعد وہ کچن میں زویا اور نازیہ کے ساتھ کھڑی ہو جاتی تھی۔ کبھی سبزی کاٹ دیتی، کبھی سلاد بنا دیتی، چاول چن دیتی یا برتن دھونے کے ساتھ ساتھ چھوٹے موٹے کام کر دیتی۔

اس دن وہ کچن میں کھڑی کباب تل رہی تھی۔ زویا سموسے بنا رہی تھی۔ کبابوں کے بعد سموسے تلنے تھے جب فرائی پین میں کباب رکھتے چھینٹے اڑ کر اس کے ہاتھوں پر جل ہونے بنا گئے تھے وہ کفگیر وہیں پھینک کر پورے کچن میں بریک ڈانس کرنے لگی تھی۔

"ہائے امی جی..... ہائے میرا ہاتھ..... ہائے اللہ۔" وہ مسلسل دہائی دے رہی تھی۔

"توبہ ہے تم تو حد کرتی ہو۔ دکھاؤ مجھے اپنا ہاتھ۔" زویا جو سموسے بنا رہی تھی ایک دم سب چھوڑ کر اس کی طرف بڑھی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھا تو بائیں ہاتھ کی پشت واقعی خاصی جل گئی تھی۔ اس نے ماریہ کا چہرہ دیکھا۔ آنسوؤں سے تر تھا۔ اسے ماریہ پر ترس آیا۔

"تم رہنے دو۔ میں کرلوں گی۔ نازیہ تو یوں بھی ساتھ کام کروائے گی تم جاؤ۔" کیبن سے ٹیوب نکال کر اس کے ہاتھ پر لگاتے ہوئے اس نے کہا تو وہ دوسرے ہاتھ سے چہرہ صاف کرکے نفی میں سر ہلانے لگی جب کہ لبوں سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔

"یہ تو اب روز جلیں گے۔ میں کب تک یوں ہی بچتی رہوں گی۔ میں کر لیتی ہوں۔" زویا نے اب کے ایک بار پھر اسے بغور حیران ہو کر دیکھا۔ اس قدر بڑی تبدیلی۔

"سنو۔ تم کوئی ڈرامہ تو نہیں کر رہی ناں..... تمہیں واقعی سچ مچ داؤد عالم سے محبت ہوئی ہے ناں؟" اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ ماریہ شاکی نظروں سے دیکھ کر اپنا ہاتھ چھڑا کر دوبارہ اوون کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" اس نے دوبارہ چمچ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو بہت سیریس حالت لگ رہی ہے۔ رہنے دو۔ اب اتنی بھی سعادت مندی تم پر اچھی نہیں لگتی..... میں کرلوں گی..... داؤد عالم اب اتنے بھی اچھے نہیں کہ تم ان کے لیے اپنے پھول جیسے ہاتھ ہی برباد کرلو۔" اس نے اس کے ہاتھ سے چمچ لینا چاہا مگر وہ ہاتھ پرے کر گئی۔

"ان چند دنوں میں مجھ پر اپنی ذات کے بہت سے انکشافات ہوئے ہیں۔ میں سب کر سکتی ہوں۔ مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ میں جو یہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی رہتی ہوں۔ وہ کسی کے لیے ناقابل برداشت بھی ہو سکتی ہیں۔ تم لوگ بھی تو یہی کام کرتے ہو..... مگر اب جب خود یہ سب جھیل رہی ہوں تو لگ رہا ہے میں ہمیشہ سے غلط تھی۔ مجھے یہ سب بہت پہلے سے کرنا شروع کرنا چاہیے تھا۔ داؤد عالم تو خوامخواہ ایک بہانہ بنا ہے۔"

"ارے..... بس..... بس..... اتنے چرکے ہی کافی ہیں کہیں میں بے ہوش ہی نہ ہو جاؤں..... اف اللہ یقین نہیں آ

رہا۔ واقعی واضح تبدیلی اور وہ بھی تم میں..... مل جائیں داؤد بھائی تو شکر ادا کروں گی کہ ہماری اس قدر سر پھری لڑکی کو سیدھا کر دیا۔" زویا واقعی حیرت زدہ تھی۔

"نہیں۔ تم اسے کچھ نہیں بتاؤ گی۔ وہ پہلے ہی خوش فہمیوں میں مبتلا ہے۔ مزید پھیل جائے گا کہ میں اس کے پیچھے خوار ہو رہی ہوں۔" اس نے فوراً اسے ٹوک دیا تو زویا نے ہنس کر اثبات میں سر ہلایا۔

ہر کوئی ماریہ کی ہمت افزائی کر رہا تھا۔ وہ سب کو خوش دیکھ کر بہت خوش ہوگئی اور پہلی دفعہ اسے محسوس ہوا کہ بعض اوقات دوسروں کو خوش کرنا بھی کس طرح روح کی طمانیت کا سبب بنتا ہے۔"

اگلی شام اس نے فیرنی بنائی تھی جسے دیکھ کر زویا اور نازیہ نے خوب مذاق اڑایا تھا۔

"بھئی یہ کیا چیز؟ اسے کم از کم فیرنی نہیں کہہ سکتی میں..... ہاں فرنی کے علاوہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔" نازیہ باؤل میں ادھر ادھر پانی کی طرح بہتے آمیزے کو دیکھ کر ہنسی تھی۔

"دفع ہو جاؤ۔ تم جیسے بدذوق لوگ کیا جانیں کہ اصل میں فیرنی ہوتی کیا ہے؟" اس نے باؤل اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور پلٹ کر فریزر میں رکھا۔

"سن رہی ہو زویا! میں جو گزشتہ آٹھ سالوں سے کچن میں کام کر رہی ہوں بدذوق ہوں..... اور مجھے فیرنی کا کچھ پتہ ہی نہیں۔" اس نے رو دینے والی زویا کو بھی گھسیٹا تو وہ بھنا کر پاؤں پٹختی وہاں سے باہر نکل آئی اور رات کو جب سب چائے نوش فرما رہے تھے تو میٹھے کی طلب ہوئی بلکہ فرمائش ہوئی تھی۔ وہ جو نازیہ کی باتوں پر پہلے ہی بوکھلائی ہوئی تھی بنپٹا گئی۔ نازیہ تو موقع کی تلاش میں تھی۔ فوراً فریج سے باؤل نکال لائی۔

"یہ کیا چیز ہے بھئی؟" زوہیب بھائی نے باؤل میں جھانکتے ہوئے پوچھا تو وہ خفیف ہوئی۔

"فیرنی ہے..... وہ بھی ہماری ماریہ نے بنائی ہے۔ ٹیسٹ کریں اور داد دیں بنانے والی کو۔" نازیہ تو پورا "بی جمالو" کا کردار ادا کر رہی تھی۔ وہ دانت کچکچا کر رہ گئی جب کہ زوہیب بھائی ہنس دیئے۔

"نہ بھئی نہ..... میں تو یہ تجربہ افورڈ نہیں کر سکتا۔" انہوں نے ہنس کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"تو ادھر دیں خود کھالوں گی۔ خوامخواہ ہی فریزر سے نکال لائی ہے۔" ماریہ کا غصے سے برا حال تھا۔

"نہیں بھئی۔ ہماری بیٹی نے اتنی محنت کی ہے۔ لاؤ نازیہ مجھے پیالی میں ڈال دو۔ میں کھاؤں گا۔" اسے یوں سب کے مذاق کا نشانہ بنتے دیکھ کر تایا ابو کو ذرا اس پر ترس آیا۔ نازیہ نے پیالی میں فیرنی نما آمیزہ نکال کر انہیں دیا۔ انہوں نے چمچ بھر کر منہ میں ڈالا تو ماریہ کی سانس اٹکنے لگی۔

"واہ بھئی۔ ذائقہ تو اچھا ہے۔" ایک دو منٹ ذائقہ محسوس کرکے انہوں نے سر ہلایا اور پھر کھانے لگے۔ انہیں اس قدر رغبت سے کھاتا دیکھ کر دوسرے لوگ بھی کھانے لگے۔

"واقعی یہ ماننا پڑے گا..... کہ ذائقہ لاجواب ہے۔ شکل کیا ہے..... شکل تو انسان کی بھی بری ہو سکتی ہے۔ اصل چیز تو باطن کی ہوتی ہے ناں۔" حمزہ بھی اسے چڑا رہا تھا۔ "ویسے اگر ماریہ کی شکل اچھی ہے تو اندر بھی اچھا ہونا چاہیے۔ کیوں تایا ابو....." وہ سب باقاعدہ اس کا مذاق اڑانے لگا تو ماریہ بھنا اٹھی۔

"تم تو رہنے ہی دو۔ ایک تو پیالی بھر کر کھا بھی لی ہے اور پھر باتیں کر رہے ہو۔ خود بناؤ تو پتا چلے۔" اس کا غصہ دیکھنے کے قابل تھا۔ سب ہی ہنس دیئے۔

"بری بات ہے حمزہ! بہن کا مذاق نہیں اڑاتے۔ ہماری بیٹی نے اتنی اچھی کوشش کی ہے۔ اسے تو انعام ملنا چاہیے۔ بولو

ماریہ کیا لوگی؟" حمزہ کے والد چھوٹے چچا نے حمزہ کو ٹوک کر اسے پیار سے پوچھا تو وہ ایک دم چہکی۔

"میں جو مانگوں گی وہ دیں گے ناں۔" اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ انہوں نے سر ہلایا۔

"تو امی سے اجازت دلا دیں۔ میں مزید پڑھنا نہیں چاہتی۔ قسم سے کالج جاتے ہوئے میری جان جاتی ہے۔ کتاب کو ہاتھ لگاؤں تو نیند آنے لگتی ہے۔ جو کہیں گے کروں گی مگر بی اے نہیں کروں گی۔" سب نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ خاص طور پر امی نے جو بیٹی کی پہلی کاوش پر مسکرا رہی تھیں مگر وہ اب گھورنے کا کام سرانجام دے رہی تھیں۔

"تم اگر اس مقصد کے لیے یہ سب کر رہی ہو ہاں تو مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر تم یہ سیکھو گی۔ چاہے رو کر یا ہنس کر۔ اس وقت کی اہم ضرورت تعلیم ہے۔ بی اے سے پہلے تو میں تمہاری شادی کا بھی نہیں سوچوں گی۔ کالج چھوڑنے کا خیال ذہن سے نکال دو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" امی نے فوراً ڈانٹ دیا تھا۔ اس نے منہ بسور کر سب کو دیکھا۔ سب ہی کیا متفق نظر آئے۔ وہ پاؤں پٹختی ہال کمرے سے نکل آئی..... اور نسرین بیگم نے اسے وہاں سے نکلتے ہوئے تاسف بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

اگلے دن کالج سے واپسی پر وہ تینوں سواری کی تلاش میں کھڑی تھیں۔ ان کے لیے رکشہ لگوایا ہوا تھا جو انہیں چھوڑنے بھی آتا تھا اور لینے بھی۔ آج ان سے چھٹی کر لی تھی۔ صبح جیسے تیسے کر کے وہ آ گئی تھیں مگر اب واپسی کا مسئلہ بنا ہوا تھا۔

"بھئی کیا مصیبت ہے۔ ان کا بس چلے تو وہ رات کو بھی کالج بھیجیں۔" انتظار سے اکتا کر کتابیں زوبیا کو پکڑا کر کالج کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"سواری مل جائے گی۔ تم یونہی اکتا جاتی ہو۔" نازیہ نے اس کی مرجھائی صورت دیکھ کر قدرے سکون سے کہا۔ دور تک آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھنے لگی۔ یونہی دیکھ رہی تھی جب کوئی بائیک زن سے آگے بڑھی تھی مگر پھر پلٹ کر ان کے قریب آکر رکی تھی۔ ماریہ نے چونک کر دیکھا۔ داؤد عالم کو دیکھ کر اس کا دل ایک دم دھڑکنے لگا۔

"یہ یہاں کیسے؟" وہ حیران ہوئی۔

"السلام علیکم! آپ لوگ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟ کوئی کنوینس کا مسئلہ ہے؟" اس نے بائیک روک کر دونوں سے پوچھا تھا جب کہ ان دونوں سے قدرے فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ماریہ کو دیکھا۔

"وعلیکم السلام! جی آج ہمارا رکشے والا نہیں آیا مگر اب کوئی سواری نہیں مل رہی۔" نازیہ نے رسان سے جواب دیا۔

"اوہ آئی سی۔ میں تو ادھر سے گزر رہا تھا۔ آپ لوگوں کو دیکھ کر رک گیا۔ بتائیں اس سلسلے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" کافی مہذبانہ انداز میں وہ پوچھ رہا تھا۔ گزشتہ ملاقات کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ بغور دیکھے گئی۔

"خدمت تو یہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں گھر چھوڑ آئیں مگر آپ تو بائیک پر سوار ہیں بھلا یہ خدمت کیسے سرانجام دے سکیں گے۔" زوبیا نے ہنس کر کہا تو وہ بھی ہنس دیا۔

"میرا خیال ہے ایک فرد تو بائیک پر بیٹھ ہی سکتا ہے کیوں؟" وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ مسکرا کر ماریہ کو دیکھا تو وہ تو جل ہی گئی جب کہ نازیہ اور زوبیا ہنس دیں۔

"وہ ایک فرد ماریہ کبھی نہیں ہو سکتی۔ انگور کھٹے ہیں۔ اس لیے ہم میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیں۔" زوبیا نے بھی برملا کہا تو نازیہ اور داؤد کے ہنسنے کے ساتھ وہ بھی جھینپ گئی۔

"میرا خیال ہے۔ دو خواتین تو بیٹھ ہی سکتی ہیں..... اگر اعتراض نہ ہو تو۔"

"نہیں جی تین بھی بیٹھ سکتی ہیں..... بشرطیکہ ہم میں سے کسی ایک کو بائیک چلانا آتی ہو۔" نازیہ نے بھی برجستہ کہا تھا۔

کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"چلیں..... خدمت کرنا ہی چاہتے ہیں تو ماریہ کو لے جائیں۔ ہم تو عادی ہیں۔ وہ اس طرح دھوپ میں کھڑی مر رہی ہے۔ ان سے پہلے کہ ہمیں اس کو اٹھانے کے لیے گھر سے کسی کو بلوانا پڑے آپ اس کو لے جائیں۔" وہ مسلسل چپ تھی۔ زوبیا نے شرارتاً کہا تھا جواباً داؤد عالم نے یوں سانس کھینچ لی کہ خوامخواہ ماریہ چڑ گئی۔

"معاف کیجئے گا زوبا جی! مجھے صحیح سلامت گھر پہنچنا ہے اور میری والدہ کو بھی میری ابھی ضرورت ہے۔ کبھی یہ جنگلی بلی بنی ہوتی ہیں اور کبھی جھگڑالو ٹائپ خاتون..... اب کیا پتہ یہ شیرنی بن کر مجھے ہی دبوچ لیں۔ البتہ آپ دونوں کو لے جا سکتا ہوں۔" وہ جب کہہ رہا تھا اور ماریہ اندر ہی اندر وہ پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

"ہاں مجھے تو جیسے بڑا شوق ہے تم سے لفٹ لینے کا۔" وہ دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔ "جی نہیں شکریہ۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں آپ کی اس اعلیٰ وارفع بائیک کی سواری کا۔ جائیے راستہ ناپیے اپنا۔" وہ چپ رہنے والی نہ تھی۔ دل کا کیا تھا ایک پتھر رکھ کر وہ فوراً اس سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار تھی۔

"تھینک گاڈ۔ شکر ہے آپ بول سکتی ہیں۔ میں سمجھا کہیں زبان رکھ کر بھول چکی ہیں۔" وہ کہہ کر پچھتائی۔ اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورا جب کہ نازیہ اور زوبیا ہنس پڑیں۔

"آپ سے بہتر بول سکتی ہوں اور ویسے بھی مجھے فضول لوگوں سے بات کرنے کی وہ بھی خوامخواہ عادت نہیں ہے۔" اپنی لفٹ ستانے کو وہ یہ بھی کہہ گئی۔ داؤد عالم نے ایک افسوس بھری سانس خارج کرتے نازیہ اور زوبیا کو شرارت بھری آنکھوں میں دیکھا۔

"مجبوری کی مجبوری۔ سب جھیلنا پڑ رہا ہے۔ اوکے مجھے علم ہوتا کہ یوں سر راہ ملاقات ہو سکتی ہے تو کسی دوست کی کار ہی لے آتا۔ تم لوگوں کو افسوس تو نہ ہوتا۔" اس نے بھی دل جلانے کی حد کر دی تھی۔ نازیہ نے شرمناک نظروں سے دونوں کو دیکھا جو ہنس رہی تھیں۔

"مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔" وہ بھی بولنے پر مجبور تھی تو اس نے سر ہلایا۔ وہ سر پیٹ کر رہ گئی۔

"تو پھر مجھے کچھ جلنے کی بو کیوں آ رہی ہے؟" وہ جھک سے اوئی۔ وہ زود رنج نظروں سے اسے دیکھا۔ دو آنکھوں میں شرارتی مسکان لیے پوری طرح متوجہ تھا۔ ایک دم وہ آؤٹ ہوئی تھی۔ پاؤں پٹخ کر زوبیا اور نازیہ پر چڑھ دوڑی۔

"تم دونوں کو گھر جانا بھی ہے یا ہر ایرے غیرے فضول لوگوں کے ساتھ کھڑے ہو کر گپیں ہانک کر اپنا تماشا کرانا ہے۔" وہ جب بھی آؤٹ ہوئی تھی یوں ہی بولتی تھی۔ زوبیا سے کتابیں چھین کر کالج کی طرف بڑھی۔

"جب کوئی سواری مل جائے تو بلا لینا۔" ایک سلگتی نظر داؤد عالم اور دونوں پر ڈال کر وہ کالج میں گھس گئی۔ داؤد ہنس دیا۔

"کیا چیز ہے یہ......؟"

"ویسے داؤد بھائی! یہی حال رہا تو میں سوچ رہی ہوں کہ آپ دونوں کا گزارا کیسے ہوگا؟" نازیہ کے لہجے میں اب بھی شرارت تھی۔ داؤد نے ایک سانس کھینچی۔

"ہو ہی جائے گا۔ تم دونوں دعا کرنا۔ میں گھر خیریت سے پہنچ جاؤں۔ ویسے کسی کو یوں جلتے کڑھتے بددعائیں دیتے چھوڑ کر جانا اچھی بات تو نہیں مگر کیا کیا جا سکتا ہے..... آپ کی کزن صاحبہ میں انا بہت ہے۔ چاہے اپنا نقصان کیوں نہ ہو۔ وہ پہلے بولتی ہیں پھر سوچتی ہیں۔ ایسے لوگوں کی بددعائیں بڑا اثر رکھتی ہیں۔ چلو ہاتھ تو انجکشن سے ٹھیک ہو سکتا ہے مگر کوئی ہڈی پسلی فی الحال افورڈ نہیں کر سکتا۔ اوکے اللہ حافظ۔" وہ شرارت سے کہہ کر بائیک بھگا لے گیا۔ نازیہ اور زوبیا ہنستی چلی گئیں۔

وہ ہاتھ لے کر کمرے میں آیا تو کافی دیر سے بجتا موبائل اٹھالیا۔ وہاں آنے والا نمبر دیکھ کر وہ مسکرا رہا تھا۔

''السلام علیکم۔'' تولیے سے بال خشک کرتے دوسرے ہاتھ سے موبائل کان سے لگایا۔

''وعلیکم السلام داؤد بھائی کیا حال ہے؟'' دوسری طرف زویا تھی۔ داؤد نے تولیہ اسٹینڈ پر ڈال کر خود کو صوفے پر گرا لیا۔

''بالکل اے ون۔ تم بتاؤ ادھر کا مطلع کیسا ہے؟ دوپہر کو کافی ابر آلود لگ رہا تھا بلکہ گھر پہنچتے پہنچتے مجھے محسوس ہوا جیسے بارش بھی ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کافی گھن گرج کے ساتھ بارش ہوئی ہے اور تمہاری کال بھی اسی گھن گرج کا پیش خیمہ ہے کیا؟'' دوسری طرف خوب صورت ہنسی کی جھنکار سننے کو ملی تھی۔

''آپ بھی کیا چیز ہیں؟ اب بس بھی کریں۔ اتنا کافی ہے۔ وہ تو بے چاری جل کر کڑھ کڑھ کر آدھی ہو گئی ہے بلکہ ہاتھ جلا کر اس کے پھول سے ہاتھوں کا ستیاناس ہو رہا ہے۔ آپ کو ترس نہیں آتا اس پر......''

''کبھی آتا تھا ترس مگر اب نہیں آتا۔'' داؤد نے گنگنا کر کہا تو زویا ہنستی چلی گئی۔ ''مادام! میں نے فرمائش نہیں کی تھی کہ پھول سے ہاتھوں کا ستیاناس کیا جائے۔ آپ کی کزن صاحبہ خود ہی اعلیٰ و ارفع چیز ہیں۔ وہ کسی کی باتوں میں آنے والی نہیں۔'' بالوں میں انگلیاں پھیرتے اس نے کہا تھا۔

''مگر وہ آپ کی باتوں میں آگئی ہے..... سچ سچ آپ اسے بری طرح خوار کر رہے ہیں۔ پہلے وہ ہر وقت اس بات پر کڑھتی رہتی تھی کہ اسے روز لائبریری میں ایشاد کرنے والا شخص آخر کون ہے؟ اس کا کیا مقصد ہے؟ وہ تو ان ہی دنوں آپ سے دو ہاتھ کرنے پر بضد تھی۔ وہ تو بھی شکر ہے کہ میری اور نازیہ کی بروقت کی بریفنگ نہ ہوتی..... ورنہ آپ کا بھانڈا کب کا پھوٹ چکا ہوتا! آپ کو علم نہیں وہ کیا چیز ہے؟ اگر اسے علم ہو گیا کہ آپ اسے الو بنا رہے ہیں تو خدا کی قسم وہ آپ کی گردن دبوچ لے گی..... جناب چاہ رہے تھے وہ تو ہو گیا۔ اب تو شکر ہے بتلائے درد ہونے کے ساتھ ساتھ بتلائے درد خانہ داری بھی ہو گئی ہیں اور بھی نجانے کیا کیا ہونے کے امکانات ہیں۔ اب اس پر ترس کھالیں۔ اس نے تو کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ آپ کی خاطر کیا کیا نہیں کر رہی..... جسے ٹھیک سے جھاڑو پکڑنا نہیں آتی تھی اس کے ہاتھوں میں چھالے دیکھ کر میرے نازک دل کو تو بڑی تکلیف ہوتی ہے اور آپ کتنے پتھر دل ہیں ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔'' وہ زکی تو داؤد نے ایک گہری سانس کھینچی۔

''اثر لینے کا مطلب ہے..... اس کو اپنے سر پر سوار کر لوں..... بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اسے تھوڑی اور دقت پیش آجائے جب وہ یہاں آئے تو مجھے اس پر زیادہ محنت نہ کرنی پڑے۔ میں جس انداز میں ڈھالنا چاہوں وہ ڈھل جائے۔ ادھر سے اب اماں باقاعدہ ناراض ہونے لگی ہیں کہ نہ میں انہیں لائبریری والی لڑکی سے ملا رہا ہوں اور نہ ہی ادھر ہاں کر رہا ہوں..... کچھ نہ پوچھو کس طرح ان دو محاذوں پر لڑ رہا ہوں۔''

''آپ تو پھر بھی فائدے میں ہیں جب کہ صرف اپنی ذات سے لڑنا سب سے مشکل کام ہوتا ہے۔ وہ لڑکی جس نے زندگی میں کسی چیز کو سنجیدہ ہی نہ لیا ہو وہ اچانک کسی ایک شخص کی خاطر اپنی پوری زندگی کو ہی بدلنے پر مصر ہو جائے تو اس انقلاب کو آپ کیا کہیں گے...... یا اچانک تو وہ نما نہیں ہوا ہوگا...... کتنا اس نے اپنے آپ سے، اپنی عادتوں سے اور اپنی فطرت سے جھگڑا کیا ہوگا۔ صرف اپنی ذات کو نظر انداز کر کے ایک دم کسی کی اہمیت تسلیم کر لینا بہت بڑی بات ہے۔ داؤد بھائی وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے لیے جس نے محبت جیسی لغویات کو کبھی گردانا ہی نہ ہو، جس کے نزدیک شادی جیسا فعل صرف حماقت اور اپنی زندگی برباد کرنا ہو، وہ اگر اپنے آپ کو بدلنے کے لیے تیار ہو جائے بلکہ عملی طور پر اس کا مظاہرہ بھی کرے تو ایسے میں آپ یہ توقع رکھیں کہ وہ خود آگے بڑھ کر اظہار محبت کرے تو آپ غلط ہیں۔ وہ بہت اچھی ہے۔ سونے جیسا دل ہے اس کا۔ پلیز اسے مزید خوار مت کریں۔ وہ بہت بدل چکی ہے بلکہ آج جب سے اس نے آپ کو دیکھا وہ متضاد خیالات میں گھری ادھر سے ادھر چکرا رہی ہے۔ چپکے چپکے رو بھی چکی ہے۔

نے شادی سے انکار کیا ہے اور اب وہ آپ کی منتظر ہے تو آپ کو بھی اس کے احساسات کا پاس رکھنا ہوگا۔''

داؤد مسکرا رہا تھا۔

''آپ کے کہنے پر میں نے اور نازیہ نے وہ سب کیا ہے جو شاید اس کے علم میں آجائے تو وہ ہمیں قتل کروا ڈالے۔ اسے اپنی انا بہت عزیز ہے اور اگر اسے علم ہو گیا کہ ہم شروع سے آخر تک اس واقعے میں شامل ہیں تو نجانے وہ کیا کرے..... بہت ہو گیا ڈرامہ اور مذاق آپ کو اب کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔'' وہ چپ ہو گئی۔

''ٹھیک ہے میں سوچتا ہوں۔ وہ تو ٹھیک ہے ناں۔ میرے دوپہر والے مذاق کا اس نے اثر تو نہیں لیا ناں۔''

''ابھی تک تو اس نے آپ کی کج ادائی کا ہی اثر لیا ہوا ہے، مزید کوئی ڈرامہ بازی کیے بغیر لوہا گرم ہے چوٹ لگالیں تو بہتر ہے اور ہاں آج کل گھر میں ایک رشتہ آیا ہوا ہے۔ میری ممانی کے بھائی کا ہے۔ رشتے دار ہیں۔ اب تو وہ سلجھی جا رہی ہے تو نسرین چچی بھی سنجیدہ ہو رہی ہیں۔ پڑھائی میں ماریہ کی دلچسپی زیرو ہے۔ صرف وہ ایم اے کی منتظر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شادی تو نہیں البتہ منگنی ضرور کریں گی۔''

سنجیدگی سے اس نے بتایا تو داؤد عالم ایک دم پریشان ہو کر سیدھا ہوا۔

''کیا...... ہوش میں تو ہو تم...... اور تم اس رشتے کے متعلق اب بتا رہی ہو...... اتنی محنت میں نے کی ہے...... اور کوئی اور لے اڑے ناممکن...... پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے تا کہ میں امی سے بات کرتا......'' وہ ایک دم ناراض ہوا تھا اس پر۔

''مجھے خود ابھی علم ہوا ہے۔ وہ لوگ اتوار کے دن آرہے ہیں۔ دراصل جیسے ہی ہم گھر پہنچے تو ان لوگوں کا فون آگیا۔ ماریہ تو نتے ہی کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ رو رو کر برا حال ہو رہا تھا اس کا۔ ابھی وہ نکلی ہے تو میں آپ کو فون کرنے آئی ہوں۔''

''اچھا کیا تم نے..... میں امی سے بات کرتا ہوں۔ کل ہی وہ اور بہن وغیرہ آئیں گی اور ہاں اپنی کم عقل کزن کو مت بتانا پہلے ہی اس میں عقل کی کمی ہے۔ خوامخواہ کوئی نیا ایشو اٹھائے گی۔ انا تو ویسے بہت ہے اس میں..... لیکن میرا مقصد ابھی چند دن اور بڑا دینے کا ہے..... اور یہ چند دن مزید تم لوگوں کو میرا ساتھ دینا ہے سمجھیں......'' وہ ایک دم اسے کہہ رہا تھا۔ دوسری طرف وہ ہنسی۔

''او کے۔ سمجھ گئی باس۔ اور کیا حکم ہے؟'' وہ بھی کھل کر ہنسا تھا۔

''حکم یہ ہے کہ لوہا گرم ہے۔ تم مسلسل چوٹ لگاتی جاؤ۔ لوہا مزید پگھلتا جائے گا۔'' اب وہ ہلکا پھلکا ہو کر کہہ رہا تھا۔ زویا ہنستی چلی گئی۔

''ٹھیک ہے مگر یہ آخری بار ہے۔ پہلے ہی میں اسے بہت تکلیف دے چکی ہوں۔ آپ اپنا ڈرامہ فولڈ کر لیں۔ اس سے پہلے کہ میں خود بتا دوں۔'' اب کے وہ اسے چڑا رہی تھی۔

''ضرور ضرور بتاؤ، اگر تمہیں اپنی گردن پیاری نہیں۔ تمہاری کزن تو ویسے بھی جنگلی بلی ہے پوری۔'' داؤد نے آرام سے کہا تھا۔

''ایک منٹ داؤد بھائی! مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے دوسرے فون سے کوئی سن رہا ہے۔ میں آپ سے پھر بات کروں گی۔ اللہ حافظ۔'' ایک دم عجلت سے کہتے زویا نے فون بند کر دیا تھا۔ داؤد عالم نے ایک گہری سانس خارج کرتے موبائل سائیڈ پر رکھا۔

ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ جیسے ہی تیز تیز قدم اٹھاتی ٹی وی لاؤنج میں آئی تو وہاں ماریہ کو ریسیور پکڑے دیکھ کر اپنی جگہ پر جھجکی۔ وہ اس کی داؤد عالم سے ہونے والی تمام گفتگو سن چکی تھی۔ اسے یوں چپ سادھے بیٹھے دیکھ کر زویا نے خشک ہوتے حلق کو تر کرتے آگے قدم بڑھائے۔

"ماریہ!" اس نے قریب پہنچ کر اسے پکارا۔ اس نے کریڈل پر ریسیور رکھ کر اسے جس انداز میں دیکھا۔ زویا کا دل چاہا کہ وہ زمین میں سما جائے۔

"ماریہ میں..... وہ داؤد بھائی......" اس نے اس سے کچھ کہنا چاہا تھا مگر وہ اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر وہاں سے بھاگ گئی۔

"ماریہ! بات سنو میری۔ پلیز ماریہ۔" وہ بھی پیچھے لپکی تھی مگر وہ کمرے میں جا کر دروازہ لاک کر گئی تھی اور وہ بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔ ماریہ کا ردعمل انتہائی شدید تھا وہ خوفزدہ ہوئی۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ تقریباً سب ہی اپنے کمروں میں سو گئے تھے۔ نازیہ نو بجے ہی سو گئی تھی۔ ماریہ نے جب سے رشتے کا سنا تھا تب سے کمرے میں بند تھی۔ آج تو اس نے کچن میں ان کا ہاتھ بھی بٹایا تھا۔ نسرین بیگم جانتی تھیں وہ رشتہ سن کر خاموش احتجاج کر رہی ہے تو انہوں نے بھی ذرا توجہ نہ دی۔ اب انہوں نے سوچ لیا کہ پہلے ہی دو رشتے ہاتھ سے گنوا چکی ہیں اب وہ مانے یا نہ مانے وہ ہاں کر دیں گی۔ اسی لیے اس کا رویہ باوجود بھی نظر انداز کر گئیں۔ زویا کافی دیر تک اسے تسلیاں دیتی رہی تھی پھر وہ لیٹ گئی تھی تو وہ نیچے چلی آئی۔ برآمدے میں ہی رکھا فون اسٹینڈ دیکھ کر اس کے دل میں داؤد سے مسئلہ ڈسکس کرنے کا خیال آیا تو نمبر ملا لیے۔ اسے تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ ماریہ نیچے بھی آسکتی ہے اور پھر دوسرے فون سے اس کی ساری گفتگو بھی سن لے گی..... اور اب اس کا ردعمل... اس کا دل خوف سے سمٹنے لگا۔ وہ نجانے کیا سمجھے۔ وہ جوں جوں سوچ رہی تھی پریشان ہو رہی تھی۔ وہ کافی دیر تک ادھر ادھر ٹہلتی رہی مگر اس طرح ساری رات تو نہیں گزر سکتی تھی۔ وہ دوبارہ دروازے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس نے تین چار دفعہ دروازہ کھٹکھٹایا تھا مگر وہ نہیں کھلا تھا۔

"پلیز ماریہ دروازہ کھولو۔ میں اس طرح ساری رات کمرے سے باہر نہیں گزار سکتی۔ پلیز....." وہ روہانسی ہو گئی تھی اور تب ہی دروازہ کھل گیا تھا۔ وہ تیر کی سرعت سے اندر داخل ہوئی۔ ماریہ دروازہ کھول کر بستر پر دراز ہو کر سر تک چادر تان چکی تھی۔ اس نے بے بسی سے دیکھا۔

"ماریہ! اگر تم میری بات سن لو تو شاید تمہیں سوچنے میں آسانی ہو۔ بخدا میرا مقصد تمہیں تکلیف دینا نہیں تھا..... بلکہ تو....."

"تمہارا اور نازیہ کا جو بھی مقصد تھا۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ تم دونوں نے میری تذلیل کی ہے اور اس کے لیے میں تم لوگوں کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔" ایک دم سپاٹ آواز میں سب کہہ گئی تھی۔ زویا دیکھتی رہ گئی۔

"ماریہ!"

"پلیز! مجھے نیند آرہی ہے..... اور ہاں مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔" پھنکارتی آواز تھی۔ زویا تو گنگ سی کھڑی رہی۔ ہاں وہ جانتی تھی کہ ماریہ اس معاملے میں کس قدر شدت پسند ہے۔

* * *

صبح کے وقت ابو امی اور داؤد عالم تھے۔ داؤد سوچ رہا تھا کہ امی سے کیسے بات کرے..... امی تو اب اس سے ناراض رہنے لگی تھیں۔ جب سے اس نے لائبریری والی لڑکی کے متعلق آگاہ کیا تھا۔ وہ اس لڑکی کے گھر جانا چاہتی تھیں مگر وہ کوئی سرا ہی ہاتھ نہیں پکڑا رہا تھا۔ پہلے اس نے ماریہ کی جانب سے خود انکار کیا تھا اور اب ایک اقرار۔

"امی! وہ مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" کھانا کھاتے ہوئے اس نے گفتگو کی ابتدا کی۔

"ہاں کہو....." انہوں نے سرسری سا کہا۔

"وہ امی! میں چاہتا ہوں کہ آپ نسرین آنٹی کے ہاں آج جائیں۔ ان کی بیٹی ماریہ کے لیے۔" اٹک اٹک کر اس نے کہہ ہی دیا۔

"کیا.....؟" امی تو امی عالم صاحب بھی حیران رہ گئے۔

"یہ کیا مذاق ہے؟ تم جانتے ہو داؤد! کہ مجھے ایسا مذاق قطعی پسند نہیں کہ جس میں کسی کی بیٹی وغیرہ پر حرف آئے۔ پہلے انکار اب اقرار..... یہ کیا بات ہوئی بھلا....." وہ خفگی سے کہہ رہی تھیں۔

"میں پہلے بھی راضی تھا..... یہ ایک لمبی بات ہے پھر کبھی بتاؤں گا۔ فی الحال تو آپ لوگ آج ان کے ہاں جائیں۔ ماریہ کے لیے اتوار کو ایک رشتہ آرہا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ ان لوگوں سے پہلے بات کرلیں تو اچھی بات ہے۔" اس نے آرام سے کہا تھا۔ امی نے ابو کو دیکھا۔

"تم بھول رہے ہو کہ تم اس لڑکی کے لیے پہلے ہی انکار کر چکے ہو۔ اب میں کس منہ سے ان کے ہاں جاؤں.....؟" امی کو اچانک تاؤ آیا تھا۔ "اور وہ لڑکی جس کا تم ایک بار ذکر کر رہے تھے اسے کس کھاتے میں ڈالو گے بولو۔"

"امی! وہ لڑکی نسرین آنٹی کی بیٹی ماریہ ہی ہے..... اور پلیز مجھ سے یہ مت کہیے گا کہ میں نے جان بوجھ کر انکار کیا تھا اور اب اقرار کر رہا ہوں تو اس کی بھی وجہ ہے کہ میں اس لڑکی کو کھونا نہیں چاہتا۔ آگے آپ سمجھ دار ہیں۔" وہ کھانا کھا چکا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔

امی ابو بھی چپ چاپ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھتے رہ گئے۔

زویا اس سے بار بار بات کرنے کی کوشش کر چکی تھی مگر اس کی چپ نہیں ٹوٹی۔ بہت سنجیدگی کے ساتھ وہ کالج گئی تھی اور حیرت کی بات تھی اس نے پہلی دفعہ سارے پیریڈ اٹینڈ کیے تھے اور تو اور پہلی دفعہ اس نے لیکچر کے دوران ٹیچر سے سوال بھی کیا تھا۔ واپس آکر وہ کچن جانے کے بجائے کمرے میں گھس گئی تھی۔ نماز ادا کر کے قرآن مجید پڑھتی رہی۔ قرآن مجید بند کیا تو کتابیں کھول لیں۔ زویا تو سب جانتی تھی مگر نازیہ بھی حیران ہوئی اور پھر جب اسے زویا سے ساری حقیقت کا علم ہوا تو وہ بھی چپ کی چپ رہ گئی۔

شام کی چائے کی ذمہ داری بڑی بھابی نے اس پر عائد کی تھی، جسے اس نے نہایت خاموشی سے نبھایا بھی تھا۔ ابھی وہ لوگ چائے پی رہے تھے جب تجمل آنٹی اور عالم انکل چلے آئے۔ ان کے ساتھ ان کا داماد اور جبین بھی تھیں۔ ان کو دیکھتے ہی وہ کمرے میں گھس کر دروازہ لاک کر گئی تھی۔ اسے نہیں پتا وہ لوگ کب گئے اور کیا کیا باتیں ہوئیں؟ بس وہ تو اپنے اندر کی آگ سے نبرد آزما تھی۔ وہ لوگ چلے گئے تو وہ کمرے سے نکلی۔ عشاء کی نماز ادا کی۔ وہ امی کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ جائے نماز پر کھڑی تھیں۔ ابھی انہوں نے نماز شروع ہی کی تھی۔ وہ ان کے بستر پر لیٹ گئی اور جب تک انہوں نے نماز مکمل کی وہ چھت کو گھورتی رہی۔ آدھے گھنٹے بعد انہوں نے جائے نماز لپیٹا تو وہ تب ہی اسی حالت میں تھی۔ وہ جائے نماز ایک طرف ڈال کر اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

"ماریہ! کیا بات ہے..... چندا کوئی بات ہوئی ہے؟" وہ جتنی اس کی حرکتوں پر خائف رہتی تھیں اتنی ہی اس سے محبت بھی کرتی تھیں۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

"امی! یہ تجمل آنٹی وغیرہ کیوں آئے تھے؟" ان کے سوال کو نظر انداز کرتے اس نے پوچھا تھا۔ وہ پہلے تو چونکیں پھر مسکرا دیں۔

"تم جانتی ہو..... بلکہ جو سمجھ رہی ہو وہ سچ ہے۔ وہ ایک دفعہ پھر اپنے بیٹے کے لیے رشتہ لے کر آئی ہیں۔"

"امی جان پلیز! آپ انکار کر دیں۔ مجھے نہیں کرنی اس داؤد عالم سے شادی۔ اس کے علاوہ آپ جہاں کہیں گی میں تیار ہوں مگر ادھر نہیں۔" وہ ایک دم بھر گئی تاہم خود کو رونے سے باز ہی رکھا۔

"مگر ماریہ......" انہوں نے اس قدر دوٹوک انداز میں کچھ کہنا چاہا تو اس نے روک دیا۔

"امی پلیز! زویا کی ممانی کے بھائی کا جو رشتہ آ رہا ہے وہ مجھے منظور ہے۔ آپ ان لوگوں کو ہاں کہہ دیجئے گا۔" وہ انتہائی سنجیدہ تھی بلکہ خطرناک حد تک۔

اس روپ میں تو انہوں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"ماریہ۔" ان کے لب ہلے تھے۔

"امی! میں بہت بری ہوں۔ مجھے اب احساس ہو رہا ہے۔ میں ایک لمبے عرصے سے آپ کے لیے تکلیف کا سبب بنتی رہی ہوں۔ میں نے زندگی کو کبھی سنجیدگی سے لیا ہی نہیں۔ میرے نزدیک زندگی کا نام صرف کھیل تماشا تھا اور اس کو میں پوری زندگی سمجھتی رہی ہوں...... لیکن اب لگتا ہے کہ زندگی اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے...... مگر اب میں اپنے سارے رستے گم کر چکی ہوں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کہاں جاؤں؟ کس راستے پر قدم رکھوں؟ کون سا راستہ اچھا ہے کون سا برا؟" وہ ایک دم ان کی گود میں منہ چھپا کر بکھر گئی۔ نسرین بیگم پریشان ہو گئیں۔

"میں نے تعلیم کو قدروایت کو کبھی پرکھا ہی نہیں۔ مجھے ہمیشہ "بہو" زہر لگتی تھی۔ میرا بس چلتا تو میں ساری کتابیں بھٹی میں جھونک دیتی۔ میری جان جاتی ہے اس لفظ سے مگر اب لگتا ہے میں کیا کچھ کھو بیٹھی ہوں۔ تعلیم انسان کو شعور دیتی ہے کہ وہ معاشرے میں مقام بنا سکے۔ لوگوں کو پرکھ سکے...... انسان کے چہروں کے پیچھے چھپی اصلیت اخذ کر سکے۔ اپنے اردگرد کا جائزہ لے سکے۔ تعلیم تو نام ہی اور اک کا ہے اور میں نے کیا درست کیا؟ میں جب بھی سوچتی ہوں تو مجھے ہر طرف زیرو ہی زیرو نظر آتا ہے۔ امی میں ایسی کیوں تھی...... ؟ بتائیں میں ایسی کیوں تھی...... مجھے زندگی کو سمجھنا کیوں نہ آیا...... ؟" وہ بخوت بخوت کر رونے لگی اور اسے یوں بلک بلک کر روتے دیکھ کر نسرین بیگم کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔

"ماریہ! میری جان میری چندا، کچھ بتاؤ تو سہی...... کیا ہوا ہے؟" وہ تڑپ اٹھی تھیں۔

"امی آپ کی ماریہ ہار گئی۔ زندگی سے ہار گئی۔" وہ مزید بخوت بخوت کر رو دی۔

اور کافی دیر تک روتے رہنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ ایک تسلسل سے کیا حماقت کیے جا رہی ہے اور امی کیا سوچ رہی ہوں گی۔ احساس ہوتے ہی اس نے ایک دم سر ان کی گود سے اٹھا لیا تھا۔ شرمندہ ہوتے ہوتے اپنا چہرہ صاف کیا پھر امی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ وہ ابھی بھی پریشان اس کا چہرہ کھوج رہی تھیں۔

"ایم سوری امی! میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا نہیں تھا۔ رئیلی سوری۔" ان کے ہاتھ پکڑ کر وہ ندامت سے کہہ رہی تھی۔ انہوں نے بغور جائزہ لیا۔ "تمہارے رونے کی وجہ کیا ہے؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"وہ بابا یاد آ رہے تھے۔" یہ سچ بھی تھا جب سے زویا اور نازیہ کی حقیقت علم میں آئی تھی تب سے اپنے یتیم ہونے کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ تب سے وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اس کے سر پر باپ کا سایہ ہوتا تو کیا تب بھی زویا اور نازیہ اس کے ساتھ یہ سب باتیں کرتیں۔ کل سے اب تک اسے اپنا آپ بہت حقیر لگ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں نے بیچ چوراہے میں اس کی بولی لگا دی ہو۔

"اس کے علاوہ...... ؟" وہ اتنی جلدی مطمئن ہونے والی نہ تھیں۔

"اس کے علاوہ اپنی غلطیوں کا احساس ہے۔ آپ کو پریشان کرنے اور مسلسل تکلیف دینے کا پچھتاوا ہے۔ کبھی بھی آپ کی بات نہ ماننے کا احساس...... تکلیف دہ باتوں کی یاد...... رئیلی امی جی۔ مجھے لگتا ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں آگہی کا ایک لمحہ ضرور آتا ہے اور وہ میری زندگی میں کل رات آیا تھا۔ میں ماضی میں جو بھی کر چکی ہوں اس کو بدل تو نہیں سکتی مگر میرا وعدہ ہے حال اور مستقبل میں آپ مجھے بالکل ویسا ہی پائیں گی جیسا کہ آپ چاہتی ہیں۔ میں اپنے آپ کو سنوار لوں گی۔ آپ کے معیار پر پورا اترنے کی کوشش کروں گی۔ آپ چاہتی تھیں نہ کہ میں بہت پڑھوں اگرچہ کتابوں سے میری جان جاتی ہے مگر میں پڑھوں گی صرف آپ کے لیے۔"

وہ ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے سب کہہ رہی تھی اور وہ خوشی کے ساتھ اس کی اس کایا پلٹ جانے پر حیران ہو رہی تھیں۔

زویا کی ممانی اگلے دن اتوار کے روز اپنے بھائی کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ جسے سوچ کر بتانے کا کہا گیا تھا۔ اس نے امی کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ دوسرا رشتہ قبول کر لیں۔ اب پتا نہیں وہ سب کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ ماریہ کی جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ کالج جانا اور گھر پر بھی وقت دینا ایسے میں دل کی شکستہ بستی کو نظرانداز کر کے صرف سامنے نظر آنے والے منظر کو ہی ملاحظہ کرنے کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا مگر اب وہ جس طرح ان سب حالات سے پوری استقامت کے ساتھ نبرد آزما تھی اس پر وہ خود بھی حیران تھی کہ اس کے اندر اتنی طاقت کہاں سے آ گئی ہے یا پھر ایک انکشاف نے اس کے اندر برسوں سے چھپے بزدل لمحوں کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ وہ نالائق ضرور تھی مگر بے عقل نہیں۔ اچھی سمجھ بوجھ والی لڑکی تھی۔ کبھی اپنے آپ کو استعمال ہی نہیں کیا تھا اور اب وہ خود کو آزمانا چاہتی تھی۔ زویا اور نازیہ نے ہر ممکن طریقے سے اس سے بات کرنا چاہی مگر وہ انہیں بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیتی تھی۔ تنگ آ کر زویا رو ہی دی۔

"یہ سب داؤد بھائی کی وجہ سے ہوا ہے۔ ان ہی کا پلان کیا ہوا ڈرامہ تھا۔ ہمارا قصور تو صرف اتنا تھا کہ ہم نے ان کا ساتھ دیا۔ صرف اور صرف ماریہ کے بہتر مستقبل کے لیے مگر وہ ہمیں ہی ملزم سمجھ رہی ہے۔ بات سننے پر آمادہ ہی نہیں۔ کم از کم حقیقت تو جان لے پھر چاہے جو مرضی سزا دے لے مگر اس طرح چپ کی مار تو مت مارے۔" ماریہ کے سامنے وہ رو رہی تھی۔

"وہ شروع سے ہی کم عقل ہے۔ اب بھی حماقت کر رہی ہے۔ بے وقوف کہیں کی...... میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ کس کر تھپڑ لگاؤں۔" زویا کا رونا اس سے برداشت نہیں ہوا۔ غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ "میں داؤد بھائی کو سب بتا دوں گی۔ مجھ سے نہیں برداشت ہوتی اس کی ناراضگی۔ زندگی میں اس طرح اس نے کبھی بھی نہیں کیا۔ ان چار پانچ دنوں میں کتنی بدل گئی ہے وہ۔ داؤد بھائی جانیں اور ان کا پلان۔ ہم تو خوامخواہ پھنسے ہیں۔ اب تو نیکی کا کوئی زمانہ ہی نہیں رہا۔" آنسو صاف کرتے اس نے فیصلہ کیا۔ نازیہ نے بھی گردن ہلائی پھر دونوں نے مل کر داؤد عالم کو فون کیا۔ ساری بات بتا کر وہ اسے ماریہ کا ردعمل بھی بتانے لگیں۔

"داؤد بھائی! اس نے ممانی کے بھائی کا رشتہ بھی قبول کر لیا ہے۔ تاہم چچی جان نے فیصلہ دادی اماں اور تایا ابو پر چھوڑ دیا ہے۔" وہ اسے بتا رہی تھی اور وہ پریشان ہوا۔

"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا اس لڑکی کا جب اس نے سن ہی لیا تھا تو تم اس کو ساری بات بتانے کی کوشش تو کرتیں......"

آخر میں وہ زویا پر ہی چڑھ دوڑا۔

"اچھی بات ہے۔ آپ دونوں کی نیکی جرم گناہ لازم والی بات فٹ آئی ہے ہم پر۔ ایک تو ہم گیند کی طرح ادھر سے ادھر لڑھک رہے ہیں۔ آپ دونوں کی بھلائی چاہ رہے ہیں۔ اور الٹا ہم ہی کو الزام۔ واہ بھئی واہ کیا دستور ہے آپ کے ہاں نیکی کا بدلہ اتارنے کا سبحان اللہ۔" زویا کی زبان آج تیز دھاری تلوار بنی ہوئی تھی۔ داؤد سٹپٹا گیا۔

"ایم سوری۔ تم اس سے بات کرنے کی کوشش کرو۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی؟ جب وہ مجھ سے محبت کرتی ہے تو پھر دوسرا رشتہ قبول کر لینے کی کیا تک ہے بھلا۔"

"یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔ اب ہم کسی بھی معاملے میں آپ کا ساتھ نہیں دیں گے۔ آپ جانیں اور وہ پاگل لڑکی...... آج کل تو بڑی بدل گئی ہے...... اور کچھ فائدہ ہوا ہو یا نہ ہو یہ ضرور ہوا کہ جس لڑکی کو سالوں تک کوئی ایک لفظ بھی نہیں آ سکا تھا وہ صرف پانچ دنوں میں سر سے پاؤں تک بدل گئی ہے...... اور دکھ کی بات یہ ہے کہ آپ کے لیے اس نے خود کو بدلنے کی کوشش ضرور کرنا چاہی تھی مگر بدلی وہ اپنے لیے ہے، صرف اور صرف اپنے لیے...... تاکہ ہم اور آپ جیسے لوگ اس کی ذات کو اعتبار نہ

بتائیں۔" داؤد عالم کو سب کہہ کر زویا نے فون بند کر دیا اور داؤد عالم کتنی دیر تک ہکا بکا بیٹھا رہا تھا پتھر کی مانند۔

"وہ کون ہوتی ہے..... میرے لیے انکار کرنے والی..... ایسی کی تیسی......" اس نے موبائل زور سے بیڈ پر پھینکا "ایک دفعہ ہاتھ لگ جائے..... ایسی سزا دوں گا کہ ساری عقل ٹھکانے آ جائے گی..... بے وقوف..... جنگلی بلی..... احمق....." کمرے میں چکر لگاتا مسلسل کڑھ رہا تھا۔

"تم صرف میری ہو ماریہ بی بی۔ میں وہ بچپن والا داؤد نہیں ہوں۔ سیدھا سادا الو سا جسے اگر تم کھینچ کھانچ کر دروازے میں بند کر دو اور کچھ مزاحمت بھی نہ کر پاؤں۔ تمہیں تو اب میں عقل سکھاؤں گا۔" کشن اٹھا کر دیوار پر مارتے اس نے ہونٹ بھینچے۔

✠ ✠ ✠

وہ امی کو انکار کر کے کچھ مطمئن سی ہو گئی تھی۔ دادی جان کی زبانی داؤد عالم کے رشتے کی منظوری سن کر سکتے میں آ گئی تھی۔ ہلنا جلنا حرکت نہ کر سکی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے امی نے اسے یہ خبر دی تھی تب سے اب تک وہ گنگ بیٹھی ہوئی تھی۔

"نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا..... ایک آوارہ بدتمیز شخص ہی میرے لیے رہ گیا ہے۔ میں لاکھ سزا کی حق دار لیکن یہ سزا مجھے قطعی منظور نہیں..... میں اپنی غلطیاں تسلیم کرتی ہوں۔ اپنی سب بے وقوفیوں پر نادم ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک ایسے شخص کو ساری زندگی کے لیے قبول کر لوں جو دوسروں کے ساتھ مل کر میری ذات کا اشتہار لگاتا ہے۔ لائبریری کی حرکتوں کو میں نظر انداز کر دوں گی مگر اپنے دل کا کیا کروں۔ جس نے پہلی دفعہ اس کے نام دھڑکنا سیکھا تھا۔ کتنا زعم تھا اس شخص کو خود پر کہ وہ مجھے خوار کرے گا لیکن نہیں..... میں کیوں خوار ہوں..... وہ ہوگا..... وہ کون ہوتا ہے اتنا بڑا دعویٰ کرنے والا اوروں کے ساتھ مل کر میری ذات کے پرخچے اڑانے والا۔ مجھے کیڑوں مکوڑوں سے بھی حقیر کر دینے والا..... میری اپنی نظروں میں ہی میری تذلیل کرنے والا..... نہیں داؤد عالم..... بالکل نہیں..... غلطی میری تھی، میں زویا اور نازیہ کی باتوں میں آ گئی۔ میں واب بھی ہوں کہ شاید تمہاری طرف کبھی دھیان نہ ہو پاتی جو اگر یہ دونوں نہ ہوتیں..... کیسے ہر وقت مجھ سے تمہارا ذکر کرتی تھیں..... لائبریری میں کی جانے والی حرکتیں..... ہمارے گھر آنا اور پھر اس کے بعد واقعات..... کس طرح انہوں نے مجھے بریفنگ دی تھی اور میں بھی کتنی بے وقوف نکلی جو ان کی باتوں میں پھسلتی چلی گئی تھی..... میں احمق ہوں اور کم عقل بھی مجھے زندگی کا سلیقہ ہی نہیں تھا۔ مجھے سوائے لڑنے کے کچھ آتا ہی نہ تھا اور تب میں نے سوچا تھا کہ میں تمہارے لیے خود کو بدلوں گی۔ محبت نے میرے دل میں جگہ بنائی تھی اور میں کتنی احمق نکلی..... سمجھ ہی نہ سکی کہ وہ محبت نہیں تھی بلکہ یہ تو تذلیل تھی جو تم لوگوں کو رشتے سے انکار کر کے میں نے کی تھی۔ تم مجھ سے بدلا لینا چاہتے تھے..... تم مجھے اپنی نظروں سے گرانا چاہتے تھے..... تم تو ایک عام انسان کی طرح ہی میرے سامنے آئے تھے۔ اتنی دیر تک منظر پر رہے اور پھر جب یہ منظر میرے دل پر نقش ہونے لگے تو تم نے سارے خوابوں کو اکھاڑ پھینکا۔ کاش اس رات میں پیچھے نہ آتی۔ زویا کو فون پر مصروف دیکھ کر چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھ کر میرے دل میں اس کی باتیں سننے کا خیال پیدا نہ ہوتا اور نہ ہی میں ساری گفتگو سنتی۔ نہ ہی یہ اذیت سہتی کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے بلکہ میری انا کو کچلنا چاہتے ہو..... میں پاگل بے عقل سی بے وقوف لڑکی تھی۔ میرے پاس سوائے انا کے اور تھا ہی کیا اور تم اسے چھیننا چاہتے تھے..... نجانے تم نے یہ سب کیوں کیا؟ بس میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ میری ذات کی تذلیل کی گئی ہے اور یہ زویا، نازیہ..... میری کوئی بہن نہیں تھی مگر یہ دونوں میری سب کچھ تھیں..... لیکن انہوں نے کیا صرف ایک غیر شخص کے لیے میرا برسوں کا اعتماد ریزہ ریزہ کر دیا۔ تنکوں سے بھی حقیر ہو کر رہ گئی ہوں میں۔ ان کا جو بھی مقصد تھا لیکن مجھے تو صرف ایک بات ہی سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے ایک اشارے باز شخص کی خاطر میری انا کے بدلے میری محبت، میرے جذبوں اور سب سے بڑھ کر میری ذات کی بولی لگائی ہے..... کاش میں ان پر کبھی دوبارہ اعتماد کر سکوں..... داؤد عالم اس سب کے

لیے میں تمہیں معاف نہیں کروں گی..... میری بددعا ہے جس طرح میں روز تڑپتی ہوں، سسکتی ہوں تم بھی تڑپو..... تم بھی خوار ہو..... سکون کو ترس جاؤ تم..... میری محبت کا مذاق اڑایا تم نے کبھی سکھی نہ رہو۔" ان چند دنوں میں اس نے اپنے آپ کو کس قدر تنہا اور اکیلا کر لیا تھا۔

"بابا کی وفات کے بعد مجھے لگتا تھا کہ میری زندگی میں کوئی خلا آ گیا ہے۔ میں ہر وقت روتی رہتی تھی اور سارے گھر والے میرے آنسوؤں سے پریشان ہو جاتے تھے۔ ان سب نے مجھے غیر معمولی توجہ دی تھی۔ پیار، محبت، اپنائیت اتنا ملا کہ میں بگڑتی چلی گئی۔ میری زندگی میں توازن ختم ہوتا چلا گیا اور میں غیر متوازن ہوتی گئی۔ پہلے کتابوں سے دل اچاٹ ہوا پھر پڑھائی..... پتا نہیں بی اے تک کیسے آ گئی؟ امی نہ ہوتیں تو میں شاید ان پڑھ ہی رہتی..... اور پھر وقت سرکتا گیا اور اس زندگی کو میں نے اپنا نصب العین بنا لیا۔ کوئی کیا کہتا ہے کس چیز میں میری بہتری ہے؟ کون مجھے سکھانا چاہتا ہے؟ میں نے دھیان دینا چھوڑ دیا تھا اور شاید اس سب میں میرا اپنا قصور تھا جس کا نتیجہ اب میں بھگت رہی ہوں..... نہ ہی میری شخصیت اس قدر غیر متوازن ہوتی اور نہ ہی میری زندگی میں داؤد عالم کا نام ہوتا۔" رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ پہلے کمرے میں اندھیرا پھیلا اور پھر یہ اندھیرا اس کی آنکھوں اور ذہن میں بھی چھاتا چلا گیا..... اور جب ہوش آیا تو ہر کوئی پریشان چہرہ لیے اس پر جھکا ہوا تھا۔

وہ بستر پر تھی۔ اس نے بے دھیانی میں سب کو دیکھا پھر نظر امی پر جا کر رک گئی۔

"امی......" اس کے لبوں سے سسکاری نکلی۔

"ماں صدقے...... کیا ہوا میری چندا کو......" انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"امی! مجھے شادی نہیں کرنی..... نہیں کرنی..... بالکل نہیں کرنی..... کسی داؤد سے نہیں کرنی..... کسی سے نہیں کرنی......" وہ ایک دم ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ امی دادی اور وہاں موجود ہر شخص اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

"ماریہ..... ماریہ......" مگر وہ ان کے ہاتھوں سے پھسلتی چلی گئی۔

"ہائے میری بچی..... کیا ہو گیا اسے.....؟" وہ دوبارہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ نسرین بیگم کی تو اپنی حالت بگڑنے لگی۔

دوبارہ جب اسے ہوش آیا تو کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ماریہ کی نظر سب چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ جب پہلے ہوش آیا تھا تو وہ اپنے کمرے میں تھی مگر اب امی کے کمرے میں تھی۔ امی بستر کے دوسری طرف سو چکی تھیں۔ آہستہ آہستہ اسے یاد آتا گیا کہ وہ عصر کے قریب اپنے کمرے میں تھی جب بے ہوش ہوئی تھی اور اب اس نے گھڑی دیکھی تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔

"یا اللہ میرے دل کو مضبوط کر دے۔ میں یہ کیا پاگل پن کر رہی ہوں۔ مجھے استقامت بخش..... مجھے میرے اپنوں کے سامنے شرمندہ نہ کرنا۔ میں پہلے ہی بہت سی حماقتیں کر چکی ہوں۔ اب سرخرو کر دے۔" بے آواز روتے ہوئے وہ نجانے کب تک دعا مانگ رہی تھی۔

اگلے دن سب ہی اسے نارمل دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔ تاہم اس سے کسی قسم کا کوئی سوال جواب نہیں کیا گیا تھا۔ زویا اور نازیہ شرمندہ شرمندہ سی اس کے سامنے آنے سے کتراتی رہیں جب کہ نسرین بیگم اس کے اس ردعمل پر شش و پنج میں پڑ گئی تھیں کہ کیا کریں؟ ایک دل چاہا کہ کھل کر ماریہ سے بات کریں مگر رات اس کی حالت دیکھ کر دل اس طرح ڈرا ہوا تھا کہ وہ دوبارہ کوئی ذکر چھیڑ کر کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی تھیں۔ تاہم جمل آنٹی سے زیادہ انہیں اپنی بیٹی عزیز تھی۔ داؤد ہر لحاظ سے معقول تھا لیکن ماریہ کی جگہ نہیں لے سکتا تھا۔

"ایم سوری ماریہ! یہ سب ہماری وجہ سے ہوا ہے..... اگر تم ہماری بات سن لو تو تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی پھر جو بھی سزا دو گی ہم بخوشی برداشت کر لیں گے لیکن پلیز ہم سے یوں منہ نہ موڑو۔" وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی جب نازیہ اور زویا

اس کے پاس آگئی تھیں۔ وہ نادم تھیں، شرمندہ تھیں۔ ماریہ نے ایک گہری سانس لی۔

"میں تم لوگوں سے ناراض نہیں ہوں لیکن آئندہ تم مجھ سے کوئی ذکر نہیں کرنا۔ خاص طور پر یہ مجھے بہت تکلیف دیتا ہے۔" ان کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے مسکرا کر کہا تھا تو دونوں نظریں چرا گئیں۔

وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھی تجل آنٹی، ان کی بیٹی اور داماد، انکل اور...... داؤد آئے تھے۔ شاید ان کی ناساز طبیعت کا سن کر آئے تھے۔ ان کو دیکھ کر اس کی بھنویں تن گئیں۔ دل تو چاہا چیخ کر ان سے کہے کہ وہ اس کے گھر سے نکل جائیں لیکن وہ برداشت کر گئی جب تک ان کے پاس بیٹھی رہی چہرہ سپاٹ ہی رہا۔

داؤد عالم گاہے بگاہے اس پر نظر ڈال لیتا تھا لیکن وہ تو دیکھنا کیا ایک نظر ڈالنا بھی قابل نفرت سمجھ رہی تھی۔ وہ اس کے تیور دیکھ کر بیزار ہو گیا۔ وہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھی رہی۔ بالکل چپ چاپ اور سپاٹ چہرے لیے۔ جب ضبط چھلکنے لگا تو معذرت کر کے بڑے ہی پروقار قدموں سے چلتی وہاں سے نکل آئی۔ داؤد عالم کی نگاہوں نے باہر نکلنے تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

"کیا یہ میری بات سن پائے گی؟" وہ سوچ کر رہ گیا۔

بڑے باتوں میں مصروف تھے۔ سب ہی ٹی وی لاؤنج میں تھے سوائے اس بے وقوف کے۔ وہ جبین کے پاس سے اٹھ کر زوبا اور نازیہ کے قریب چلا گیا۔

"سنو میں ماریہ سے ملنا چاہتا ہوں، میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ایم سوری۔ ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے...... وہ مختر مہ پہلے والی لڑکی نہیں رہی...... وہ واقعی بدل گئی ہے۔ ویسے بھی پہلے ہی اس کی طبیعت خراب ہے۔ آپ کو نہیں پتا بات ہمارے گھر قیامت آتے آتے رہ گئی تھی۔ وہ کس بری طرح ہمارے ہاتھوں پھسلتی چلی گئی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ ڈاکٹر موجود تھا جو فوری ٹریٹمنٹ دینے سے وہ سنبھل گئی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اسے کسی بھی قسم کے صدمے سے دور رکھیں ورنہ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو سکتا ہے...... اور ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتیں۔" نازیہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔

"پلیز! میں صرف اس لیے بات کرنا چاہتا ہوں۔ معاملہ صاف کرنا چاہتا ہوں ایک دفعہ...... پلیز صرف ایک دفعہ...... میں احتیاط کروں گا کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جو اس کی طبیعت کو دوبارہ سے خراب کرنے کا سبب بنے۔" وہ انتہائی عاجزی سے کہہ رہا تھا کہ زوبیا کا دل پسیج گیا۔

"ٹھیک ہے...... لیکن میرا نام نہیں آنا چاہیے۔" اٹھتے ہوئے اس نے تنبیہ بھی کی۔

وہ اسے لے کر کمرے میں گئی تو وہ وہاں نہ تھی۔ وہ اسے تلاش کرتے رہے جو گھر کی پچھلی جانب بنی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چاند آخری تاریخوں کا تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ صرف ایک سائھ واٹ کا بلب تھا جس کی روشنی بہت مدھم تھی۔ نجانے کیا سوچ رہی تھی۔ بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے ہوئے تھے۔ سب سے چھپ کر وہ یہاں آ بیٹھی تھی۔ زوبیا اسے اشارہ کر کے وہاں سے چلی گئی۔ وہ چلتا ہوا اس کے عقب میں آ کھڑا ہوا۔

"ماریہ......" بہت آہستگی سے پکارا گیا تھا لیکن وہ ایک دم ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔

"آ...... آپ......" اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"کیسی ہو......؟" اس کے زرد چہرے کو نظروں کے حصار میں لیتے بہت محبت سے پوچھا تھا۔ جواباً وہ استہزائیہ ہنس دی۔

"کم از کم ویسی نہیں ہوں جیسا کہ آپ کو مجھے دیکھنے کی خواہش تھی۔" وہ طنزیہ کہہ رہی تھی۔

"تم خوامخواہ خود کو اذیت دے رہی ہو۔ اگر آرام سے بات سن لو...... معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔" داؤد عالم نے بات شروع کی تھی۔

"داؤد عالم صاحب! کیسا معاملہ؟ آپ شاید بھول رہے ہیں...... ہمارے درمیان کبھی کوئی معاملہ طے ہی نہیں ہوا اور پھر آپ کس معاملے کی بات کر رہے ہیں؟" اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ داؤد نے لب بھینچے۔

"ماریہ! تم جانتی ہو کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ یہ رشتہ میری پسند سے بھیجا گیا تھا...... لیکن اس سے پہلے کے واقعات سے تم بے خبر ہو۔ میں تمہیں وہی سب کچھ بتانا چاہتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں...... اسی لیے میں نے......"

"پلیز داؤد صاحب! اتنے مقدس جذبے کی یوں تضحیک نہ کریں۔ آپ کیا جانیں محبت کسے کہتے ہیں......؟ لائبریری کی چار دیواری میں بیٹھ کر اشارے کرنے والا شخص کیا جانے کہ جذبے کیا ہوتے ہیں......؟ کسی کی تذلیل کرنے والا شخص مجھے ان لفظوں کو اپنے منہ سے نکال کر توہین کرنے والا قابل نفرت لگ رہا ہے......" اس کا ہر لفظ زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"تم آخر میری بات کیوں نہیں سنتیں......؟ پہلے اصل بات تو جان لو پھر کوئی رعنہ بھی عائد کرنا۔" وہ ایک دم اشتعال میں آ گیا تھا لیکن اپنے لب و لہجے پر بمشکل کنٹرول کر پایا۔

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی...... اور کس زعم میں آپ میرے سامنے آ کر اس طرح بات کر رہے ہیں......؟ مائنڈ اٹ داؤد صاحب! میں نے جتنا آپ کی نازیبا حرکات برداشت کی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے ہی گھر میں اس طرح میری باز پرس کریں...... اور کس دعوے پر آپ یہاں تک چل کر آئے ہیں...... انکار میرا حق ہے اور میں نے کہا تھا کہ آپ اپنا حق استعمال کریں اور میں اپنا حق استعمال کروں گی۔" وہ مضبوط لہجے میں کہہ رہی تھی اور پھر قدم اٹھا کر اس کو بالکل نظر انداز کر کے جانے کو تھی کہ اچانک داؤد عالم نے بڑھ کر اس کا بازو کھینچ کر روکنا چاہا تھا۔

"تم میری بات سنے بغیر نہیں جا سکتیں...... سمجھیں تم......" وہ غیر متوازن اس کے بازو سے آ لگی تھی۔ ماریہ کو یوں لگا جیسے اس کے پورے بدن میں کرنٹ لگ گیا ہو۔

"چھوڑیں مجھے۔ کاش میں آپ کی اس حرکت پر آپ کا منہ نوچ سکتی۔" پھولی سانس سمیت وہ کہہ کر جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کر وہاں سے بھاگ نکلی۔

"آئی ڈیم اٹ۔" اس نے جھنا کر دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر دیوار پر دے مارا۔ داؤد عالم کو اگر اس کی خراب طبیعت کا احساس نہ ہوتا تو وہ منٹوں میں اس کا سارا دماغ درست کر دیتا مگر اب لب بھینچ کر رہ گیا۔

* * *

امی نے اس سے انکار کی وجہ پوچھی تھی اور اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ پائی۔ بالکل خاموشی سے ان کے سامنے سے اٹھ آئی۔ اسے رہ رہ کر داؤد عالم پر غصہ آ رہا تھا۔ کس قدر دھڑلے سے اس سے باز پرس کر رہا تھا جیسے اس نے باقاعدہ اس کے سامنے اظہار محبت کیا ہو۔ اس سے عہد و پیمان باندھے ہوں اور اب وہ مکر رہی ہو۔ اسے بھولنے سے بھی کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اللہ سے اپنے حق میں سکون قلب مانگا تھا اور پھر سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر پرسکون ہو گئی تھی۔

تجل آنٹی کے ہاں سے ڈھیروں ساز و سامان آیا تب اسے احساس ہوا کہ امی نے ان کو ہاں کہہ دی ہے۔ وہ بوکھلا کر رہ گئی تھی کتنے ہی دن لگے ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"امی! میرے انکار کے باوجود آپ نے ان لوگوں کو ہاں کہہ دی...... میری ذرا بھی اہمیت نہیں آپ کی نظروں

میں......؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ان کا دل پسیجا مگر اگلے ہی لمحے انہوں نے دل پر پتھر رکھ لیا۔

"تم جب تک مجھے انکار کی وجہ نہیں بتاؤ گی۔ میں تمہاری بات نہیں مانوں گی...... ناحق شادی نہ کرنے کی چھوٹی سی ضد پر اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے گنوا دی...... "وہ کہہ رہی تھیں۔ وہ چند لمحے چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی۔

"تب تو آپ کو صرف رشتہ گنوانا تھا مگر اب آپ بیٹی کو بھی گنوا دیں گی۔" ایک دم روتے ہوئے کہہ کر وہاں سے نکل گئی تھی۔ ساری رات روتی رہی۔ سب اس کے پاس آئے تھے مگر اس نے دروازہ ہی نہیں کھولا تھا۔

سب کو ہی اس کی فکر تھی مگر وہ تو جیسے کمرے میں بند ہو کر باہر نکلنا بھول گئی۔ خوب رو دھو کر ساری کسر نکالنے کے بعد کمرے سے نکلی۔

"کسی کو میرا احساس نہیں۔" وہ خود ترسی کا شکار ہونے لگی پھر نجانے ذہن میں کیا سمائی کہ فون لے کر بیٹھ گئی۔ داؤد عالم کے موبائل کا نمبر ڈائری میں درج تھا۔ اپنی سرخ ہوتی ناک کو صاف کر کے اس نے نمبر ملایا۔ بیل جاری تھی پھر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ اس کی آواز آ رہی تھی۔

"ہیلو......" وہ کہہ رہا تھا۔

"داؤد عالم صاحب! میں نے زندگی بھر آپ جیسا گھٹیا انسان نہیں دیکھا۔ حیرت ہے میری اس قدر شدید نفرت کے باوجود آپ لوگوں نے ہمارے گھر وہ سب ساز و سامان بھیجنے کی ہمت کیسے کر لی؟ اور ہاں یاد رکھنا داؤد عالم...... وہ لڑکیاں ہوں گی جن سے کبھی تمہارا واسطہ پڑا ہوا...... ماریہ قطب الدین نہیں...... تم مجھے خوار کرنے کا دعویٰ کرتے تھے اور میں کہتی ہوں میں تمہیں خوار کروں گی...... اس قدر رسوا کروں گی کہ تم اپنے آپ سے بھی نظر نہ ملا سکو گے...... جس طرح میں بالکل تنہا ہوتی جا رہی ہوں...... تم بھی ہوتے جاؤ گے دیکھنا! را......" اس کی آواز پہچان کر ماریہ نے دل کی ساری بھڑاس نکالی اور پھر اس کی کوئی بات سنے بغیر ریسیور کریڈل پر رکھنے کے بجائے اسٹینڈ پر پٹخ دیا اور نئے سرے سے رونا شروع کر دیا اور پھر سے کمرے میں بند ہو گئی۔

سارا دن بغیر لباس بدلے، کچھ کھائے پیئے بغیر کمبل سر تک تانے وہ لیٹی رہی۔ کتنے دنوں سے آنسو بہا رہی تھی۔ اب تو آنکھیں بھی خشک ہو گئی تھیں۔ عصر کے قریب جب کمرے کی گھٹن اور حبس سے جی گھبرانے لگا تو باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر ایک سادہ سا سوٹ نکال کر زیب تن کیا اور باہر نکل آئی۔ سب نے ہی اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ امی، چچی، تائی، دادی جان، نور باجی، بھابیاں، بچے سب ہی خوش تھے۔ وہ بھی خاموشی سے سب میں شامل ہو گئی۔

رات کو حمزہ، زویا، نازیہ، نور باجی اور بچوں کا آؤٹنگ کا پروگرام تھا۔ اسے بھی سب نے گھسیٹنا چاہا۔ اس نے منع کر دیا تو دادی جان نے ٹوک دیا۔

"چلی جاؤ بچے! طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ اس طرح گھر میں بند رہ کر تو اور طبیعت خراب ہو گی۔" محبت سے اس کی پیشانی چومتے انہوں نے کہا تو اسے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ تو جو کچھ بھی ہوا وہ ایک طرف...... وہ سب کے ساتھ کیا کر رہی ہے؟ ایک دفعہ پھر وہی سب غلطیاں اور بے وقوفیاں دہرا رہی ہے۔ انسان ایک دفعہ ٹھوکر کھا کر سیکھ جاتا ہے اور وہ بار بار ٹھوکر کھانے کے کام کر رہی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو ڈانٹا۔ کپڑے تو نہ بدلے البتہ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگائی۔ شال لے کر جب وہ باہر آئی تو وہاں لاؤنج میں تجمل آئی اور انکل آئے بیٹھے تھے۔ وہ بغیر ان سے ملے سائیڈ سے ہو کر وہاں سے نکل آئی۔

آؤٹنگ کے دوران کافی ہلا گلا کیا گیا تھا۔ وہ لوگ پارک میں آئے تھے۔ بچوں کے ساتھ حمزہ خود بچہ بنا ہوا تھا پھر نور باجی بھی اس کی طبیعت کی تھیں۔ خوب لطیفے سنا سنا کر ایک دوسرے کو محظوظ کرتے رہے۔ حمزہ بچوں کو لے جھولوں کی طرف چلا گیا تو نور باجی اپنے بچے کو سنبھالتی نازیہ کے ساتھ پارک کے ایک گوشے میں مٹی کے برتن بیچنے والے آدمی کے پاس جا کر برتن دیکھنے لگیں۔ زویا

کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

"آؤ ماریہ ہم بھی گھومیں۔ یہ کیا ایک ہی جگہ آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ ذرا مزہ نہیں آ رہا۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ کہہ رہی تھی۔ ماریہ نے ہاتھ جھٹکنا مناسب نہ سمجھا۔ خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لی وہ دونوں پارک سے گزرتے ہوئے دوسری جانب جا رہی تھیں۔ درختوں کے اندھیرے میں زویا نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتی پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"زویا......" وہ واپس کیوں پلٹی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ عقب سے کسی سے ٹکرا گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سیدھی ہوتی۔ اس کی کلائی پر گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔

"داؤد بھائی پلیز میں نے رسک لیا ہے۔ پلیز خیال رکھیے گا۔ کوئی ایسی حرکت نہ کیجیے گا کہ مجھے پچھتانا پڑے۔" وہ پتھر بنی اپنے اس قدر قریب کھڑے شخص کو دیکھ رہی تھی جب زویا کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"تو زویا نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے؟" ماریہ نے سوچا۔

"پلیز ماریہ! غلط مت سمجھنا۔ تم جو بھی رویہ اپنائے ہوئے تھی۔ اس کے لیے یہ سب بہت ضروری تھا۔ تم داؤد بھائی کی بات سن لو پھر کوئی فیصلہ کرنا۔" وہ آرام سے اسے کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتی نظروں سے غائب ہو گئی اور اس کے ساکن وجود میں حرکت پیدا ہوئی تھی۔

"چھوڑو مجھے۔ تمہیں ہمت کیسے ہوئی...... یہ سب کرنے کی......" اگلے ہی لمحے وہ پھنکاری تھی۔ "نور باجی سے میری بات ہو چکی ہے۔ وہ حمزہ کو سنبھال لیں گی۔ تم چلو میرے ساتھ۔" اس کے سوال کے جواب میں اس نے اس کا بازو گھسیٹا۔

"چھوڑو مجھے نہیں جاؤں گی میں تمہارے ساتھ کہیں بھی...... دھوکے سے لائے ہو تم لوگ مجھے۔" وہ چیخ رہی تھی، مزاحمت کر رہی تھی۔ لیکن داؤد عالم کے جھٹکے سے، بازو سے وہ کھنچتی چلی جا رہی تھی۔

"میں شور مچا دوں گی۔ اگر تم نے میرا بازو نہ چھوڑا تو......" وہ چیخی تھی۔ مگر ادھر اثر کہاں تھا۔ وہ اسے لے کر پارکنگ میں کھڑی گاڑی کے پاس آیا تھا۔ لاک کھولا اور اسے اندر گھسیٹ دیا۔

"دروازہ کھولو...... داؤد عالم تم اچھا نہیں کر رہے۔ پچھتاؤ گے تم......" وہ دہاڑ رہی تھی۔ دوسری طرف آ کر بیٹھتے ہوئے اس نے اگنیشن میں چابی لگا گھمائی اور پھر اس کی طرف پلٹا جو ہاتھوں میں چہرہ دیئے رو رہی تھی۔

"آخر تم اتنی جذباتی کیوں ہو......؟" وہ مکمل طور پر متوجہ ہوا تھا۔ ماریہ نے تڑپ کر ہاتھ ہٹائے آنسوؤں سے بھری شاکی نظریں اس پر جمائیں۔

"تم اچھا نہیں کر رہے...... پچھتاؤ گے تم......" وہ پھر روئی تو داؤد نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ماریہ نے دوبارہ رونا شروع کر دیا اور پھر کافی دیر تک آنسو بہاتے رہنے کے بعد اچانک احساس ہوا تو ہاتھ ہٹا کر دیکھا۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو......؟" وہ خوفزدہ ہوئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔

"افق کے اس پار۔" دوسری طرف کافی غیر سنجیدہ جواب موصول ہوا تھا۔ اس کے آنسو پھر بہہ نکلے۔

"داؤد دیکھو اگر تم مجھے کسی ایسی ویسی جگہ پر لے گئے تو میں جان لے لوں گی اپنی بھی اور تمہاری بھی......" آنسو پھر بہہ نکلے۔

ورنہ تم پہلے ہی فدا ہو چکی ہے۔ خالی جسم کا کیا کرو گی؟" ادھر تو جیسے اثر ہی نہ تھا۔

"داؤد! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ گاڑی روکو ورنہ میں کود جاؤں گی۔"

"دروازہ لاک ہے۔ اس لیے اگر تم یہ حماقت کرو گی بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ گاڑی ایک دوست کی ہے اس سے مانگ کر

لایا ہوں۔ تمہیں اگر کچھ ہو گیا تو وہ بیچارہ پھنس جائے گا۔" نہایت سکون سے جواب ملا تھا۔ ماریہ کا طیش کے مارے برا حال ہو گیا۔ ایکدم ہاتھ مار کر اسٹیئرنگ گھما ڈالا۔ وہ جو توقع ہی نہیں کر رہا تھا ایک دم بوکھلا گیا۔

"میں زندہ تو تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔ اب لاش ہی ملے گی تمہیں۔ بیٹھ کر ماتم کرنا روتے رہنا ساری عمر۔" وہ اس وقت مرنے یا مار دینے کا سوچے ہوئے تھی۔ وہ جو اسٹیئرنگ سے اس کے ہاتھ ہٹانے میں ناکام ہوا تھا۔ اس نے بازو دبوچ کر اسے اپنے شکنجے میں لے کر دوسرے ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے پاؤں بریک پر رکھ کر اس کی ساری مزاحمت بے کار کی۔

"تم واقعی جنگلی ہو پوری کی پوری۔ عزت راس نہیں ہے تمہیں۔" وہ ایک دم خونخوار ہو کر اسکی طرف پلٹا تھا۔ گاڑی رک چکی تھی۔ وہ اس کے بازو کے حلقے میں تھی۔ اس کے اس طرح بولنے پر سہم کر اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو دی۔ وہ لب بھینچے بیٹھا رہا۔

"کیسی آفت ہے لڑکی۔ زودہا کہتی ہے یہ بدل گئی ہے مگر مجھے تو اس میں ایک چیز بھی بدلی نہیں لگ رہی۔ ویسی کی ویسی ہے۔ مرنے مارنے کو تیار۔" اس کے بالوں میں ہاتھ رکھ کر اس نے ہلکا سا دباؤ ڈالا تھا۔ وہ فوراً سیدھی ہوئی تھی پھر بغیر اس کی طرف دیکھے رخ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اپنی بے خبری پر اسے رونا آنے لگا۔ وہ اس کے حصار میں تھی۔ اس کے کندھے پر رکھے رو رہی تھی۔ ماریہ کو خود پر غصہ آنے لگا تو داؤد نے مسکرا کر اسے دیکھا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ رات کے اندھیرے میں ہر منظر واضح تھا۔ بس گاڑی تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ داؤد نے نظریں گھمائی۔ وہ سوں سوں کرتی انگلیاں مروڑتی دیکھنے کے قابل لگ رہی تھی۔

پھر اچانک گاڑی کو بریک لگ گئی۔ وہ چونک گئی یہ جانی پہچانی جگہ تھی۔

"اترو بادام! آگئی ہے ہماری منزل۔ میرا ارادہ تھا کہ گاڑی میں اچھے خاصے مذاکرات ہو جائیں گے۔ خوامخواہ دوسرے کا احسان بھی لیا لیکن تمہارے تیور دیکھ کر میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ عافیت اسی میں تھی کہ کسی پرسکون جگہ بیٹھ کر آرام سے بات کر لی جائے۔" اس کی طرف آ کر گاڑی کا دروازہ کھول کر جھکتے ہوئے اس نے ساری بات بتائی۔

"مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ بس مجھے واپس جانا ہے۔"

وہ اس وقت اپنے گھر میں لے کر آیا تھا۔ وہ اب پہچان گئی تھی کہ وہ کہاں ہے؟

"تو میڈم! جب تک ساری بات کلیئر نہیں ہو گی آپ یہاں سے ہلیں گی بھی نہیں..... چلو آؤ۔" اس نے دوبارہ کہا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو داؤد نے اس کا بازو پکڑ کر باہر کھینچا۔

"تم کیوں چاہتی ہو کہ میں تمہیں بار بار چھوؤں......" وہ کہہ رہا تھا وہ فوراً گاڑی سے اتر گئی۔

"شٹ اپ۔ تم مجھ سے اس طرح کی بات مت کرو۔ نہیں جانا مجھے تمہارے گھر سمجھے تم؟" اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے وہ چیخی بھی تھی لیکن داؤد نے دروازہ لاک کر کے گیٹ کے پاس جا کر لاک کھولا اور پھر اسے اس پکڑے اندر کی طرف بڑھتا گیا تھا۔

ڈرائنگ روم میں لا کر اس نے اس بازو چھوڑ دیا تھا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر تمام لائٹس آن کی تھیں۔ کمرہ روشنی میں نہا گیا۔

"بیٹھو۔" وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ روشنی میں اس کے چہرے کے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔ رونے سے چہرہ کافی سرخ ہو چکا تھا اور ناک دہکتا انگارہ بنی ہوئی تھی۔

"کیا پیو گی...... بلکہ یہ بتاؤ کیا خدمت کروں میں تمہاری؟" وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ داؤد نے صلح جو انداز میں پوچھا تو وہ

اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"زہر......" انداز بھی زہر بھرا تھا۔ وہ کھل کر مسکرایا۔

"زہر کیوں...... بلکہ اپنی محبت کا امرت گھول کر پلاؤں گا بشرطیکہ تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔" وہ اس کی اس بات پر ادھر ادھر جھانکنے لگی۔ وہ مسکراتا چلا گیا تھا۔ واپس لوٹا تو ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں اور کولڈ ڈرنکس کے گلاس تھے۔

"اپنے گھر میں تو تم نے منہ پھٹ انداز میں مہمان داری کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ کھاؤ یہ سب اور میری امی کے ذائقے کی داد دو...... بلکہ یہ سب سیکھنے کی کوشش بھی کرنا۔ مجھے یہ سب بہت پسند ہے۔" ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کی زبان مسلسل چل رہی تھی۔ وہ ناگواری سے دیکھنے لگی۔ کئی لوازمات تھے اس نے دوبارہ نظر نہ ڈالی۔

"میں یہاں یہ سب اڑانے نہیں آئی تھی۔ تمہیں جو کہنا ہے وہ کہو تاکہ میں اپنے گھر جا سکوں۔" اس کے انداز میں ذرا بھی رعایت نہیں آئی تھی۔

"تم بیٹھو تو سہی۔ تھانیداروں کی طرح کھڑی مجھے گھورے جا رہی ہو۔" وہ ہنس رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ جانتی کہ جب تک وہ اپنی منوا نہ لے جانے نہیں دے گا۔ تاہم اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ "میں نہیں کہتا کہ یہ ایک بڑی لمبی چوڑی داستان ہے لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ یکطرفہ محبت نہیں تھی۔ یہ تب کی بات ہے جب میں امی کے ساتھ تم لوگوں کے گھر آتا تھا۔ تم اچھی تھی اور مجھے تمہاری شرارتیں اچھی دلچسپ لگا کرتی تھیں لیکن مجھے تم جس طرح بدھو بنالی تھیں تو مجھے تم پر غصہ بھی آتا تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد مجھے تم لوگوں کی خیریت ملتی رہی اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ تم کیسی ہو؟ اب تم کیا کر رہی ہو؟ رفتہ رفتہ میرا ذہن ایک واضح امیج بنا چکا تھا کہ تم ایسی ہو سکتی ہو یا ویسی؟ پھر ان دنوں جب جبین باجی کی شادی تھی تو امی تم لوگوں کے ہاں آئی تھیں۔ واپسی پر وہ کچھ تصاویر لے کر گئی تھیں۔ ان تصاویر میں ہنستی مسکراتی لڑکی مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ امی اور جبین جس طرح خصوصی طور پر تمہارا ذکر کرتی تھیں وہ مجھے دیکھنے کا تجسس پیدا ہو گیا لیکن میری مصروفیات ایسی تھیں کہ میں کبھی یہاں نہ آ سکا۔ یہاں جب امی اور ابو دوبارہ سیٹل ہوئے تو انہوں نے مجھے فون کرنے تمہارے متعلق بات کی تھی اور میں ایک دم سنجیدہ ہو کر سوچنے لگا تھا لیکن حنا جو ان دنوں یہاں امی ابو سے ملنے آئی ہوئی تھی اس نے مجھے فون پر تمہارے متعلق تفصیل بتایا تھا کہ تم کس قسم کی لڑکی ہو؟ کیسی ہو؟ ذمہ دار ہو کہ نہیں؟ تعلیم کے متعلق تمہارے کیا نظریات ہیں اور گھرداری میں تمہارا کیا رول ہے؟ یقین کرو ماریہ جب مجھے ہر معاملے میں تمہاری صفر کارکردگی کا جب علم ہوا مجھے دکھ ہوا تھا۔" وہ رک کے کر اس کے سامنے والے صوفے پر آ بیٹھا تھا۔ وہ جو اس کی طرف سے چہرا موڑے ایک ایک لفظ بغور سن رہی تھی۔ اور حیران ہو رہی تھی سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ بظاہر اسے دکھ ہونا چاہیے تھا لیکن وہ صرف سن رہی تھی۔

"میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں اور لاشعوری طور پر امی کی خواہش ایسی بہو کی ہے جو ان کے ساتھ ساتھ اس گھر کی بھی پوری ذمہ داری اٹھائے جب تم یہ نہیں کر سکتی تھیں اور میں صرف پسند کی بنیاد پر اتنا بڑا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اگر میں امی کی اس بات کو درست بھی مان لیتا کہ تم یہاں آ کر سیکھ لو گی تو تمہیں بہت ٹائم لگتا جبکہ میں اپنے گھر کے معاملے میں بہت حساس ہوں اور شاید تم سے شادی کر کے پچھتاتا بھی۔ اسی لیے میں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مجھے امی کو انکار کرنا چاہیے یا پھر اقرار......؟" ماریہ جو صرف اسے دیکھ رہی تھی اس کی بات پر ہونٹ بھینچ کر سر جھکا گئی۔ داؤد نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹرے میں پڑا گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"تم ساتھ ساتھ یہ لو...... ورنہ یہ گرم ہو جائے گا۔" ماریہ نے خاموشی سے گلاس لے لیا تھا۔ وہ بھی اپنا گلاس لے دوبارہ صوفے پر جا بیٹھا۔

"میں اسی کشش و پنج میں تھا کہ مجھے آنا پڑا۔ میں اپنے گھر سے جدا ہو کبھی نہیں رہا اور وہاں مجھے اتنے ماہ تنہا رہنا پڑ رہا تھا اس لیے میری کوشش تھی کہ میرا تبادلہ یہاں ہو جائے تاکہ وہاں کی پریشانی ختم ہو ایک دن نسرین آنٹی ہمارے ہاں آئیں۔ وہ امی سے

تمہاری نالائقیوں اور بے وقوفیوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ امی صرف اور صرف نسرین آنٹی کی محبت میں
وارفتہ ہو رہی ہیں جب کہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا اور اتفاق سے ان کو واپسی پر لینے کے لیے زویا، نازیہ اور زوہیب بھائی آئے
نسرین آنٹی کو ہمارے گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ واپسی پر لینے آئے تو میری نازیہ اور زویا سے ملاقات ہوئی تو مجھے
لگیں۔ وہ زیادہ تر تمہاری ہی باتیں کرتی رہیں اور میں خاموشی سے سنتا رہا اور پھر میں واپس چلا گیا۔ وہاں جا کر مسلسل سوچنے
بات ذہن میں آئی کہ تم اتنی بری بھی نہیں ہو۔ اچھی عادت کی مالک ہو۔ بس گھر داری اور تعلیم کی طرف سے غفلت برت رہی
میں اپنے لیے تمہارے اندر یہ احساس پیدا کروں تو کہ تم اپنے آپ کو بدل لو۔ کیا ہی اچھا ہوا اس خیال کا آنا تھا کہ میں ایک دم
گیا اور پھر تمہارے گھر فون کیا تھا۔ فون نازیہ نے اٹھایا تھا۔ ہلکی پھلکی بات چیت کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میرا ساتھ دے گی
یا نہیں؟ زوبا اور نازیہ دونوں مجھے اچھا لگیں اور پھر میں یہاں مستقل آ گیا۔ یہاں آنے کے بعد میں حنا کے ذریعے
زوبا سے ملا تھا اور انہیں اپنے ساتھ ملانے کو کہا تھا۔ پہلے تو وہ نہ مانیں۔ ان کا خیال تھا کہ تم اول شادی کے چکر ہی میں نہیں
۔ دوسرا تم کبھی نہیں بدلو گی مگر میرے نظریات ذرا بہت کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کی فطرت میں اتنی لچک ضرور رکھی ہے کہ وہ
حالات کے دھارے میں موڑ سکے۔ تم بھی تو ایک لڑکی ہی ہو اور جس رخ سے میں تمہاری ذات میں انوالو ہونا چاہتا تھا وہ میرے لیے
مشکل نہ تھا۔ بس ضروری یہ تھا کہ تم بالکل نہ ہو اور نہ ہی میں کچھ غلط کروں پھر اس کے بعد لائبریری آنا، روز تمہیں اسمائل پاس کرنا
سلام جھاڑ دینا تو صرف تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنا تھا۔ نازیہ اور زوبا مجھے اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ تمہارے غصے سے بھی باخبر تھیں اس
لیے نازیہ تمہیں ٹھنڈا کر دیتی تھی۔ اس طرح یہ سب ہوتا چلا گیا۔"

وہ بولتے بولتے سب کچھ سر جھکائے کافی پشیمان تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اب کیا کرے؟ گلاس خالی کر کے خود
ٹیبل پر رکھ دیا۔

"کافی دیر ہو گئی ہے۔ مجھے اب چلنا ہوگا۔" اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے ماریہ نے سوچا۔

"ماریہ! تم یقین کرو۔ اس سب ڈرامے کا مقصد نہ ہی تمہاری ذات کو نقصان پہنچانا تھا اور نہ ہی تمہاری توقیر کم کرنا تھا۔
میں نے امی کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ تو خوش ہیں کہ میں تمہارے ساتھ شادی کے لیے رضامند تب ہوا جب یہ جان لیا کہ اب تم اس
کہ میں جس طرح چاہوں تمہیں اپنی خواہش کے مطابق ڈھال سکتا ہوں۔ محبت دنیا کی سب سے خوبصورت اچھائی ہے۔ تمہیں اپنی
طرف انوالو کر کے میرا مقصد تمہاری انا ختم کرنا نہیں تھا۔ میرا صرف یہ خیال تھا تم اپنے اندر اتنی لچک پیدا کر لو کہ جب میں شادی کر کے
تمہیں اپنے گھر لاؤں تو تمہیں اس گھر کی ذمہ داری نبھانے میں کوئی اعتراض نہ ہو۔ دنیا کی ہر لڑکی سیکھ جاتی ہے یہ کام۔ ہماری حنا بھی
بالکل تمہارے جیسی تھی لیکن امی نے اس کی شادی کروا دی تھی۔ گھر کی ذمہ داریوں میں پڑ کر وہ اپنا سارا بچپنا بھول گئی اور مجھے
تمہارے متعلق جو کچھ بھی علم ہوا اس سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلا تھا کہ تم حنا کی طرح سمجھو گی نہیں بلکہ سمجھاؤ گی۔ وہ بھی اپنے
اور مجھے صرف ایک ایسی عورت چاہیے تھی جو نہ صرف مجھے پسند ہو بلکہ اس میں تمام خوبیاں بھی ہوں۔ تم ایسی نہیں تھی مگر
تمہارے اندر اس خامی کے متعلق احساس تو اجاگر کر سکتا تھا اور میں نے صرف یہی کیا اور یہی میرا مقصد تھا۔" وہ ایک دم خاموش ہو گیا
ماریہ کو لگا جیسے وہ ایک دم فیصلے کی دہلیز پر آ کھڑی ہوئی ہے۔

"ایم سوری۔ سب کہتے ہیں میں جذباتی ہوں۔ میں واقعی بہت جذباتی ہوں۔ مجھے جب فون پر آپ اور زویا کی
علم ہوا تو مجھے صرف یہی محسوس ہوا کہ ایک غیر آدمی صرف میری ذات کے پرخچے اڑانا چاہتا ہے۔ میرے جذبات کو غلط
کر صرف مجھے پامال کرنا چاہتا ہے..... ایم سوری" وہ انگلیاں چٹخاتے واقعی ہی شرمندہ تھی۔ "ایسے میں میرا رد عمل کچھ غلط نہ
زندگی بالکل ویسے ہی گزری ہے جیسی ابھی آپ نے ابھی ذکر بھی کیا ہے۔ میں بہت غیر ذمہ دار اور نالائق قسم کی لڑکی واقع ہوئی

واقع زویا اور نازیہ کی باتوں سے میرے اندر یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ میں ان کی طرح ناول انداز میں زندگی کو نہیں لے رہی اور پھر
آپ کا بھی خیال رہتا تھا اور واقع میں اس طرح کی لڑکی نہ تھی لیکن زویا اور نازیہ کی ہر وقت کی جانے والی برین واشنگ نے ہی میرے
اندر آپ کا احساس جگایا تھا۔ ان کی ہر وقت باتوں، چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق نے ہی مجھے آپ کی طرف متوجہ کیا تھا، ورنہ شاید میں زندگی
کے دوسرے اول امور کی طرح اس قسم کے جذبات سے بھی نابلد رہتی..... اور جو کچھ کے بعد ہوا بحیثیت لڑکی غلط نہ تھا۔ کم از کم آپ کو
مجھے سب بتانا چاہیے تھا۔ آپ نہیں تو زوبا اور نازیہ تھیں نا، مگر انہوں نے آپ سے وعدہ نبھایا، میرا خیال نہ کیا۔ یہی اصل دکھ تھا جس کی
بنا پر میں اتنی جذباتی ہوتی چلی گئی تھی۔" نظریں اپنے ہاتھوں پر جمائے وہ ناخن کھرچنے لگی۔

"چلیں جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب کیا ارادہ ہے۔" وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ کر جھینپ گئی۔

"میں نے اب سوچ لیا تھا میں بھی زوبا اور نازیہ کی طرح گھر پر توجہ دوں گی۔ یہ ایک عورت کے لیے بہت ضروری ہے کہ
سب سیکھے۔ میں نالائق ضرور ہوں پھوہڑ نہیں۔ ان چند دنوں میں مجھے بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے۔" اس کی بات ٹالنے پر اس
نے اسے گھور کر دیکھا۔

"یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم اب سیریس ہو ہی جاؤ گی۔ انسان کو صرف ایک جھٹکا ہی کافی ہوتا ہے۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں
میرے گناہ معاف کیے جانے کے قابل ہیں کہ نہیں..... " وہ اپنے موڈ میں واپس لوٹ چکا تھا۔ ماریہ کو امید نہ تھی کہ وہ براہ راست
اصل بات کی طرف آ جائے گا۔ اب بری پھنسی تھی۔

"آپ نے مجھے اتنی تکلیف دی کہ میں آپ کو اتنی جلدی معاف کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ لائبریری سے لے کر اب
تک ایک ایک حرکت قابل گرفت ہے۔" اس نے آرام سے کہا۔

"کیا..... ؟" وہ چیخا۔ "تم ہوش میں تو ہو لڑکی..... " اس نے رعب جمانا چاہا تھا۔

"بالکل۔" ماریہ پر کوئی اثر نہ تھا۔ وہ تاسف بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

"زیادہ خوش فہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ بی اے تو تمہیں کرنا ہی ہے..... بلکہ اس کے بعد بھی میں چاہوں گا کہ تم
پڑھو۔" اس نے اسے پڑھائی کا ڈراوا دیا تھا۔ وہ ہنس دی۔

"کروں گی..... بلکہ میرا ارادہ ہے کہ کم از کم امی کی طرح ایم اے تو ضرور کروں گی۔ یہ کیا اتنی لائق فائق تعلیم یافتہ
ماں کی بیٹی ایف اے پاس اچھی لگتی ہے کیا..... بلکہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کروں گی پھر امی کی طرح پی ایچ ڈی کروں گی اور پھر اس کے بعد
..... " وہ شرارت سے کہہ رہی تھی۔ اس سے پہلے اس کا پروگرام لمبا ہوتا داؤد نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"بس..... زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف بی اے تک انتظار کر سکتا ہوں۔ عورت کے لیے اصل چیز اس کا گھر
ہونا چاہیے۔ بی اے کرو تک کی ضرورت ہے۔ باقی رہنے دو..... بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ سب سیٹ ہوتا جائے گا..... اگر مجھے
محسوس ہوا کہ تمہیں تعلیم کی ضرورت ہے تو میں خود تمہاری مدد کروں گا لیکن ابھی نہیں۔"

"اچھا جی..... " وہ ہنس دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے کوئی تگڑا سا جواب دیتا اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے جھنجھلا کر
اسے دیکھا۔ موبائل کی یہ مداخلت اسے بہت گراں گزری اس وقت۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ماریہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی۔

"تمہیں تو میں ابھی دیکھتا ہوں۔ پہلے اس رقیب روسیاہ سے نمٹ لوں۔" وہ جھینپ گئی تو وہ موبائل سننے لگا۔

"داؤد بھائی بڑی بری بات ہے۔ مجھے گھر سے جوتے پڑوانے کا ارادہ ہے کیا..... آپ ایک گھنٹہ کہہ کر آئے تھے اب
دو ڈھائی گھنٹے ہو رہے ہیں۔ خدارا کچھ تو احساس کریں۔ گھر سے آپ کے والدین رخصت ہو چکے ہیں اور آپ ہیں کہ..... جہاں کہیں
بھی ہیں فوراً پہنچیں۔" دوسری طرف زویا تھی جو حمزہ کے موبائل سے کال کر رہی تھی۔ داؤد نے ایک گہری سانس لی۔

"اگر میں نہ آؤں تو......" اپنے سامنے کھڑی ماریہ پر ایک گہری نگاہ ڈال کر کہا۔

"ارے یہ حوصلوں کے علم اتنے بلند کیسے ہوگئے...... محترم بھائی صاحب! لگتا ہے کہ مذاکرات کافی کامیاب رہے ہیں؟" زویا داؤد کے لہجے کی کھنک محسوس کر کے کہہ رہی تھی۔ وہ ایک دم قہقہہ لگا گیا۔

"بہت زیادہ۔ میرا تو دل چاہ رہا ہے اسی وقت کسی قاضی وغیرہ کا انتظام کروں۔" ماریہ کے قریب آ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے کہا۔ موبائل آف کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے وہ ماریہ کی طرف خفیف سا جھکا۔

"اور آپ کیا فرماتی ہیں مادام......؟ سیدھے قاضی کے پاس نہ چلے چلیں۔ ایمان سے یہ دل بڑا بے ایمان ہو رہا ہے اس وقت۔" دل پر بات رکھ کر وہ خاص فدویانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ ماریہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔

"نہ...... نہ...... نہیں..... تنگ..... گھر چلیں...... بہت دیر ہو رہی ہے۔" اس جیسی پر اعتماد لڑکی گھبرا رہی تھی۔ وہ اسے دیکھے گیا تھا۔ وہ مزید خود میں سمٹی تھی۔

"آہا...... پر دل بھی کیا چیز ہے...... اچھے بھلے ہوش مند شخص کو بھی پاگل کر دیتا ہے۔" وہ گنگنا کر پوچھ رہا تھا۔ وہ چیخ اٹھی۔

"داؤد پلیز!" اس کی آنکھوں میں قطرے چمکنے لگے۔ وہ مسکرایا۔

"تم بھی ناں......" ماریہ کے گھورنے پر وہ ہنسا۔ "ٹھیک ہے چلتے ہیں۔ کل اچھی طرح ڈریس اپ ہونا۔ میں آؤں گا۔ اگر تمہارے گھر والوں نے اجازت دی تو ایک اچھا سا ڈنر بھی باہر کریں گے۔" وہ منصوبہ بنا رہا تھا اور ماریہ نے مسکراتے ہوئے اسے جھلملاتی آنکھوں سے دیکھا۔

وہ میری قسمت کا درخشاں ستارہ تھا۔ شکر ہے اسے اپنی نالائقیوں سے اسے کھو نہیں دیا۔ وہ نہ جانے اور بھی کیا کہہ رہا تھا تو بس اسے دیکھ رہی تھی۔ صرف اپنی قسمت کے درخشاں ستارے کو محسوس کر رہی تھی۔

"یا اللہ تیرا شکریہ ہے۔" وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر بجا لائی کہ یہ خالص نایاب موتی اس کی عنایت تھی۔

مسافر لوٹ آئے ہیں

اس نے آٹھ برس بعد اپنی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ پورے آٹھ سال بعد جہاں سے نکلتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ وہ یہاں کبھی بھی پلٹ کر نہیں آئے گا مگر ایک عرصے بعد وہ پھر پلٹ آیا تھا اسی شہر بد اماں میں۔ جہاں اس کا وجود زخمی زخمی ہوا تھا۔ روح میں کئی گہرے زخم لگے تھے۔ گھاؤ ایسے تھے کہ آٹھ سال کا طویل دورانیہ اور تنہائی بھی انہیں مندمل نہ کر سکی تھی۔

اسی زمین میں جہاں وہ نامہربان وجود رہتا تھا۔ جس نے اس کے وجود سے جان کھینچ لینے کی بھی کوشش کی تھی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی مانگ لی تھی۔ اور وہ تھا کہ صرف اور صرف اس کی خواہش کا احترام کرتے، اس کی خوشیوں کی خاطر اپنے دل کی پروا کیے بغیر اس کی عمر بھر کی تنہائی اور ہجر سے لپٹی عمر بھر کی قید اپنے حصے میں لکھ دی تھی۔ صرف اور صرف اس کے جذبوں کا احترام کرنے اور اب اگر وہ پلٹا بھی تھا تو صرف اور صرف اس کی خاطر۔ ایک دفعہ پھر اپنی روح، جسم کو اذیت کے گہرے سمندر میں دھکیلنے کی خاطر۔ اپنے وعدے کی پاسداری کی خاطر جو اس نے اس سے کیا تھا۔ اب نہیں جانتا تھا کہ آگے کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اپنے وعدے کو نبھانے چلا آیا تھا۔ جب محبت کی ہے تو پھر سود و زیاں کا حساب بے کار رہتا ہے۔ یہ حقیقت بہت پہلے اس نے جان لی تھی۔

ٹیکسی سے اتر کر کرایہ ادا کر کے اس نے اپنے اطراف دیکھا۔ یہ وہی گاؤں تھا جہاں وہ بڑے فخر، غرور و شان کے ساتھ بھی چلتا تھا۔ اور اب یہ وہی علاقہ تھا جو اس نے گزشتہ آٹھ سال سے اپنے لیے شجر ممنوعہ کی طرح بنا رکھا تھا۔ بہت کچھ بدلا تھا۔ مگر سامنے نظر آنے والی حویلی اسی شان و شوکت کے ساتھ اپنی جگہ پر کھڑی تھی جیسا کہ وہ آٹھ سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔

گیٹ پر دستک دیتے ہوئے اسے چاچا جانی اور بی بی جان کا خیال آ رہا تھا۔ اسے یوں اپنے سامنے دیکھ کر نہ جانے ان کی کیا کیفیت ہو۔ وہ کچھ بھی اندازہ نہیں کر پا رہا تھا۔

"جی صاحب..... کس سے ملنا ہے؟" ایک نوجوان سا لڑکا پوچھ رہا تھا۔ بلکہ سر سے پاؤں تک جائزہ بھی لے ڈالا تھا۔ سالک نے اپنا بیگ زمین پر رکھا۔

"مجھے قمر الزمان صاحب سے ملنا ہے۔ بہت دور سے آیا ہوں۔"

"جی مگر وہ اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔ اگر آپ نام بتا دیں تو سہولت رہے گی۔ ورنہ آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔" ملازم نے ادب سے بتایا تھا شاید وہ اس کے حلیے سے متاثر ہوا تھا۔

"میں ان کا بھتیجا سالک ہوں۔ انیس الزمان کا بیٹا۔" اس نے اپنا حوالہ دیا تھا۔ ملازم کی آنکھوں میں ایک دم حیرت سمٹ آئی تھی۔ بغور دیکھا تھا پھر بوکھلا گیا۔

"سلام سرکار...... معاف کیجئے، مجھے علم نہیں، نیا آیا ہوں نا...... مگر بڑے سرکار سے اکثر آپ کا نام سنا ہے۔ آپ

چھوٹی بی بی کے شوہر ہیں نا...... "وہ فوراً احترام بجالایا تھا۔ زمین پر پڑا اس کا بیگ اٹھا لیا تھا۔ پہلے ہی موڑ پر اسے چھوٹی بی بی کا ہونا
بہت ناگوار گزرا تھا۔

"آئیں...... سرکار...... آئیں...... "وہ اندر بڑھ گیا تھا۔ ملازم پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا۔ یہ وسیع و عریض آسائشات سے
حال کو تھی اندر سے بھی ویسی ہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اندر آنے کے بعد سب سے پہلے اس کا سامنا سراج بابا سے ہوا تھا۔

"سالک بیٹا......!" بابا اپنی جگہ ساکن ہو گئے تھے۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام...... تم سالک ہو نا...... واقعی میری آنکھیں سچ دیکھ رہی ہیں نا...... یہ تم ہی ہو نا......" بابا اسے یوں
برسوں بعد سامنے دیکھ کر بدحواس سے ہو گئے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔

"یہ میں ہی ہوں بابا...... سالک! بدنصیب......" آخری لفظ اس نے اس قدر آہستگی سے کہا تھا کہ بابا کو سنائی نہیں دیا
تھا۔ وہ بس خوش تھے اسے اپنے سامنے دیکھ کر۔

"میں بڑے سرکار کو بتاتا ہوں۔" بابا سراج فوراً اندر بڑھ گئے تھے۔ وہ بھی ان کے پیچھے ہی قدم بڑھانے لگا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم...... سالک آ گیا ہے...... سالک......" سراج بابا کی طرح چاچا جانی بھی ششدر تھے۔ وہ دروازے
پر ہی رک گیا۔

"چاچا جانی......" اس کے ہونٹ نم وا ہوئے تھے۔ وہ دروازے پر ہی رک گیا۔
پھر آگے بڑھ آئے تھے۔ دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔

"سالک...... بیٹا...... میری جان، تو کہاں تھا؟ اتنے برسوں تڑپایا ہمیں، ہم ترس گئے تھے تمہاری صورت
کو...... تمہارے وجود کو، کوئی یوں بھی کرتا ہے۔ ہاں ہم نے جبر کیا تھا مگر تم نے بھی تو حد کر دی۔
سالوں کی دوری حائل کر دی اپنے اور ہمارے درمیان کچھ نہ سوچا...... ہم کیسے جئیں گے، کیسے رہیں گے۔" وہ رو رہے
تھے بے جان سے تھے۔ وہ بس ان کے سینے سے لگا اپنی اور ان کی برسوں کی پیاس بجھا رہا تھا۔ وہ بھی مرا تھا ان کے بغیر ایک ایک پل
جان کنی کے عمل سے گزرا تھا۔ کیسے ہارا ہے یہ سزا تو مقدر میں تھی اور نجانے کب تک رہے جو خود اس کی اپنی منتخب کردہ تھی۔

"کہاں تھا تو...... ؟ نیویارک میں تو نہیں تھا، پھر کہاں چلا گیا تھا......" وہ پوچھ رہے تھے۔ سراج بابا اپنی آنکھیں
صاف کرتے باہر نکل گئے تھے۔ وہ چاچا کو دیکھنے لگا۔ کتنے نڈھال اور ضعیف ہو گئے تھے وہ۔ پہلے والا دم خم نہیں رہا تھا۔ اس نے انہیں
بستر پر بٹھایا۔

"میں یہاں سے جانے کے صرف ایک دو ماہ بعد ہی نیویارک سے واشنگٹن شفٹ ہو گیا تھا اور پھر وہاں سے انگلینڈ اور
انگلینڈ سے جرمنی چلا گیا تھا۔" سہولت سے بیٹھ کر بتانے لگا تھا۔

"اور اتنے برسوں میں ایک دفعہ بھی خیال نہ آیا کہ یہاں ہم پر کیا گزری؟ تمہارا یوں لاپتا ہو جانا ہمیں کس درد سے دوچار
کر گیا تھا۔ تمہاری ماں کیسے کیسے نہیں روئی...... تمہاری چچی اور اسوہ نے تمہیں کتنا یاد کیا ہے۔" وہ ابھی بھی غمزدہ تھے۔ وہ سر جھکائے
بیٹھا رہا۔ اس دوران سراج بابا ٹرالی سجائے اندر داخل ہوئے تو وہ حیران ہوا۔ اس کے خیال میں اس کی آمد کی خبر سراج بابا نے تقریباً
سب کو دے دی ہو گی مگر کوئی بھی نہیں آیا تھا خاص طور پر بی بی جان اور چاچی۔

"بی بی جان اور چاچی جان کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا تھا۔ اسوہ کا نام لینے میں احتیاط ہی برتی۔

"برادری میں ایک شادی ہے اسوہ اور وہ دونوں وہیں گئی ہیں۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی گھر پر ہی رہ گیا تھا۔" انہوں

نے سر ہلایا۔

"سالک بیٹے فریش ہو لو...... پھر کچھ کھا پی لو۔" سراج بابا نے کہا تو وہ سر ہلا کر اٹھ گیا۔
چاچا کے روم میں ہی اس نے منہ ہاتھ دھو لیا تھا۔ ملازم اس کا بیگ بھی یہیں رکھ گیا تھا۔ کپڑے نکال کر بدلے اور پھر چاچا
جانی کے ساتھ ہی کھانے لگا۔ کھانے کے دوران وہ اس سے گزرے ماہ و سال کے متعلق ہی پوچھتے رہے تھے۔ وہ اپنی طرف سے ان کو
تسلی بخش جواب دیتا رہا تھا۔

"تم آرام کر لو...... نیویارک سے پاکستان کی فلائٹ بہت تھکن زدہ کر دیتی ہے۔ اوپر سے یہاں گاؤں میں آنا۔" وہ کافی
تھک چکا تھا اور چاچا نے اس کے چہرے سے اندازہ بھی لگا لیا۔ سوائے نصیحت کرتے کمرے سے نکل گئے تھے۔ وہ ان کے بیڈ پر ہی
لیٹ گیا۔ جرمنی سے وہ تین دن پہلے ہی نیویارک پہنچا تھا۔ کامران کے فون کی وجہ سے کہ اتنے سالوں بعد اس کے گاؤں سے اس کے
نام کوئی خط آیا ہے۔ شروع کے دو سالوں تک تو خوب رابطہ ہوا تھا اسے ہر جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تھی، خاص طور پر کامران بیچارہ
اس سلسلے میں کافی پریشان بھی رہا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ اس کی تلاش کی کوششیں سرد پڑ گئی تھیں۔ برسوں بعد اس کے نام کوئی خط آیا تھا۔ وہ
خود بھی حیران تھا۔ اس کا پتا اور موبائل نمبر کا صرف کامران کو علم تھا سو وہ پہلے نیویارک پہنچا تھا۔ خط اسوہ کی جانب سے ہی لکھا گیا تھا۔ آٹھ
سال پہلے کیے گئے وعدے کی یاد دہانی کرائی گئی تھی مگر وہ بھی اس شرط پر کہ وہ وعدہ آ کر کوئی فیصلہ کرے۔ چاہتا تو کبھی وعدہ نہ نبھاتا اس
کی خواہش کے احترام میں وہیں بیٹھے بیٹھے وہ وعدہ پورا کر دیتا اور اس کی خواہش پوری کر دیتا مگر اس کی شرط بھی وہ ٹال نہیں سکتا تھا۔
جب بچھڑنا طے ہے تو پھر ایک دفعہ روبرو ہونے میں کیا حرج ہے یا شاید وہ اپنے جذبۂ محبت کی انتہا دیکھنا چاہتا تھا۔ اور اس کا لکھا خط بھی
کیا تھا صرف چند الفاظ تھے۔

"سالک!
میں آپ کے فیصلے کی منتظر ہوں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ اپنا وعدہ نبھائیے مگر ایک شرط ہے سب کچھ روبرو طے ہو۔
اسوہ۔"

اور یہ چند الفاظ اس کی ذات کو کس طرح ادھیڑ گئے تھے یہ صرف وہی جانتا تھا۔ اور اب وہ یہاں تھا اس گھر میں جہاں اس
نے اپنی عمر کے کئی حسین دور گزارے تھے۔ وہ انہی باتوں میں الجھا ہوا تھا جب نیند کی دیوی نے اسے آ لیا تھا۔
سراج بابا نے اسے اٹھایا تو وہ باہر نکل آیا۔ ساری حویلی دیکھ ڈالی تھی۔ چاچا جانی باہر جاگیر کے معاملات دیکھنے چلے گئے
تھے۔ سراج بابا کو چائے کا کہہ کر وہ لائبریری میں چلا آیا تھا۔ اس لائبریری میں اس کے ذوق و شوق کی سب کتابیں موجود تھیں۔ وہ
پڑھ رہا تھا جب باہر جیپ رکنے کی آواز پر ٹھٹک گیا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ چاچا جانی کے علاوہ اس کی ابھی کسی اور
سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گیا۔ ڈرائیور گاڑی کے دروازے کھول رہا تھا۔ سالک کا دل اس کی کنپٹیوں میں
دھڑکنے لگا تھا۔ بی بی جان، چاچی جان اور اسوہ گاڑی سے اتری تھیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر جائے اور بی بی جان کے قدموں میں
جھک جائے۔ دیارِ غیر میں کس قدر یاد آئی تھیں وہ ہر پل، ہر لمحہ۔ ان کی شفیق و مہربان ممتا بھری گود کی گرمی اسے اذیت کی بھٹی میں
جھلسانے لگتی تھی مگر وہ مجبور تھا۔ اپنے دل کے ہاتھوں، اور اب...... وہ دروازے کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اوپری منزل پر واقع یہ لائبریری
نیچے کا سارا منظر واضح کر دیتی تھی۔ بی بی جان، چچی جان اور اسوہ تینوں صوفوں پر آ کر گر گئی تھیں۔ وہ برسوں بعد انہیں دیکھ رہا تھا عجیب
لگ رہا تھا۔

"سراج بابا...... بابا جانی کہاں ہیں؟" چادر اتارنے کے بعد اسوہ نے پوچھا تھا۔
"چھوٹی بی بی! وہ زمینوں پر گئے ہیں۔ کہہ گئے تھے کہ وہ تھوڑی دیر میں لوٹ آئیں گے۔" بابا نے بتایا تھا۔ وہ کمرے سے

نکل آیا۔ اب سالک کا رخ نیچے کی جانب تھا۔

"کیا بات ہے بابا، بہت خوش ہیں؟" اسوہ بابا کو مسلسل مسکراتے دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔ بی بی جان اور چچی جان بھی متوجہ تھیں۔

"جی چھوٹی بی بی، بات ہی کچھ ایسی ہے۔ آپ بھی سنیں تو حیران ہوں گی۔ آج برسوں بعد اس حویلی کی خوشیاں لوٹ آئی ہیں۔" سالک سیڑھیاں اترنے لگا تھا۔

"ایسی بھی کیا خوشی آ گئی؟ کچھ بتاؤ تو سہی......" بی بی جان نے بھی پوچھا تھا۔

اسوہ چادر اتار کر صوفے کی پشت پر ڈال کر اپنے گھنے آبشار ایسے کھلے بالوں کو آگے کر کے انگلیاں پھیر رہی تھی جب وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کی نظر سیڑھیاں اترتے سالک پر ٹھہری تو ایکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔ لمحوں میں بدحواس ہوئی تھی جبکہ باقی لوگ اس طرف متوجہ نہیں تھے سوائے سراج بابا کے۔

"سالک بیٹا آئے ہیں، وہ دیکھیں بڑی سرکار۔" وہاں تک پہنچ گیا تھا۔

جب بابا نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے انکشاف کیا تھا۔ بی بی جان اور چچی جان بھی ایک دم پلٹی تھیں اور اسوہ کا تو کاٹو تو بدن میں خون نہیں والا حال تھا۔

"السلام علیکم بی بی جان......" وہ والہانہ انداز سے ان کی طرف بڑھا تھا۔ اسوہ اپنی جگہ حیران و ساکت تھی۔ ابھی اسے دن ہی کتنے ہوئے تھے خط لکھے ہوئے اور باقی جلدی وہ روبرو تھا۔ اس کی حیرانگی کے برعکس چچی جان اور بی بی جان حیران تھیں۔

"تم سالک، تم آ گئے بچے! کہاں چلے گئے تھے۔ اتنے سال گزار دیے۔ کتنے ظالم تھے تم...... ماں کے ضبط کو آزماتے رہے، کہاں تھے؟ بولو سالک...... میرے بچے۔" بی بی جان اسے بازوؤں میں لیے گرمجوشی سے روتی بے قرار ہو رہی تھیں۔ وہ بمشکل مسکرا سکا تھا۔ ایک نگاہ غلط اسوہ پر اٹھ گئی تھی جو اس کی جواشن اور اس کی آمد پر حیران ہوتی اپنے ہاتھ مسل رہی تھی اور ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

"السلام علیکم چچی جان کیسی ہیں آپ؟" بی بی جان سے جدا ہو کر وہ چچی جان کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"ہمارا ضبط آزما کے پوچھتے ہو کہ کیسے ہیں...... جی رہے ہیں۔" وہ آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ اس کا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے پیشانی چومتے کہہ رہی تھیں۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ جانتا تھا یہ شکوے، یہ شکایتیں برحق ہیں۔

"کب آئے......؟" صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھیں۔ وہ بھی بی بی جان کو سہارا دیے ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا جبکہ اسوہ ابھی بھی کھڑی تھی۔ اسی طرح ساکت و صامت۔

"آج دوپہر کو......" مختصر بتایا پھر ایک نظر اسوہ پر پڑ گئی۔ وہ یہاں سے جانے کو پر تول رہی تھی۔

"یہ اسوہ ہے، جانتے ہو نا یا اسے بھی بھول گئے ہو۔ ماں، چچا اور چچی کی طرح۔" بی بی جان نے اسے ایک دم کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا۔ گویا دونوں کی جان مشکل میں ڈال گئی تھیں۔ وہ ہنس دیا تھا۔ ایک عجیب سی نظر اس وجود پر ڈالی جو سر جھکائے کھڑی تھی۔ کتنی بدل گئی تھی وہ۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو بالکل مختلف تھی۔ اب سنجیدہ سی، خوبصورتی کے سب پیمانوں پر پورا اترتی، چند لمحوں کو اس کی توجہ سمیٹ گئی تھی۔ اس نے ایک گہری نظر اس کے سراپے پر ڈالی تھی۔

"میں کچھ بھی نہیں بھولا بی بی جان۔ سب یاد ہے۔" اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا تھا۔ بی بی جان کو ایک دم ملال نے آ لیا۔ انہوں نے اس کے ساتھ کم زبردستی کی تھی کیا۔ اس نے تو پھر بھی اعتراض تک نہیں کیا تھا صرف بغیر بتائے آٹھ سالوں تک بغیر کوئی نام و نشان چھوڑے قطع تعلق کر گیا تھا اور اب تو وہ اعتراض کا بھی حق نہیں رکھتی تھیں۔ نہ جانے کون کون سے دکھ تھے جو آنکھوں

سے بہہ نکلے تھے۔

"ہاں ہم گنہگار تھے، اگر وہ زبردستی نہ کرتے تو نہ جانے کیا دن دیکھنے پڑتے۔" چچی جان اپنی دختر نیک اختر پر ایک کٹیلی سی بھری نگاہ ڈال کر طول سی کہہ رہی تھیں۔ اب اسوہ کے لیے مزید کھڑے رہنا محال تھا۔ وہ بغیر چادر اٹھائے بھاگتے ہوئے زینہ طے کرتے اوپر چلی گئی تھی۔ سب نے اسے جاتے دیکھا تھا۔ سالک سر جھکا گیا تھا۔ اس کا مقصد چچی جان کو شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ اس سارے قصے میں بھلا ان کا کیا قصور؟

رات کے کھانے تک وہ دونوں خواتین کے درمیان ہی گھرا رہا تھا۔ چاچا جانی بھی شام کے بعد آ گئے تھے۔ مختلف سوالات کرتے رہے تھے۔ وہ مختصر بتاتا گیا۔ پھر ملازمہ نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی تو وہ سب کی سربراہی میں کھانے کی ٹیبل پر آ گیا۔

"جاؤ اسوہ کو بلا لاؤ۔" زبیدہ چچی جان نے حکم دیا تھا۔ وہ "جی اچھا" کہہ کر چلی گئی تھی۔ بی بی جان اور چچی جان اس کے لیے کھانا نکالنے لگی تھیں۔ سراج بابا نے کھانے پر خصوصی اہتمام کروایا ہوا تھا۔ کئی قسم کی ڈشز تھیں جو کبھی وہ بہت رغبت سے کھاتا تھا مگر اب جیسے کھانے پینے سے بھی دل اچاٹ ہو گیا تھا جو مل جاتا تھا کھا لیتا تھا۔

"چھوٹی بی بی کہہ رہی ہیں وہ کھانا نہیں کھائیں گی، انہیں بھوک نہیں ہے۔" زبیدہ نے آ کر اسوہ کا انکار سنایا تھا۔ چاچا جانی، بابا جان اور چچی جان سب کے ہاتھ رک گئے تھے۔ وہ صرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد اس نے سوچا تھا کہ وہ بدل گئی ہے مگر اب اس کا کھانے کے لیے انکار سن کر اسے اپنی رائے بدلنا پڑی تھی وہ اب بھی ویسی ہی تھی۔ کسی کا بھی خیال نہ کرنے والی۔ وہ تلخی سے ہنسا تھا۔ یہ تلخی اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھی مگر اب جب سے وہ اس گھر لوٹ آیا تھا مسلسل اک کھنچاؤ کی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔

"اسے جا کر کہو کہ فوراً کھانے کی میز پر آئے، بھوک نہیں ہے تب بھی۔" چاچا جانی کے چہرے پر خشمگیں سی کیفیت رقم ہو گئی تھی۔ چچی جان نے ہی درشتی سے کہا تھا۔

"رہنے دو رافیہ! شادی میں پیٹ بھر کر کھا لیا ہوگا۔ بھوک نہیں ہوگی۔" بی بی جان نے فوراً کہا تھا۔

"پھر بھی بھابی بیگم اسے خیال تو کرنا چاہیے...... یہ بالکل ناشائستگی والی بات ہے کہ سب یہاں موجود ہیں اور وہ غائب ہے۔" چچی جان نے دبی دبی آواز میں کہا تھا۔

"کوئی بات نہیں...... تم یہ بریانی چکھو سالک، تمہیں بہت پسند ہے نا۔" بی بی جان یوں لے رہی تھیں، جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ورنہ سالک جانتا تھا کہ اس گھر کی روایتیں کیا ہیں؟ اور ان روایتوں سے انحراف کی سزا کیا ہے۔ اسوہ اس سزا کو بھگت چکی تھی اس کے باوجود وہی ہٹ دھرمی اور ضدی طبیعت برقرار تھی۔

کھانے کے بعد باتوں اور چائے کا دور چلا تھا۔ بی بی جان تھکی ہوئی تھیں خود چچی جان بھی مگر سالک کی خوشی میں رات گئے تک باتیں ہوتی رہی تھیں۔ گزرے دنوں کی، رشتہ داروں کی، گزشتہ حالات و واقعات کی، بہت سے تذکرے تھے، بہت سے قصے کہانیاں تھیں۔ وہ دلچسپی سے سنتا رہا پھر چاچا جانی تھکاوٹ کا کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے تو چچی جان بھی ساتھ ہو لیں۔ بی بی جان اور سالک دونوں وہیں بیٹھے رہے تھے۔ اسوہ اوپر جانے کے بعد نیچے نہیں آئی تھی۔ چچی جان خود جا کر بلانے گئی تھیں مگر اس کا انکار ہاں میں نہیں بدل سکا تھا۔

"سن سالک، جو بھی ہوا سب بھول کر اک نئی زندگی شروع کر...... اسوہ اگر بہت نہیں بدلی تو پہلے جیسی بھی نہیں رہی۔ تو کیوں دل کو روگ لگا رہا ہے۔ کب تک یوں سودائیوں کی طرح پھرے گا۔ اپنا گھر آخر اپنا ہی ہوتا ہے۔ جو سکون، محبت گھر اور بیوی سے حاصل ہوتی ہے وہ اور کہیں سے بھی نہیں مل سکتی۔ میں جانتی ہوں تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ پہلے تمہارے بابا جانی

گزر گئے اور پھر اسوہ، دل لگانے سے، یا قطع تعلق کر لینے سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ اور الجھ جاتے ہیں۔ اس حویلی کو بھی سہاروں کی ضرورت ہے۔ تم اپنے بابا کے وارث ہو، اکلوتے، اور تمہارا کوئی وارث نہیں۔ جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے... تین چار بچے ہو جانے تھے مگر تم خوامخواہ کی ناراضگی لئے، بغیر کسی سے کچھ کہے چلے گئے۔ اسوہ کا بھی نہ سوچا۔ وہ جیسی بھی تھی تمہاری بیوی تھی۔ اسے بھی کچھ نہ بتایا اور جوڑ پے دو علیحدہ...... اب تو ہم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہیں خدانخواستہ تم...... میرے منہ میں خاک، مگر ایسا ہوتا تھا۔ ہر جگہ جہاں تم مل سکتے تھے پتا کروایا تھا۔ کچھ علم ہی نہیں ہوتا تھا۔ خاندان والے اور دیگر رشتہ دار سوچ بیٹھے تھے کہ اب تم اس دنیا میں نہیں رہے کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہو گے، اگر زندہ ہوتے تو کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی رابطہ تو ضرور کرتے۔ اور تم نے بھی... دی...... دل اتنا پتھر کر لیا تھا کہ ماں بھی یاد نہ رہی۔" اس کا سر اپنی گود میں رکھے بالوں میں انگلیاں پھیرتے وہ سب کہہ رہی تھیں، وہ خاموش ہی رہا۔ جواب بہت سے تھے مگر کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"اسوہ اب بدل گئی ہے۔ شاید وہ پچھتا بھی رہی ہے۔ تم کھلے دل سے کام لو، اسے معاف کر دو۔ ساری زندگی کا سوال ہے۔ وہ عزت ہے اس خاندان کی۔ بہت کچھ سہا ہے اس نے۔ بہت انتظار کیا ہے...... اب اسے انتظار کی اذیت سے نکال لو۔ سب رنجشوں کو بھلا کر دل سے اک نئی زندگی کا آغاز کرو۔"

اس کی کشادہ پیشانی پر بوسہ دیتے، انہوں نے نصیحت کی تھی۔ وہ دل مسوس کے رہ گیا۔

کیسی زندگی، کیسی خوشی، وہ تو یہاں صرف اپنا وعدہ نبھانے آیا تھا جو اس نے شاید اسوہ سے نہیں اپنی محبت سے کیا تھا۔ اس کو شاید گوہر مقصود مل گیا تھا۔ کبھی اتنے برسوں بعد اس نے رابطہ کیا تھا۔ اسی پرانے ایڈریس پر اور اسوہ کی قسمت تھی کہ اسے وہ مل گیا تھا اور اب یہاں آ بھی گیا تھا۔

"رات گہری ہو گئی ہے نیند آ رہی ہے، جاؤ آرام کرو، تھک گئے ہو گے۔" اسے ڈھیر سارا پیار کر کے وہ چلی گئی تھیں۔ اس نے گھڑی دیکھی ایک بج رہا تھا۔ ورنہ گاؤں میں اتنی دیر تک بھلا لوگ کب جاگتے تھے۔ آج صرف اس کی وجہ سے سب نے اپنی روٹین خراب کی تھی۔ تھکے تھکے اعصاب لیے وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس کی نظر سیدھی بیڈ کے بالکل وسط میں لیٹے وجود پر پڑی تھی۔ قدم جہاں تھے وہیں تھم گئے۔

"اسوہ......" وہ شاید بھول گیا تھا کہ وہ کمرے میں بھی ہو سکتی ہے۔ وہ جب آٹھ سال پہلے یہاں سے گیا تھا تو تب بھی اسی کمرے میں تھی اور اب بھی...... عجیب لڑکی تھی تب بھی وہ اسے نہیں سمجھ سکا تھا اور اب بھی نہیں...... جب دلوں میں گنجائش نہیں تھی تو کمرے میں ایک ساتھ رہنے کی بھی بھلا کیا تُک تھی۔ اس نے شادی کے اولین دنوں میں اسوہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ چاہے تو علیحدہ کمرہ لے سکتی ہے خاص طور پر ڈریسنگ روم جن کے دروازے اسی کمرے میں کھلتے تھے تب بھی وہ ڈھیٹ تھی اور اب بھی۔ تب اس نے سمجھا تھا کہ وہ اسے صرف اذیت دینے اور اپنی بات منوانے کے لئے اسے زچ کر رہی ہے مگر اب تو وہ آزاد تھی اس کے باوجود اس کمرے میں تھی۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟

مدھم خوابناک نیلگوں روشنی پورے کمرے کو اپنے سحر میں جکڑے ہوئے تھی۔ وہ سر جھٹکتا آگے بڑھا تھا۔ سراج بابا اس کا بیگ کمرے میں رکھ گئے تھے۔ لائٹس جلا کر دیکھا تو وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اسے ڈریس چینج کرنا تھا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر بہت نفاست سے سجی ہوئی تھی۔ کہیں کوئی گرد اور بے ترتیبی نہیں تھی۔

"کہاں رکھا ہے بیگ بابا نے......" اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اس نے کچھ جھک کر بیڈ کے نیچے بھی دیکھ ڈالا وہاں بھی نہیں تھا۔ اسے کوفت سی ہونے لگی۔ یونہی الماری کی طرف بڑھ گیا۔ پہلا دروازہ کھولا ساری کیبن زنانہ سوٹوں سے بھری پڑی تھی اس نے دوسرا پٹ کھولا تو سکون ملا اس کے کپڑے سلیقے سے ہینگرز پر لٹکائے رکھے تھے۔ دیگر اشیاء بھی نچلے درازوں میں موجود تھیں جو وہ ساتھ

لیا تھا جن میں کچھ تحفے تھے، کتابیں تھیں۔ اس کے روزمرہ استعمال کی کئی دیگر اشیاء تھیں۔ ایک ترتیب سے سیٹ تھیں۔ وہ جب تک یہاں تھا شلوار قمیص ہی پہنتا تھا مگر جب سے یہاں سے گیا تھا شلوار قمیص کو جیسے ہاتھ لگانا ہی بھول گیا تھا۔ اس نے رات کی مناسبت سے ایک شرٹ اور ٹراؤزر نکال لیا تھا۔ بیگ سے یہ سب سامان الماری تک کیسے پہنچا یہ سوال غور طلب تھا مگر پھر سراج بابا کا سوچ کر مطمئن ہو گیا۔ کم از کم اسوہ کی جانب سے اسے یہ خوش فہمی کبھی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گیا۔ کپڑے چینج کر کے آیا تو نظر سیدھی بیڈ پر آ ٹھہری۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا تو اسوہ چادر گردن تک اوڑھے سوئی ہوئی تھی۔ اب شاید کروٹ بدلی تھی۔ چادر اب آدھے وجود پر تھی۔ دوپٹہ ندارد تھا۔ جس لباس میں وہ شادی سے لوٹی تھی ابھی بھی اسی میں ملبوس تھی۔ میک اپ کی موجودگی بھی برقرار تھی۔ اس کے کالے سیاہ گھنے لمبے بال سرہانے بیڈ پر بکھرے ایک عجیب سا منظر پیش کر رہے تھے۔ محو خواب چہرہ ہر سو چاندنیاں سی بکھیر رہا تھا۔ چہرے پر سے نظر ہوتی ہوئی اس کے وجود کا طواف کرنے لگی تھی۔ بلو نگینوں سے مرصع سوٹ کی فٹنگ بہت نمایاں تھی۔ وہ لیٹی بھی کچھ اس طرح سے تھی کہ گلے کی گہرائی اور واضح ہونے بہت سے چھپے راز کھول رہی تھی۔ وہ نظر ہٹا گیا تھا۔ اسے ہمیشہ سے خود پر بہت کنٹرول تھا۔ اتنا عرصہ ہو گیا تھا، وہ پہلے اس کے نکاح پھر کمرے میں تھی اس کے باوجود اس کے ہاتھ اس کے وجود تک کے لمس سے محروم تھے۔ جب نکاح میں تھی تب بھی اسے چھونے کی کبھی خواہش ہی نہیں کی تھی اور پھر جب رخصتی ہوئی تھی وہ مکمل طور پر اس کے اختیار میں تھی تو تب بھی سالک نے اپنے اوپر بہت سی پابندیاں عائد کر لی تھیں۔ رخصتی کے بعد وہ کئی دفعہ اس کے یوں لاپرواہی سے سوتے پر جھنجلایا تھا مگر شاید وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ کچھ چچی جان نے نام بھی اپنی صاحبزادی کا چن کر رکھا تھا اسوہ۔ جو نہ کے نام کے برعکس بالکل الٹ واقع ہوئی تھی۔ یہاں سے جانے سے پہلے دونوں نے بمشکل ایک ماہ ہی ایک ساتھ گزارا تھا اور اسے جب بھی وہ وہی کام کرتی تھی جو سالک کو ناپسند ہوتا تھا۔ گھٹن سے برا حال تھا مگر وہ بیڈ کے بالکل درمیان میں تھی۔ کچھ اس کا حلیہ ہی ڈسٹرب کر دینے کو کافی تھا۔ جھنجلاتے ہوئے وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھا تھا۔ ہینڈل گھمایا مگر دروازہ لاک تھا۔ دوسرا ابھی چیک کیا وہ بھی لاک تھا۔ اسے حقیقتاً غصہ آنے لگا۔ نجانے کس کس سے۔

"عجیب مصیبت ہے۔" ایک کاٹ بھری ناپسندیدہ، ناگوار سی نظر اسوہ پر ڈالی تھی، جو بے خبر گہری نیند میں غرق تھی۔ کمرے سے باہر بھی نہیں جا سکتا تھا اوپر کمرے تو کافی تھے۔ اب یہ علم نہیں تھا کہ وہ بھی لاک ہیں یا کھلے ہوئے ہیں۔ دوسرے اگر کسی کے علم میں یہ بات آ جائے تو نہ جانے کیا ہو۔ وہ وہیں...... صوفے پر گر گیا۔ اور سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

"کیا کیا جائے اب؟" پرسوچ نظروں سے بیڈ کو دیکھتے وہ رات گزارنے کا طریقہ سوچنے لگا۔

اسوہ کو اکثر سوتے میں پیاس لگ جاتی تھی۔ حلق خشک سا ہونے لگتا تھا۔ اکثر رات کو وہ اٹھ کر پانی پیتی تھی۔ اس کے لئے وہ ہمیشہ جگ اور گلاس سائیڈ ٹیبل پر ضرور رکھتی تھی۔ رات کا نجانے کونسا پہر تھا اسے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہوئے۔ لیٹے لیٹے ہی سائیڈ ٹیبل پر ہاتھ مار کر لیمپ روشن کیا۔ ہلکی مدھم سی روشنی ہر سو پھیل گئی تھی۔ جگ خالی تھا، رات غصے میں وہ پانی بھرنا بھول گئی تھی۔ شادی میں بھی اس نے کچھ نہیں کھایا تھا مگر آ کر بھی کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ سر شام ہی بغیر کپڑے بدلے ایسے لیٹی تھی کہ اب آنکھ کھلی تھی۔ ہلکی مدھم سی روشنی میں رسٹ واچ پر نگاہ کی تو غور کرنے سے اندازہ ہوا ساڑھے تین کا وقت ہو چکا ہے۔ بیڈ سے اترتے ہوئے اس نے بیڈ کی دوسری سائیڈ خالی دیکھی تھی۔ اس کی سوچ کے مطابق اسے کمرے میں ہی ہونا چاہیے تھا مگر تو سیدھ صوفہ بھی خالی تھا۔ گلاس لے کر وہ آگے بڑھی مدھم روشنی میں زمین پر پڑی کسی چیز سے ٹکرا کر منہ کے بل گری تھی۔ خوف سے ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی۔ گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر کر چھناکے کی آواز سے نہ صرف اس کا دل سہما گیا تھا بلکہ قالین پر لیٹا سالک بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

اسوہ اس کے اوپر بے توازن انداز میں گری تھی۔ تو سالک نے بازوؤں کا سہارا دیا تھا۔

"کون؟" اسوہ سرعت سے پیچھے ہٹی تھی مگر اپنا توازن برقرار رکھنے میں ناکام رہی تھی۔

"اسوہ..... "ہلکی مدھم روشنی میں سالک اسے پہچان گیا تھا کچھ نا سمجھ رہا تھی کی کیفیت لئے دیکھنے لگا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اسوہ کو پیچھے ہٹانا چاہا جو ابھی خاصی بے توازن سی تھی۔

"یہ کیا تماشا ہے۔" وہ جھنجلا سا گیا تھا ابھی تو مارے بندھے آنکھ لگی تھی اور وہ ابھی ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

"وہ..... میں..... پانی...... گلاس...... "وہ بوکھلائی سی ٹھیک سے وضاحت بھی نہ کر سکی۔ سر پیچھے کرنے کی بجائے میں ہلکی سی بھی لبوں سے آزاد ہو گئی۔ پیچھے ہٹتے ہوئے اس کا پاؤں کسی کانچ پر پڑ گیا تھا۔ وہ سسکاری بھر کر وہیں بیٹھ گئی۔

"اب کیا ہوا ہے؟" اپنی نیند کے خراب ہونے اور اسوہ کے یوں ڈسٹرب کرنے نے اسے اچھا خاصا جھنجلا دیا تھا تیوریاں تن گئی تھیں مگر جب نظر اس کے خون آلود پاؤں پر پڑی تو ٹھٹک گیا۔ اردگرد کانچ بکھرے ہوئے تھے وہ ننگے پاؤں تھی۔ کانچ شاید گہرا جا لگا تھا خون بہہ رہا تھا۔

"یہ کیسے ہوا؟" وہ اتنا پتھر بھی نہیں تھا، یہ لڑکی تو اس کے دل میں دھڑکتی تھی۔ سانسوں میں رہتی تھی۔ مشام جاں کو مہکاتی تھی بے اختیارانہ اس کی طرف بڑھا تھا۔

"اٹھو یہاں سے...... مزید زخمی ہونے کا ارادہ ہے کیا؟" وہ جو اسے دعویٰ تھا کہ اس کے ہاتھوں نے کبھی اس کے وجود کو نہیں چھوا تھا بے اختیار انداز میں اس کا بازو پکڑ کے جھنجلائے ہوئے لب و لہجے سے کہتے اسے کھڑا کر رہا تھا۔

"جو لوگ روح تک زخمی ہوں انہیں یہ چھوٹے موٹے زخم تکلیف نہیں دیتے۔ آپ رہنے دیں، شکریہ۔" تلخی سے اپنا بازو سالک کی گرفت سے آزاد کروایا تھا۔ جبکہ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ہونٹوں سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔ کھڑا ہونا محال تھا۔

"تم......" سالک نے کچھ کہنا چاہا تھا پھر لب بھینچ لئے۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا اس وقت اسے فوری ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ مگر وہ کہاں ان باتوں کو سمجھنے والی تھی۔ ضدی وہ ہمیشہ سے ہی تھی۔

"مجھے بھی کوئی ضرورت نہیں ہے ہمدردیاں کرنے کی مگر اس وقت خون بہت بہہ رہا ہے۔ ادھر بیٹھو بستر پہ ادھر تو ہر طرف کانچ ہی کانچ ہیں۔" اس کی پروا کئے بغیر اس کی کمر میں بازو ڈال کر اسے اٹھا کر بستر پہ لے آیا تھا۔ اسے امید نہیں تھی وہ اتنی جلدی یہ کرے گا۔ چہرہ پھیر گئی تھی۔ نظریں ملانے کا یارا نہیں تھا۔ کہاں صدیوں کی دوری تھی اور کہاں یہ قربت تھی۔

"کمرے میں فرسٹ ایڈ باکس تو ہوگا؟" اسے بستر پہ بٹھا کر اس کا پاؤں دیکھتے سر اٹھا کر اس کے رخ پھیرے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ اسی پوزیشن میں نفی میں سر ہلا گئی۔

"نیچے کچن میں رائٹ سائیڈ کی کیبن نمبر ۲ میں رکھا ہوا ہے۔" وہ بمشکل کہہ سکی تھی۔ درد سے برا حال تھا۔ سالک نے کس قدر تشویش سے اسے دیکھا۔ پھر فوراً اٹھا اور باہر نکل گیا۔ جب واپس لوٹا تو ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ وہ قالین پر ہی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر خاموشی سے روئی اور ڈیٹول سے اس کا پاؤں صاف کرنے لگا تھا۔

"لگتا ہے کانچ گہرا ہے۔" خون کسی بھی طور پر نہیں رک رہا تھا۔ خود کلامی سا انداز تھا۔ تکلیف سے بے حال ہوتی وہ منہ پہ ہاتھ رکھے چیخوں کو دبانے لگی۔ وہ کانچ نکالنے لگا۔

"نہیں..... پلیز...... "کانچ نکالتے ہوئے ایکدم اسوہ نے تکلیف سے تڑپ کر اس کا ہاتھ پیچھے ہٹایا۔

"ڈونٹ وری...... ہلکا سا زخم ہے۔ تھوڑی دیر میں درد ختم ہو جائے گا۔" اس کی سسکیاں اس کے لئے برداشت کرنا مشکل تھا۔ اس کے آنسوؤں سے وہ ہمیشہ ہار جاتا تھا یا شاید یہ اس کی کمزوری تھی وہ کسی کو بھی تکلیف میں یا روتے نہیں دیکھ سکتا تھا پھر یہاں تو معاملہ ہی دل کا تھا۔ وہ کیسے خود پہ جبر کرتا۔ بہت نرمی سے کہا تھا جبکہ اسوہ بار بار سر نفی میں ہلا رہی تھی۔ کانچ نکلا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

"امی جی۔"

"ٹیک اٹ ایزی اسوہ! ابھی مرہم لگے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ درد نہیں ہوگا۔ بلیوی۔" نجانے وہ کس رو میں کہہ رہا تھا۔ انداز و لہجہ انتہائی نرم و محبت لئے ہوئے تھا مگر درد سے بے حال ہوتی اسوہ کیا خاک غور کرتی۔

ماہر مرہم ساز کی طرح اس نے منٹوں میں اس کے پاؤں کی بینڈیج کر دی تھی۔ مرہم لگانے سے درد کی شدت میں کچھ کمی ہوئی تو اسوہ کے آنسو بھی کم ہوئے اور سسکیاں میں بھی کمی آئی۔ وہ ایک نظر بینڈیج کرنے کے بعد اسوہ پہ ڈال کر سامان سمیٹے فرسٹ ایڈ باکس سائیڈ کی دراز میں رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

قالین پر جا بجا چھوٹے بڑے کانچ بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک کرکے چننے لگا۔ کچھ وقت لگا تھا، پھر کانچ ڈسٹ بن میں ڈال کے وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ تکئے سے ٹیک لگائے بیٹھی اسوہ نے آنکھیں نیم وا کر کے اسے باہر نکلتے دیکھا تھا پھر ہونٹوں پر زبان پھیرتی اردگرد دیکھنے لگی۔ وہ قالین پر ہی لیٹا ہوا تھا۔ یہاں سے جانے سے پہلے بھی وہ اکثر قالین پر سوتا تھا۔ وہ کیوں جاتا ہے وہ بہت کوشش کے بھی پوچھ نہیں سکی تھی۔ نہ ہی کبھی دل میں ملال جاگا تھا مگر آج اس حادثے نے اس کی سوچ کا رخ بدلا تھا۔

سالک کمرے میں لوٹا تو چھوٹی سی ٹرے میں دودھ کا گلاس تھا اور ساتھ ہی گولیاں تھیں۔

"دودھ پی کر یہ میڈیسن لے لو۔ درد میں افاقہ ہوگا۔" ٹرے اس کے سامنے کئے وہ کہہ رہا تھا۔ وہ ایک پل کو ہی اس اونچے لمبے چوڑے مرد کو دیکھ سکی تھی۔

"شکریہ...... مجھے نہیں دودھ پینا۔" انداز میں اب بھی روٹھا پن تھا۔ صاف انکار کیا تھا۔

"تمہیں پلانے، یا خدمتیں کرنے کا مجھے بھی شوق نہیں ہے۔ تمہاری سسکیوں سے مجھے نیند نہیں آئے گی جبکہ میں سونا چاہتا ہوں۔ یہ گولیاں درد میں افاقہ کریں گی۔" سالک کے لہجے میں بھی برہمی شاید چند لمحوں کے لئے آئی تھی۔ اس کا کڑوا لہجہ سن کر وہ اپنے لب و لہجے کو بھی کڑوا ہونے سے نہیں روک سکا تھا۔

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ کس نے کہا تھا راستے میں لیٹنے کو...... سارا قصور آپ کا ہے۔ اتنی ہی ناقابل برداشت تھی تو کہہ دیا ہوتا میں خود ہی کمرے سے نکل جاتی۔ کم از کم آپ کو زمین پر سونے کی زحمت تو نہ اٹھانا پڑتی۔ دوسرے میں نے دعوت تمہاری کی ہمدردی جتانے کی۔ منع کیا تھا میں نے......" وہ اس سے زیادہ تند لہجے میں کہہ گئی تھی۔ سالک کے اندر اک اشتعال سا ابھرنے لگا۔ یہ سب زبان درازی کڑواہٹ کا مظاہرہ کرنا اشتعال انگیزی وغیرہ قسم کے جذبات اس کی طبیعت کا خاصا نہیں تھے۔ وہ تو شروع سے ہی بہت تحمل مزاج تھا یہ تو دو تین دن سے یہ کیفیت ہو گئی تھی۔ آتے ہوئے وہ خوامخواہ کامران سے جھگڑ پڑا تھا۔ یہاں آنے کے بعد اب یہ طنزیہ جملے وہ ایکدم اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ گیا۔ بہرحال وہ تکلیف میں تھی۔ اور اسے اس وقت میڈیسن کی ضرورت تھی۔

"پلیز اسوہ! ہر بات میں ضد اچھی نہیں ہوتی۔" ایکدم نرمی سے کہہ رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسوہ نے گلاس تھام لیا۔ اس نے دل ہی دل میں شکر کا کلمہ پڑھا۔ بغیر مزید کوئی نخرہ دکھائے اس نے میڈیسن بھی کھا لی تھی۔ اس نے ٹرے ایک طرف رکھ کر گھڑی دیکھی جو چار بجا رہی تھی۔ اسوہ اب بیڈ کے کنارے پر تھی۔ باقی سارا بیڈ خالی تھا پہلے موڑ پر پہلی رات میں ہی یہ تلخ تجربہ اسے ہو چکا تھا۔ سو دوبارہ زمین پر سونے کے بجائے بیڈ کی دوسری طرف آکر تکیہ درست کیا۔

"تم سوؤ گی یا لائٹس جلتی رہنے دوں؟" اس نے پوچھا تھا۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر دراز ہو کر چادر سر تک تان گئی تھی۔ وہ

چند لمحے تاسف بھری نظروں سے اس کی پشت کو گھورتا رہا پھر آگے بڑھ کر لائٹس آف کر دیں۔

اسوہ نے بیڈ پر دوسرے وجود کو لیٹتے محسوس کر کے اندھیرے میں چادر چہرے سے ہٹائی تھی۔ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے وہ غیر محسوس طریقے سے دائیں سے بائیں طرف کروٹ بدل گئی تھی جدھر وہ تھا۔

* * *

اسے آئے کتنے دن ہو گئے تھے۔ پہلے تو رشتہ داروں سے ملنا ملانا رہا پھر وہ بھی ختم ہو گیا۔ ہر وقت حویلی میں بیٹھے بور ہونے لگا تو چاچا جانی کے ساتھ زمینوں اور باغات پر چلا جاتا تھا۔ وقت آرام سے گزرنے لگا تھا۔ وہ جس مقصد کے لیے آیا تھا اس طرف سے ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ بہت چاہنے کے باوجود وہ خود بھی کوئی بات نہیں کر پا رہا تھا۔ شروع کے چند روز انتظار رہا مگر جب اسوہ کے انداز و اطوار دیکھے تو نجانے کیوں دل اپنے وعدے سے منکر ہونے کو چاہنے لگا تھا۔ گزرے وقت نے اسے کافی بدل دیا تھا۔ وہ حیران تھا، وہ سوڑی سی، تنک چڑھی سی، ضدی جھگڑالو لڑکی نجانے کہاں جا چھپی تھی۔ اب تو جب بھی اسے دیکھو وہ ایک نئے روپ میں ہی نظر آتی۔ کبھی بی بی جان کی خدمت کر رہی ہے، کبھی چچی جان کے ساتھ لگی ہوئی ہے، کبھی کچن میں مصروف ہے تو کبھی حویلی کے دوسرے کاموں میں الجھی ہوئی ہے۔ ملنے ملانے والے الگ اس کی سیرت و خوش گفتاری کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ وہ اسے نہ پہلے سمجھ سکا تھا اور نہ ہی اب۔ بلکہ اب تو سالک کا اپنا دل بھی مشکوک سا ہونے لگا تھا اس کی طرف سے۔ وہ نجانے کیا کھیل کھیلنا چاہتی تھی۔ اتنے عرصے بعد خود اس نے خط لکھ کر اسے بلوایا تھا اور اب یہاں وہ تھا تو یوں بنی ہوئی تھی جیسے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ وہ اسے سمجھنے سے قطعی قاصر تھا۔ بظاہر وہ خود کو پرسکون رکھے ہوئے تھا مگر اسوہ کے انداز اطوار دیکھ کر ذہن کے اندر تلاطم برپا ہونے لگے تھے۔ کبھی دل خوش کن احساسات میں گھرنے لگتا تھا تو کبھی بے شمار منفی سوچیں اسوہ کے گزشتہ رویے یاد آ آ کر اس کے دل کا سکون تباہ کرنے لگتے تھے۔ وہ کیا کرے وہ بے بس سا خود کو عجیب احمق سا محسوس کرنے لگا تھا۔

کچھ پچھلی رات جو واقعہ ہوا تھا پاؤں میں کانچ لگنے سے اگلے تین چار دن تک وہ شدید بخار میں جلتا رہی تھی۔ اس کی بیماری کے دوران تو اس کے اندر ہمت ہی نہیں ہوئی تھی کہ ایک لفظ بھی کہہ لے بعد میں اس نے کئی دفعہ بات شروع کی تو وہ ادھر ادھر ہو گئی تھی۔ اور اس کی یہی حرکت اسے سب سے زیادہ کھٹک رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بات جلد از جلد نمٹ جائے وہ چاچا جانی کے ساتھ زمینوں پر نکلا ہوا تھا، باغات کے کچھ معاملات تھے۔ چچا جان کے ساتھ اسے شہر جانا پڑ گیا تھا۔ دونوں عصر کے قریب گاؤں پہنچے تھے راستے میں اسوہ اور اس کی مشترکہ پھوپو کا گھر پڑتا تھا، چاچا جان، بہن کے گھر اتر گئے تھے۔ وہ تنہا ہی حویلی پہنچا تھا۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ نے اسے تھکا دیا تھا۔ آتے ہی وہ صوفے پر گر گیا تھا۔ پانی کی طلب ہو رہی تھی اٹھ کر جگ دیکھا وہ خالی تھا۔ پھر یونہی بیزار سا لئے منہ دراز ہو گیا تھا۔ بی بی جان اور چچی جان سے نیچے ہی سامنا ہو گیا تھا۔ اسوہ کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ شاید حویلی میں نہیں تھی۔ وہ کمرے آ گیا تھا۔ ابھی اسے لیٹے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے چہرے کا رخ بدلا تو اسوہ ٹیبل پر کھانے کی ٹرے رکھ رہی تھی۔

''کھانا کھا لیں..... بی بی جان نے بھجوایا ہے۔'' شاید اسے عادت تھی بی بی جان یا چچی جان کے کہنے پر ہی اس کے کام کرتی تھی۔ یہاں سے جانے سے پہلے رخصتی سے پہلے اور اب بھی اسوہ نے اس کا جب بھی کوئی کام کیا تھا بی بی جان چچی جان کا حکم ضرور دبا تھا۔ اس کے دل میں حسرت ہی رہی تھی کہ وہ خود سے بھی اس کے لئے کوئی کام کرے۔ یہ ایسی واحد ان ہونی خواہش تھی جسے وہ اپنا حق سمجھتا تھا، مگر وا دری قسمت ...... وہ اٹھ بیٹھا...... ایک گہری مگر بھرپور نظر اس کے اجلے، بجلیاں گراتے سراپے پر ڈالی سوائے چند بار کے اس نے آج تک اسے بکھرے ہوئے حلیے میں نہیں دیکھا تھا۔ رواج کے مطابق لباس زیب تن کیے ہونٹوں پر

ہلکی سی لپ اسٹک لگائے نازک سی گولڈ کی جیولری پہنے ہوئے تھی۔ پتا نہیں یہ بناؤ سنگھار بھی اس نے کسی کے کہنے پر کیا تھا یا...... اس کے ہاتھوں میں پڑے سونے کے کنگنوں اور کانچ کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ سالک کو ڈسٹرب کرنے لگی تھی۔ وہ اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر آیا تو وہ الماری میں سر دیئے نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ وہ نظر انداز کیے ٹرے اپنے آگے سرکا کر کھانا کھانے لگا تھا۔ اس دوران وہ الماری سے ہٹی تو ڈریسنگ کی ترتیب شدہ چیزوں کو نئے سرے سے ترتیب دینے لگی۔ سالک کی اگرچہ ساری توجہ کھانے پر تھی مگر اس کی موجودگی بھی نظر انداز نہیں کر پا رہا تھا۔ ہر ہر حرکت اور ہر ہر انداز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اوپر سے اس کی چوڑیوں کی کھنک...... وہ کھانا ختم کر چکا تھا، نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے ٹرے پرے کھسکائی تو ادھر ادھر مصروف اسوہ بھی قریب آ گئی۔

''بیٹھو مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' تکیے کے سہارے کمر سیدھی کرتے ہوئے وہ بیٹھ گیا تھا۔ وہ ٹرے اٹھا رہی تھی جب اس نے کہا تھا۔ وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔

''کہیے، میں سن رہی ہوں۔'' وہی اکھڑ لہجہ تھا۔ تند خو...... وہ الجھا...... سب کے ساتھ اس کا رویہ بہت ملنسار اور محبت کرنے والا ہوتا تھا۔

''مجھے کھڑے کھڑے ہی تم سے یہ بات کرنا ہوتی تو میں آٹھ سال کا نام نہ رہتا۔ بہت پہلے یہ مسئلہ حل ہو چکا ہوتا۔ چند منٹ کے لئے تم بیٹھو۔'' اس کا لہجہ سخت تھا۔

''ایم سوری...... میں نیچے کچن میں کچھ کام چھوڑ کر آئی ہوں۔ بیٹھنے کا میرے پاس وقت نہیں۔ اتنی دیر جو رکی ہوئی تھی تو چاچی جان کی تاکید تھی ورنہ...... بہر حال اگر آپ کی بات وضاحت طلب یا طویل ہے تو پھر کر لیجیے گا۔'' وہ سالک کے لہجے کی سختی سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئی تھی۔ جانے لگی تو سالک ایک دم اٹھ کر اس کے راستے میں آیا۔ اسوہ کے لئے یہ عمل باعث حیرت تھا۔ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''جب تمہارے پاس وقت ہی نہیں تھا تو میرے اچھی بھلی زندگی میں ایک دفعہ پھر پتھر کیوں ڈالا تم نے؟ کیوں بلوایا مجھے؟ بتلا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا چاہتی ہو اب تم؟'' اپنی جیب سے خط نکال کر اس نے اس کے سامنے لہرایا تو بجائے وہ شرمندہ ہونے کے مسکرانے لگی۔ مسکراہٹ بھی بڑی طنزیہ سی تھی اور نظروں کی کاٹ حد سے سوا۔

''کیا چاہتی ہوں میں؟'' اس نے خود سے دہرایا تھا پھر ہنس دی۔ ''بڑے عرصے بعد یہ سوال کرنے کا خیال آیا۔'' وہ سالک کی آنکھوں میں دیکھنے لگی تھی۔ وہ لب بھینچ گیا۔ ''آپ کو کیوں بتاؤں میں کیا چاہتی ہوں...... چلیے چھیے...... اس وقت میں مصروف ہوں بعد میں یہ بات زیر بحث لے آیئے گا۔ بے فکر رہیے کہیں نہیں بھاگی جا رہی میں۔ جبکہ بقول آپ کے آپ کچھ عرصے بعد چلے جائیں گے۔'' کتنا پر اعتماد انداز تھا۔ شکست دیتا ہوا۔ نجانے وہ کیا تھی۔ ہمیشہ اسے مجبور کر دیتی تھی مگر اس دفعہ وہ مجبور نہیں ہونا چاہتا تھا۔ محبت میں انا بھی شامل ہونے لگی تھی۔ اب کے اس کے لئے اپنی ذات کی توہین برداشت نہیں تھی۔ اپنے رشتے کی پامالی گوارا نہیں کی۔

''لٹ از نف اسوہ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ میری بات سنے اور میرے سوال کا جواب دیئے بغیر......'' انگلی اٹھا کر غصے سے کہا۔

''آپ مجھے روک بھی نہیں سکیں گے۔ میں ضرور جاؤں گی۔'' اس نے مسکرا کر سالک کی غصہ بھری آنکھوں میں دیکھتے جیسے اس کے ضبط کو آواز دی تھی۔ انداز و لہجہ نہایت چیلنجنگ تھا۔ اچھا خاصا کول مائنڈڈ سالک ایک دم لوز ٹمپرڈ ہوا تھا۔

''کیا سمجھتی ہو؟ میں اگر کچھ نہیں کہتا تو بے بس و مجبور ہوں۔ مائنڈ اٹ تم میری بیوی ہو...... سارے اختیار رکھتا ہوں میں تم

پر......'' اس کے ہاتھوں سے ٹرے چھین کر میز پر پٹختے ہوئے اس کا بازو تھام کر اسے بستر پر دھکیلتے وہ غرایا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی نیچر، طبیعت اور مزاج کے خلاف کچھ کیا تھا۔ اسوہ نے منہ کے بل بستر پر گرنے کے بعد کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ سرو پا بے ہی پاؤں میں الجھ کر کچھ قالین اور کچھ بستر پر گر گیا تھا۔

''اب مجھے جواب دو...... کیوں بلوایا تھا تم نے مجھے؟ کیا ارادے ہیں تمہارے؟'' اس کا رخ سیدھا کیا تھا۔ پہلی سے گندمی دراز کالے سیاہ بالوں کی چوٹی آگے آ گئی تھی۔ کہنیوں کے سہارے وہ ابھی بھی بے توازن نیم دراز تھی۔ جبکہ نظریں اس سے گریزاں تھیں۔ سالک کی کن پٹیاں جھلنے لگیں۔

''جواب دو اسوہ، مجھے، میں کچھ بکواس کر رہا ہوں۔'' آج تو اس کا لب ولہجہ کیا ہر انداز ہی نرالا تھا۔ اسوہ صرف ایک نظر اس پر ڈال کر رہ گئی۔ برسوں کی خواہش آج شاید پوری ہو گئی تھی۔

''میں نے خط میں ظاہر کر دیا تھا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔'' چند ثانیے بعد اس کی مضبوط آواز گونجی تھی۔ سالک صرف دیکھ رہا۔ دل میں بہت کچھ آن واحد میں ٹوٹ گیا تھا۔ شاید حالات بدل گئے ہوں، شاید اس کی سوچ نے کچھ مثبت رخ اختیار کیا ہو۔ شاید کے گمانوں میں الجھانہ جانے کیا کچھ لاشعور میں آ کر اب اسے اکسانے لگی تھیں۔ ذہن پر، دل پر کچوکے لگانے لگی تھیں۔ اس کے اندر کے متحمل مزاج کم گو آدمی کو تند و تیز، تلخ مزاج بنانے لگی تھیں۔

''تم......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ اسوہ اگرچہ اس وقت خود کو مضبوط ظاہر کر رہی تھی۔ مگر اس کی لحظہ بہ لحظہ بدلتی کیفیت اسے اندر ہی اندر ہراساں کر رہی تھی۔

''تم...... تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا...... پہلے تمہیں میرے آٹھ سالوں کا قرض ادا کرنا ہو گا۔ کیونکہ مجبور ہے...... میں وعدے کا پکا انسان ہوں۔ جو کہتا ہوں کرتا ہوں۔ کیوں سوتے بازی کرو گی۔'' اپنی محبت کو دل کے کسی کونے میں دفن کرتے ہوئے اپنے مزاج و عادات کے خلاف اس نے اس کا بازو چٹانی گرفت میں لئے پہلی دفعہ استحقاق سے بھرپور انداز میں اس کو اپنے حلقے میں مقید کر لیا تھا۔ وہ پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

وہ یہ سب کیوں کر رہا تھا وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ شاید ان کے لاشعور میں بہت کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ اس کا مان...... اس کے برسوں سے قائم کئے گئے مفروضے اور محبت کی طاقت...... اتنے سالوں کا ضیاع...... اگرچہ وہ مائنڈ میک اپ کر کے آیا تھا اپنے دل کو بہلا کر، سمجھا کر آیا تھا مگر اب دل ہر حقیقت ماننے سے انکاری تھا۔ دماغ کے آگے سب دلیلیں بے کار تھیں۔ دل و نگاہ سب صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ لڑکی جو اس کی بیوی ہے۔ اس کی غیرت و عزت، انا و مردانگی، عزت نفس و خودداری پر گہری چوٹ لگنے کا سبب بنی ہے۔ ان کی محبت کی پامالی کا سبب بنی ہے۔

''کیوں...... مل گیا تمہیں اپنا گوہر مقصود...... تمہارا محبوب عالی جو تمہیں کہا تا تھا کہ وہ تمہیں بہن کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتا...... اب کیسے اس نے تمہیں بہن کے علاوہ کچھ اور بنا لینے کی جرأت کر لی ہے۔ بھئی شوہر ہوں تمہارا...... مجھے نہیں بتاؤ گی۔'' ہاتھ سے اس کی تھوڑی اٹھا کر اوپر کرتے اپنے چہرے کے قریب لے جاتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔ پہلے والا سالک کہیں تھا ہی نہیں...... آنکھوں میں ایک عجیب سا استہزاء تھا۔ اسوہ کا وجود کٹنے لگا۔ اس کی بات کا مفہوم وہ بخوبی سمجھ گئی تھی۔ کچھ کہنے کے بجائے وہ اپنے لب کترنے لگی تھی۔ سالک کی سانسوں کی حدت و گرمی اس کا چہرہ سلگائے دے رہی تھی۔ اوپر سے اس کی یہ قربت...... اس کے وجود کی سحر انگیزی...... دست و نگاہ کی گہرائی میں لپٹی ہوئی ٹھنڈک...... اس کے پورے وجود میں ایک جھرجھری سی دوڑا گئی تھی۔

''آپ کو اس سلسلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئے۔ آپ اپنے وعدے کا سوچیں۔'' اس کا لہجہ زہرخند ہو گیا تھا۔

''کیوں...... کیوں...... دلچسپی نہیں ہونی چاہئے اسوہ بیگم؟ تمہیں اتنا یقین و اعتماد کیوں ہے کہ میں اپنے وعدے کو نبھانے

کے لئے اتنی دور سے آیا ہوں۔ ہیں بولو، تمہاری اتنی خوش فہمی کس سلسلے میں ہے کہ میں اپنا کوئی حق استعمال نہیں کروں گا۔ مائی ڈیئر وائف اتنی جلدی تو ہم بھی رہائی نہیں دیں گے۔'' یہ لب ولہجہ اس کی عادت نہیں تھا۔ وہ ہر ہر لفظ اپنے مزاج کے خلاف بول رہا تھا۔ ہر حرکت اس کی طبیعت کے متضاد تھی۔ اسوہ صرف دیکھ کر رہ گئی۔ نجانے دل کو خوشی ہوئی تھی کہ کیا ہوا تھا۔

''اس لئے سالک صاحب کہ نظر شناسی کی صلاحیت آپ میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ اپنی ذات کے گرد فصیلیں کھڑی کرتے کرتے بالکل ڈھے گئے ہیں۔ کبھی اپنی ذات سے نکل کر دیکھیں تو میرا مطالبہ برا نہیں لگے گا۔'' اتنی گہری چوٹ لگا جائے گی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس کے وجود کے گرد اس کے ہاتھ ایک دم ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ وہ استہزائیہ ہنسی۔

''اسوہ......'' اس نے تنبیہی پکارا تھا مگر پہلے والی برودت شامل نہیں تھی۔

''میں جو ہوں...... جیسی ہوں، اچھی یا بری، ڈنکے کی چوٹ پر ہوں۔ جن اختیارات کا آپ آج مجھے حوالہ دے رہے ہیں وہ گزشتہ کئی برسوں سے ہمارے درمیان ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں آپ مجھے کسی کمزور لمحے یا ذاتی تسکین کا سبب بنا لیں گے۔ اگر آپ کو اپنی ذات کی توہین گوارا نہیں تو مجھے بھی نہیں۔ مگر اتنی جرأت ہے کہ سب کے سامنے کھل کر انکار کر سکتی ہوں۔ جب مجھے پہلے زبردستی گوارا نہیں تھی اب تو بالکل بھی نہیں۔'' وہ نہ جانے کیا کہہ رہی تھی اس کی سمجھ سے بالا تھا سب کچھ۔

''کیا بکواس ہے یہ؟'' سالک کی سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کمزور لمحوں کا مفہوم چھبنے لگا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ اس کے وجود کے گرد سے ہٹا لئے تھے۔ وہ ہنس دی تھی۔ صاف مذاق اڑاتی ہوئی ہنسی تھی۔ وہ بمشکل خود پر کنٹرول کر سکا۔

''سالک صاحب! پہلے اپنے اختیارات کی ابجد سے واقف ہو لیں پھر قدم بڑھائیں۔ یہ بکواس نہیں ہے حقیقت ہے۔'' دوپٹہ کھینچ کر وہ بستر سے اتر گئی تھی۔ سالک اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔ اسوہ نے آگے بڑھ کر ٹیبل سے دوبارہ ٹرے اٹھائی۔

''اپنے حقوق کی دھمکی اچھی لگی مگر ہر انسان میرے جیسی نیچر کا حامل نہیں ہوتا۔ جب میں نے آپ سے گزشتہ آٹھ سالوں کا حساب نہیں مانگا تو میں بھی مجبور نہیں ہوں کہ آپ کو اپنی ایک ایک جنبش کا جواب دوں۔ جبکہ ہمارے درمیان طے پایا تھا کہ ہم کبھی بھی ایک دوسرے کی زندگی میں مداخلت نہیں کریں گے۔ اپنے اپنے دائرے میں رہیں گے۔ آپ نے مجھے اپنے ہر حقوق سے آزاد قرار دیا تھا تو پھر اب یہ تماشا کیا ہے؟ آپ کو بلانے کا مقصد صرف یہی تھا کہ بی بی جان آٹھ سالوں سے انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہیں۔ وہ دل کی مریضہ بن چکی ہیں۔ سب مجھے الزام دیتے ہیں۔ جب میرا قصور تھا تب ہر الزام میں آسانی سے سہہ گئی تھی مگر اب برداشت کرنا ناممکن ہے۔ چھ ماہ پہلے انہیں شدید ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ان کے دل کا صرف ایک ہی روگ ہے اور وہ آپ ہیں۔ سب نے منع کیا تھا کہ آپ کو یہ بات نہ بتائی جائے مگر آپ بضد تھے سو شوق پورا ہو گیا ہو گا۔ جبکہ نہ مجھے آپ سے کوئی سروکار ہے اور نہ ہی آپ سے کسی وعدے سے۔ اب میرے لئے کوئی وعدہ...... کوئی بات، کوئی زبردستی...... کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ مجھے زندگی گزارنی ہے اور اسی حویلی میں گزارنی ہے۔ میں نے نہ پہلے آپ کی زندگی میں شامل ہونے کی کوشش کی ہے اور نہ اب کروں گی۔ آپ کو خط لکھنا صرف ایک بہانہ تھا۔ سب سمجھتے تھے کہ مجھے علم ہو گا کہ آپ کہاں ہیں؟ جبکہ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا۔'' وہ بغیر رکے کتنا کچھ سنا گئی تھی۔ خاص طور پر بی بی جان کے بارے میں انکشاف نے اسے دہلا دیا تھا۔ اپنی ذات کا ماتم کرتے ہوئے وہ باقی ہر حقیقت، ہر رشتے کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ کچھ دیر پہلے حاوی ہونے والا سارا جوش، سارا اشتعال، ساری فرسٹریشن منٹوں میں ہوا ہو گئی۔ وہ اب آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگا تھا۔

''اور ہاں ایک بات اور سالک صاحب! جس عالی کا طعنہ آپ مجھے دیتے رہتے ہیں اور ساری حویلی والے دیتے رہتے تھے اگر وہ مجھے سگی بہن کی طرح سمجھتا تھا تو میں نے اسے سگے بھائی والا مقام دیا تھا۔ میں نے یہ اتنے جھوٹ کیوں بولے؟ اپنی ذات پہ بیچڑ کیوں برداشت کیا؟ کاش اس کے متعلق سوچتے، نہ مجھے کل کوئی گوہر مقصود ملا تھا اور نہ ہی اب ملا ہے۔ اور جو ملا تھا......'' وہ

باہر نکلنے سے پہلے دروازے پر ہی رکتے سب کہہ رہی تھی۔ وہ ایک انکشاف کے بعد دوسرا کر رہی تھی اور سالک کیفیت عجیب سے عجیب تر ہوتی جا رہی تھی۔

"خیر...... میں آپ کو یہ سب کیوں بتا رہی ہوں شاید اس لئے کہ آپ نے کچھ دیر پہلے پوچھا تھا کہ میں کیا چاہتی ہوں...... کاش سالک صاحب! یہ سوال آپ آٹھ سال پہلے کرتے...... نہ مجھے آپ کی کسی وعدہ ایفائی سے غرض ہے اور نہ ہی کسی اور بات سے۔" سرد سے لہجے میں اتنا کچھ کہہ کر وہ باہر نکل گئی تھی۔ پیچھے سالک کو حیران و ششدر چھوڑ کر۔

"یہ سب کیا تھا......؟" اس کے سامنے ایک بڑا سا سوالیہ نشان تھا۔ اس کی ذات گہرے سمندروں میں گم ہونے لگی تھی۔ ہر طرف ماضی کی فلم چلنے لگی تھی۔ گزشتہ واقعات ایک ایک کر کے اس کے ذہن کے پردے پر چھانے لگے تھے۔

* * *

"مگر بابا جانی یہ کیسے ممکن ہے۔ ابھی تو صرف میں جونیئر کیمبرج میں ہوں۔ نو بابا جانی...... وہ مجھے پسند نہیں۔ وہ بہت چھوٹی ہے۔ مغرور بھی ہے۔" کل ہی لوٹا تھا جب آج صبح ہی بابا نے اسے اپنے روبرو طلب کر کے ایک خواہش ظاہر کی تھی۔ ایک بم پھٹنے سے ہی اکھڑ گیا تھا۔

"مگر ہم زبان دے چکے ہیں۔ شروع سے ہی ہماری یہی خواہش تھی۔ اسوہ بہت اچھی بچی ہے۔ بس عمر ہی ایسی ہے کچھ شرارتی سی ہے، پھر وہ سالار کی اکلوتی اولاد بھی تو ہے۔ سو کچھ ضدی اور اکھڑ مزاج ہے مگر بدتمیز ہرگز نہیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ اگر تمہیں اس کے چھوٹے اور مغرور ہونے پر اعتراض ہے تو وقت کے ساتھ ساتھ وہ سمجھ جائے گی ابھی تو بچی ہے۔ دکھاوا ابھی ہم تم دونوں کی شادی کر رہے ہیں۔ بس ایک خواہش ہے، زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ میں مرنے سے پہلے تمہاری دلہن دیکھنا چاہتا ہوں۔" بابا آخر میں جذباتی ہو گئے تھے۔ اعتراض تو اس کے پاس بہت سے تھے مگر بابا کے سامنے وہ چپ ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی کا ہر فیصلہ بابا جانی نے ہی تو کیا تھا۔ پہلے بھی اب بھی۔ بچپن سے لے کر اس عمر تک اسے بابا جانی سے خاص انسیت تھی۔ ان کے لئے ان کا ہر کہا لفظ حرف آخر ہوتا تھا۔ اس کے مزاج، عادات، اخلاق و کردار، پر ان کی شخصیت کی گہری چھاپ رقم تھی۔ کبھی بھی اس نے ان کا دل دکھانے اور ان کا حکم ٹالنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر اب ان کا حکم...... وہ عجیب دوراہے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ پھر وہ جس دور میں تھا، پسندیدہ جیون ساتھی کے خواب وغیرہ کوئی ان ہونی بات تو نہیں تھی۔ وہ خود بھی کم گو، سنجیدہ مزاج متین سی فطرت کا مالک تھا۔ یعنی اس کا آئیڈیل بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اب اسوہ کا نام سن کر اس کی سوچیں منتشر ہونے لگی تھیں۔ وہ قطعی سالک کے لئے موزوں نہ تھی لیکن بابا جانی آج کل بیمار رہنے لگے تھے۔ گزشتہ ماہ ان کا روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ان کی بیک بون متاثر ہوئی تھی۔ بیماری نے انہیں بہت حساس بنا ڈالا تھا۔ اب ہر وقت انہیں یہی گمان رہنے لگا تھا کہ کہیں کوئی لمحہ زندگی کی ڈور سے انہیں جدا نہ کر دے۔ سالک ان کی زندگی کی پہلی اور آخری خواہش تھا۔ اکلوتی اولاد تھا۔ اسوہ انہیں شروع سے ہی پسند تھی۔ اب انہوں نے دونوں کے نکاح کے لیے اصرار کیا تھا تو وہ پہلوتہی کی کوئی راہ تلاش نہیں کر پا رہا تھا۔ بہرحال اس حالت میں وہ بابا کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل آیا تھا۔

بابا کے کمرے سے نکل کر ابھی وہ کاریڈور کراس بھی نہیں کر پایا تھا کہ سامنے ہی وہ آ کھڑی ہوئی، جس کے نام کی کڑواہٹ اس کی زندگی میں گھلنے والی تھی۔

"ہیلو کزن......" مسکراتی آنکھیں اور کھلکھلاتا لہجہ تھا۔ وہ چپ چاپ گزر رہا۔ اسے اسوہ کی یہ بدتمیزی بہت زہر لگتی تھی کہ وہ کوئی حوالہ استعمال کئے بغیر اسے صرف کزن یا سالک کہتی تھی۔

"امی جان بتا رہی تھیں کہ آپ رات کو ہی لوٹے ہیں۔ کیسی طبیعت ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟ اور اسٹڈی کیسی چل رہی ہے۔" اس نے تحمل سے پوچھا تھا۔

"بالکل اے ون۔ اور اسٹڈی کا پوچھتے ہی مت وہ چل نہیں رہی دوڑ رہی ہے۔ ہمیشہ کی طرح ٹاپ آف دی لسٹ میں رہوں گی۔" پُراعتماد لہجہ، بے پروا و بے فکر انداز تھا۔ اپنی جسامت کی وجہ سے اپنی باتوں کے برعکس وہ بہت کم عمر بلکہ کم سن سی بچی ہی لگتی تھی۔ جبکہ دونوں میں صرف سال ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ مگر اس کی نظر میں وہ بچی ہی تھی۔

"آپ کو تو آنا ہی نہیں تھا اگلے ماہ آپ کے امتحان ہونے والے ہیں۔ پھر اب کیسے آئے؟" وہ آگے بڑھا تو وہ پوچھنے لگی۔ بلا کی باتونی تھی۔ مجال ہے کسی کو چپ رہنے دے۔

"بابا نے فون کر کے بلوایا تھا۔" وہ بھی ساتھ ہی چل رہی تھی۔ ایک دو دفعہ اس کا کندھا سالک کے کندھے سے مس ہوا تھا وہ شعوری طور پر دو قدم مزید آگے بڑھ گیا تھا۔

"کیوں؟" سادہ سا انداز تھا وہ چڑ گیا مگر ظاہر نہ ہونے دیا۔

"بس ملنا چاہتے تھے۔" مختصراً بتایا۔

"اتنی جلدی...... ابھی پندرہ دن پہلے ہی تو مل کر گئے تھے۔" وہ حیرت سے کہہ رہی تھی۔ وہ بات کی کھال نکالنے میں ماہر تھی۔ وہ چپ ہی رہا۔

"چلیں اچھی بات ہے۔ ایک دو دن رہیں گے ہی نا۔ آج کل میرے ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔ تھوڑی سی ہیلپ کروا دیجئے گا۔" سالک نے جان چھڑانے والے انداز میں فوراً سر ہلا دیا تھا۔ جانتا تھا وہ بھی، جیسے پڑھتی خاک نہیں تھی۔ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کے سوالات کر کے اسے زچ کر دیتی تھی۔ بس اس کی ہیلپ لینا تو ایک بہانہ ہوتا تھا اصل مقصد تو اسے چڑانا ہوتا تھا مگر مجال ہے جو کبھی اس نے اندر کا غبار باہر آنے دیا۔ وہ اوپر سے نیچے تک حویلی کے طور طریقے اور اصولوں کی پاسداری کا ہمیشہ خیال رکھتا تھا۔ ہر بات میں شائستگی، رواداری، تحمل مزاجی کے وصف کا خیال رکھتا تھا۔ شور شرابے سے سخت نفرت تھی اور وہ تھی کہ بالکل متضاد تھی۔ شعلہ جوالہ ہر وقت ایک ہنگامہ برپا رکھنے والی، ضدی، اکھڑ، تند خو سی تھی۔ اگر یہ کہا جاتا کہ ایک مشرق اور دوسرا مغرب ہے تو یہ بے جا نہ ہوتا۔ وہ واقعی ایسی ہی تھی۔

وہ اسے چھوڑ کر بی بی جان کے پاس آ گیا وہ کچن میں ملازموں سے اس وقت صبح کا ناشتہ تیار کروا رہی تھیں۔

"بی بی جان مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"ہاں کہو نا...... میں سن رہی ہوں۔" انہوں نے اسی مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

"یہاں نہیں میرے کمرے میں چلیں۔" بی بی حیران ہوئیں پھر اس کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گئیں۔

"بی بی جان میں اسوہ سے نکاح نہیں کروں گا۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔ اس وقت کمرے میں داخل ہوتی اسوہ دروازے پر ہی ٹھٹک گئی تھی۔

"ہیں...... کیا کہہ رہے ہو تم......" بی بی حیران تھیں۔ اتنا مؤدب بیٹا انکار کیسے کر سکتا ہے۔

"بی بی جان! ہم بالکل مختلف ہیں۔ ہمارے عادات و اطوار، مزاج، سوچ، ہر لحاظ سے مختلف ہیں۔ آپ بابا جانی کو سمجھائیں۔ وہ مجھ سے میچ نہیں کرتی...... ایک کزن کی حیثیت سے میں اسے قبول تو کر سکتا ہوں مگر بیوی کی حیثیت سے قطعی نہیں۔" الجھا ہوا دوٹوک انداز تھا۔ بی بی جان حیران ہوئیں انہیں اس انکار کی امید نہیں تھی۔

"مگر ہم سب کچھ طے کر چکے ہیں۔ پرسوں تمہارا نکاح ہے۔ ابھی اسوہ کو اس معاملے کی خبر نہیں کی مگر تمہارے بابا جانی

زبان دے چکے ہیں۔ اور تم جانتے ہو انہیں اپنی زبان کا کتنا پاس ہوتا ہے۔" بی بی جان نے کچھ غصے سے کہا تھا وہ بے چارگی سے دیکھنے لگا۔

"زبردستی تو نہیں بی بی جان! بس مجھے اسوہ پسند نہیں۔" اسوہ دھک سی کھڑی رہ گئی تھی۔

"تو پھر کون پسند ہے۔ وہی لڑکی جس کی تصویر تم لائے تھے۔ وہ جو تمہارے دوست کی بہن ہے۔" بی بی جان پوچھ رہی تھیں اور اسوہ الٹے قدموں واپس مڑ گئی تھی۔ اب مزید سننا اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"نہیں بی بی جان! آپ غلط سمجھ رہی ہیں، مجھے اس انداز میں کوئی بھی پسند نہیں بس میں ابھی یکسوئی سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ پلیز بی بی جان! وہ تو میری کلاس فیلو ہے۔ میرے دوست کی بہن ہے۔ وہ جو تصویر تھی وہ گروپ فوٹو تھی آپ نہ جانے کیا کچھ سمجھ رہی ہیں۔ اپنے سالک پر ذرا بھی اعتبار نہیں۔" وہ زودرنجی پن سے گویا ہوا تھا۔ بی بی جان کو اس پر ایک دم پیار آ گیا۔

"مجھے پتا ہے تم ایسے نہیں ہو۔ ہم پر بھروسہ کرو...... مزاج کا کیا ہے ابھی کونسا ہم شادی کر رہے ہیں صرف نکاح ہوگا۔ جب تم دونوں تعلیم سے فارغ ہو جاؤ گے تو شادی بھی ہو جائے گی۔ درمیان میں اچھا خاصا وقت ہے۔ اسوہ کے مزاج میں لاپرواہی کا عنصر غالب ہے مگر پھوہڑ اور بدتمیز نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سمجھ جائے گی۔" بی بی جان اسے سمجھا رہی تھیں۔

"مگر بی بی جان!" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"ہم پر اعتبار ہے نا...... تو بھروسہ رکھو...... ہم والدین ہیں تمہارے دشمن نہیں۔ تمہارے بابا جانی کی یہ خواہش ہے زندگی کے اس تکلیف دہ دور میں کیا تم ان کی مراد پوری نہیں کرو گے۔" بی بی جان نے جیسے فرار کی ساری راہیں ہی مسدود کر دی تھیں۔

"مجھے دنیا میں سب سے بڑھ کر آپ دونوں پر اعتبار ہے۔" وہ ایک دم جذباتی ہو گیا تھا۔

"تو پھر یقین رکھو بیٹے! ہم انشاء اللہ اس اعتبار کو ختم نہیں ہونے دیں گے۔"

وہ چپ رہا تھا مزید بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ نکاح کی تقریب بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ بابا جانی تو پورے ہر شوق پورا کرنا چاہتے تھے۔ ان کا بس چلتا تو رخصتی بھی کروا دیتے مگر پھر دونوں کی تعلیم کا خیال تھا۔ دونوں ہی کم عمر تھے۔ ابھی بہت وقت تھا ایک دم مطمئن ہو گئے تھے۔ نکاح کے اگلے دن ہی سالک کو واپس جانے کی پڑ گئی۔

"ابھی کچھ دن ٹھہر جاتے۔" بی بی جان اس کے بیگ میں کپڑے رکھ رہی تھیں۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال بنانے لگا۔ بی بی جان کو دو تین دنوں سے اس کی خاموشی بری طرح کھل رہی تھی۔

"سالک! ناراض ہو......" کپڑے چھوڑ کر پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر اتنے چپ کیوں ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے۔ اتنی پیاری، بھولی بھالی ہنس مکھ سی لڑکی تمہارا نصیب بنی ہے۔" بی بی جان اب اسے سمجھا رہی تھیں۔

"کچھ وقت دیں بی بی جان! پلیز جب یوں اچانک زندگی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہو جائے جو وہم و گمان میں بھی نہ ہو تو انسان کا شاک زدہ ہو جانا یقینی ہے۔" وہ کافی ڈسٹرب تھا۔ بی بی جان نے اس کی پیشانی چوم لی۔ ایک دم ہی بہت پیار آیا اس پر۔

"میری دعا ہے اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں اور سکھ دے۔ اسوہ اچھی لڑکی ہے تمہاری ہم عمر ہی ہے۔ تم بہت جلد مطمئن ہو جاؤ گے دیکھ لینا۔" اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھر کراتے یقین سے کہا کہ وہ مسکرا دیا۔

"اور ہاں...... جانے سے پہلے تم ذرا اسوہ سے بھی مل لینا۔" وہ دوبارہ کپڑوں کی طرف متوجہ ہو گئیں وہ اس بات پر حیران ہوا۔ "کیوں؟"

"وہ بھی تمہاری طرح بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔ پہلے تو مان ہی نہیں رہی تھی، کہتی تھی کہ تم اسے بالکل کزنوں کی طرح

سمجھتے ہو۔ ہم نے سمجھایا پھر تمہارے بابا جانی نے بھی بات کی تو نہ جانے کیسے راضی ہوئی تھی۔ تین دن کمرے سے نہیں نکلی۔ نکاح کے وقت بھی بخار تھا اب تو کچھ دیر پہلے چپ رہی تھی۔ ایک سو چار بخار ہے۔ بی بی بھی بے حد لو ہو رہا ہے۔ تم اسے عقل سے پیدل، احساس سے عاری سمجھتے ہو۔ دیکھ لو وہ تم سے زیادہ حساس ہے۔" بی بی جان بتا رہی تھیں وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ بہر حال وہ بیوی سے پہلے کزن تھی۔ جیسی بھی تھی سب گھر والوں کی اگر چہیتی تھی تو بری اسے بھی نہیں لگتی تھی۔ اس کی بیماری کا سن کر اس کی روح بجت سی تھوم گئی تھی۔

وقت رخصت سب سے ملنے کے بعد وہ اس کے کمرے میں بھی آیا تھا۔ وہ بستر پر بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ چچی جان قریب ہی بیٹھی تھیں اسے دیکھ کر خوش ہوئیں۔ وہ حد درجہ کا خاص خیال رکھنے والا بندہ تھا۔ خاص طور پر اسوہ کے کمرے میں بہت کم آتا تھا۔ اب بھی جھجک رہا تھا۔

"رک کیوں گئے سالک! آؤ اندر آؤ۔" بے سدھ لیٹی اسوہ نے بھی آنکھیں نیم وا کر کے اسے دیکھا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ رہا تھا اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

"بی بی جان ذکر کر رہی تھیں کہ اسوہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں واپس جا رہا تھا سوچا طبیعت پوچھ لوں۔" وہ وضاحت پیش کر رہا تھا۔ چچی جان مسکرا دیں۔

"بس شاید موسم کا اثر ہو گیا ہے۔ ایک سو چار بخار ہے۔ بلڈ پریشر کا تو پوچھو ہی نہیں۔ میں حیران ہوں، اس عمر میں تو ہے۔" اسوہ کی پلکیں لرز رہی تھیں وہ بمشکل نظریں ہٹا سکا۔ زرد زرد سا پژمردہ چہرہ نہ جانے کیوں دل کے بہت قریب لگ رہا تھا۔ شاید رشتہ بدل گیا تھا اس لئے۔

اسے نہیں علم کہ اسوہ کبھی بیمار بھی ہوئی ہو پہلی دفعہ بخار نے آلیا تھا سب ہی پریشان متفکر تھے۔ اور بی بی جان نے جو وجہ بتائی تھی وہ بھی نظر انداز کی جانے والی نہ تھی۔

"سو رہی ہے اسوہ۔" اس کی پلکیں لرز رہی تھیں مگر آنکھیں وا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اسی لئے اس نے چچی جان سے پوچھا تھا۔

"شاید...... تھوڑی دیر پہلے تو جاگ رہی تھی۔" چچی خوامخواہ شرمندہ ہوئیں۔

"کوئی بات نہیں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں چلتا ہوں، میری طرف سے ضرور پوچھئے گا۔" وہ اپنی رواداری اور شائستگی کی بدولت سارے خاندان میں سراہا جاتا تھا اب بھلا کیوں نہ کرتا۔ چچی جان نے سر ہلایا تھا۔

وہ باہر نکلا تو چچی جان بھی اسے گاڑی تک چھوڑنے باہر تک آئیں۔ باقی لوگوں سے وہ مل چکا تھا۔ اس کے کمرے سے نکلنے کے بعد اسوہ نے آنکھیں کھول لی تھیں۔ آنسو قطار در قطار رخساروں پر بہتے چلے گئے تھے۔ دل کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ ہر بات اپنے اختیار سے باہر محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ چند دن پہلے تک زندگی بہت حسین تھی۔ اب اچانک ہی ساری رونق، ساری خوشیاں کہیں کھو گئی ہیں۔ زندگی سے ایک دم جی اچاٹ سا ہونے لگا تھا۔

وہ ہوسٹل میں تھا جب بی بی جان کا فون آیا تھا۔ "تمہارے بابا جانی کی طبیعت سخت خراب ہے، جلدی آنے کی کوشش کرو۔" چاچا جان کی اطلاع نے اس کے اعصاب پر بم پھوڑا تھا۔ اب بار بار چھٹیاں لینا بھی مشکل تھا مگر وہ مجبور تھا۔ جیسے تیسے کر کے چھٹیاں لے کر وہ حویلی پہنچا تو وہاں ایک کہرام برپا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی بابا جانی اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

بی بی جان پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ساری حویلی جیسے طوفان کی زد میں آ گئی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اس نے بابا جانی کو لحد میں اتارا تھا۔ پھر کتنے دن اسی خاموشی میں گزر گئے۔ چچی جان کی بڑی بیٹی منتہیٰ جو پھوپو کے گھر بیاہی گئی تھی۔ وہ بھی یہیں تھی۔

اسود، چچا جانی، چچی جان سب ہی غمزدہ تھے اور وہ تھا کہ خود تنہا سے تنہا ہوتا جا رہا تھا۔ ہر لمحہ یونہی لگتا تھا کہ جیسے اس کا سب سے قیمتی کچھ کہیں کھو گیا ہو۔

اسے چائے کی طلب تھی سراج بابا کو کہہ کر وہ صوفے پر آ بیٹھا تھا۔ ابھی اسے بیٹھے چند پل ہی گزرے ہوں گے جب اسود بھی ادھر آ گئی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر کونے میں کشن پر جا بیٹھی تھی۔ گھٹنوں میں سر دیئے وہ نجانے کس کا غم منا رہی تھی۔ نکاح کے بعد تو وہ اسے دوسری دفعہ دیکھ رہا تھا۔ بہت کم وہ اس کے سامنے آئی تھی۔ پہلے والی بات ہی نہیں رہی تھی اس میں۔ اوپر سے بابا جانی کا دکھ، اسے علم تھا وہ بابا جانی سے بہت پیار کرتی تھی۔ چچا جانی سے بھی بڑھ کر وہ بابا بھی تو اس پر جان دیتے تھے۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ نہ جانے کیوں اس کا رونا دل کو مضطرب کیے دے رہا تھا۔

''اسود......'' اس کی پکار پر اس نے ایک دم سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اپنے دوپٹے سے چہرہ خشک کر لیا۔ ''کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟'' اس کا لہجہ بہت نرم اور محبت لیے ہوئے تھا۔

''نہیں کوئی بات نہیں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ پیچھے کی طرف قدم بڑھاتے وہ کچھ فاصلے پر ہو گئی تھی۔ ''ایم سوری..... میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ مجھے نہیں علم تھا کہ آپ یہاں ہیں۔'' نجانے اس کے لہجے میں کیا تھا، طنز، تحقیر، بے بسی یا غم کی کیفیت، بھٹکے بغیر نہ رہا تھا۔ وہ رخ بدل گئی تھی کہ پھر تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی تھی۔

''تم کیا جانو..... میں تب سے ہی واقعی ہو گیا ہوں۔ تم بابا جانی کی بہت چہیتی تھیں اور اب......'' وہ لب بھینچ گیا تھا۔ نظریں دروازے پر ہی جمائے بیٹھا رہا حتیٰ کہ سراج بابا چائے لے کر آ گئے تھے۔

زندگی گزرنے لگی تھی۔ اسود کے لیے اس کی محبت دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی مگر وہ بہت حدود کا خیال رکھتا تھا۔ کبھی آگے بڑھ کر اسود کی خیریت دریافت نہیں کی تھی۔ کبھی اس کی زندگی میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دستور والا بندہ تھا۔ اس کی تربیت ان ہی خطوط پر ہوئی تھی۔ وہ ہر رشتے کو عزت و احترام دیتا تھا پھر محبت کرتا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اسود کے دل میں اس کے لیے کیا احساسات ہیں۔ بس وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ نکاح کے بول دلوں میں انسیت پیدا کر دیتے ہیں۔ سو اس کا دل بھی اسود کے نام پر دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اس کی تھی، اس کے نکاح میں تھی۔ جانتا تھا وہ جب چاہے گا رخصتی کروا لے گا۔ اس سے پہلے وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شروع میں اسود اس سے کتراتی رہی تھی مگر پھر رفتہ رفتہ اس نے بھی اس تعلق کو قبول کر لیا تھا۔ وہ پہلے کی ہی طرح ہو گئی تھی۔

شوخ و چنچل، اکھڑی، ضدی، بلکہ اب تو اس کے اندر کچھ اور بھی وصف پیدا ہو گئے تھے۔ طنز و استہزاء، اس کا سامنا ہوتا تو ہر بات عموماً شروع ہو کر طنز پر ختم ہوتی تھی۔ کبھی وہ حیران ہوتا اور کبھی چڑ جاتا تھا مگر کبھی منفی انداز میں نہیں سوچا تھا۔ ہاں اسے اس کے مزاج کی لاپروائی اور ضدی و اکھڑی طبیعت سخت ناپسند تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ رخصتی سے پہلے وہ اپنے آپ کو چینج کر لے۔ اس لیے دبے دبے لفظوں میں وہ اکثر بی بی جان، چچی جان اور مغلئی سے بھی کہہ چکا تھا۔ وہ سب اسے سمجھاتی تھیں مگر وہ بھی نجانے کس مٹی سے بنی ہوئی تھی کہ پہلے سے زیادہ خودسر بنتی جا رہی تھی۔ خود سے وہ کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا تھا اور اسود کو جیسے اس کی پرواہ ہی نہیں تھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے وہ سمجھنے سے قاصر تھا اور پھر وقت کچھ اور گزر رہا تھا۔

ایف اے کے بعد اسود نے ساری حویلی والوں کو زچ کر رکھا تھا۔ ایف اے میں اس کی فرسٹ پوزیشن آئی تھی۔ اس نے بھر ٹاپ کیا تھا۔ اسی لیے وہ بضد تھی کہ لاہور جا کر ہوسٹل میں رہ کر مزید تعلیم حاصل کرے گی۔ قریبی کالج صرف ایف اے تک تھا۔ جبکہ ان کے خاندان میں پرائیویٹ اعلیٰ سطح پر تعلیم حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی مگر عورت ذات کا ہوسٹل میں جا کر پڑھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

ان دنوں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانے کی تگ و دو میں تھا۔ کاغذات بنا رہا تھا۔ حویلی کی خواتین نے اسے اسود کی اس ضد سے قطعی بے خبر رکھا ہوا تھا۔

وہ نہا کر باہر نکلا تو اپنے کمرے میں اسود کو دیکھ کر چونکا۔ اپنے حلیے کا احساس ہوتے ہی اس نے فوراً بیڈ سے کپڑے اٹھائے۔ ایک ناپسندیدگی کی نظر اسود پر ڈالی جو شاید آئی ہی اس مقصد کے لیے تھی کہ اسے زچ کرے۔

''کسی کے کمرے میں آ کر بیٹھنے کا یہ کونسا طریقہ ہے؟'' مانا کہ ان دونوں کے درمیان ایک گہرا رشتہ تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ یوں کمرے میں آ جاتی۔ اس کا دل اس کی طرف سے بدگمان ہوا۔

''کسی کے کیوں، میں اپنے شوہر کے کمرے میں اس کے بیڈ پر بیٹھی ہوں۔ ایسی کونسی معیوب حرکت ہے یہ۔'' ترکی بہ ترکی جواب ملا تھا۔ لہجہ طنزیہ تھا، آنکھوں میں شرم و حیا نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اسے افسوس ہوا۔

''اسود......'' وہ رک گیا۔ وہ اس وقت بالکل بنیان میں ملبوس تھا۔ بغیر اس کو کچھ کہے وہ دوبارہ باتھ روم میں گھس گیا۔ شلوار قمیص پہن کر آیا تو وہ اسی طرح ریلیکس موڈ میں بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے اس کی منتظر تھی۔

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' حاکمانہ انداز تھا۔ سالک چپ رہا۔ تولیے سے بال خشک کرتے اسے صرف دیکھا۔ یہ لڑکی سدھرنے کے بجائے دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی۔ یہ سالک کی ذاتی رائے تھی۔

''میں مزید پڑھنا چاہتی ہوں۔ لاہور جا کر ہاسٹل میں رہ کر۔'' وہ حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ پڑھنے پر نہیں لاہور جا کر ہاسٹل میں رہ کر پڑھنے پر ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا اس وقت اگر کمرے میں آئی ہے تو کوئی چھوٹی بات نہیں ہوگی۔ ایک گہری سانس لی۔

''تم مجھے اطلاع دے رہی ہو کہ اجازت مانگ رہی ہو؟'' تولیہ ایک طرف پھینک کر وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ گہرے آتشی لباس میں وہ خود بھی آگ کی طرح دہک رہی تھی۔ سالک کی آنکھوں میں رنگ سے اترنے لگے مگر ان کے اگلے الفاظ کو سن کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''دونوں ہی نہیں..... صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ اس حویلی کے مرد جب ہر عیاشی افورڈ کر سکتے ہیں، خود باہر جا کر پڑھ سکتے ہیں تو پھر اس حویلی کی عورتوں پر پابندی کیوں؟'' وہ سوالیہ نشان بنی جواب کی منتظر تھی۔ سالک بڑی مشکل سے اپنے اندر اٹھتے اشتعال کے لاوے پر قابو پا سکا تھا۔ خاص طور پر ''عیاشی'' کے لفظ پر دماغ گھوم گیا تھا۔ در پردہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی، کسے کہہ رہی تھی وہ بخوبی سمجھ گیا تھا۔

''اسود! حد ہوتی ہے۔ کچھ کہتے ہوئے لفظوں کے چناؤ کا خیال کیا کرو۔'' وہ صرف یہی کہہ سکا تھا ایک دم مشتعل ہو جانا اس کی نیچر نہیں تھی۔ اب بھی برداشت کر گیا تھا۔

''میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں اور کیا لفظ استعمال کر رہی ہوں۔ جب آپ باہر جا کر پڑھ سکتے ہیں اور میں تو صرف اسی ملک میں رہ کر پڑھنا چاہتی ہوں پھر بابا جانی اور امی جان دونوں مجھ پر پابندی کیوں لگا رہے ہیں۔ جبکہ سب جانتے ہیں میں جو ایک دفعہ سوچ لیتی ہوں وہ کرتی بھی ہوں۔ سب میری فطرت سے واقف ہیں۔ اگر مجھے خود اجازت نہیں دیں گے تو میں درمیانی رستہ نکال لوں گی مگر یوں چھپ کر نہیں پڑھوں گی۔'' اور وہ درمیانی رستہ کیا ہو سکتا تھا وہ بخوبی سمجھ رہا تھا وہ ایسی ہی ضدی تھی کچھ بھی کر سکتی تھی۔

''تو تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' اس نے آرام سے پوچھا تھا۔

''کچھ بھی نہیں..... صرف اتنا باور کرانا چاہتی ہوں کہ میں اسود ہوں، کوئی قیدی یا بے جان وجود نہیں ہوں۔ یہ زندگی میری ہے اسے اپنی مرضی سے گزاروں گی۔ کسی کی خاطر خود کو بدل نہیں سکتی۔ آپ کو گوارا ہے تو ٹھیک ورنہ......'' اس ورنہ کے آگے

کیا تھا وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا۔ دل تو چاہا کہ خوب سنا دے مگر دل کسی کام کا نہیں رہا تھا جو اسے دیکھتے ہی ہر بات بھول جاتا تھا۔ اگر کچھ یاد رہتا تھا تو وہ "اسوہ" کا نام ہوتا تھا۔

"اور ہاں سالک صاحب..... میں اپنی ذات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتی۔ آپ پاس چوائس ہے۔ میں کبھی آپ کی مجبوری نہیں بنوں گی اور یہی خواہش میری بھی ہے کہ آپ بھی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوں گے۔"

وہ دروازے کے پاس رک کر کہتے اپنی بات کر کے کمرے سے نکل گئی تھی۔ سالک کی ذات زلزلوں کی زد میں چھوڑ کے۔ وہ جانتا تھا اسوہ رویوں سے اسے محسوس کروا دیا تھا کہ نکاح کے لفظ ایک کے دل میں ایک جیسے جذبات پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اسے ناپسند کرتی ہے۔ اس کے طنزیہ رویے، کاٹ دار جملے اسے یہ باور کروانے کو کافی تھے مگر اس حد تک وہ اس کی ذات کی نفی کر جائے گی اسے امید نہیں تھی۔ اسوہ کے متعلق دل میں جو چند خوش فہمیاں برقرار تھیں اس گفتگو کے بعد وہ بھی اپنی موت آپ مر گئی تھیں۔ اس کے متعلق ناپسندیدگی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

سالک نے چچا جان سے بات کی اور انہیں اسوہ کے لاہور جا کر پڑھنے پر راضی کر لیا تھا۔ وہ شوہر تھا اسے کوئی اعتراض نہیں تھا تو بھلا وہ کیا کہتے۔ اس کا ایڈمیشن سالک نے خود کروایا تھا۔ ہاسٹل میں رہنے کا بھی بندوبست ہو گیا تو وہ اپنے کام کو سنبھالنے میں لگ گیا۔ اسوہ لاہور چلی گئی تو وہ بھی بیرون ملک آ گیا۔

سب ہی اکثر بیشتر فون کرتے رہتے سوائے اسوہ کے۔ اسوہ کے نام کا ورد اب اسے مستقل لاحق رہنے لگا تھا۔ گھر والوں سے خاص طور پر بی بی جان سے اس کی خیریت کی اطلاع ملتی رہتی تھی۔

وقت گزرنے لگا تھا۔ اس بھاگ دوڑ میں تین سال گزر گئے۔ پہلے سال چھٹیوں میں وہ ایک ماہ کے لئے پاکستان گیا تھا پھر دوبارہ نہیں گیا تھا۔ اس دفعہ چھٹیاں ہوئیں تو وہ بغیر اطلاع کے پاکستان پہنچ گیا۔ اسوہ نے گریجویشن کے بعد ایک دفعہ پھر ایف ایس سی کر کے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ وہ حویلی پہنچا تو سب ہی خوش ہوئے۔ اسوہ لاہور میں ہی تھی، پنجاب یونیورسٹی میں ہی پڑھتی تھی۔ گھر والوں نے اسے فون کر کے اس کی آمد کی اطلاع دے دی تھی مگر وہ سخت دل کٹھور لڑکی نہیں آئی تھی۔ ڈرائیور لینے گیا تو اس نے آنے سے انکار کر دیا اور اسے واپس بھیج دیا۔ سالک کو دکھ تو بہت ہوا مگر برداشت کر گیا۔ چچا جان کو لاہور کچھ کام تھا۔ منڈی میں فصلیں بھجوائی تھیں، باغات کی فصل بھی بھیجنی تھی۔ وہ جا رہے تھے اس نے انہیں منع کر دیا اور خود چلا آیا۔ سارا کام نمٹانے کے بعد وہ ایک ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا جب فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک خوش شکل وڈیسنٹ سے لڑکے کے ساتھ ایک اور لڑکی کی موجودگی میں اسوہ داخل ہوئی تھی۔ چادر ابھی بھی اس نے اوڑھی ہوئی تھی مگر وہ مسلسل کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ وہ تینوں چلتے ہوئے اس کے عقب میں رکھی ٹیبل پر آ بیٹھے تھے۔

"اسوہ دیکھ لو...... یہ عالی کسی دن ضرور مجھ سے پٹے گا۔" وہ دم سادھے سانس روکے بیٹھا ہوا تھا جب دوسری لڑکی کی آواز سنائی دی تھی۔ اسوہ نے اسے بالکل نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ اس کی کرسی کی پشت سالک کی پشت کی طرف تھی۔

"عالی! مت تنگ کرو نا اسے......" یہ اسوہ کی آواز تھی جو وہ لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

"مادام! ہم آپ کو تو کچھ نہیں کہہ رہے..... آپ کے لئے ہمارے دل میں جو محبت ہے یہ محترمہ اس سے جیلسی فیل کر رہی ہیں۔" یہ اس لڑکے کی آواز تھی جواباً اسوہ کی ہنسی سنائی دی تھی۔

"تم بھی بس نا۔"

"کیوں؟ محترمہ کہکشاں صاحبہ! غلط کہہ رہا ہوں میں کیا میں محبت نہیں کرتا اسوہ سے، کر سکتی ہو تم مجھے چیلنج۔" وہ دوسری لڑکی سے مخاطب تھا۔ سالک کے لئے برداشت مشکل ہو رہی تھی۔

اسے لگ رہا تھا کہ اگر اس لڑکے نے مزید کچھ اور بکواس کی تو وہ اس کا گریبان پکڑ لے گا۔ مگر وہ بڑی مشکل سے خود پر کنٹرول کر رہا تھا۔

"ہاں...... ہاں میں سمجھتی ہوں تمہیں بھی، اور تمہاری اس مادام کو بھی۔ دیکھ لینا تم دونوں، کیدو کا کردار ادا نہ کیا تو کہنا...... بڑے آئے محبت کرنے والے دو آفاقی دل۔" وہ لڑکی لڑ رہی تھی۔

"ہاہا...... "لڑکے کے قہقہے بے اختیار تھے جن میں اسوہ کی ہنسی بھی صاف سنائی دی تھی۔

"ہاں کرتے ہیں ہم محبت...... اسوہ وہ گانا کیا ہے، ہاں یاد آیا...... اگر دو دل مل جاتے تو بگڑتا کیا زمانے کا...... اگر دو دل......"

"سالک کے لئے اب یہ سب برداشت کرنا ممکن نہیں تھا مگر اس وقت سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفقود ہوتی جا رہی تھیں۔ کھڑے ہو کر اس نے اپنا رخ اس ٹیبل کی طرف کیا تھا۔

"ویٹر...... "ویٹر جو اس ٹیبل پر کھانا سرو کر رہا تھا جب اس نے پکار لیا تھا۔ اس کی آواز تھی یا یوں ہی اسوہ نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ آنکھوں میں نفرت سی نفرت لئے دیکھ رہا تھا۔ نظریں گھور رہی تھیں۔ ویٹر فوراً اس کی طرف آیا تھا۔

"بل اٹھا لینا۔" ویٹر کو کہہ کر ایک آخری حقارت بھری نظر اسوہ پر ڈال کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا اسوہ جو صورتحال سمجھ بھی نہیں سکی تھی اسی رخ بیٹھی رہ گئی۔

"ہیلو...... مادام...... تمہیں کیا ہو گیا...... کوئی سانپ سونگھ گیا ہے یا کوئی جن دن دیکھ لیا ہے۔ میرا خیال ہے جن ہی دیکھ لیا ہے۔ پلیز ڈسوہ ڈیئر سسٹر! مجھے بھی تو جن دکھاؤ۔ رئیلی میں نے پہلے کبھی جن نہیں دیکھا۔" وہ سیدھی ہو گئی تھی۔ مسلسل ذہنی رو بھٹکی ہوئی تھی۔ جبکہ عالی مسلسل بکواس کر رہا تھا۔

"یہ یہاں کیا کر رہے تھے۔" وہ ایک ہی بات سوچ رہی تھی۔ اگر وہ کچھ ہی لیا تھا تو مل بھی لیتے۔ مگر خیر..... مجھے کیا؟ میں کون سا انہیں پسند ہوں اوپر سے اس قدر آزادانہ ماحول میں عالی اور کہکشاں کے ساتھ دیکھ کر جل بھن ہی گئے ہوں گے۔" وہ بہت منفی ہو کر سوچ رہی تھی۔

کل سے لے کر بابا جانی کے کئی فون آ چکے تھے کہ وہ کب آ رہی ہے۔ ڈرائیور انہوں نے کل ہی بھیج دیا تھا۔ اس کی اہم اسائنمنٹ تھی اگر فکر نہ ہوتی تو فوراً چلی جاتی اور اسائنمنٹ جن پروفیسر صاحب کی تھی وہ تو بے عزتی کرنے میں ماہر تھے۔ وہ صرف اسائنمنٹ جمع کروانے کو رکی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب کا چوتھا پیریڈ تھا اسائنمنٹ جمع کروا کے وہ فوراً گاڑی میں آ بیٹھی تھی۔ ویسے تو ایک گاڑی بمعہ ڈرائیور ہر وقت اس کے ساتھ ہوتی تھی مگر جب بھی گاؤں سے اسپیشل بلاوا آتا تھا تو گاڑی بھی اسپیشل ہی آتی تھی۔

گاؤں پہنچی تو بی بی جان اور امی جان سب ہی خوش ہوئے البتہ بابا سرد سے انداز میں ملے تھے۔ سالک کہیں دکھائی نہ دیا۔ سارا دن سکون سے گزرا تھا مگر رات بابا جان نے اسے جو حکم سنایا وہ ساکت سی رہ گئی۔

"اب تم لاہور نہیں جاؤ گی۔ میں نے تمہاری رخصتی کی تاریخ فکس کر دی ہے۔ سالک بہت کم چھٹیوں پر آیا ہے۔ اسے واپس بھی جانا ہے۔ میں اب اس ذمے داری سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔" کھانے کی ٹیبل پر سب ہی تھے سالک بھی تھا۔ بڑے سرد سے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس انکشاف پر بھی اس نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پہلے سے باخبر جبکہ چچی جان اور بی بی جان دونوں حیران ہوئی تھیں۔

"مگر بابا جانی! میرا لاسٹ ایئر ہے۔ میں کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ ایک ہفتے بعد میرے سمسٹرز ٹیسٹ ہونے والے ہیں۔"

سالک اب بھی چپ تھا جیسے چپ شاد کا روزہ رکھا ہو۔ بی بی بھی کچھ الجھ گئی تھیں۔ نہ کوئی مشورہ نہ کوئی صلاح ایک دم یہ فیصلہ اور یہ سالک کی خاموشی۔

"بس...... بہت کر لی پڑھائی تم نے۔ منشی کو میں نے فون کر دیا ہے وہ کل پہنچ جائے گی۔ آپ سب خواتین مل کر شادی کی تیاری آسانی سے کر لیجئے گا۔" اب ان کا اشارہ راضیہ اور بی بی جان کی طرف تھا۔

"مگر اتنی جلدی...... ابھی سالک ماشاءاللہ پڑھ رہا ہے۔ اسوہ بھی ابھی ہوئی ہے۔ بعد میں سہولت سے کام ہو جائے گا۔" بی بی جان نے کہا تھا۔

"نہیں بھابی بیگم! جب سہولت سے کام ہوگا...... یہ لڑکی ہماری عزت کو بٹہ لگا چکی ہوگی۔ میں کچھ نہیں دیکھوں گا۔ بہت کر لی اس نے اپنی من مانی اب صرف رخصتی ہوگی۔"

"مگر...... بابا جانی......" بابا جان نے کچھ بھی نہ کہتے ہوئے اسے بیچ چوراہے پر لا کھڑا کر دیا تھا۔ اور سالک، اس کی نظریں بے اختیار اس پر اٹھ گئیں۔ چند دن پہلے اسے جو نظریں دکھائی دی تھیں اب بھی وہی نظریں تھیں وہ تب سمجھ نہیں سکی تھی مگر اب سالک کی آنکھوں میں واضح لکھا تھا کہ اسے اپنی موت آپ مار گیا تھا۔

"نہیں...... بابا جانی نہیں......" وہ اپنی بے گناہی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ انتہائی بے اعتباری سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ کیسے یقین کر لے یہ جو اتنے پیارے رشتے تھے، جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اس پر انگلی نہیں اٹھا سکیں گے وہ اس کو شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے اور یہ شک کی مار اس اذیت ناک تھی کہ اسے اپنا جسم نیل و نیل ہوتا محسوس ہوا۔ دل تو چاہا کہ چیخ چیخ کر کہے کہ وہ سب غلط ہیں۔ ان کی سوچیں غلط ہیں، وہ بالکل بے گناہ ہے۔ وہ شخص جسے اس کے ساتھ منسوب کیا جا رہا ہے وہ تو اسے بھائیوں کی طرح عزیز ہے۔ مگر وہ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکی۔ صرف نفی میں سر ہلاتی بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی تھی۔

احتجاج، جھگڑا، الجھنا اپنا ہر حربہ اس نے استعمال کر دیکھا تھا مگر بابا جان کا فیصلہ نہیں بدلا تھا۔ وہ یوں بے موت نہیں مرنا چاہتی تھی۔ جھولی تو اس کی پہلے ہی خالی تھی، کاسہ دل میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی مگر وہ جسمانی طور پر بھی خالی ہونے کو تیار نہیں تھی۔ خاص طور پر سالک کے نام پر تو کبھی بھی نہیں۔ سالک کے نام سے اسے ایک نفرت سی محسوس ہونے لگی تھی کجا کہ ساری زندگی۔

"بی بی جان! آپ بابا جانی کو سمجھائیں...... میں مر جاؤں گی۔ یوں نہیں کریں۔" اس دن بی بی جان اس کے کمرے میں آئیں تو وہ ان کے پاؤں پڑ گئی۔ بی بی جان ایک دم تڑپ اٹھی تھیں۔ یہ نازوں پلی لڑکی انہیں بہت عزیز تھی اس کا یوں تڑپنا رونا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ ایک دم اسے اٹھا کر سینے سے لگایا۔

"اللہ نہ کرے، مریں تمہارے دشمن۔ صرف شادی ہی تو ہو رہی ہے تمہاری۔" انہوں نے اس کے لمبے سیاہ بکھرے بال کانوں کے پیچھے اڑسے ہوئے تھے۔

"بی بی جان نہیں...... میں مر جاؤں گی۔ سچ میں مر جاؤں گی۔ میں نے جیسے تیسے اس نکاح کو قبول کر لیا تھا مگر یہ شادی...... بی بی جان! مجھے صرف پڑھنا ہے۔"

"ادھر بیٹھو...... یہ پانی پیو۔" انہوں نے اسے بستر پر بٹھایا تھا۔ پانی پلایا تو اسوہ کو کچھ سکون ملا۔ "وہ لڑکا کون تھا؟" بی بی جان نے پوچھا تھا۔ وہ ساکت رہ گئی۔

"بی بی جان آپ بھی۔" وہ یقین کرنے کو تیار نہ تھی، بی بی جان نظریں پھیر گئیں۔

"کیوں بتاؤں کون تھا وہ لڑکا؟ کوئی بھی ہو...... مگر آپ کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ آپ اسے جو بھی معنی پہنائیں مجھے غرض نہیں۔" وہ ایک دم طیش میں آ کر کہہ گئی تھی۔ اس وقت اپنا کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔

"جائیں...... آپ یہاں سے...... مجھے پیدا کرنے والے، مجھے نہ سمجھ سکے، آپ تو پھر اس شخص کی ماں ہیں جس نے مجھے دیکھا تھا ایک غیر مرد کے ساتھ۔ جائیں یہاں سے پلیز چلی جائیں میری نظروں کے سامنے سے...... ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گی۔" وہ اپنے ہوش و حواس کھونے لگی تھی۔ ایک دم چیختے ہوئے کہہ رہی تھی۔ بی بی جان ڈر گئیں۔ فوراً باہر نکل گئیں۔

وہ سالک سے ایک دفعہ ملنا چاہتی تھی۔ اس سے اپنا قصور پوچھنا چاہتی تھی۔ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر اس حد تک نفرت کرتا تھا تو درمیان میں یہ تعلق نہ بناتا۔ نجانے کہاں ہوتا تھا، کسی کو کچھ علم بھی نہیں تھا۔ وہ رات دیر تک انتظار کرتی رہی آخر کار وہ گھر آ ہی گیا۔ وہ کمرے سے باہر نکل آئی، وہ اوپر جا رہا تھا۔ کچھ دیر کھڑی رہی پھر سوچ کر آگے قدم بڑھائے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا وہ اندر داخل ہو گئی۔ وہ صوفے پر بیٹھا پانی پی رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔

"تم اس وقت......" رات کے دو بج رہے تھے۔ اور وہ اس کے کمرے میں بلا جھجک آ گئی تھی۔

اب کی دفعہ اسے اس کی یہ حرکت ہمیشہ سے زیادہ بری لگی۔

"ہاں میں...... میں کوئی وضاحت پیش کرنے نہیں آئی اور نہ ہی تم سے کوئی بھیک مانگنے آئی ہوں۔ بس اپنا حق مانگنے آئی ہوں۔ مجھے طلاق چاہئے۔ صرف اور صرف طلاق......"

"چٹاخ......" اس سے پہلے کہ اس کا لفظ مکمل ہوتا سالک کا ہاتھ اس کے رخسار پر اپنے نشان چھوڑ گیا تھا۔ نازوں پلی لڑکی تھی۔ ذرا سے درد پر ساری رات بے چین رہتی تھی۔ اب سسک اٹھی۔

"بکواس نہیں کرو۔ میں نے ہمیشہ تمہاری بدتمیزیوں کو نظر انداز کیا ہے۔ تمہاری ہر بکواس کو چپ ہو کے سنا ہے۔ اب نہیں۔" وہ پہلی دفعہ اپنے غصے کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ رخسار پر ہاتھ رکھے اسے دیکھے گئی۔ نہ ہی کوئی آنسو بہا اور نہ ہی رو رو جا کر۔ بس ایک سسکی خارج ہوئی تھی پھر لب دانتوں تلے دبا لئے تھے۔ اتنی سختی سے کہ خون نکلنے لگا تھا۔

"میں بکواس نہیں کر رہی۔ میں تمہیں پسند نہیں کرتی۔ میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے [illegible] طلاق چاہئے۔ اگر بڑے بات نہیں مانو گے تو میں اس حویلی سے بھاگ جاؤں گی۔" وہ نفع و نقصان کی تمیز کئے بغیر صرف اور صرف اسے سنا رہی تھی۔ [illegible] سے یا گڑگڑائے۔ وہ اس کی اس جرأت پر اسے دیکھتا رہ گیا۔

"جس لڑکے کے ساتھ مجھے ہوٹل میں بیٹھے دیکھا تھا...... وہ میرا کلاس فیلو ہے عالی! ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

سالک کو لگا اس کے کانوں میں کسی نے سیسہ انڈیل دیا ہو۔ بے غیرتی کی انتہا تھی یا برداشت کی کہ سب سن کر بھی وہ اپنے اٹھے ہاتھ کو پہلو میں گرا گیا تھا۔

"دفع ہو جاؤ میرے کمرے سے۔ پلیز گیٹ لاسٹ۔" وہ حلق کے بل چیخا تھا وہ پرسکون کھڑی رہی۔ وہ ضبط کرتے کرتے نڈھال ہونے لگا۔

"پلیز اسوہ جاؤ یہاں سے۔ پلیز جاؤ۔ میں تمہاری کوئی بات نہیں مان سکتا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ ہوگا کہ میں اپنے آپ کو ختم کر لوں۔"

"تمہارے مر جانے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا۔" وہ ظالم تھی یا احساس سے عاری وجود۔ سالک دیکھے گیا۔

"اسے دھمکی نہ سمجھنا۔ تم نے اگر مجھے طلاق نہ دی تو میں چلی جاؤں گی۔ کہیں بھی۔ مگر تمہاری خلوت گاہ کی زینت بن کے تمہاری کسی انتقامی حس کی تسکین کا باعث نہیں بنوں گی۔ تم مجھے زبردستی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔" نفرت و حقارت سے کہہ کر اسے دیکھے وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔ سالک بیڈ پر گر گیا۔

"سالک یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" بی بی جان بہت پریشان سی تھیں۔ وہ مسکرایا۔ صرف خالی خولی ہنسی تھی بھرم رکھنے والی
اب شاید ساری عمر یہی ہنسی ہنسی تھی۔

"اسوہ مر جائے گی۔ تم اگر اس کی حالت دیکھو تو پریشان ہو جاؤ۔ پانچ دن سے وہ کمرے میں بند ہے۔ نہ کسی سے ملتی ہے، اور نہ کسی سے بات کرتی ہے۔ اب تو روتی بھی نہیں۔" بی بی جان رونے لگی تھیں۔

"بی بی! وہ کہتی ہے اسے طلاق چاہیے۔ وہ شادی کرنا چاہتی ہے اسی لڑکے سے، جس سے وہ محبت کرتی ہے۔" نظر جھکائے بتا گیا۔ بی بی جان نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"آپ نے کہا تھا بی بی جان، وہ اسوہ مر جائے گی مگر وہ نہیں سدھری میری زندگی کو اپنے نام کا روگ لگا گئی ہے۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تو بس اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ چچا جان سے فوراً رخصتی کی بات کی تھی کیا علم تھا کہ وہ مجھ سے حقیقت اگل دے گی۔ بی بی جان! اب سب روکنا ناممکن ہے۔ یہ چچا جان کی ضد بن گئی ہے۔"

"اس کا کوئی حل بھی ہے؟" کتنے خاموش پل سرک گئے تھے۔ تب بی بی جان نے لب کشائی کی تھی۔

"ہاں ہے۔ اگر اسوہ تھوڑی دیر انتظار کر لے۔ میں اسے طلاق دے دوں گا اگر وہ مان جائے ورنہ چچا جان اسے مار دیں گے مگر شادی ملتوی نہیں کریں گے بعد میں وہ سر کش میرے ذمے داری ہو گی۔ میں معاملہ ہینڈل کر لوں گا۔" وہ سوچ سوچ کر کہہ رہا تھا۔ بی بی جان بھونچکی بیٹھی رونے لگیں۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ پھر سب کچھ بہت آنا فانا ہوا تھا۔ بی بی جان نے بڑی مشکلوں سے اسوہ کو راضی کیا تھا۔ منتوں سے، خوشامد سے، مان سے، دھمکی سے، محبت سے، آخر کار وہ ہار ہی گئی تھی۔ رخصتی پر آمادہ ہو گئی تھی۔ صرف اس وعدے پر کہ پھر وہ جو چاہے گی وہی کرے گی۔ کسی کی کوئی بات نہیں مانے گی۔ اور بی بی جان نے اس کی بات مان لی تھی۔ سالک کو بھی سمجھائی رہی تھیں ورنہ اسے بھلا کیا چاہ رہی تھی زندگی سے اسوہ سے۔

وہ حجلہ عروسی میں پہنچا تو وہ سر تک چادر تانے سوچکی تھی یا سونے کا مظاہرہ کر رہی تھی وہ جان نہیں سکا۔ وہ اس لڑکی کو کبھی بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ دل تو اپنا بھی خالی ہو چکا تھا۔ وہ دل جہاں اس کی محبت سے ہر سو روشن روشن تھا اب وہاں ویرانے ڈیرہ جما کر بیٹھے تھے۔ کوئی حسرت، کوئی خواب، کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس کی غیرت، مردانہ انا بری طرح پامال کی گئی تھی۔ اگر بی بی کا احساس نہ ہوتا تو وہ واقعی اسے اب تک اپنی زندگی سے علیحدہ کر چکا ہوتا۔ وہ سب کچھ یوں کرنا چاہتا تھا کہ اس لڑکی کو معاشرہ رد نہ کرے۔ ایک نظر اس کے سوئے ہوئے وجود پر ڈال کر وہ باتھ روم میں گھس گیا تھا۔

⁜ ⁜ ⁜

"میں سالک انیس الزمان ہوں۔ اسوہ قمر الزمان کا شوہر۔" وہ اس خوبرو ڈیسنٹ سے خوبرو نوجوان کے ساتھ کھڑا تھا۔
"اوہ...... آپ اسوہ کے شوہر ہیں۔ رئیلی بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ جنہیں...... میں عالی ہوں، وہ آپ کی بات کرتی رہتی...... میرے پاس اس کا کوئی کنٹیکٹ نمبر نہیں تھا ورنہ اب تک ضرور آ چکا ہوتا آپ کے گاؤں۔"
وہ باتونی تھا۔ سالک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ یونیورسٹی آیا تھا لوگوں سے پوچھتے وہ بمشکل اس تک پہنچا تھا۔
"اس کی شادی ہو گئی تھی وہ اس لیے نہ آ سکی۔" اس نے بتایا مگر عالی کے رد عمل پر الجھ گیا۔
"اوہ، رئیلی بہت مبارک ہو۔ ویسے بڑی بے مروت ہے آپ کی مسز، ڈونٹ مائنڈ کیونکہ اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ کسی کو بلائے نہ بلائے اپنی شادی میں مجھے اور کہکشاں کو ضرور بلائے گی۔ بڑا بھائی بھائی کہتی تھی جا کر بھول ہی گئی کہ یہاں کوئی بھائی بھی ہے جو اس کی فکر میں دبلا پتلا ہو رہا ہے۔" اس کے الفاظ سالک کو حیران کیے دے رہے تھے۔ اس کے اپنے شکوک علیحدہ دم توڑ

چکے تھے۔ اور اسوہ نے جو کہا تھا، وہ ساکت سا دیکھے گیا۔ (کیا وہ سب جھوٹ تھا)
"ویسے آپ کو اس نے سفارش کے لیے بھیجا ہو گیا۔ مگر جا کر بتا دیجئے گا، مادام کو کہ میں اور کہکشاں اسے اس بے ایمانی پر بلکہ بے وفائی پر کبھی معاف نہیں کریں گے۔" وہ کہہ رہا تھا سالک اپنی ہی نظروں میں گرتا جا رہا تھا۔
"بڑی انسیت ہے آپ دونوں میں۔ اسوہ بہت ذکر کرتی ہے آپ کا۔" کچھ تو کہنا تھا اسے۔ اب کیسے بتاتا اسے کن دلوں سے یاد کرتی ہے...... لہجے میں کتنی نفرت ہوتی ہے۔
"جی ہاں...... اعلیٰ قسم کی محبت ہے ہم میں۔ ساری یونیورسٹی والے جلتے تھے ہم دونوں سے۔ دراصل اسوہ کا کوئی بھائی نہیں اور میرے کوئی بہن نہیں۔ ایک تھی اس کا نام بھی اسوہ تھا مگر بچپن میں ہی انتقال کر گئی، مجھے بڑی حسرت تھی کسی بہن کی۔ اسوہ کو دیکھا تو یوں لگا مجھے اسوہ میری بہن مل گئی ہے۔ میں نے ہی دوستی کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا ورنہ اس نے کبھی یونیورسٹی میں کسی لڑکے سے بات تک نہیں کی۔ سب لڑکے جلتے تھے میری اور اس کی دوستی سے۔ بلکہ بعض لوگ تو اسے غلط نظروں سے بھی دیکھتے تھے مگر ہمارے دلوں میں کوئی کھوٹ نہیں یہ ہم جانتے ہیں یا ہمارا اللہ۔" وہ اور بھی نجانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔
"اسوہ تو مجھے بالکل سگی بہن کی طرح عزیز ہے۔ اس کی شادی میں نہ آ سکا اور اس بے وفا نے بھی نہیں بلایا، ساری عمر ناراض رہوں گا میں اس سے۔"
سالک چونکا۔ احساس زیاں تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔
"یہ کیا کر دیا میں نے......" کچھ وقت ان کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ جب لوٹا تو ایک پچھتاوا اس کے ساتھ تھا۔ وہ تو آج اسوہ کی خاطر اس عالی سے ملنے آیا تھا اس لیے کہ وہ دونوں کے درمیان سے نکلنا چاہتا تھا۔ بڑی خاموشی کے ساتھ مگر اس سے پہلے وہ دونوں طرف کے راستے صاف کر دینا چاہتا تھا لیکن لیکن...... اس کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں وہ واپس جا رہا تھا۔ پچھلے دنوں گھر میں جو خرابی پڑی رہی تھی اس کی بدولت اب اس گاؤں جانا سب کو ہی غمزدہ کر رہا تھا۔ اسوہ کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا نہ ہی اس کے یہاں رہنے سے اور نہ ہی کہیں چلے جانے سے۔ وہ بس اپنا نام ان کے نام سے علیحدہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے طنز پر طنز کرتے استہزا اڑاتے اس نے نہ صرف خود کو اذیت میں جلا کر دیا تھا بلکہ ساری حویلی والے سخت پریشان تھے۔ اسکی طلاق والی ضد بی بی جان اور سالک کے درمیان سے نکل کر باقی سب کے درمیان بھی موضوع گفتگو بن گئی تھی۔ اسوہ کو پروا نہیں تھی کہ کوئی اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ بس اسے صرف ایک ہی رٹ لگائے جا رہا تھا کہ جس نے اس کے کردار پر شک کیا تھا بغیر اسے کوئی صفائی کا موقع دیئے اسے قربان گاہ کی طرف دھکیل دیا گیا تھا۔
وہ ڈھلتی سہ پہر کے قریب حویلی کے وسیع لان میں بائیں طرف صوفہ نما پتھر سے بنے بنچ پر ٹانگیں اوپر کیے کتنی دیر سے بیٹھی تھی۔ بہروپیوں کی یہ مصنوعی جسم کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے اندر اٹھتے دلوں طوفان سے نبرد آزما تھی جو ہر وقت اسے یکا یک اکساتا رہتا تھا کہ وہ یہاں سے کہیں بھاگ جائے کسی ایسے کونے میں جا چھپے جہاں کوئی انسان نہ ہو، کوئی غلط نظر نہ ہو، سالک نہ ہو۔

سالک اپنے کمرے کی کھڑکی سے نیچے اسے صحن میں بنچ پر بیٹھے کتنی دیر سے دیکھ رہا تھا۔ لمبے بال ارد گرد بکھرے ہوئے تھے۔ فیروزی سادہ سے کاٹن کے سوٹ میں چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت لیے وہ عجب سوگواری کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ چپ اس کو گھر کے کمرے سے نکل آیا۔ لان میں آیا تو وہ ابھی وہیں تھی۔ آنکھیں بند کیے ارد گرد سے بیگانہ۔ جب سے عالی سے ملاقات ہوئی تھی اسے اپنا آپ عجیب مجرم سا لگنے لگا تھا۔ کتنی دفعہ اس سے بات کرنا چاہی تھی مگر وہ کوئی موقع ہی نہیں دیتی تھی۔
"اسوہ......" وہ اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ اسوہ نے اس پکار پر آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ بنچ کی پشت سے کمر ٹکا کر

وہ سیدھی ہوگئی۔ بغیر ہونٹوں کو حرکت دیے وہ اسے دیکھنے لگی۔

''ایم سوری...... '' وہ حیران ہوئی، وہ کس لیے معافی چاہ رہا تھا۔ مگر خاموشی ہنوز برقرار تھی۔

''میں کچھ دن پہلے عالی سے ملا تھا۔'' وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ وہ ساری بات سمجھ گئی، ایک تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آٹھہری۔ تو اب کیا صفائی پیش کرنے آیا ہے۔

''تو پھر...... '' سالک نے اسے دیکھا۔ اس کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔

''میں نے تمہیں اور اسے غلط سمجھا۔ عالی سے مجھے علم ہوا کہ وہ تمہیں صرف ایک بہن سمجھتا تھا۔''

''تو عالی کو بھی سارا قصہ سنا دیا ہو گیا۔'' وہ اندر ہی اندر تلخ ہوگئی۔

''نہیں۔ جھوٹ...... ''

''کیا بکواس ہے یہ عالی نے کہا اور آپ سالک صاحب آپ نے یقین کر لیا۔ حیرت ہے۔''
غلطی کے احساس سے اگرچہ وہ شرمندہ سا تھا مگر وہ کس قدر مطمئن تھا، وہ ایک نظر میں ہی سمجھ گئی تھی۔ اس کی ساری زندگی کی نیک نامی، اس کی تعلیم داؤ پر لگ گئی تھی، جب وہ آگ کے دہکتے انگاروں پر جھلس رہی تھی تو پھر وہ اسے کیوں مطمئن ہونے دیتی۔ اس کے چہرے کے یہ اطمینان اور سالک کے الفاظ اس کے اندر کی تلملاہٹ کو مزید دو آتشہ کر گئے تھے۔

''عالی نے جھوٹ بولا آپ نے سچ مان لیا۔ کیوں...... مجھ سے زیادہ لوگوں پر اعتبار ہے۔ حیرت ہے اور یہ عالی بھی کتنا جھوٹا ہے، جینے مرنے کے وعدے ایک ساتھ کر کے اب وعدہ خلافی کر رہا ہے۔ حیرت ہے۔ شاید دنیا کے سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔'' وہ پاگلوں کی طرح ہنستے ایک دفعہ پھر سالک انیس الرحمان کو اذیت میں مبتلا کر گئی تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر بے یقینی و بے اعتباری کی لپیٹ میں آنے لگا تھا۔

''اسوہ، وہ تم سے اس انداز سے محبت نہیں کرتا...... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

اس نے ایک اور کوشش کی۔ شاید خود کو بہلانا چاہ رہا تھا۔

''ہرگز نہیں مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی۔ آپ کون ہوتے ہیں میرے معاملے میں، اتنی تفتیش کرنے والے۔ اچھا...... عالی سے کنفرم کرنے گئے ہوں گے۔ اب میں سمجھی۔ اور عالی کتنا بزدل نکلا ہے، کتنا جھوٹا اور مکار، محبت کو تماشا بنا دیا ہے اس نے۔ جب کما نہیں ڈری تو کیوں ڈر رہا ہے۔ پاگل...... آپ کو دیکھ کر جھوٹ بول گیا ہو گا۔ ہیں نا۔'' وہ یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے اس خبر نے اسے بہت صدمے زدہ کر دیا ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح الٹا سیدھا بکتی جا رہی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں نے آنسو بھی بہہ دیے تھے۔ سالک عجب شش و پنج میں پڑ گیا۔

''عالی...... میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کم از کم میرا بھرم تو رہنے دیتے۔'' وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پہلے سے زیادہ شدت سے رو رہی تھی۔ سالک کے لیے اس صورتحال کو سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اس کے الفاظ، عالی کے لیے اس کا یوں تڑپ تڑپ کر رونا...... وہ سب دیکھ رہا تھا۔ دل ایک دفعہ پھر بے یقینیوں کی زد میں آتا جا رہا تھا۔

''ہو سکتا ہے، مجھے دیکھ کر عالی نے واقعی جھوٹ بولا ہو۔ ورنہ اسوہ یوں پاگل نہ بنتی۔'' اس کا یوں رونا اسے پھر سوچوں کے بھنور میں دھکیل گیا تھا۔

''کیوں گئے تھے آپ اس کے پاس...... کیوں گئے تھے؟ میری طرف سے آپ لوگوں کی عزت و ناموس کو خطرہ تھا جب میں آپ لوگوں کی قید میں ہوں تو کیا تماشہ بنوانے لگے تھے مجھے...... میرا رہا سہا بھرم بھی توڑ دیا ہے۔'' اب وہ الفاظ سوچ سمجھ کر ادا نہیں کر رہی تھی۔ وہ واقعی اس وقت جنونیت میں مبتلا ہو رہی تھی۔ جو جی میں آ رہا تھا، کہہ رہی تھی۔ اذیت تھی کہ کوئی حد نہیں تھی۔

میں کرتی ہوں محبت اس سے...... ساری عمر کروں گی...... اس نے مجھے دھتکار دیا ہے پھر بھی...... میرا بھرم کھو دیا ہے پھر بھی...... جو کرنا ہے آپ لوگوں کو کر لیں۔ مجھے پروا نہیں۔ مگر مجھے نہ آپ سے غرض ہے نہ ہی کسی اور سے۔ نفرت کرتی ہوں میں آپ سے، سنا آپ نے۔'' وہ چیخ چیخ کر کہتی اندر بھاگ گئی تھی۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ سالک کو اپنی ٹانگیں بے جان سی محسوس ہو رہی تھیں، ایک دفعہ پھر اسوہ اسے بے موت مار گئی تھی۔

وہ جا رہا تھا مگر جانے سے پہلے کوئی فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ اسوہ اب کچھ نہیں کہتی تھی۔ جب سے اس نے اسے عالی سے ملاقات کے متعلق باخبر کیا تھا، وہ بالکل چپ ہوگئی تھی۔ اب اس کی طرف سے نہ ہی کوئی طنز سننا پڑتا تھا اور نہ ہی کوئی استہزائیہ جملہ۔ وہ خاموش ہوگئی، یوں بالکل چپ چاپ، ویران سی۔ بہت چاہنے کے باوجود وہ اپنے دل سے اسے نکال نہیں پا رہا تھا۔ وہ کسی اور کی بے وفائی کا سوگ منا رہی تھی مگر سالک کو ہر لمحہ کوئلوں پر گھسیٹ لائی تھی۔ ایک طرف وہ اس سے نفرت محسوس کرتا تھا مگر دوسری طرف اس کی محبت شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس نے جانے سے پہلے ایک فیصلہ کیا تھا۔ کسی کو اعتراض نہیں تھا، مگر اپنے اندر اسوہ سے بات کرنے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔ اس نے چاہا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں اسوہ پھر سے اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کر دے۔

اگلے دن اس کی فلائٹ تھی جانے سے پہلے وہ اس سے بات ضرور کرنا چاہتا تھا۔ وہ کمرے میں آیا تو وہ بیڈ کی کراؤن سے ٹیک لگائے دیوار پر موجود پینٹنگ پر نظریں جمائے کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔ اس کو دیکھ لینے کے باوجود اپنا شغل جاری رکھا تھا۔

''اسوہ...... '' وہ بستر پر اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تو اس نے اپنے اعتبار کے قاتل کو دیکھا۔

''صبح میری فلائٹ ہے۔ میں نے تمہاری یونیورسٹی بات کر لی ہے۔ ایک ماہ کی چھٹیاں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ تم یونیورسٹی چلی جانا۔ اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کرو۔''

''نہیں...... مجھے نہیں پڑھنا......'' ایک دم انکار کر دیا تھا اس نے۔ سالک چپ سا ہو گیا۔ کتنے لمحے خاموش سرک گئے وہ اس سے مزید بات کرنے کے لیے ہمت مجتمع کرنے لگا۔

''آپ مجھے کب طلاق دیں گے۔ اگر آپ یہ سوچ کر خوش ہو رہے ہیں کہ عالی سے دھوکہ کھا کر میں یونہی آپ کے ساتھ ساری زندگی گزار دوں گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔ اگر مجھے میرا گوہر مقصود نہیں ملا تو میں یہ سمجھوتہ بھی نہیں کروں گی۔ مجھے ہر حال میں طلاق چاہیے۔'' کتنی نفرت تھی اس کی آنکھوں میں۔ سالک اس کے لہجے میں الجھ گیا۔ جو کسی بھی لچک سے پاک تھا۔ سخت دلی۔ وہ رنجیدہ ہوتے بستر سے اٹھ گیا۔

اسوہ کے لیے اس کا یہ انداز ناقابل برداشت تھا۔ وہ جا رہا تھا اور جانے کب آتا۔ جانے سے پہلے وہ بھی ایک فیصلہ چاہتی تھی، ساری عمر اذیت میں نہیں گزار سکتی تھی۔ اس نے عالی کے نام کا جو داغ خود پر لگوا لیا تھا اب وہ کبھی نہیں اترتا تھا۔ ساری عمر کی بدنامی، مگر سالک مطمئن رہے یہ اسے گوارا نہیں تھا اس کی ذات پر کیچڑ اچھالنے کا سبب بھی یہی شخص بنا تھا وہ کیسے فراموش کر دیتی۔ کیسے معاف کر دیتی کیسے پرسکون رہنے دیتی؟

''ٹھیک ہے۔ میں وہاں جا کر تمہیں کاغذات بھیج دوں گا۔ بس یا کچھ اور...... '' وارڈروب کا دروازہ کھول کر اپنا سامان نکالتے اس نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا تو اسوہ چونک گئی۔ اتنی جلدی وہ مان گیا تھا۔ اتنی جلدی...... اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاید نفرت بہت گہری تھی۔

''نہیں...... '' پھنسی پھنسی آواز سے وہ صرف یہی کہہ سکی۔ سالک نے اسے صرف ایک نظر دیکھا۔ ''پہلے میں نے سوچا تھا کہ کچھ عرصہ اس معاملے کو رہنے دوں گا، حالات سازگار نہیں، چچا جان اور چچی جان کبھی نہیں مانیں گے۔ مگر خیر...... تمہیں بہت جلدی ہے تو میں جاتے ہی سب سے پہلے یہی کام کر دوں گا۔''

''نہیں...... مجھے کوئی جلدی نہیں، آپ جب چاہیں فیصلہ کر دیں۔'' نہ جانے کیسے اسوہ کے لبوں سے پھسلا تھا۔ سالک نے حیران نظروں سے اسے دیکھا تو وہ خود نظریں چرا گئی۔ کہاں وہ جلدی فیصلہ ہونے کے لئے بے تاب تھی اب وہ مہلت دے رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''پہلے میرے سامنے عالی تھا۔ اب کوئی بھی نہیں۔ مگر یہ طے ہے، مجھے آپ کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی۔ آپ مان گئے ہیں، جب بھی امی جان اور بابا جانی مانے میں اطلاع کر دوں گی۔ آپ کو اپنے وعدے کی پاسداری کرنا ہوگی۔'' کتنا دو ٹوک انداز تھا سالک کی مکمل نفی کرتا ہوا۔ اس نے مزید کچھ نہیں کہا تھا صرف سر ہلا تھا۔

اس کے بعد ایک خاموشی تھی اور یہ خاموشی آٹھ سالوں پر محیط ہو گئی تھی۔ وہ پہلے نیو یارک پہنچا تو دل پڑھائی میں لگا۔ آخری سال تھا مگر وہ بمشکل وہاں دو ماہ ہی گزار پایا تھا۔ کامران کو کسی فلیٹ کی تلاش تھی۔ اسے اپنا فلیٹ دے کر وہ وہاں سے بھی نکل گیا تھا۔ پاکستان سے اپنے ساتھ اچھی خاصی رقم لایا تھا۔ نجانے کہاں کہاں گھومتا رہا، رقم ختم ہوئی تو غم روزگار نے آلیا۔ چھوٹی موٹی جابز کرتا رہا۔ پھر اس دوران اس کی ملاقات ایک فرانسیسی لڑکی سے ہوئی۔ وہ تو پہلے ہی چوٹ کھایا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ وقت گزارنے لگا۔ وہ کسی نیوز چینل میں ڈانسر تھی۔ اس کو اپنے گروپ کے ساتھ انگلینڈ شو کرنے جانا تھا اسے بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ اس سے بہت شدت سے محبت کرتی تھی مگر باوجود کوشش کے سالک اپنے دل سے اسوہ کو نہیں نکال پایا تھا۔ محض وقتی رشتہ نبھاتا رہا۔ کئی بار اس نے شادی کا کہا مگر وہ ہر بار ٹال گیا۔ لزا اپنے گروپ کے ساتھ ملکوں ملکوں گھومتی تھی۔ اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹنا چاہتی تھی مگر وہ کسی گمنام گوشے میں چپ چاپ زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ آخر کار اس کی طرف سے ہار کر وہ ہمیشہ کے لئے اس کی طرف سے قطع تعلق کر گئی۔ کچھ سال انگلینڈ میں رہا۔ اس دوران مختلف کورسز کرتا رہا۔ ادھوری تعلیم مکمل کی اور پھر اسے جرمنی کی ایک کمپنی میں بہت اچھی پوسٹ پر جاب کی آفر ہوئی تو وہ جرمنی چلا گیا۔ اپنی زندگی میں وہ آہستہ آہستہ مطمئن ہونے لگا تھا کہ ایک دن کامران کا فون آ گیا کہ کئی سالوں بعد ایک دفعہ پھر اس کی حویلی سے اس کے نام ایک خط آیا ہے، خط لکھنے والی اسوہ ہے، وہ سخت حیران ہوا۔ ایک عرصے سے اس کی تلاش کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ شروع شروع میں جب اس نے نیو یارک چھوڑا تھا تو کامران اس کی وجہ سے سخت پریشان ہوا تھا۔ بابا جانی جیسے اسے زمین کی تہہ سے نکالنے کے درپے تھے۔ دو دفعہ خود آئے تھے امریکہ مگر ہر دفعہ ناکام لوٹ گئے اور اب اسوہ کا خط...... پھر وہ نیو یارک پہنچ گیا تھا۔ خط پڑھتے ہی وہ سخت اذیت میں مبتلا ہو گیا مگر یہ طے تھا کہ اب واپس لوٹنا ہے، اور اب اگر وہ لوٹا تھا تو اسوہ کا یہ انکشاف کہ نہ وہ عالی سے محبت کرتی تھی اور نہ ہی اسے کسی اور کی تلاش تھی۔ ایک دفعہ پھر اس کو پچھتاوے کی گہری دلدل میں دھکیل گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اسوہ کو غلط سمجھتا رہا تھا۔ وہ بہت گہری لڑکی واقع ہوئی تھی۔ کبھی کچھ بھی کرتی نہ تھی۔ اب اس کا رد عمل...... وہ ایک دفعہ پھر الجھ گیا تھا۔

✠ ✠ ✠

ماضی کی یادوں سے نکلا تو احساس ہوا وہ کتنا کچھ غلط کر چکا تھا۔ اسوہ کا کہاں کہاں قصور تھا، ایک دم سب واضح ہو گیا تھا۔ مگر اب بھی اس کی انتہا درجے کی نفرت اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ عالی کے واقعے سے پہلے بھی وہ بے حد متنفر رہتی تھی۔ اس کے بعد میں جو کچھ بھی وہ کرتی یا کہتی رہی تھی وہ تو اس کا رد عمل تھا۔ انصاف سے ہر پہلو پر غور کیا تو احساس ہوا وہ کہیں بھی غلط نہیں تھی۔

کالی گہری رات ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ کمرے آ گیا تھا۔ اسوہ کتنا وقت گزرنے کے بعد کمرے میں نہیں آئی تھی۔ وہ یونہی منتظر رہا۔ نجانے کب آنکھ لگی تھی۔ اپنی طرف سے تو وہ اسوہ کا انتظار کر رہا تھا۔ یونہی اس کی آنکھ کھلی تو کچھ دیر خالی الذہنی کی کیفیت میں لیٹا رہا۔ آنکھیں جب دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہ چونکا۔ اپنے وجود سے مس کرتا دوسرا وجود بلاشبہ

تھا۔ اس کا بازو سالک کے سینے پر تھا۔ اس نے ہاتھ ہٹانا چاہا مگر ہٹا نہ پایا۔ کانچ کی چوڑیوں سے سجا خوبصورت سفید بازو ہلکی مدھم روشنی میں بہت بھلا لگ رہا تھا۔ اس کا سر اس کے کندھے سے چھو رہا تھا۔ وہ چونکہ اسے سوچتے سوچتے ہی سویا تھا اب اسے یوں اپنے اس قدر قریب دیکھ کر دل ایک دم مطمئن ہونے لگا تھا۔ اس کے وجود کا لمس سالک کے اندر ایک نئی زندگی دوڑا رہا تھا۔ وہ گہری نیند میں غرق تھی۔ سالک نے اپنا دایاں بازو اس کی کمر کے گرد لپیٹ دیا تھا۔ اپنی کیفیت اسے جذبات بہت بھلے لگ رہے تھے۔

میں جانتا ہوں میری غلطی ناقابل معافی ہے۔ مگر میں تمہارا اعتماد جیتنے کی کوشش ضرور کروں گا تم جو میری زندگی ہو، بھلا تم سے جدا ہو کر میں جی سکتا ہوں۔ کبھی نہیں۔ اسی لئے تو نیو یارک چھوڑ دیا کہ کہیں تم مجھے میرا وعدہ یاد نہ دلا دو۔ ملکوں ملکوں گھوما ہوں، برسوں خاک چھانی ہے، صرف اور صرف تمہارے لئے۔'' اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھتے وہ عجیب کیفیت میں غرق تھا۔ کمرے کی تنہائی، اپنے رشتے کا استحقاق، سحر انگیز ماحول اور اپنی گزشتہ غلطیاں سب اسے اپنے حصار میں مقید کر رہی تھیں۔

''ایم سوری، رئیلی سوری۔'' بہت نرمی سے اس نے اسے خود سے مزید قریب کر لیا تھا۔ یوں کہ دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑکنے لگے تھے۔

وہ اسوہ سے کھل کر ہر مسئلے پر بات کرنا چاہتا تھا، وہ اب اپنے رشتے کو ایک واضح شکل دینا چاہتا تھا۔ اسوہ کی زندگی میں کوئی نہیں تھا۔ یہ خیال اس کی روح تک کو سرشار کر جاتا تھا۔ وہ کتنا ہلکا پھلکا ہو گیا تھا اور یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس نے اسوہ سے کوئی وعدہ بھی کیا ہے۔ دوسری طرف اسوہ شاید سب سمجھ رہی تھی۔ اس سے بچتی پھر رہی تھی۔ کئی گھنٹے کی تھی۔ کچھ کہنے کا کبھی موقع ہی نہیں دیتی تھی۔ رات کو بھی دیر سے جب وہ سو جاتا تھا تو کمرے میں آتی تھی۔ جب اٹھتا تو اس کے ساتھ سو رہی ہوتی تھی۔

اس دن وہ کچن میں مصروف تھی، شومئی قسمت کہ کوئی ملازم بھی موجود نہیں تھا۔ وہ پانی پینے آیا تھا جب وہ اسے کچن کے دروازے پر دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔ پھر نظر انداز کر کے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

''ایک گلاس پانی مل جائے گا۔'' اسے متوجہ نہ دیکھ کر کہا تو وہ فریج بند کر کے چولہے کے پاس جا کھڑی ہوئی جیسے سنا ہی نہ ہو۔

''اسوہ......'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس نے تیزی سے ایک طرف پڑا گلاس اٹھا کر پانی بھر کر اسے لا پکڑایا۔ سالک نے گلاس تھاما تو وہ واپس چولہے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ پلیز کچھ دیر کے لئے کمرے میں چلو۔'' اس نے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔

''مگر مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔ میرا وقت ضائع مت کریں۔ جائیں آپ یہاں سے۔'' تلخی سے جواب ملا تھا جیسے بمشکل خود کو برداشت کر رہی ہو۔

''اسوہ...... رئیلی سوری...... میں......'' اس نے کچھ کہنا چاہا تو وہ خونخوار انداز لئے پلٹی۔

''نہیں سالک صاحب بس، ایک لفظ بھی نہیں۔ آپ کی یہ سوری میری ذات پر اچھالا گیا کیچڑ نہیں دھو سکے گی۔ آپ کی ندامت مجھے باکردار ثابت نہیں کر سکے گی۔ میں نے ہر الزام سہ لیا۔ تحفے کی طرح اپنے سینے پر سجا لیا۔ اس لئے نہیں کہ کسی آج کے دن کے لئے کہ آپ صرف سوری کے چند الفاظ سے میری ذات خرید لیں۔ آپ نے جو دیکھا نہ وہ جھوٹ تھا نہ عالی سے محبت میری مجبوری تھی۔

ہاں اگر کچھ جھوٹ تھا تو ہمارے درمیان یہ تعلق ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میرے دل میں، اور میری زندگی میں آپ کے لئے قطعی گنجائش نہیں ہے تو پلیز میرا ضبط مزید مت آزمائیں۔ برسوں ترسی ہوں اب کہیں جا کر زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھ پائی ہوں۔ اب یوں میری راحت کھوٹی کریں۔ اپنے والدین کی نظروں سے ایک دفعہ گری ہوں دوبارہ اٹھ نہیں سکی۔ اب کیا چاہتے ہیں،

جان لینے کے درپے ہیں کیا؟"

وہ رو پڑی تھی۔ یہاں آنے کے بعد وہ پہلی دفعہ اس کے سامنے یوں ضبط کھوئی تھی۔ اس کا دکھ بہت بڑا تھا۔ اسود چپ ہو گیا۔ سالک کو اپنی زیادتیاں بہت بڑی لگیں۔

"آئی ہیٹ یو...... رئیلی آئی ہیٹ یو...... میں جانتی تھی کہ آپ مجھے ناپسند کرتے ہیں، میں یہ بھی جانتی تھی کہ آپ کی پسند میں نہیں کوئی اور ہے۔ آپ نے بی بی جان سے میرے نکاح کرنے پر بہت اعتراض کیا۔ مجھے نہ جانے کیا کیا کہتے رہے...... میں واقعی بہت پاگل تھی۔ زندگی میں آپ کے علاوہ کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ میں تو صرف آپ کے قریب رہنا چاہتی تھی۔ کسی نہ کسی بہانے اسی لیے چھوٹی موٹی حرکتیں کر جاتی تھی مجھے نہیں معلوم تھا اس کی اتنی بڑی سزا دیں گے۔ مجھے تو صرف یہ غصہ تھا کہ مجھے برا بھلا کہتے ہیں اور خود کسی اور لڑکی کو پسند کرتے ہیں۔ اسی لیے آپ کو چڑانے لگی تھی۔ تاکہ یہ جو بے دلی کا تعلق قائم ہوا ہے ختم ہو جائے۔ آپ کے قریب جب بھی آنا چاہا آپ نے بری طرح دھتکار دیا۔ پھر بنے رہے۔ اب آپ کی نفرت میں سہی گئی تھی اس لیے ضد کر کے لاہور چلی گئی۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ آپ کی نفرت اتنی گہری ہے، مجھے یوں ذلیل و رسوا کریں گے، کبھی لاہور نہ جاتی۔ میں جو پاگلوں کی طرح آپ کو صرف پوجتی تھی، شدید نفرت کرنے لگی۔ میرا اعتماد، میرے ماں باپ، ان کی محبت سب کچھ مجھ سے چھین لیا۔ وہ عالی جس کا نام میری رسوائی کا سبب بن گیا وہ تو مجھے صرف بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ وہ مجھے بہن کا مان دیتا تھا۔ پھر میں اس کی محبت اور خلوص کو کیسے نظر انداز کر دیتی۔ اور یہی میری غلطی تھی۔ اور آپ نے اسی غلطی سے فائدہ اٹھایا۔ اتنی زیادہ نفرت کرتے تھے تو کہا ہوتا، میں خود اپنی کوئی بندوبست کر لیتی مگر یوں رسوا نہ کرتے......" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر شدت سے رو رہی تھی۔ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ سالک کو اپنے بدن سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اتنی بدگمانیاں، اس نے کب نفرت کی تھی کچھ اعتراضات تھے اور وہ ان اعتراضات کو اس رخ پر لے گی اتنا کچھ سوچ لے گی۔ اتنی نفرت، وہ ششدر تھا۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ یوں سوچے گی، وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

"اسود......" وہ آگے بڑھا تو اسود پیچھے ہٹ گئی، سر نفی میں ہلا گئی۔

"نہیں سالک......! آپ نے صرف اپنی نفرت کا اظہار کیا تھا مگر مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ وہ محبت جو بچپن سے اب دل میں پنپتی چلی آئی تھی آپ کی نفرت اسے کھا گئی۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں کیا کر ڈالتی۔ ان دنوں صرف ایک ہی ضد تھی کہ مجھے طلاق لینی ہے۔ پھر آپ بھی مان گئے۔ دل میں ایک خوش فہمی تھی کہ شاید آپ سختی سے رد کر دیں اس تقاضے کو مگر......" چپ ہو گئی۔

سالک نے اسے کندھوں سے تھام لیا...... لرزتا وجود اور لرزنے لگا۔ اس نے خود میں بھینچ لیا۔

"اسود......" سالک کے لب کپکپائے تھے صرف۔

"آپ چلے گئے۔ میں لمحہ لمحہ مری، ہر ایک کی نظر میں میں مجرم تھی۔ میں گنہگار تھی۔ بابا جانی نے کبھی بلایا نہیں۔ امی جان نے کبھی پاس بٹھا کر کوئی بات نہیں کی۔ اگر بی بی جان نہ ہوتیں تو یہ آٹھ سال مجھے مار دیتے۔ جینے کی خواہش تو جیسے پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔ آپ کا یوں گمنام ہو جانا مزید حوصلے پست کر گیا۔ میری جو ضد تھی کہ صرف طلاق لینی ہے، وہ جیسے کہیں مٹ گئی تھی۔ چاہے ایک خیال، مسلسل آ رہا تھا کہ شاید آپ میری طرف سے کسی پیش رفت کے منتظر ہوں۔ بی بی جان کا ہارٹ اٹیک تو صرف بہانہ تھا کہ میں ضبط نہ کر سکی۔ ادھورے ایڈریس پر خط لکھ دیا۔ کیا لکھتی ہمارے درمیان کچھ تھا ہی نہیں۔ بی بی جان کی طرف سے پریشان کرنا ہی چاہتی تھی۔ بس وہی بھولا بسرا وعدہ یاد آ گیا۔ یہی سوچ کر اگر آپ کی نفرت اتنی ہی گہری ہے تو میری نفرت کو انجام تک پہنچانے کے لیے تو ضرور آئیں گے۔ اللہ سے دعائیں مانگی تھیں۔ اور آپ آ گئے مگر میری ذات کا سارا حوصلہ آپ کو دیکھتے ہی جیسے کہیں کھو گیا۔ لمحوں میں دل اس خوف میں مبتلا ہو گیا کہ آپ اب مجھے طلاق دے دیں گے۔ میں یقین دلاتی ہوں میں آپ کی زندگی میں

مداخلت نہیں کروں گی۔ مگر خدارا مجھے اپنے والدین کی نظروں میں اب رسوا نہ کریں۔ مجھے میری زندگی جینے دیں، برسوں حوصلہ کیا ہے بکھری ہوئی ہوں۔ اب میرے رہے سہے بھروسے کی عمارت مسمار مت کریں۔ مجھے طلاق نہیں چاہیے۔ کبھی نہیں۔" سالک خود پشیمان ہو گیا۔ وہ برسوں چپ رہی تھی، آج کھلی تھی، طلاق کے خوف نے اسے بولنے پر مجبور کر دیا تھا وہ سب کچھ جو برسوں سے بلکہ بچپن سے دل کے نہاں خانوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے کہتی گئی تھی۔ وہ کیا سوچ رہا تھا اور کیا نکلا تھا۔

سالک کی وہ حالت تھی کہ بیان کرنا مشکل تھا۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتی تھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس قدر جذباتی تھی، گزرے واقعات فراموش کر دینے والے نہ تھے۔ اس کا کہا ایک ایک لفظ سچا معلوم ہو رہا تھا۔ سالک کا دل مانتا جا رہا تھا۔ نادم ہوتا جا رہا تھا۔

* * *

اسود پھپھو کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی سب کو کھٹک رہی تھی۔ سب ہی اسے مس کر رہے تھے اور وہ تھی کہ اپنے دل کا سارا غبار نکال کر سالک کو کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر اگلے دن بی بی جان کے ساتھ پھوپو کے ہاں چلی گئی تھی۔ بی بی جان تو دو دن رہ کر آ گئی تھیں مگر وہ وہیں رہ گئی تھی۔ اس کی غیر موجودگی سب سے زیادہ سالک کو محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جب سے آیا تھا وہ اس کا ہر کام خاموشی سے سرانجام دے رہی تھی۔ جب سے گئی تھی کمرے میں بے ترتیبی سی پھیلتی جا رہی تھی۔ کپڑوں سے لے کر کھانے تک بغیر اس کے کہے ہر چیز حاضر کر دیتی تھی، خاموشی سے۔ اس نے صرف اتنا جتا دیا تھا کہ وہ بی بی یا چچی جان کے کہنے پر سب کر رہی ہے مگر اب ہر بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جو اسے بدنام جتا تھا۔ اسود تو اپنے دل کا غبار نکال کر منظر سے ہٹ گئی مگر اسے پشیمانی و پچھتاووں کے گہرے سمندر میں دھکیلتی جا رہی تھی۔ اس کا ایک ایک آنسو، ایک ایک لفظ، انی کی طرح دل میں چبھتا جا رہا تھا۔ کسی پل قرار نہ تھا۔ کسی پل چین نہ تھا۔ جو سوچا تھا وہ کیا نکلا تھا، اور جو سامنے آیا تھا وہ کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ کب بھی سوچا تھا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہو گی اور اب جب سب باتیں روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھیں تو دل تب بھی سچ بچ تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک کے سارے واقعات ایک ایک کر کے ازبر ہوتے گئے تھے۔

"کیا بات ہے سالک......؟ آج کل کچھ پریشان ہو، کمرے سے نکلتے ہی نہیں۔" وہ بیٹھا نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا جب بی بی جان کمرے میں داخل ہوئی تھیں، ہر سو اندھیرا تھا۔ انہوں نے لائٹس آن کیں۔ وہ فوراً سیدھا ہوا۔ بی بی جان اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

"نہیں...... ویسے ہی...... کوئی کام تھا کیا؟" وہ مسکرایا تو وہ بغور دیکھنے لگیں۔

"اسود اور تم میں کوئی بات ہوئی ہے۔" انہوں نے ایک دم پوچھا تھا وہ بوکھلا گیا۔

"نہیں...... نظریں خود بخود پھیر گیا۔

"میں نے فون کیا تھا۔ ڈرائیور کو بھی بھیجا، وہ آ ہی نہیں رہی۔ آج پھر فون کیا تو کہہ رہی تھی دو تین ہفتے رہے گی۔" انہوں سادگی سے بتایا تو وہ دیکھے گیا۔

"کیا بات ہے میرے بچے...... مجھے نہیں بتاؤ گے۔ تم دونوں مجھ سے چھپے ہوئے نہیں ہو۔ اب کیا مسئلہ ہے۔" وہ بڑی شفقت سے لگاوٹ کا مظاہرہ کیے پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں بی بی جان، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اب تو جیسے سارے مسئلے حل ہو گئے ہیں۔" وہ بدقت تمام مسکرا دیا تھا مگر افسردہ تھا۔ مسکراہٹ میں کوئی رنگ نہیں تھا۔

"مجھ سے چھپا رہے ہو..... مجھ سے......" انہوں نے جیسے اسے زچ کر دیا تھا۔

"کیا بتاؤں بی بی جان۔" نادم سا سر جھکا کر رہ گیا۔

"وہی جو اسوہ کے یہاں سے جانے کا سبب بنا ہے۔"

"قسم لے لیں بی بی میں نے اسے نہیں بھیجا، مجھے تو علم بھی نہیں تھا۔"

"یہی تو پوچھ رہی ہوں کیوں علم نہیں تھا۔ جبکہ تمہیں پتا ہونا چاہیے تھا۔" ان کا لہجہ اب سخت ہو گیا تھا۔ بازپرس کرتا ہوا۔

"بی بی جان! اچھا ہوا ہے وہ منظر سے غائب ہے۔ اگر وہ یہیں رہتی تو شاید میں یکسوئی سے اپنی غلطیاں کبھی نہ ڈھونڈ پاتا۔" بی بی جان چپ رہیں۔ پھر اس نے شروع سے لے کر آخر تک سب کہہ سنایا۔ بی بی جان کی بھی وہی کیفیت تھی جو اس کی ہوئی تھی۔ اسوہ کی زبانی سب سن کر۔ وہ بھی شاکڈ تھیں۔

"بہت برا کیا بچے، بہت برا۔ وہ جذباتی تو شروع سے ہی تھی۔ اتنے بڑے الزام کو اپنے سر لے لیا۔ کبھی ایک لفظ نہ کہا۔ یہی ظاہر کرتی رہی کہ جیسے......" وہ چپ ہو گئیں۔ آنسو ایک ایک کر کے بہنے لگے۔

"بی بی جان میں خود میں حوصلہ نہیں پاتا کہ اس کی طرف قدم بڑھاؤں۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ میری وجہ سے صرف میری وجہ سے وہ اپنے والدین کی نظروں میں گر گئی۔"

اس نے بی بی جان کی گود میں سر رکھ لیا تھا۔ شروع سے ہی وہ اس کے ہر راز کی امین تھیں۔ اس کے ہر دکھ سکھ میں اس کے ساتھ رہی تھیں۔ اب بھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

"بس میرے بچے! کچھ غلطیاں انسان دانستہ کرتا ہے اور کچھ نادانستگی میں سرزد ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ غلطیاں نہ کرے تو اسے زندگی کی قدر نہ ہو۔ یہ آزمائشیں، یہ غلطیاں اسے سبق سکھاتی ہیں۔ شرمندہ ہو کر کمرے میں بند ہونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ سب کچھ کہہ کر اپنے دل کا غبار نکال چکی ہے تو بھی سب کچھ بھول کر قدم بڑھا، جا کر اسے لے آ۔ وہ شاید تمہاری راہ دیکھ رہی ہو۔ میں نے کہا تھا وہ بہت اچھی ہے، تم نے دیکھ بھی لیا ہے۔ بس تم دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ چھوٹی چھوٹی بدگمانیوں کو اگر جگہ دل میں دے دی کہ حقیقت کا اصل چہرہ کہیں چھپ گیا۔ تمہیں میں اکثر سمجھاتی تھی تاکہ سب جذبے چپ کی زبان سے عیاں نہیں ہوتے کبھی کبھی زبان سے بھی کام لینا پڑ جاتا ہے۔ اگر تم ہر بات دل میں رکھنے کے بجائے کبھی کبھار اسے اچھے انداز میں کچھ کہہ دیتے، ہنس کر بات کر لیتے تو بات اتنی نہ بڑھتی۔ پرانی قدریں بس قدریں رہ گئی ہیں۔ یہ نیا دور ہے، ہر انسان کے لئے دوسرے سے زیادہ اپنی ذات مقدم ہے تو بیٹا! انسان کو حالات کے مطابق ہی چلنا چاہیے نا۔"

وہ خاموش رہا تھا۔ یہ ملال تو اسے بھی تھا کہ کیا تھا وہ اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس کبھی ہنس کر، اپنی ذات سے نکل کر اس کی ذات کو بھی اہمیت دے لیتا۔ اسے دعویٰ تھا کہ نکاح سے لے کر رخصتی تک اس نے کبھی اسے چھو کر نہیں دیکھا۔ یہ اتنی فخر کی بات تو نہیں تھی۔ بحیثیت شوہر وہ حق رکھتا تھا اور خاص طور پر لڑکیاں تو اس معاملے میں حساس ہوتی ہیں۔ نجانے اس کے دل میں کیا کیا جذبات تھے جو اس کی سرد مہری کی وجہ سے ہمیشہ دل کے اندر ہی تو طیبت کا شکار ہوتے گئے ہوں گے جبکہ اسوہ نے کہا تھا۔

"نظر شناسی کی صلاحیت آپ میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ اپنی ذات کے گرد فصیلیں کھڑی کرتے کرتے بالکل اندھے ہو گئے ہیں۔ کبھی اپنی ذات سے نکل کر دیکھیں۔"

اور واقعی اب اس نے اپنی ذات سے نکل کر دیکھا تو بہت سے راز کھل گئے تھے۔

"اب کمرے میں بند ہو کر مت بیٹھو۔ باہر نکلو...... اگر برا نہ مانو تو جا کر اسوہ کو لے آؤ...... جب ہر معاملہ کلیئر ہو گیا تو یہ منہ چھپا کر بیٹھے رہنا کیوں...... ہمت کرو۔ اب وہ خود تو تمہیں کہنے سے رہی کہ مجھے لے جاؤ۔ بہرحال کچھ ناراضگی کا حق تو اس

بھی بنتا ہے۔" بی بی جان ہلکے پھلکے انداز میں کہتے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ انہوں نے گویا اسے ایک راستہ دکھا دیا تھا۔

"شکریہ بی بی جان۔" انہوں نے ہمیشہ سیدھے رخ اس کی رہنمائی کی تھی۔ ابھی تک وہ الجھا ہوا تھا کہ کیا کرے۔ ان کی باتوں نے اس کے اندر ہمت پیدا ہوئی تھی۔ اسوہ کا سامنا کرنے کی۔

"اللہ تم دونوں کو خوش رکھے۔ میری دعا ہے۔ میں راضیہ اور قمر الزمان سے بھی بات کروں گی، ماں باپ ہیں اس کے آخر کتنا بھی ناراض رہ لیں، اولاد کی محبت پلٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر وہ کونسا واقعی ناراض ہیں بس غصہ ہے جب حقیقت کھلے گی تو دل خود بخود صاف ہو جائیں گے۔" اس کی پیشانی چوم کر ای باہر نکل گئی تھیں۔ وہ سوچنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

منتہیٰ کے چھوٹے واثق کو لے کر وہ باہر لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ باقی بچے بھی ادھر گرد تھے۔ منتہیٰ اور وہ دو ہی بہنیں تھیں۔ منتہیٰ اس سے آٹھ سال بڑی تھی۔ کم عمری میں ہی اس کی شادی کر دی تھی وہ خوش قسمت تھی عبد الرزاق بھائی بہت اچھے اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ سب کا ہی ادب کرتے تھے۔ وہ اکثر آتی رہتی تھی پھوپھو کے گھر۔ اس دفعہ وہ رہنے کی غرض سے آئی تھی۔ ہفتہ ہو گیا تھا یہاں آئے ہوئے۔ واپس جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ وہ چڑچڑا رہی تھی کہ منہ جانے کب کر دو لمحے میں کہہ کر وہ سالک سے سب کہتی گئی تھی جو وہ برسوں سے برداشت کر رہی تھی۔ وہ اذیت، وہ دکھ، وہ تکلیف، وہ نفرت سب کچھ..... اب دل بہت ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ بالکل خالی سا۔ شاید یہ کہہ لینے کا اثر تھا برسوں کا غبار تھا، بچپن کی یادیں تھیں جنہیں وہ سالک کے سامنے ایک ایک کر کے دہراتی گئی تھی۔

پہلی دفعہ سالک کی طرف سے وہ تب بدگمان ہوئی تھی جب بی بی جان! اسے اس سے نکاح کا کہہ رہی تھیں اور وہ انکار کرتے ہوئے اس کی خامیاں گنوا رہا تھا۔ اس کے دل میں سالک کا بہت بلند مقام تھا۔ بہت محبت کرتی تھی اسے۔ بہت چاہتی تھی، ایک دم اس کی زبان سے اپنے لئے ناپسندیدگی سن کر وہ چڑ سی گئی تھی۔ اذیت تھی کہ حد نہیں۔ اوپر سے یہ انکشاف روح کو گھائل کرنے کو کافی تھا کہ وہ اس سے نہیں بلکہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ اس کی پسند کوئی اور ہے، وہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ سالک نے اس کی ذات کی نفی کی تھی۔ بحیثیت کزن وہ مروت اختیار کر لیتا تھا مگر جب نکاح ہوا تو وہ اس سے بچی گئی۔ مجبوراً ہی سہی وہ نکاح پر راضی ہو گئی تھی نا اپنی ذات کی نفی کے باوجود دل میں اسے اپنا بنانے کی خواہش ایسی زور آور تھی کہ وہ اپنی عزت نفس کی پامالی بھی گوارا کر گئی۔ پھر وہ عمر بھی تو ایسی تھی ضدی سی۔ چاند کو چھونے کی تمنا تھی، بہرحال میں چھونا چاہتی تھی۔ پھر وہ اس کا بن گیا تھا اور یہی وہ دور تھا کہ جب اس نے اسے جتلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ سالک اس سے اتنی نفرت کرتا ہے کہ اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ عام لڑکیوں کی طرح اس کے بھی جذبات تھے، پھر دونوں میں جو رشتہ تھا اس کے تقاضے بھی کچھ تو کم نہ تھے۔ مگر وہ اس کے جذبات کہاں سمجھنے والا تھا۔ جب بھی نظر ڈالی ناپسندیدگی کی ڈالی۔ جب بھی بات کی سمجھانے والی کی جبکہ اس کے کان لاشعوری طور پر کچھ اور سننے کے منتظر رہتے تھے۔ جواباً وہ چڑچڑی ہوتی گئی۔ طنزیہ جملے بولنا اپنا مشغلہ بنا لیا۔ جس کام سے یا جس عادت سے اسے نفرت ہوتی تھی وہ سب سے زیادہ اس کا اظہار کرتی پھر یوں ہوا کہ ایک دو دفعہ کا نوکتا اسوہ کے دل میں بدگمانیوں کی ایک فصیل کھڑی کر گیا۔ اسے ضدی ہو گئی اسے چڑانے کی، اسے زچ کرنے کی۔ اپنے اندر کی تلملاہٹ و چڑچڑاپن وہ اسی طرح نکالنے لگی تھی۔ گفتگو کرتے وقت وہ زیادہ سے زیادہ ایسے الفاظ استعمال کرنے لگی تھی جو اسے سخت ناپسند ہوتے تھے یا وہ اشتعال میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ اس کی گفتگو سے ناپسندیدگی کا اظہار سالک کے چہرے سے بخوبی ہو جاتا تھا مگر وہ ہمیشہ خود پر کنٹرول کر جاتا تھا جبکہ وہ اسے آخری حد تک دیکھنا چاہتی تھی۔ لاہور جانے کا فیصلہ اور اس سے پہلے کی گفتگو بھی اسی زمرے میں آتی تھی مگر وہ بجائے اشتعال کے بہت تحمل کا مظاہرہ کر گیا تھا وہ ایک دفعہ

پھرنا کام ہوئی تھی اس کا خیال تھا کہ یہ شخص اسے اس حد تک ناپسند کرتا ہے کہ کچھ بھی کرسکتا ہے اور بعد میں یہ سچ ثابت ہوا۔
عالی کے ساتھ اس کی ذات کو منسوب کرنا سالک کی نفرت کو مکمل کر سامنے لے آیا تھا۔ وہ شاک میں مبتلا ہو گئی تھی کہ اسے
جب یقین ہو گیا کہ اس پر الزام لگانے اور شک کرنے والی کوئی اور ذات نہیں صرف سالک انیس الرحمان ہے تو برداشت کی حد ختم ہو
گیا تھا پھر تو جیسے اس کے دل میں بھی محبت نہیں رہی تھی بے پناہ نفرت آ گئی تھی۔ وقت اور حالات نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا مگر اس
نے اپنے آپ کو لڑکھڑانے نہیں دیا تھا۔ رخصتی سے لے کر سالک کے وطن چھوڑنے تک وہ اس الزام پر کاربند رہی تھی۔ پھر رہی بھی
کیوں نہ یہ الزام ہوا اس کے محبوب شوہر کی طرف سے ملا تھا۔ محبت تو جیسے اپنی موت آپ مر گئی تھی اس کے بعد اس نے صرف اور صرف
سالک سے نفرت کی تھی انتہائی زیادہ کہ اس نے اس کی موت کی دعائیں مانگی تھیں۔

وہ چلا گیا اور اس کی انتہائی نفرت سب گزرتے وقت کی دھول ثابت ہوئے۔ شروع سالوں میں وہ صرف اور صرف اسے
اذیت دینے کی خاطر کوئی پیش رفت کیے بغیر بیٹھی رہی مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔ لوگ یہاں اس کی گمشدگی
کی طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس کی نفرت بھی اعتدال پر آ گئی مگر ختم نہ ہو سکی۔ آٹھ سال بعد اسے بس یونہی خیال آیا
تھا شاید وہ آ جائے شاید وہ کہیں زندہ ہو۔ کسی کا منتظر ہو۔ نہ جانے کیوں آہستہ آہستہ یہ خیال تقویت پکڑنے لگا اور پھر بی بی جان کی
خراب طبیعت نے اسے خط لکھنے پر مجبور کر دیا تھا اب آیا تھا تو پہلے والا سالک نہیں تھا جس پر کسی بھی بات کسی بھی طنز یا کسی بھی استہزاء
کا اثر نہیں ہوتا تھا تحمل مزاجی کی جگہ اشتعال انگیزی جڑ پکڑنے لگی تھی۔ اس نے پہلی ہی رات یہ بات محسوس کر لی تھی۔ مگر لوٹ کر آنے
والے کو وہ سر آنکھوں پر نہیں بٹھا سکی تھی۔ اس کی نفرت ابھی باقی تھی۔ ہاں یہ سچ تھا پہلے والی حالت نہیں رہی تھی مگر ختم بھی نہیں ہوئی تھی
اسی لیے تو سالک کا ضبط آزمانے کے چکر میں وہ اس شام اس پر عیاں کر گئی تھی۔ اس نے کبھی عالی سے محبت نہیں کی تھی بلکہ سگے بھائی
کی سی محبت کی تھی۔ پھر تو جو ہوا تھا وہ شاید ماحول یا حالات کا اثر تھا اب یہ حالت تھی کہ اس کے اندر سالک کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں
تھی۔ برسوں وہ اپنی ذات کی توہین کرواتی آئی تھی اب ایک دم سالک کے قدموں میں جا بیٹھنے کے خیال سے ہی عجیب سا محسوس
ہونے لگا تھا۔ اگر وہ قصوروار تھی تو قصوروار سالک بھی تھا۔ اسے ضرور آنا چاہیے تھا۔ بات کرنی چاہیے تھی مگر آٹھ دن گزرنے کے
باوجود بھی انتظار کا موسم برقرار تھا۔ دل میں محبت و نفرت کچھ بھی نہیں تھا۔ بس عجیب سی کیفیت تھی، جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔

حامق رونے لگا تو وہ اسے لے کر اندر آ گئی ملیحی کو پکڑا کر وہ کمرے میں آ گئی۔ باہر کا موسم اچھا ہو رہا تھا اگرچہ سردیاں تھیں
مگر آسمان پر چھائے بادل بھلے لگ رہے تھے۔ کپڑے نکال کر وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر نکلی تو باہر بارش ہو رہی تھی ہلکی ہلکی۔ بال
سلجھاتی کمرے کی کھڑکی سے دیکھنے لگی۔ برسوں بعد اسے بارش اچھی لگی تھی۔ شاید دل کا موسم بدل رہا تھا اسی لیے۔

اپنے بیگ سے مختلف چیزیں نکال کر وہ آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ جب بھی پھوپو کے گھر آتی تھی تو جیولری وغیرہ
ساتھ لاتی تھی ورنہ اسے یوں ہی دیکھ کر پھوپو کا لیکچر خاصا جھاڑ پلانے والا ہوتا تھا۔ یہاں آتے ہوئے وہ کنگن پہنے تھی۔ دوسرے ہاتھ
میں ست رنگ خوبصورت کانچ کی چوڑیاں تھیں، جو ہر سوٹ کے ساتھ بھلی لگتی تھیں۔ نہانے سے پہلے اس نے اتاری تھیں۔ آئینے کے
سامنے کھڑے ہو کر پہنیں۔ جیولری بھی نکال کر پہن لی۔ آج کتنے دنوں بعد بننے سنورنے کو جی چاہ رہا تھا ورنہ حویلی میں تو صرف بی بی
جان کی خاطر کوئی ہار سنگھار کر لیتی تھی۔ لپ اسٹک لگا کر آنکھوں میں کاجل لگا کر اس نے اپنے اوپر ایک تنقیدی نظر ڈالی تھی۔ عمر اگرچہ
تیس سال تھی مگر جسامت اس کی اب بھی ۲۲ سالہ لڑکیوں جیسی تھی۔ گزرتے آٹھ سالوں نے اس کے سراپے پر کوئی فرق نہیں ڈالا تھا۔
بس یہ ہوا تھا کہ پہلے سے کچھ سنجیدہ و میچور ہو گئی تھی۔ جو شاید گزرے وقت کا تقاضا تھا۔ دوپٹے کو سلیقے سے اوڑھ کر سینڈل اڑس کر وہ باہر
نکل آئی۔

''ارے...... واہ...... یہ چاند کدھر سے نکل آیا ہے۔'' بلیک سوٹ میں اس کی سفید رنگت چاندنی کی طرح چمک رہی تھی۔

ملیحی نے اسے دیکھتے ہی چھیڑا تھا۔ وہ جھینپ سی گئی۔
''لگتا ہے سالک نے تمہیں پہلے ہی اپنی آمد کی اطلاع دی ہوئی تھی۔'' اس کے سجے سجائے سراپے پر پیار بھری نگاہ ڈال کر
ملیحی نے مزید کہا تو وہ حیران ہوئی۔
''کیا...... سالک!...... کہاں ہیں وہ؟'' اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔
''ڈرائنگ روم میں امی کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابو بھی وہیں ہیں۔'' وہ ہونٹ کچلنے لگی۔
''شاید تمہیں لینے آئے ہیں۔ میں تمہارے کمرے میں گئی تھی بلانے تم باتھ روم میں تھی۔''
اس کا دل خوش فہمیوں میں گھرنے لگا۔ ''مجھے لینے......'' ملیحی ہنس پڑی۔
''اچھی لگ رہی ہو بلکہ بہت پیاری...... سالک سے نظر ضرور اتروا لینا۔ کہیں......'' وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔ اور اس کا
دل خود بخود سہمنے لگا۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ بھی اپنی کیفیت پر حیران ہوئی۔ ''تو کیا دل نے دماغ نے اتنی جلدی ہار مان لی ہے۔'' اس
نے خود سے پوچھا۔
''ہاں......'' اندر سے کوئی چیخا۔ وہ ڈر گئی جبکہ ابھی وہ وقت لینا چاہتی تھی۔
''چلو اندر...... انتظار کر رہے ہوں گے تمہارا حضرات۔'' وہ اسی پر جملے اچھالتے کچن کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ لرزتی
ٹانگوں سمیت اندر داخل ہوئی وہ پھوپھا جان کے ساتھ مصروف گفتگو تھا۔ سالک نے اس کو دیکھا۔
''السلام علیکم۔'' وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ نجانے کیوں دل اندر ہی اندر خوف میں مبتلا تھا کہ اگر اس نے جانے سے انکار کر دیا
یا پھر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیا تو...... لیکن اسوہ کا سلام کرنا اور حلیہ دونوں برعکس تھے۔ اس نے سر ہلایا۔ وہ ایک طرف
پھوپو کے ساتھ بیٹھ گئی۔ گلاس وال سے باہر دیکھا بارش رکی ہوئی تھی۔
''اسوہ کو کچھ اور دن رہنے دیتے تم...... کافی عرصے بعد آئی ہے بچی۔'' وہ شاید اپنی آمد کا مقصد بتا چکا تھا۔ پھوپو نے
اسے دیکھتے ہی کہا تو اس نے اسوہ کو دیکھا جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ اس کی کیا مرضی ہے۔ چلنا چاہتی ہے یا نہیں۔
''ہم پھر آ جائیں گے فی الحال جانے دیں۔'' اسوہ خاموش تھی امی نے کہا۔
''کھانا تو کھا کر جاؤ گے نا۔'' انہوں نے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔
''نہیں...... موسم کا کچھ پتا نہیں۔ دوسرے میں گھر بتا کر نہیں آیا۔ کھانے تک نہیں رک سکتا۔ شہر گیا ہوا تھا راستے میں
یہاں آ گیا ہوں۔ بی بی پیچھے پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ابھی تو بارش رکی ہوئی ہے۔ پتا نہیں کب شروع ہو جائے۔'' اسوہ انگلیاں چٹخا
رہی تھی جبکہ وہ سہولت سے کہہ رہا تھا۔
''یہ خوب کہی تم نے پہلی دفعہ تم دونوں اکٹھے میرے گھر میں ہو ایسے کیسے جانے دوں۔'' پھوپو کھانا نہ کھانے والی بات پر
ناراض ہوئیں۔
''موسم خراب نہ ہوتا تو شاید رک جاتا۔ پھر بھی سہی۔ اب تو انشاء اللہ آتے رہیں گے۔'' اسوہ نے ایک دم سر اٹھا کر اسے
دیکھا وہ بھی ادھر ہی متوجہ تھا۔ وہ فوراً نظروں کا زاویہ بدل گئی۔ دل نے گویا ایک دم سے بدلی تھی۔ (کیا واقعی سب کچھ بدل چکا ہے)
''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔'' پھوپو نے کہا تو اس نے اسوہ کو دیکھا۔
''اسوہ! تیار ہو...... چلیں......'' وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے پہلے سے اس کا اس کے ساتھ پروگرام طے ہو۔ ایک دم چونک
کر دیکھا پھر سر اثبات میں ہلایا۔
''میں بیگ لے آؤں۔'' وہ باہر نکل گئی تھی۔
پھوپو کے ہاں سے بھی نکلتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ آسمان پر بادل ایک دفعہ پھر چھانے لگے تھے ہر طرف اندھیرا ہونے لگا تھا

۔وہ اس کے ساتھ جیپ میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی بالکل خاموش تھی۔ خاموش تو وہ بھی تھا مگر معنی خیز سی خاموشی دونوں اطراف سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ نظر انداز کئے اپنا دھیان تیز طوفانی ہوا کی طرف مبذول کئے ہوئے تھی۔ موسم کے تیور خطرناک تھے۔ پھر بارش کا بھی کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے ہوا تھا کہ پھر تیز بارش شروع ہوگئی تھی۔ وہ ہراساں سی ہوگئی۔ باہر طوفانی بجلی کڑک کے چمک رہی تھی۔ ایسے موسم سے ہمیشہ ہی اسوہ کی جان نکلتی تھی۔ وہ ایک دم پردے برابر کرکے سالک کی طرف سمٹ آئی۔

''پلیز یہ پردے آگے کردیں۔ باہر بجلی کڑک رہی ہے۔'' خوف سے کپکپاتی آواز تھی۔ سالک نے چونک کر اسے دیکھا۔ گاڑی کا ماحول بھی تاریک سا ہو رہا تھا ایسے میں اسوہ کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اس نے اپنی طرف کے پردے برابر کئے تو وہ کچھ پرسکون ہوئی۔

''بارش کافی تیز ہوگئی ہے۔ ابھی گاؤں کا کافی فاصلہ باقی ہے۔ ایسی طوفانی بارش کے آثار تو نہیں تھے۔'' اس نے بھی بات شروع کی تھی۔ ''مجھے بہت خوف آرہا ہے جلدی چلیں...... '' سردی سے اس کے دانت بجنے لگے۔ وہ مسکرایا۔ دل چاہا کچھ کہے۔ مگر پھر خاموش ہوگیا نجانے اس کا کیا ری ایکشن ہو۔ موسم خاصا خراب ہوگیا تھا۔ حویلی تک پہنچنا ذرا مشکل تھا۔ قریبی گاؤں میں ان کا ایک باغ تھا۔ ساتھ میں ریسٹ ہاؤس بھی تھا۔ اس نے گاڑی ادھر موڑ لی۔

''یہ آپ کدھر جا رہے ہیں۔ حویلی چلیں۔ گاؤں میں۔''

''ابھی حویلی جانا مشکل ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہے۔ ڈرائیونگ کرنا مشکل ہے۔ ہوا کا رخ بھی تو نجانے کدھر ہے۔ موسم ٹھیک ہوتا ہے تو چلتے ہیں۔''

''مگر آپ جا کہاں رہے ہیں۔'' وہ اب پریشان ہوگئی تھی۔

''یہاں ہمارا قریب ہی ریسٹ ہاؤس ہے۔''

''کیا سے بہتر تو پھوپھو کا گھر ہی تھا۔ خوامخواہ......'' اسوہ کو غصہ آنے لگا تھا۔ اس نے رخ موڑ کر دیکھا۔ وہ بہانے آنکھیں پھیلائے اندھیرے کو گھور رہی تھی۔ چہرے پر ایک ناگواری رقم تھی۔ ہونٹ ایک دوسرے میں بھنچ گئے تھے۔ وہ چپ رہا۔

چوکیدار نے ریسٹ ہاؤس میں پہنچتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔ وہ گاڑی اندر لے آیا۔

''آؤ......'' گاڑی سے اترتے اس نے اسوہ سے کہا۔ تو وہ چپ چاپ اتر آئی۔ برآمدے تک پہنچتے وہ اچھی خاصی بھیگ گئی تھی۔

''نواز خان کمرہ کھول کر دو اور گاڑی سے سامان بھی لے آؤ۔ احتیاط سے۔'' ملازم جو کہ چوکیدار تھا، نے فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ ہاتھ مسلتی اندر چلی آئی۔ سالک ساتھ ساتھ تھا۔

''یہ سائیڈ پر کمرہ ہے۔ یہ چابی لے لو۔'' سالک نے گیلے بال جھٹکتے اپنی جیب سے چابی نکال کر اسے تھمائی تو وہ خاموشی سے اس کے بتائے گئے کمرے میں آگئی۔ اس نے گیلی چادر اتار کر بستر پر پھیلائی۔ سردی لگ رہی تھی۔ ابھی وہ سردی کا سدباب کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ لائٹ چلی گئی۔ باہر بجلی کڑک رہی تھی اندر بجلی بھی چلی گئی تھی۔ اسوہ کا دل خوف سے سمٹنے لگا۔

''سالک......'' اس کے حلق سے ہلکی سی سسکی نکل گئی۔

''سالک...... سالک......'' وہ بے اختیار پکارنے لگی۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر بجلی کی کڑک چمک ایک بار چمک کر معدوم ہو جاتی تھی کھڑکی کے شیشے سے یہ منظر بالکل واضح محسوس ہو رہا تھا۔ تبھی کمرے کا دروازہ کھولا اور کوئی اندر داخل ہوا تھا۔

''سالک......'' اس نے پکارا تھا مگر جواب ندارد تھا۔

وہ کمرے میں ادھر سے ادھر چلی تو کسی سے ٹکرا گئی۔ ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''اسوہ......'' سالک کی آواز انتہائی قریب سے سنائی دی۔ اس کا وجود سالک کے حصار میں تھا۔ اسے کچھ تسلی ہوئی۔

''سالک! لائٹ جلائیں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ اس کے سینے میں منہ دیئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ دل کی حالت حد سے سوا تھی۔

''میں نے نواز خان سے کہا ہے وہ بندوبست کرتا ہے۔'' اپنی جیب سے موبائل نکال کر اس نے اسکرین جلائی تو ہلکی سی روشنی ہوگئی جو بہت کم تھی۔

''تم سکون سے بیٹھو......'' وہ بستر کے کنارے ٹک گئی۔ چند سیکنڈ بعد کمرہ روشنی میں نہا گیا تھا۔ اسوہ نے سکون کا سانس لیا۔

جنریٹر آن کیا گیا تھا۔ سالک نے اسوہ کو پرسکون ہوتے دیکھ کر حویلی کے نمبر ملائے۔ سراج بابا تھے، انہیں مختصراً صورتحال سے آگاہ کر کے ریسٹ ہاؤس میں اپنی موجودگی کا بتا کر فون بند کر دیا۔ شام ہو چکی تھی۔ جبکہ بارش رکنے کے قطعی آثار نہ تھے۔ لگتا تھا جیسے انہیں رات یہیں گزارنا پڑے گی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر اسوہ کی جانب آگیا۔ جو دوپٹے سے بے نیاز خوبصورت جدید تراش خراش والے لباس میں خوب جچ رہی تھی۔ چادر بستر پر پھیلی ہوئی تھی۔ ہاتھوں کو مسلتی وہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ سالک نے آگے بڑھ کر ہیٹر آن کیا پھر اس کی طرف آگیا۔

''اسوہ......'' اس کے سامنے بستر پر بیٹھا تھا۔ وہ صرف چند سیکنڈ دیکھ سکی۔ سالک کی نظروں کی چمک بے تحاشا تھی۔ جو اس کے لئے حیران کن ضرور تھی مگر ناقابل فہم نہیں تھی۔

''جی......'' وہ صرف یہی کہہ سکی تھی۔ سالک نے اس کے کپکپاتے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے۔ ٹھنڈے یخ ہاتھ تھے۔ وہ نرم ہتھیلیوں کو اپنے ہاتھوں سے رگڑتے حرارت پہنچانے لگا تھا۔

''اگر میں تم سے کہوں کہ میں نے تم سے کبھی نفرت کی ہی نہیں، صرف محبت کی ہے تو تمہارا کیا جواب ہوگا۔'' کتنا غیر متوقع سوال تھا۔ وہ شاکڈ سی دیکھتی رہ گئی۔

''آ...... آ...... آپ......'' وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ ''ہاں اسوہ یہ سچ ہے۔ میں نے تمہیں کبھی ناپسند نہیں کیا۔ میرے اعتراضات صرف اس حد تک تھے کہ میں تمہیں اپنے آئیڈیل میں ڈھلا دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے تم سے کبھی بھی نفرت نہیں کی۔ صرف محبت کی۔ تب سے جب ہمارا نکاح ہوا تھا۔ اظہار کرنا میری شخصیت کا حصہ نہیں تھا۔ جو بھی کچھ ہو گیا دانستہ یا نادانستہ نہ اس میں میرا قصور نہ تمہارا۔ مگر سزا ہم دونوں نے پائی ہے۔'' اس کے محبت سے لبریز لہجے میں اس اقرار محبت پر اسوہ کی آنکھیں بہنے لگی تھیں۔

''ایم سوری...... رئیلی سوری...... میں نے جان بوجھ کر کبھی بھی تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہی۔ نائلہ والے معاملے پر بھی میں صرف یہی کہوں گا کہ جو بھی کچھ کیا محبت کی انتہا تھی میری نفرت کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ تو حالات معاملے کو کچھ کا کچھ بنا گئے۔'' وہ ایک تسلسل سے رونے لگی تھی۔ سالک نے اپنی انگلیوں سے اس کے تمام آنسو چن لئے۔

''کاش تم اپنے دل کی غلط فہمیوں کو پہلے بیان کر دیتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔'' اس نے کہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ کھینچ کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا گئی۔

''میں نے چچا جان اور چچی جانی سے بھی بات کر لی ہے۔ ہم سب ہی شرمندہ ہیں۔ کیا تم اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ نہیں کرو گی۔ ہمیں معاف نہیں کرو گی۔'' وہ اسی طرح نادم سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ اسوہ نے اپنے ہاتھ ہٹائے، پھر نفی میں سر ہلایا۔

''میں کسی سے بھی ناراض نہیں ہوں۔ آپ سے بھی نہیں۔ امی اور بابا جانی سے بھی نہیں۔''

''تو پھر......''

''اگر آپ مجھے ناپسند کرتے تھے تو وہ لڑکی کون تھی جسے آپ پسند کرتے تھے۔'' کچھ دیر بعد اس نے پوچھا تو حیران ہوا پھر

ہنس دیا۔ اسوہ سر جھکا گئی۔ وہ ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

"کوئی بھی نہیں تھی۔ جس لڑکی کے بارے میں تم مشکوک ہو وہ میری کلاس فیلو اور دوست کی سسٹر تھی اور کچھ بھی نہیں۔ بہت پرانی بات ہے تمہیں ابھی تک یاد ہے۔" اب لہجہ نادم نہیں تھا شگفتگی لئے ہوئے تھا۔ وہ چپ رہی۔

"ایک بات کہوں...... مجھ پر یہ نکاح کے بعد انکشاف ہوا تھا کہ میں در پردہ تمہیں ہی پسند کرتا تھا۔" اپنے مزاج کے برعکس آج وہ مسکراتے ہوئے اسے چھیڑ رہا تھا۔ اسوہ نے اپنا چہرہ صاف کیا۔

"تم بہت اچھی ہو اسوہ، میں نے کبھی بھی تمہیں چھوڑنے کا نہیں سوچا تب بھی نہیں جب میں تمہارے بارے میں مشکوک ہوا تھا اب بھی نہیں۔ میں تو صرف تمہاری وجہ سے......"

"اسوہ...... ہم دونوں اتنا عرصہ ایک دوسرے سے بھاگتے رہے ہیں۔ اب مجھے لگتا ہے جیسے میں تھک گیا ہوں۔ میں اب رکنا چاہتا ہوں۔ ایک مرکز پر، یہیں ہمیشہ کے لئے، بی بی جان کی بھی خواہش ہے۔ اگر تم چاہو تو......" وہ جھجکتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ گیا تھا۔

"بارش کب ختم ہوگی......؟" اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بھی وہ انجان کا مظاہرہ کر رہی تھی جبکہ چہرہ کافی حد تک بلش ہو گیا تھا۔ وہ اس معنی خیز "تو" سے بچنا چاہتی تھی۔

"شاید آج بارش کا بھی برسنے کا موڈ ہے۔ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔"

"مجھے بہت خوف آتا ہے ایسی طوفانی بارش سے۔" وہ اپنا ڈر بیان کر رہی تھی۔

"اور مجھے تو ایسی بارش میں بھیگنے میں لطف آتا ہے۔" سالک نے کھڑکی کے شیشے کے پار برستی موسلا دھار بارش کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسوہ......! چلو آؤ بارش میں بھیگتے ہیں۔" اچانک اس نے کہا تو وہ ایک دم پیچھے ہٹی تھی۔

"نہیں...... مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ کبھی نہیں۔ اتنی سردی ہے۔" وہ ابھی سے کپکپانے لگی تھی۔ سالک مسکرا دیا پھر اس کا بازو تھام کر اسے قریب کر لیا۔

"پاگل ہو تم بھی...... میں مذاق کر رہا تھا۔ مگر میری موجودگی میں تمہیں ڈر نہیں لگے گا۔ بی لیوی......"

گمبھیر لہجے میں کہتے اس نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ اسوہ کا کپکپاتا وجود لرز اٹھا مگر اب اس میں خوف کا عنصر نہیں بلکہ محافظت کا احساس غالب تھا۔

"ہم پچھلی سب باتوں کو بھلا کر ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔ اس وعدے کے ساتھ کہ کوئی بھی بات کوئی بھی غلط فہمی دل میں نہیں رکھیں گے۔ ورنہ یہ چھوٹی موٹی باتیں بڑھ کر بہت بڑی ہو جائیں گی اور "Poison Tree" کا کردار ادا کریں گی۔" اس کے کان میں سرگوشی کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اسوہ کی آنکھوں سے چند آنسو بہے تھے اور سالک کے گریبان میں جذب ہو گئے تھے۔

سالک نے جھک کر ایک استحقاق بھری مہر اس کی پیشانی پر ثبت کی تھی اسوہ اس کی پناہ میں مزید سمٹ گئی تھی۔ باہر بارش ابھی تیز تھی مگر اندر وہ پرانے دنوں کو بھلائے نئی زندگی کی شروعات کر رہے تھے۔ دونوں ہی پرسکون اور خوش تھے۔

اور زندگی بھی انہیں دیکھ کر مسکرائی تھی۔

"مسافر لوٹ آئے ہیں۔" ہوائیں کھڑکی کے شیشوں پر دستک دیتے گنگنا رہی تھیں۔ سالک اس کے کان میں سرگوشی کے سے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا اور اسوہ سر ہلائے مسکرائے جا رہی تھی۔ کہ یہی زندگی تھی اور یہی محبت تھی۔

ہم دل سے ہارے ہیں

وہ سوئی ہوئی تھی۔۔ بہت گہری نیند میں تھی جب ایک دم کمرے کا دروازہ تھپتھپانے کی آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ ادھ کھلی آنکھوں سے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ دروازے پر دستک خواب میں نہیں حقیقت تھی۔

"کون۔۔؟" کمرے کی مدہم روشنی میں دوپٹے کی تلاش میں ناکام ہو کر وہ دروازے کی طرف چلی آئی تھی۔ باہر سے فوز ان کے رونے کی آواز کانوں میں گونجی تو اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

"آ۔۔آ۔۔آپ۔۔" شہباز حیدر کو سامنے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ششدر رہ گئی تھی۔ وہ فوزان کو اٹھائے ہوئے تھے، جو مسلسل رو رہا تھا۔ شہباز حیدر نے لب بھینچے ہوئے تھے۔

"فوزی میری جان۔۔" وہ فوراً آگے بڑھی تھی۔

"کیا ہوا ہے۔۔ یہ رو کیوں رہا ہے؟" شہباز حیدر کے تاثرات نظرانداز کیے پریشانی سے گویا تھی۔ شہباز حیدر نے سلگتی نظروں سے عیشہ واجد کو دیکھا۔

"ماما پاس جانا ہے۔۔" اسے دیکھ کر وہ مزید بلکا۔

"سنبھالو اسے۔۔" دو گھنٹوں سے اس نے میرا سر کھایا ہوا ہے۔۔" ان کو مزید بلک کر عیشہ کی طرف بازو بڑھاتے دیکھ کر ان کا پارہ ایک دم ہائی ہوا تھا۔ عیشہ واجد نے بغور شہباز حیدر کو دیکھا، کمرے کی ہلکی روشنی سیدھی شہباز حیدر کی چہرے کے تاثرات کو آشکار کر رہی تھی۔ انتہائی بیزاری کوفت، ناگواری کے تاثرات صاف پڑھے جا سکتے تھے، انہوں نے فوراً ان کو اس کی طرف بڑھایا تو اس نے بھی جلدی سے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"میری جان، میرا فوزی۔۔ میرے پاس آنا تھا۔۔" اسے پچکارتے خاموش کرواتے اس نے نیچے کھڑا کیا تھا، پھر اس کا سر اپنے ساتھ لگا لیا تھا، اس کے پاس آتے ہی فوراً خاموش ہو گیا تھا۔

"یہ رو کیوں رہا تھا؟" شہباز حیدر واپس پلٹے تھے، جب اس نے پوچھا تو اس نے چہرا موڑ کے اسے دیکھا۔ ہلکی مدھم روشنی میں کھلے بالوں، بغیر دوپٹے کے ڈھیلے ڈھالے سراپے میں نمایاں ہوتا اس کا سفید دودھیا چہرہ بالوں کی لٹوں میں ایک لمحے کو انہیں، اس پر کسی گزرے لمحے کا گمان ہوا تھا، اس وقت وہ ان کو بالکل وریشہ کی طرح لگی تھی۔ وہی ہونٹوں کا کٹیلا پن، لمبی پلکوں کی جھالر تلے چھپی آنکھوں کی جھیل سے گہرائی میں موجزن طوفان دودھیا رخساروں کی چمکتی چاندنی میں ہلکورے لیتا احساس، پشت پر بکھرا گھنے بالوں کا آبشار ایک لمحے کو انہیں بھی کسی طوفان سے آشنا کر گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ سنبھل کر نظریں چرا گئے تھے۔ وہ عیشہ واجد تھی، وریشہ نہیں تھی۔

"تمہارے پاس آنے کی ضد کر رہا تھا۔۔" ہونٹوں کو دانتوں کو تلے سختی سے دبا کر انہوں نے اپنے کسی احساس سے نظر چرا

کر کہا تو وہ تڑپ اٹھی۔۔ کتنا ظلم کر رہے تھے بچے کے ساتھ ساتھ اس پر بھی۔

''تو لے آتے۔۔ آپ اسے مجھ سے کیوں دور کر رہے ہیں۔۔ ایسی بھی کیا خطا ہو گئی ہے مجھ سے کہ آپ میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں۔'' کئی دنوں کا شکوہ اس کے لبوں پر مچل گیا۔ کچھ خفگی، کچھ ناراضگی اور بے پناہ استحقاق لیے۔۔ وہ کھڑی کہ شہباز حیدر نے چونک کر انتہائی تعجب سے اپنے سامنے کھڑی اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا جو اس کی زندگی کو کسی نئے احساس سے آشنا کرنے کے درپے تھی۔ اس کی آنکھوں کی خفگی میں صاف دکھائی دیتا جذبہ اور لہجے کی خفگی میں ڈولتا ابھرتا ''استحقاق'' کا احساس انہیں ساکن کر گیا۔

''میرے کس عمل سے اس لڑکی کو اتنی ہمت ملی ہے کہ آج میرے سامنے کھڑی ہے۔۔'' وہ حیران تھے۔ ابھی تک وہ اس سے پہلو تہی کی روش اختیار کر رہے تھے مگر اب احساس ہو رہا تھا، ان کی یہ روش اس لڑکی کو اور بھی شہ دینے لگی ہے۔ یہ لڑکی ان کی راہ میں چٹان کی طرح ان کو شکست دینے کو کھڑی ہے اور یہ فوزان کی حد سے زیادہ انچ منٹ۔۔ وہ اس وقت پر پچھتائے جب فوزان کی پیدائش کے بعد اپنے غم میں نڈھال انہوں نے سارے اختیارات عیشہ واجد کو دے دیے تھے اور پھر اس لڑکی کو اتنی ہمت ملی کہ آج وہ ان کے سامنے کھڑی یہ پوچھ رہی تھی۔ وہ بغیر جواب دیے پلٹنے لگے جب پیچھے سے وہ کہنے لگی۔

''مجھے آپ کے رویے کی سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔۔ میرا کوئی قصور ہے تو مجھے بتا دیں۔۔ مجھے اور فوزی کو اس طرح تکلیف دے کر آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ رک گئی تھی۔ فوزان کو بستر پر لیٹنے کا اشارہ کر کے کرسی پر پڑی چادر اوڑھ کر وہ اب کمرے سے نکل کر شہباز حیدر کے سامنے آ رکی تھی۔

''چلیں میں آپ کا یہ رویہ نظر انداز کرتی جا رہی ہوں۔۔ مگر کب تک۔۔ اب تو گھر والے بھی متوجہ ہونے لگے ہیں۔۔ دادی جان بھی کئی بار پوچھ چکی ہیں کہ فوزی میری بجائے اب آپ کے پاس کیوں ہوتا ہے۔۔ یا میں اکتا گئی ہوں اس کی ذمہ داری سے۔۔''

شہباز حیدر کا خیال تھا کہ اس کے اس ردعمل سے وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے گی مگر اس وقت وہ ان کے سامنے کھڑی جس انداز میں باز پرس کر رہی تھی، ان کا جی چاہا کہ وہ کھینچ کر طمانچہ اس کے منہ پر رسید کر دیں۔ یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔۔ ان کے اندر رکا آتش فشاں ایک دم پھٹا تھا۔

''تم بچی نہیں ہو کہ میرے ان رویوں کو سمجھ نہ پاؤ۔۔ یہ سوال مجھ سے نہیں اپنے آپ سے کرو تو بہتر ہے۔'' وہ پلٹے تھے پھر اسے ہکا بکا دیکھ کر رک گئے۔

''اوہ ہاں! اپنا موازنہ نہ کرتے ہوئے یہ مت بھولنا کہ رشتے میں تم میری بھتیجی ہی نہیں میں تمہارا پھوپھا بھی لگتا ہوں۔۔ اور ہمارے درمیان تیرہ سالوں کا ایج ڈیفرنس ہے۔۔ پاگل احمق لڑکی۔۔'' وہ دانت پیستے اکھا جانے والی نظروں سے گھورتے اسے اسی جگہ پر ساکن کر کے آگے بڑھ گئے تھے۔ وہ حیرت سے گنگ ان کی چوڑی پشت کو دیکھے گئی، ہاتھ پاؤں سن ہو گئے تھے۔

''تو۔۔'' وہ لڑکھڑائی۔ ''تو اسی لیے یہ میرے ساتھ یہ سلوک کر رہے تھے۔ مگر میرے کس رویے سے انہیں یہ محسوس ہوا کہ میں۔۔ میں۔۔''

''ماما آ جائیں۔۔ نیند آئی ہے۔۔'' وہ نجانے کیا کیا سوچتی فوزان کی آواز سے ہوش کی دنیا میں گھسیٹ لائی گئی۔ اپنا وجود کانپتا محسوس ہوا، وہ لرزتی ٹانگوں سمیت دروازہ بند کر کے بستر پر آئی تھی۔ فوزان بستر پر لیٹا ہوا تھا، وہ لیٹی تو اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ عیشہ واجد نے اک بے چارگی سے اسے دیکھا، اس بچے نے نجانے اس کو کن کن احساسات سے دوچار کیا تھا، اس کے اندر نجانے کیسے کیسے طوفان برپا کیے تھے۔ اس کے جذبوں کو کیسی ہوا دی تھی۔ کیسے پھول کھلائے تھے۔۔ عیشہ کی آنکھوں میں نمی

بھری، اس کی پیشانی چومتے، بالوں میں انگلیاں پھیرتے اسے بغور دیکھا۔ اس اک نظر نے اس کے وجود میں اک طوفان برپا کر دیا۔ دل کی دھڑکن کا کوئی انداز ہ نہ تھا، عیشہ واجد کو ایک پل کو یہ گمان گزرا کہ اس کے پہلو میں فوزان نہیں بلکہ شہباز حیدر ہے۔۔ اسی خیال نے اس کے وجود کے انگ انگ میں کپکپی دوڑا دی تھی۔

''مجھے آپ کے بغیر نیند نہیں آتی۔۔ پاپا نے بہت ڈانٹا تھا۔۔ تھپڑ بھی مارا۔۔ کہتے تھے کہ میں ان پاس سویا کروں۔۔ آپ گندی ہیں۔۔''

''بچے تو معصوم ہوتے ہیں، جو سنتے ہیں بلاوجہ سوچے سمجھے کہہ دیتے ہیں، وہ منہ بسور کر بتا رہا تھا۔ وہ بغیر پلکیں جھپکائے حیرت و دکھ سے دیکھے گئی۔

''یہ پاپا نے کہا تھا؟'' اس نے ''گندی'' کے لفظ پر بے یقینی سے پوچھا۔ اس نے سر اثبات سے ہلایا تو وہ بے بسی سے ہونٹ کچل کر رہ گئی۔

''پاپا کہہ رہے تھے آپ میری ماما نہیں ہیں۔۔ آپی ہیں۔۔ میں آپ کو آپی کہا کروں۔۔'' بچے اس کائنات کا سب سے بڑا سچ ہوتے ہیں، اپنی معصومیت سے وہ مزید بتا رہا تھا۔

''پاپا بھی کہتے ہیں مجھے آپ کے پاس آنے کے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔۔ آپ سے دور رہا کروں۔۔ پاپا کے پاس سویا کروں، ان کے ہاتھ سے کھانا کھایا کروں۔۔ وہ مجھے ہوم ورک بھی کروایا کریں گے۔۔'' وہ اور بھی بہت کچھ بتا رہا تھا، عیشہ واجد نے خاموشی سے اس کی پیشانی پر اپنی ٹھوڑی ٹکا کر اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

''اچھا نہیں کر رہے شہباز حیدر آپ۔۔ چھوٹے سے بچے کے دماغ میں آپ اس طرح کی باتیں بھر کر نجانے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔۔ فوزان سے میری یہ محبت بے غرض اور بے لوث ہے، یہ فوزان وجود کا احساس ہے کہ آج میرے دل میں وہ سادے جذبے پنپ رہے ہیں جو کبھی میرے اور شاید اب آپ کے نزدیک باعث گناہ ہیں۔۔'' فوزان کے بالوں میں خاموشی سے انگلیاں پھیر رہی تھی۔

''ماما۔۔'' آنکھیں بند کرتے اس نے پکارا تو اس نے اس کو دیکھا۔

''ہوں۔۔''

''ماما۔۔ آپ بابا کے پاس کمرے میں کیوں نہیں رہتیں۔۔ عدیل کی ماما چاچو کے ساتھ رہتی ہیں، پھر آپ یہاں نیچے کیوں رہتی ہیں۔۔ مجھے نہیں پتہ بس آپ اور پاپا اکٹھے رہا کریں۔۔'' وہ انتہائی بھولپن سے اس کے وجود میں آگ لگا گیا تھا، وہ بے یقینی سے دیکھے گئی۔

''چپ۔۔'' اس نے سختی سے اس کے منہ پر انگلی رکھ دی۔

''خبردار تم نے آئندہ ایسی بات کی تو۔ تمہارے بابا تو میری جان نکال دیں گے۔۔'' ایک دم خوف سے ڈر کر اس نے فوزان کو خود سے چپٹا لیا، دل کی دھڑکن حد سے سوا تھی۔

''مگر آج میں نے پاپا سے کہا تھا وہ آپ کو اپنے کمرے میں لے کر آئیں۔۔ انہوں نے اتنی زور سے تھپڑ مارا تھا۔۔ بس مجھے نہیں پتا آپ پاپا کے ساتھ رہیں۔۔ پھر آپ دونوں کے ساتھ سویا کروں گا۔۔ پاپا کے ساتھ اکیلے سوتے ڈر لگتا ہے۔۔'' وہ منہ بسورتے رو رہا تھا، عیشہ نے دہل کر اس کی معصوم صورت دیکھی۔ ہر نقش شہباز حیدر کا چرایا ہوا تھا۔

''تم نے اپنے پاپا سے یہ سب کہا تھا۔۔؟'' اس نے بے یقینی سے دہرایا تو اس نے گردن زور سے ہلائی۔

''پاپا نے سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔۔ وہ کہتے ہیں میری ماما ''اللہ جی'' کے پاس چلی گئی ہیں، آپ صرف میری آپی ہیں۔۔'' وہ دل مسوس کر رہ گئی، بھلا چھوٹے بچے سے یہ باتیں کرنے والی تھیں۔ شہباز حیدر کو ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ ان کے اس طرز عمل سے ان کے

بیٹے کی شخصیت میں کتنا بڑا خلا پیدا ہو سکتا ہے۔ ماں سے محرومی کا خلا۔۔ جو اس نے کبھی ہونے نہیں دیا۔

''ماما۔۔ پاپا سچ کہتے ہیں۔۔ واقعی آپ میری ماما نہیں ہیں۔۔؟'' وہ پوچھ رہا تھا، عیشہ کا دل کانپ کر رہ گیا، اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کتنی تلخ حقیقت تھی مگر سچ تھی۔ وہ جسے ماما کہتا ہے، وہ اس کی ماں نہ تھی، جبکہ دریشہ اس کی سگی ماں تھی، جو اس کو جنم دینے کا سبب بنی تھی مگر پالا تو اس نے تھا۔ پیدا ہوتے ہی وہ اس کی ذمہ داری بن گیا تھا، پھر اتنے سالوں تک اس کی گود اس کی ممتا کی تسکین بنتی رہی تھی، اس نے اسے کبھی ماں کی کمی محسوس ہی نہیں دی تھی اور وہی دور تھا، جب فوزان کی سنبھالتے اسے پروان چڑھاتے اسکے اندر کے الہڑ، کم عمر جذبوں کی ایک نام ملا تھا۔ شہباز حیدر کا نام۔۔۔ وہ خود ہی ڈرنے لگی تھی، اپنی انہونی خواہشوں سے منہ چھپانے لگی تھی، اور پھر جب فوزان نے بولنا شروع کیا تھا، تو اس کی زبان سے لفظ ''ماما'' نکلا تھا، اور نہال ہو گئی تھی، کم عمری کے جذبے، کم عمری کی محبت اور بھرپور محبت کا احساس نجانے کیوں اسے لگنے لگا کہ وہ واقعی فوزان کی ماما ہے۔ شروع میں سب ہی چونکے تھے فوزان کے منہ سے یہ نام کر مگر وہ بچہ تھا، اسے کوئی کچھ بھی نہ بوجھ۔۔ سب کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ جب رشتوں کو جاننے اور سمجھنے لگے گا تو خود بخود وہ اس نام کو ترک کر دے گا۔ اور پھر وقت گزرتا چلا گیا، اور اس کی ماما کہنے کی عادت پختہ ہوتی چلی گئی۔ کسی کو بھی اسے ٹوکنے یا اصل حقیقت بتانے کا دھیان نہ رہا۔ دریشہ کے بعد شہباز حیدر نے اپنے آپ کو کاروباری جھمیلوں میں اس قدر گم کر لیا کہ بچے کی طرف سے بھی غافل ہوتا چلا گیا، دادا، دادی، چچی اور سب سے بڑھ کر عیشہ اس کا خیال رکھنے والی تھیں، وہ مطمئن ولا پرواہ ہوتا چلا گیا۔ کالج سے آنے کے بعد عیشہ کی زندگی کا محور فوزان ہوتا تھا۔ اسکے چھوٹے چھوٹے کام وہ بہت محبت سے کرتی تھی، وہ شروع سے ہی اس کے پاس سوتا تھا، اور پھر یہ عادت اتنی پختہ ہوئی کہ کسی اور کے پاس ایک رات بھی نہیں سو پاتا تھا۔ یہ تو کچھ دنوں پہلے کی بات تھی بات شاید ایک ماہ سے یہ سب چل رہا تھا، غیر محسوس طریقے سے شہباز حیدر فوزان کو اس سے دور کرنے کی کوشش میں تھے، وہ جو رات گئے گھر لوٹتے، اب سرِ شام ہی گھر میں ہوتے تھے۔ فوزان کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے، کبھی باہر گھومنے لے جاتے اور کبھی کھانے کی چیز کا لالچ دے کر۔۔۔ وہ بچہ تھا، بہل بھی گیا تھا، مگر کب تک۔ عیشہ خاموشی سے صرف دیکھ رہی تھی بلکہ اچھی طرح محسوس بھی کر رہی تھی، وہ شہباز حیدر سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، ایک دو دفعہ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی بھی تو شہباز حیدر کا رویہ اس کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز، روکھا پھیکا اور سرد ہو جاتا۔ وہ اپنے مسلسل اگنور کرنے تھے عیشہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی، صرف چپ تھی وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اسے کچھ سمجھ آ رہی تھی، وہ سارا دن ترس جاتی تھی فوزان کیلئے۔ اس کی پیاری پیاری باتوں، معصوم شرارتوں کیلئے وہ صرف رات کو اس کے پاس آتا تھا، وہ بھی صرف سونے کیلئے اور آج رات وہ اس کے پاس نہیں آیا تھا، آج شہباز حیدر فوزان کو پارک میں لے کر گئے تھے، رات گئے لوٹے تھے، وہ انتظار کرتی رہی تھی کہ گھر آنے کے بعد وہ فوزان کو اس کے پاس چھوڑ جائیں گے مگر آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ کتنی دکھی ہوئی تھی، فوزان کو اپنے ساتھ چمٹا کر سونے کی عادت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اس کے بغیر سونے کا تصور ہی سوہان روح تھا مگر اب جب کہ وہ خود سونے پر مجبور کر چکی تھی بلکہ سو بھی چکی تھی تو شہباز حیدر فوزان کو اس کے پاس چھوڑ گئے تھے مگر ان کا رویہ ان کی باتیں اور اب فوزان کی باتیں۔۔ وہ کٹ کر رہ گئی تھی۔ اس نے ہونٹ کاٹتے اسے دیکھا، وہ اس کے سینے پر سر رکھے گہری نیند میں تھا، وہ خاموشی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔

''اچھا نہیں کر رہے آپ میرے ساتھ۔۔ میں نے تو آپ سے کچھ بھی نہیں مانگا اور نہ ہی مانگوں گی۔۔ صرف خاموشی محبت ہی تو آپ سے کر رہی تھی۔۔ اور اب آپ اس کا حق بھی مجھ سے چھین رہے ہیں۔۔ یہ فوزی۔۔'' اس نے بھرائی آنکھوں سے معصوم صورت کو دیکھا۔

''اس کے بغیر مر جاؤں گی۔۔ میں نے بن ماں کے زندگی گزاری ہے۔۔ مجھے پتا ہے جب ماں کا سایہ میسر نہ آئے تو زندگی میں کیسا خلا بھر آتا ہے، میں نے تو اس خیال سے اس بن ماں کے بچے کو اپنا بنایا تھا لیکن کیا پتہ تھا کہ یہ دل ہی بغاوت کر جائے

گا۔ اس معصوم صورت نے میرے اندر کے خلا کو آپ کا عکس دیا تھا، اور اب جبکہ میں اس مقام پر آ چکی ہوں جہاں واپس پلٹنا میرے لیے موت ہے تو آپ کا طرزِ عمل میری جان نکالنے کو کافی ہے۔۔ آپ کے تیور دیکھتے ہوئے اتنے دن سے اپنے آپ کو میں سنبھال رہی ہوں۔۔ مگر اب نہیں۔۔ بات کھلی ہے تو ہو نہی سہی۔۔ اچھا ہے نا، ان کہے ہی آپ میرے جذبوں سے آگہی پا گئے ہیں۔۔ ورنہ میں شاید ساری عمر تشنگی رہتی، اور آپ کو خبر ہی نہ ہو پاتی۔'' آنسو اس کے رخساروں پر تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ایک کر کے گرتے جا رہے تھے، اور وہ گیلی لکڑی کی مانند اندر ہی اندر سلگنے لگی تھی۔

اس نے بھی اظہار کی شدت میں چپ سادھے رکھی
میں نے بھی کچھ کہنے کی خواہش میں بات چھپا دی
اس دشت میں جلتے جلتے جیون دھول ہوئے ہیں
اس نے ایک دیوار اٹھا دی، میں نے ایک گرا دی

✠ ✠ ✠

ڈوبی ہوئی خلوص میں حسن کی نگاہ تھی
مجھ کو اس کی چاہ تھی اور بے پناہ تھی
فراز کس کو علم ہے اس چاند کے بغیر
جو چودھویں کی رات تھی کیسی سیاہ تھی

''اس کے گھر میں دو خاندان آباد تھے، ایک عبداللہ صاحب کا اور دوسرا حیدر صاحب کا۔ عبداللہ صاحب کے دو بچے تھے بیٹا واجد عبداللہ اور بیٹی دریشہ عبداللہ جو کہ واجد سے کئی سال بعد بڑی منتوں مرادوں سے پیدا ہوئی تھی، حیدر صاحب کے دو بیٹے شہباز حیدر اور قیوم حیدر تھے۔ تین بیٹیاں فارحہ، مہوش، اور سونیا۔۔ تینوں بڑی تھیں، پھر شہباز تھے، شہباز اور دریشہ ہم عمر تھے، جبکہ قیوم سب سے چھوٹا تھا۔ واجد عبداللہ کی شادی سگی خالہ زاد سے ہوئی تھی مگر چند سالوں بعد گردوں کی تکلیف کی وجہ سے انتقال کر گئیں، اس وقت عیشہ چار سال کی تھی، اس دوران حیدر صاحب بڑی تینوں بیٹیوں کی شادی کر چکے تھے، اب کی بار عبداللہ صاحب نے چار سال بعد دوبارہ واجد کی صاحب کا گھر بسایا تھا، عقیلہ ان کے دوست کی بیٹی تھی، وہ جوائنٹ فیملی سسٹم کی عادی نہ تھیں، دو بچوں کی پیدائش تک صبر کر کے انہوں نے یہ سب برداشت کیا تھا، واجد صاحب اس پر راضی نہ تھے مگر بیوی اور باپ کے سامنے ایک نہ چل سکی عیشہ اس وقت کافی سمجھدار تھی، پھر ماں سے محرومی، سوتیلی ماں کے ساتھ نے اسے وقت سے پہلے ہی کافی میچور کر دیا تھا، وہ باپ کے ساتھ علیحدہ گھر میں نہیں گئی تھی، یہیں رہ گئی تھی۔ عیشہ کو دریشہ سے بہت محبت تھی اور یہی حال دریشہ کا تھا، عمروں کے فرق کے باوجود دونوں دوستوں کی طرح ہوتی تھیں، دریشہ اور شہباز دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، خاندان کی بات تھی، سو دونوں کی بات بھی طے ہو گئی تھی، عیشہ آٹھویں کلاس میں تھی جب دریشہ کی شہباز سے شادی ہوئی تھی، مگر بدقسمتی سے دریشہ شادی کے تین سال بعد ہی فوزان کی پیدائش پر انتقال کر گئی تھیں، پورے خاندان پر ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا، دریشہ کی جواں مرگ کا صدمہ ہی ایسا جان لیوا تھا کہ کتنے ماہ تک کوئی بھی اپنے آپ کو نہ سنبھال پایا تھا، شہباز حیدر تو ایک طرف باقی سب بھی نڈھال تھے۔ عیشہ جو دریشہ سے نہ صرف شکل و صورت میں مشابہت رکھتی تھی بلکہ زیادہ تر دریشہ کے زیر اثر رہتے ہوئے اس کے اندر اس جیسی عادات و اطوار پیدا ہو گئی تھیں۔ اس نے بہت خاموشی سے انتہائی خلوص و توجہ سے فوزان کو سنبھال لیا تھا۔ کالج سے آنے کے بعد وہ سارا وقت فوزان کے چھوٹے موٹے کاموں میں صرف کر دیتی تھی، وہ ماں سے محرومی کے احساس سے واقف تھی، جس طرح اس کی ماں کے انتقال کے بعد داری، پھوپھی

نے سنبھال لیا تھا، اسی طرح فوزان کو سمیٹ لیا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سبھی سنبھل گئے تھے، فوزان عیشہ سے خاصے لیا اٹیچ ہو چکا تھا، کسی کو بھی احساس نہ تھا کہ آنے والے وقت میں یہ اٹیچمنٹ کوئی اور رنگ بھی اختیار کر سکتی تھی، شہباز حیدر فوزان کو بھی ذمہ داری سمجھ کر لاپرواہوتے چلے گئے۔ اور یہی وہ تھا جب اس کے اندر نئے نئے جذبات انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے چلے گئے تھے۔ اس نے خود کو روکنے کی، باز رکھنے کی کوشش کی مگر دل ناداں کب تک سمجھتا ہے اور پھر اس نے دل کے سامنے ہار مان لی۔ بی ایس سی کے بعد بی ایس سی اور اب وہ ایم ایس سی کے لیے یونیورسٹی ایڈمیشن لے چکی تھی، یونیورسٹی میں اس کا آخری سال تھا، اپنی پڑھائی میں بڑی سنجیدہ بھی اور کسی کے سامنے دل کا درد آشکار نہیں ہونے دیا تھا مگر گزشتہ ایک ماہ سے شہباز حیدر کو نجانے کیسے اس کے جذبوں سے آگاہی ہو گئی تھی، اور پھر انہوں نے حفاظتی اقدامات بھی کرنے شروع کر دیے تھے رات سوچنے کے بعد اس نے شہباز حیدر سے آر یا پار کا فیصلہ کیا تھا۔ شہباز حیدر کا فوزان کے سلسلے میں یہ رویہ اس کے لیے برداشت کرنا ناممکن تھا صبح اس نے یونیورسٹی سے آف کرنے کا سوچا تھا۔ قیوم چچا کی بیگم مہوش کالج میں لیکچرار تھیں، ان کے دونوں بچے اور فوزان سب اکٹھے ہی صبح صبح ان کے ساتھ سکول کے لیے نکلتے تھے، واپسی پر عبداللہ صاحب بچوں کو لے کر آتے تھے، فوزان عدیل اور مشاء ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے۔ عبداللہ صاحب اور حیدر صاحب لکڑی کا کاروبار کرتے تھے لکڑی خرید کر آگے فروخت کرنا ان کا کام تھا، جو رفتہ رفتہ اب کافی وسیع ہو گیا تھا، واجد کے علیحدہ ہونے پر انہوں نے اس کے حصے کا کاروبار بھی علیحدہ کر دیا تھا، اب حیدر صاحب اور عبداللہ صاحب کا سارا کام حیدر اور شہباز ہی چلا رہے تھے، وقت کے ساتھ ساتھ گھر میں خوشحالی آ چکی تھی، قیوم انجینئر تھے، واحد صاحب کے اپنی اہلیہ بیوی سے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی وہ ہر ماہ دو دن عیشہ سے ملنے آتے رہتے تھے۔ عیشہ اپنے کمرے کو سمیٹ کر کچن میں آئی تو چچی جان چیزیں سمیٹ رہی تھیں، اسے آج اس حلیے میں دیکھ کر رکیں۔

"تم یونیورسٹی نہیں گئی۔۔؟"

"نہیں۔۔" وہ کھانے پینے کو فریج کا جائزہ لینے لگ گئی۔

"بیٹھو میں پراٹھا بنا دیتی ہوں۔" اسے چولہا جلاتے دیکھ کر انہوں نے ٹوک دیا۔

"نہیں رہنے دیں۔۔ صرف سلائس لوں گی۔۔ دادا جان اور دادی جان نے ناشتہ کر لیا ہے۔۔؟"

"ہوں۔۔ سب نے ہی کر لیا ہے، صرف شہباز رہتا ہے، اس کیلئے پراٹھے تیار کیے ہے۔۔" انہوں نے ٹیبل پر ڈھکی ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔

"لائیں میں دے دیتی ہوں، تم شہباز کو یہ ٹرے دے آؤ۔۔" انہوں نے اسے پیچھے ہٹا دیا تھا شہباز حیدر کے نام پر اس کا دل دھڑکا تھا تاہم وہ خود کو سنبھالتی دوپٹہ درست کرتے ٹرے اٹھا کر اوپر چلی آئی۔ دروازہ نیم وا تھا، دونوں ہاتھوں سے ٹرے تھامے وہ بغیر دستک دیے اندر داخل ہو گئی تھی، وہ آئینے کے سامنے کھڑے بال سلجھا رہے تھے، گہرے کوٹ سوٹ میں اپنی ڈیسنٹ پرسنالٹی سمیت بہت بارعب اور پروقار لگ رہے تھے۔ ان کی شخصیت کی وجاہت دیکھنے کے قابل تھی شاید اسی لیے وہ اپنے جذبوں پر قابو نہ کر پائی تھی، آفس کی تیاری تھی، اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے رات کا واقعہ ذہن کی سطح پر ایک دم تازہ ہوا، غصے سے ٹیبل پر برش پٹخ دیا۔

"چھن چھن۔۔" پرفیوم کی شیشی نیچے گر کر ٹوٹی تھی، پورا کمرا Posion کی تیز خوشبو سے نہا گیا تھا، عیشہ ان کے تیور دیکھ کر دہل گئی، رات وہ جو آر یا پار کرنے کا فیصلہ کیا تھا، ساری ہمت دم توڑ گئی، مرے قدموں سے آگے بڑھ کر ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ ایک طرف کھڑی ہو کر انگلیاں چٹخانے لگی، سمجھ نہ آئی کہ اب کیا کرے۔۔ پلٹ جائے یا۔۔ شہباز حیدر نے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ وہ باہر نکلنے کو پلٹی تھی۔

"سنو۔۔" اس پکار پر اس کے قدم ٹھٹکے تھے، وہ پلٹی تھی، شہباز حیدر کے تیور دیکھ کر وہ مزید پزل ہوئی۔

"آئندہ میرے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دستک دے لیا کرنا۔۔ تم اچھی طرح جانتی ہو مجھے یہ بے تکلفی اچھی نہیں لگتی۔۔" انتہائی برہمی سے ٹوک دیا گیا تھا۔

"جی۔۔ اچھا۔۔" شکوہ کناں نظروں سے دیکھتے اس نے سعادت مندی سے سر جھکا لیا، وہ ان کی اس قدر پررعب باوقار پرسنالٹی کے سامنے خود کو خاصا بے بس محسوس کرتی تھی، ان کا رعب ہی ایسا تھا مگر دل کا کیا کرتی۔۔ وہ الٹے قدموں سے پلٹی تھی، ذرا سا سامنا ہونے سے ہی ٹانگیں لرزنے لگ گئی تھیں، اگر ساری زندگی۔۔ اس کا دل اسے اس طرز عمل پر احتجاج کرنے کو اکسانے لگ گیا تھا، دل و دماغ اس کے خوف کے سامنے ایک دم ڈٹ گئے تھے، نکلنے سے پہلے وہ پلٹی تھی۔

"وہ۔۔ وہ مجھے آپ سے۔۔ بہت ضروری بات کرنی ہے۔۔" وہ ہمت کر کے یہ الفاظ کہہ پائی تھی سر اٹھا کر ان کو دیکھا مگر۔۔ اف اللہ۔۔ ان کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے، اس نے بے اختیاری میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا، دل کی دھڑکن کا کچھ اندازہ ہی نہ تھا۔

"مگر مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔۔" انتہائی کرختگی سے انکار ہوا تھا، وہ ڈبڈبائی آنکھوں سمیت انہیں دیکھے گئی۔ کبھی یہ اس کے لیے مہربان ہوا کرتے تھے مگر اب۔۔

"مجھے فوزان کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔۔" اپنے رخسار پر بہہ جانے والے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کرتے اس نے خود کو مضبوط کیا، اس خیال سے کہ زیادہ سے زیادہ چیخ کر اپنا غصہ نکال لیں گے جان سے تو مارنے سے رہے۔

"فوزان میرا بیٹا ہے۔۔ اس کا اچھا برا میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔۔ اس سلسلے میں تم کو جو رعایت مل چکی ہے، اسکو غنیمت جانو تو بہتر ہے۔۔ ورنہ۔۔" اپنا بریف کیس کھول کر بستر پر بکھرے کاغذات چیک کر کے وہ اس میں رکھ رہے تھے، شہباز حیدر کے "ورنہ" پر عیشہ کا دل دھڑکنے لگا۔

"آپ کے اس طرز عمل سے اس کی شخصیت بجائے بننے کے، صرف بگڑے گی، اس کا ذہن دو حصوں میں بٹ رہا ہے، آپ کی بے نیازی اور توجہ اس کے اندر کئی سوال و جواب کے دروازے کھول رہے ہیں، مگر آپ کو کیا۔۔ آپ تو اسے صرف مجھ سے دور کرنا چاہتے ہیں اور بس۔۔"

"شٹ اپ۔۔" تمام خوف بالائے طاق رکھے اس نے کہا تو شہباز حیدر نے غصے سے ٹوک دیا۔ وہ ایک دم چپ کر گئی۔

"فوزان کا اچھا برا تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔۔ سمجھیں۔۔ بریف کیس سختی سے بند کر کے انہوں نے گھورا۔ اور تم کو کوئی حق نہیں کہ میرے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرو۔۔ فوزان کے حقوق ادا کرنے کو ابھی اس کا باپ زندہ ہے۔"

"غلط کہہ رہے ہیں آپ۔ فوزان کی پیدائش سے لے کر اب تک آپ نے کون سے حقوق نبھائے ہیں اس کے لیے۔۔ اور اب ایک ماہ سے آپ کو پتہ چل گیا ہے کہ فوزان آپ کا بیٹا ہے۔" تلخی نے عیشہ کی طرف سے بھی سر ابھارا تھا، بغیر کچھ سوچے سمجھے اس نے کہہ دیا۔

"عیشہ! تم حد سے بڑھ رہی ہو۔۔" عیشہ کی اس بدتمیزی پر انہوں نے سختی سے کہا تو اس نے سر جھکا۔

"ہرگز نہیں۔۔ آپ کی بھول ہے۔۔ اگر حد سے بڑھنا ہی ہوتا تو بہت پہلے میں آپ کے سامنے کھڑی ہوتی، آج بھی میں صرف اور صرف آپ کے رویے کی وجہ سے آپ کے سامنے ہوں۔۔ ورنہ حد سے بڑھنا کیا ہوتا ہے آپ کیا جانیں۔" ایک لمحے سے اس کو خود بھی حیرت ہوئی کہ وہ بغیر جھجکے یہ سب کہہ رہی تھی۔

"تم رشتوں کا ادب لحاظ بھول رہی ہو۔۔" وہ بے پناہ طیش سے اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

''گستاخی معاف! مجھے رشتوں کا ادب لحاظ آپ سے زیادہ پتہ ہے، میں تو صرف آپ کو کہہ رہی ہوں کہ فوزان کے معاملے میں آپ کی کسی بھی پابندی کو خاطر میں نہیں لاؤں گی۔۔ آپ کو تو اس معصوم پر ذرا بھی ترس نہیں رہا، میں اتنے دنوں سے خبر کر رہی ہوں تو یہ رشتوں کا ادب و لحاظ ہی ہے۔۔ آپ کے اس رویے سے وہ سارا دن مختلف سرگرمیوں میں الجھ کر بہل تو جاتا ہے مگر رات کو وہ جو سوال اٹھاتا ہے۔۔ کاش آپ اندازہ لگا سکیں کہ اس کی ذہنی سطح پر کس طرح اثر انداز ہو سکتے ہیں۔'' شہباز حیدر نے بے پناہ غصے سے اپنے سامنے کھڑی اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا۔

''اس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ تمہیں اس کے متعلق الجھنے کی ضرورت نہیں۔۔'' دل تو چاہ رہا تھا کہ ایک ہاتھ جڑ دے مگر ضبط کیے غصے سے کہا۔ عیشہ کا دل فوزان کے معاملے میں پھر دکھی ہو گیا۔

''میں آپ سے تو کچھ نہیں چاہ رہی۔۔ کبھی آپ نے میری زبان سے کوئی غلط لفظ سنا ہے۔۔۔ بے فکر رہیے، کبھی آپ کی پریشانی کا سبب نہیں بنوں گی، بس فوزان کو میرے پاس رہنے دیں۔۔ وہ پیدا ہونے کے بعد میرے پاس آیا تھا۔۔ اتنے سال میں وہ مجھے اپنے جسم کا حصہ لگنے لگا ہے، ورنہ شیبہ پھوپھو زندہ ہوتیں تو شاید وہ اسے اتنی محبت نہ دے پاتیں جتنی میں نے دینے کی کوشش کی ہے، ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل اس کے لیے اپنا آپ۔۔۔ بنا کسی غرض یا لالچ کے۔۔ اور اب آپ اسے مجھ سے جدا کر رہے ہیں۔۔ جان بوجھ کر۔۔ صرف اور صرف انتقاماً۔۔۔'' وہ ان کے سامنے کھڑی رو رہی تھی، شہباز حیدر کے لیے خود پر ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ اس وقت وہ ہو بہو دریشہ کی طرح لگ رہی تھی، کتنی مماثلت تھی دونوں میں۔

''میں یہ سب کچھ جان بوجھ کر یا انتقاماً نہیں کر رہا۔۔ میرے اس رویے کی وجہ مجھ سے بہتر تم جانتی ہو۔۔۔ سنا تم نے۔۔'' دانت پیستے انہوں نے باور کروایا، اور کٹ کی تھی، ان سے نظریں چرا گئی، انہیں مزید غصہ آیا۔ عیشہ کا غیر معمولی سلوک وہ بہت عرصے سے محسوس ہونے لگا تھا کہ عیشہ کا نارمل رویہ اب ان کے لیے نارمل نہیں رہا۔ جان کے سامنے آنے سے کتراتا، ایک دم سامنا ہو جانے پر گھبراتا۔۔ انہی سیدھی حرکتیں کرتا، بات کرنے پر شرماتا۔۔ خاص طور پر اس کی نگاہوں میں اپنے لیے ایک عجیب سی دبکتی آگ محسوس کرنے لگے تھے، بہت غور کرنے پر انہیں احساس ہوا کہ وہ انہیں ''چاچو'' کہنا چھوڑ چکی ہے۔۔ آپ۔ جناب دیکھتے، یہ وہ کے الفاظ استعمال کرنے لگی تھی۔ انہیں خود سے مخاطب کرنا تو تقریباً چھوڑ چکی تھی، اگر کبھی بات کرنے کا موقع مل ہی جاتا تو وہ کوئی حوالہ دیتے ہوئے آپ، ہر کے الفاظ استعمال کرتی تھی۔ ان کی چھٹی حس انہیں ایک عرصے سے آگاہ کر رہی تھی مگر وہ اپنا وہم کہہ کر ٹال جاتے تھے۔ اور پھر ایک ماہ پہلے ہی کی بات تھی، فوزان کو بخار تھا، رات وہ لیٹ آئے تھے، فوزان کی طبیعت کافی خراب تھی، سارا دن امی نے بتایا تو وہ عیشہ کے کمرے میں چلے آئے تھے۔ فوزان سویا ہوا تھا، عیشہ شاید باتھ روم میں تھی، وہ فوزان کی طبیعت جاننے کے لیے ان کے بستر پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے تھے، وہ شاید باتھ لے رہی تھی، پانی گرنے کی آواز سے وہ یہی اندازہ لگا سکے۔ فوزان کا بخار چیک کرنے انہوں نے سرہانہ اٹھا کر اس کے ساتھ کمر ٹکائی تھی، وہاں کتاب تھی، یونہی ورق گردانی کے خیال سے اٹھائی تھی، مگر وہ ششدر رہ گئے تھے۔ کتاب کھولتے ہی ان کی جھولی میں کئی تصویریں آ گری تھیں۔ سب تصویریں ان کی تھیں، صرف ایک تصویر میں ان کے ساتھ عیشہ اور فوزان تھے۔۔ یہ تصویر فوزان کی تیسری سالگرہ کے دن کھینچی گئی تھی، وہ حیران ہو کر تصویر دیکھ رہے تھے، یونہی تصویر کی پشت پر نظر پڑی تو دنگ رہ گئے۔

جب سے تیرے نام کر دی زندگی اچھی لگی
تیرا غم اچھا لگا تیری خوشی اچھی لگی
تیرا چہرہ، تیری خوشبو، تیرا لہجہ، تیری بات
دل کو تیری گفتگو کی سادگی اچھی لگی

وہ اشعار کا انتخاب نہیں تھا، بلکہ ان کے گرد خوبصورت انداز میں چاروں جانب عیشہ شہباز حیدر کے نام کی تکرار تھی خوبصورت پھولوں کی بیل کی صورت میں لکھے گئے نام کی تکرار ان کو کئی لمحوں تک سُن کر گئی تھی، وہ عیشہ کی لکھائی ہزاروں میں پہچان سکتے تھے، وہ حیرت کے سمندر میں غرق تھے، شک تو پہلے ہی تھا، اب یقین آ نے پر وہ شاک میں تھے، یونہی کتاب وہیں رکھ کر اٹھ کر وہاں سے چلے آئے، ان کا دل چاہا کہ اس سے سختی سے باز پرس کریں، مگر پھر عیشہ کے انداز و اطوار گزشتہ رویوں کا اندازہ لگا کر رہ یہ سوچ کر چلے گئے کہ اگر بات کھلنے کے بعد وہ ان کے سامنے دل کی حالت بیان کر گئی تو وہ کیا کریں گے، کیسے اپنا دامن بچا پائیں گے، تب نجانے ان کا ردعمل کیا ہو۔۔ پھر انہوں نے خاموشی سے فوزان کو ان سے دور کرنا شروع کر دیا تھا، ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اس لڑکی کو مزید کسی حماقت سے روک سکیں گے۔۔ مگر یہ ان کی خام خیالی تھی، پہلے تو شاید اسے بات کھلنے کا ڈر تھا، اور اب۔۔ کل رات انہوں نے کسی نہ کسی طرح بہلا پھسلا کر فوزان کو اپنے پاس سونے پر آمادہ کر ہی لیا تھا لیکن آدھی رات کو وہ رونا شروع ہو گیا تھا، وہ ہڑبڑا کر اٹھے تھے، اس شور کے عادی نہ تھے، کچھ پریشان بھی ہو گئے۔

''کیا ہوا فوزی۔۔؟''

''ماما کے پاس جانا ہے۔۔'' روتے ہوئے فرمائش کی گئی تھی، ایک تو نیند خراب ہو گئی تھی، دوسرا اس کی یہ الٹی فرمائش۔۔ انہیں غصہ آ گیا۔

''کوئی نہیں ہے تمہاری ماما۔۔'' ان کے ڈانٹنے کی دیر تھی، فوزان صاحب تو حلق پھاڑ کر رونا شروع ہو گئے تھے، وہ جھنجلا اٹھے، ہر طرح سے اسے سنبھالا، پچکاریاں، لالچ دیا مگر اس کی تو ایک ہی ضد تھی۔

''ماما کے پاس جانا ہے۔۔'' اب کہ انہیں عیشہ پر غصہ آنے لگا، جو ان کی زندگی میں حد سے زیادہ دخل اندازی کر چکی تھی۔

''سنو فوزی۔۔ وہ سو گئی۔۔۔ ہے۔ تم بھی سو جاؤ۔۔ میرا پیارا بیٹا ہے نہ۔۔'' انہوں نے غصہ ضبط کرتے پچکارا تھا مگر وہ بھی ڈھیٹ تھا۔

''نہیں سوؤں گا۔۔ آپ انہیں لے کر آئیں۔۔ ان کے ساتھ سوؤں گا۔۔'' وہ بیچارگی سے اس چھوٹے سے بچے کو دیکھتے رہ گئے تھے، وہ اس کی ضدی طبیعت کی عادی نہ تھے، پریشان ہو گئے۔

''وہ یہاں نہیں آ سکتیں۔۔ تمہیں میرے ساتھ ہی سونا ہے۔۔ سمجھے۔۔'' اب کے انہوں نے سختی سے کہا تھا مگر مجال ہے اثر ہوا ہو، اور وہ بوکھلایا تھا۔

''کیوں نہیں آ سکتیں۔۔ عدیل کی ماما چاچو کے ساتھ سوتی ہیں۔۔ عدیل مجھے بتاتا ہے۔۔ بس آپ ماما کو لے کر آئیں۔۔'' وہ ان ننھے سے بچے کی باتوں سے حق دق رہ گئے، اوپر سے اس کی فرمائش۔۔ انہیں ایک دم غصہ آیا تھا۔

''شٹ اپ۔۔ اس نے لاڈ اٹھا اٹھا کر تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔۔ آرام سے سو جاؤ۔۔'' غصہ تھا یا پھر فوزان کی بات کا اثر تھا، سختی سے ڈپٹتے انہوں نے اسے کھینچ کر تھپڑ مارا تھا، پھر کیا تھا۔ فوزان میاں کا فل والیم تھا وہ زچ ہو اٹھے۔

''مجھے ماما کے پاس جانا ہے۔۔ ابھی جانا ہے ماما کے پاس۔۔ آپ گندے ہیں۔۔ ماما اچھی ہیں۔۔ میں ماما کو بتاؤں گا۔۔ آپ مارتے ہیں'' وہ سر تھام کر فل والیم سے روتے اس چھوٹے سے بچے کو دیکھتے رہے مگر وہ نہیں سنبھلا تھا۔ غصے سے اٹھا کر اس کے پاس چھوڑ آئے تھے، اس وقت غصہ اس قدر تھا کہ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفقود ہو کر رہ گئی تھیں، اسی غصے کی وجہ تھی کہ وہ جو ''پہلا قدم ہے'' یہ حجاب برقرار رہنے کے لیے سرگرداں تھے، عیشہ کو خود اپنے سامنے کھڑا ہونے کا موقع دے گئے تھے۔ ساری رات دیکھتے انگاروں پر جھلتے سلگتے گزری تھی، اور اب وہ ان کے سامنے تھے۔

''دیکھو عیشہ! تم بچی نہیں ہو کہ یہ حماقتیں سرانجام دو۔۔ کل تو تمہاری شادی بھی ہونی ہے۔۔ فوزان سے تمہاری اس قدر

انجینٹ تم دونوں کے لیے ہی نقصان دہ ہے، بہتر ہے کہ تم اس سے دور رہو۔۔ وہ ابھی بچہ ہے، محبت سے پیار سے بہل جائے گا مگر بعد میں شاید یہ ناممکن ہو۔۔" شہباز حیدر نے اپنے آپ کو سنبھال کر غصے کو پس پشت ڈالتے قدرے رسانیت سے کہا تھا، وہ آنکھوں میں آنسو لیے شاکی نظروں سے دیکھے گئی، وہ رخ موڑ گئے۔

"مجھے نہیں کرنی کوئی شادی وادی۔۔ جب میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ میں آپ کے لیے کوئی مسئلہ نہیں بنوں گی تو پھر ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔۔ فوزان کو میں نے کبھی پھوپھو کا بیٹا نہیں سمجھا، بلکہ ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھا ہے۔۔ اور کوئی بھی ماں اپنے بچے کو خود سے جدا نہیں کر سکتی۔۔" وہ ان کے سامنے کھڑی واشگاف الفاظ میں آنسو بہائے دل کی بات کہہ گئی تھی۔ اسی لیے سے تو ڈرتے تھے، وہ تاسف سے اسے دیکھتے رہے۔

"کاش مجھے اندازہ ہوتا کہ تم اس حد تک بے باک ہو چکی ہو۔ تمہارے دماغ میں اس قدر خناس بھر چکا ہے تو میں یہاں تک ہی نہ آنے دیتا۔۔ بہت پہلے ہوش کے ناخن لیتا۔۔" انہوں نے تملا کر کہا تو عیشہ نے تڑپ کر دیکھا، کتنی نفرت و حقارت سے وہ اسے دیکھ رہے تھے، اس کا دل کانپا۔

"ہونہہ! تم میرے لیے مسئلہ بنو گی۔۔ عیشہ! تم میری بات کان کھول کر سن لو۔۔ تم جو اوٹ پٹانگ خوابوں کے محل تعمیر کر رہی ہو، وہ کبھی ممکن نہیں۔۔ اگر مجھے شادی کرنی ہوتی تو کب کا کر چکا ہوتا۔۔ اور تمہیں شرم تو نہ آئی یہ سب سوچتے ہوئے۔۔ میرے سامنے یوں اپنا آپ آشکار کرتے ہوئے۔۔

"شرم آ رہی ہے مجھے اس تصور سے ہی کہ جس لڑکی کو ابھی میں کم عمر بالا ابالی بچہ سمجھ رہا تھا، وہ میرے سامنے کھڑی میری آنکھوں میں دیکھتے "اظہار عشق" فرما رہی ہے۔۔"

وہ رو دی، مبہوت بہبوت کر۔۔ کتنا غلط سمجھ رہے تھے وہ اسے۔۔ وہ اپنی ساری انا، خودداری، خوف کو پس پشت ڈالے صرف اور صرف فوزان کی خاطر ان کے سامنے آن کھڑی تھی اور وہ۔۔ اس کا دل تڑپ اٹھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔۔ بغیر کسی لالچ اور غرض کے۔۔ کب میں نے اظہار کیا ہے۔ میں فوزان کی بات کر رہی ہوں اور آپ۔۔" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی۔ شہباز حیدر نے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"شٹ اپ۔۔" انہوں نے اپنی مٹھی زور سے دبائی ورنہ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ اس لڑکی کا چہرہ تھپڑوں سے سرخ کر دیں۔

"بہت بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے۔۔ مجھے فوزان کے معاملے میں تم پر اتنا اعتبار نہیں کرنا چاہیے تھا، مجھے اپنی ذمہ داری خود نبھانی چاہیے تھی۔۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا گلا دبا دیں، کیسے بے شرموں کی طرح اقرار کیا تھا۔

"پلیز شہباز۔۔ میرے ساتھ یوں پیش نہ آئیں۔۔ مجھے اتنی نفرت سے مت دھتکاریں، میں کب آپ کو مجبور کر رہی ہوں کہ میری محبت قبول کریں۔۔ کم از کم فوزان کے لیے تو اپنی زندگی میں اتنی جگہ دے دیں۔۔ قسم سے ساری زندگی کچھ نہیں مانگوں گی۔۔ مگر آپ کی نفرت نہیں سہہ سکتی۔۔ پلیز شہباز۔۔" وہ بالکل ان کے سامنے کھڑی رندھے لہجے میں کہہ رہی تھی، ان کا نام لیتے ان کی برداشت آزما گئی تھی، وہ خود پر بمشکل کنٹرول کر رہے تھے، ان کا ہاتھ ایک دم اٹھا تھا۔

"شٹ اپ۔۔ جسٹ شٹ اپ۔۔ آئندہ میرے سامنے ایسی بکواس نہیں کرنا اور ہاں۔۔ میرا نام بے جو رشتہ ہے اس حوالے سے پکارو گی۔۔ نام لیا تو حلق سے زبان کھینچ لوں گا۔۔" وہ منہ پر ہاتھ رکھے سسک رہی تھی، وہ تملا کر اسے وارن کرتے اپنا بریف کیس اٹھا کر راستے میں پڑی ہر چیز کو ٹھوکر مارتے کمرے سے نکل گئے تھے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے سسک سسک کر روتے ہوئے پلنگ پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

* * *

تو نے نفرت سے جو دیکھا تو مجھے یاد آیا
کیسے رشتے تیری خاطر یونہی توڑ آیا ہوں
کیسے دھندلے ہیں یہ چہرے جنہیں اپنایا ہے
کتنی اجلی تھیں وہ آنکھیں جنہیں چھوڑ آیا ہوں

سارا دن وہ اپنے کم مائیگی کا ماتم کرتی رہی تھی، رات تک اسے بہت تیز بخار ہو گیا تھا، وہ اس کے قدموں میں اپنی انا، اپنی خودداری، اپنی نسوانیت سمیت سب کچھ لٹا آئی تھی، یہ ایسا دکھ تھا جو اسے اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا، جب تک بات دل میں تھی، وہ مطمئن تھی، خود کو بہلا لیا تھا مگر اب زبان سے ادا ہو چکی تھی تو دل کا روگ بن گئی تھی، اسے یہ دکھ نہیں تھا کہ اس نے اس کی محبت کو قبول نہیں کیا، اسے یہ دکھ تھا کہ اس نے انتہائی نفرت وحقارت سے اسے دھتکار دیا تھا۔۔ وہ تو مکمل لٹی تھی، تن من وحسن سے سب کچھ لٹا آئی تھی۔۔ دونوں ہاتھوں سے خالی تھی۔۔ دکھ تھا کہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا، کم مائیگی سب کچھ کھو دینے کا احساس کاٹ کھا رہا تھا۔۔ وہ مضمحل سی تھی، کھانے کے بعد وہ کمرے میں بند ہوئی تو ساری رات، دہکتے انگاروں پہ لوٹتی رہی۔۔ آگ بکھرتے انگارے اسے سلگاتے رہے اور وہ سلگتی رہی، فوزان اس کے پاس بستر پہ سویا ہوا تھا، مگر اسے کوئی چین، کوئی قرار نہ تھا، جوں جوں رات بیتتی جا رہی تھی، اس کے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔

صبح تک وہ بے چین سی ہو چکی تھی، فوزان کو اسکول جانا تھا، اس کی خاطر بستر سے اٹھی تھی، بمشکل اسے تیار کرا کر کمرے سے باہر بھیج کر وہ دوبارہ بستر پر لیٹ چکی تھی، بخار کی حدت، غم کی شدت سے سر چکرا رہا تھا۔ خاموشی سے کمبل سر تک تان لیا۔ شہباز حیدر تیار ہو کر نیچے آئے تو امی نے ناشتہ تیار کر رکھا تھا، بابا جان نماز تلاوت کے بعد سو جاتے تھے، ان کا ناشتہ دس بجے ہوتا تھا، جبکہ حیدر صاحب اخبار دیکھ رہے تھے، وہ لیٹ آفس جاتے تھے، شہباز حیدر نے ان کے ساتھ والی کرسی سنبھالی۔ دوسری طرف تائی جان بیٹھی ہوئی تھیں۔

"آج عیشہ نے یونیورسٹی نہیں جانا۔۔" اچانک تائی جان کو خیال آیا تھا۔

"ہاں مجھے بھی خیال نہیں رہا۔۔ صبح سے وہ کمرے سے نہیں نکلی۔۔ رات کو بھی شام کو ہی کمرے میں گھس گئی تھی، صبح نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔۔ اور تو اور صبح پودوں کو پانی تو ضرور دیتی ہے۔۔ آج وہ بھی نہیں دیا۔۔" شہباز حیدر نے ایک نظر ماں کو دیکھا اور خاموشی سے ناشتہ کرتے رہے۔

"فوزان اسکول چلا گیا تھا۔۔؟" اچانک خیال آنے پر پوچھا۔

"ہاں! وہ تو چلا گیا تھا۔۔ تیار شیار ہو کر باہر آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ ماما کو بخار ہے۔۔ رات بھی کی طبیعت خراب تھی۔۔ خدا خیر کرے۔۔"

"جاؤ زلیخا دیکھو۔۔ عیشہ کیا کر رہی ہے۔۔" تائی جان نے فکرمندی سے کام والی کو کہا تو وہ چلی گئی، ابھی دو منٹ ہی گزرے تھے جب وہ بھاگی آئی۔

"بیگم صاحب۔۔ بیگم صاحب۔۔ عیشہ بی بی تو بے ہوش پڑی ہوئی ہیں۔۔ بخار سے تپ رہی ہیں۔۔ میں نے دو تین دفعہ ہلایا بھی مگر ہوش نہیں آیا۔۔"

"یا اللہ۔۔ خدا خیر کرے۔۔ کیا کہہ رہی ہے تو زلیخا۔۔ اب اتنی خراب طبیعت بھی نہیں تھی بچی۔۔" تائی امی تو فوراً عیشہ کے کمرے کی طرف بھاگی تھیں، ان کے پیچھے امی اور حیدر صاحب بھی۔۔ شہباز حیدر جو نارمل ہی تھے۔۔ ان کے چہرے پر بھی پریشانی

چھلکی۔۔کل کے واقعے کے بعد انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔۔وہ بھی ڈرے ایک طرف دھکیل کر اس کے کمرے کی طرف بھاگے تھے۔۔وہ بے سدھ بستر پر پڑی ہوئی تھی تائی امی اس کے ہاتھ پیر سہلا رہی تھیں تو امی نے پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹے مار رہی تھیں۔

''بڑا تیز بخار ہے اسے۔۔یا اللہ رحم کر۔۔'' تائی جان تو بس رو دینے کو تھیں۔ وہ دروازے پر ہی رکے ہوئے تھے۔

''جاؤ زلیخا۔۔ساتھ والے حامد صاحب کو بلا لاؤ، وہ اس وقت گھر پر ہوں گے۔۔جلدی کرو۔۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر اس کی نبض چیک کی تھی، ڈوبتی ابھرتی حالت تھی، وہ ایک دم گھبرا گئے تھے، زلیخا فوراً باہر بھاگی۔

''حامد صاحب ڈاکٹر تھے۔۔اپنا بیگ لے کر فوراً آ گئے۔۔عیشہ کا بی پی چیک کرنے لگے۔۔

''بچی کا بی پی بری طرح لو ہے۔۔بچی کی کنڈیشن بہت خراب ہے۔۔اتنا لو بی پی۔۔کچھ بھی ہو سکتا ہے۔۔آپ اسے فوراً ہاسپٹل لے جائیں۔۔ورنہ نروس سسٹم بھی متاثر ہو سکتا ہے۔۔''

ایک اور انجکشن لگا کر اس کا بی پی نارمل کرنے کی کوشش کی تھی، مگر در بعد ناکام ہو کر انہوں نے کہا تو تائی امی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''ہائے میری بچی۔۔''

''بھابی آپ پریشان نہ ہوں۔۔ہم اسے ہاسپٹل لے جائیں گے۔۔شہباز! گاڑی نکالو'' ابو تائی جان کو تسلی دی تھی، شہباز نے گاڑی نکالی تو ابو نے امی کی مدد سے اسے گاڑی میں ڈالا۔ عیشہ کو انتہائی نگہداشت والے روم میں لے جایا گیا تھا، وہ بالکل ہاتھ پیر چھوڑ چکی تھی، پانچ چھ گھنٹے بعد ڈاکٹر نے اسے خطرے سے باہر قرار دیا تھا۔۔پھر رفتہ رفتہ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی تھی، رات گئے وہ ہوش میں آئی تھی، حواس میں آتے ہی رونے لگ گئی تھی۔۔بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر، تائی جان، امی، مہوش بھابی اس کی دوسری والدہ ماجدہ سبھی اسے سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر نے اس کے پاس زیادہ رش کرنے سے منع کیا تھا۔۔اگلے دن وہ کافی بہتر تھی، اسے روم میں منتقل کر دیا گیا تھا، رونے کے بعد وہ خاموش ہو گئی تھی۔ سب نے اس کی خاموشی کو محسوس کیا تھا۔ واجد صاحب اس کا بھرپور خیال رکھ رہے تھے، بخار بھی قدرے بہتر تھا۔ فوزان جس نے پچھلا سارا دن عیشہ کے بغیر گزارا تھا، خاص طور پر رات کو اس نے شہباز حیدر کو بہت تنگ کیا تھا، وہ حقیقتاً پریشان ہو گئے تھے، ایک تو عیشہ کی اس قدر سیریس کنڈیشن ہو جانا۔۔اوپر سے رات کو فوزان کا رویہ وہ انتہائی ڈسٹرب ہو گئے تھے، عیشہ سے انہیں کوئی ذاتی دشمنی نہ تھی، مگر وہ جس حماقت کا مظاہرہ کر رہی تھی، اس کے جواب میں ایسی ہی حماقت سرانجام دینا انہیں قابل قبول نہ تھا۔

اگلے دن فوزان بار بار عیشہ کے پاس جانے کی ضد کر رہا تھا، اس نے سکول سے چھٹی کی تھی، دس بجے کے قریب شہباز حیدر فوزان کو ہاسپٹل لے آئے تھے، اس وقت عیشہ کے پاس واجد صاحب کے علاوہ تائی امی تھیں، جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے، عیشہ آنکھوں پر بازو لپیٹے لیٹی ہوئی تھی، تائی جان کرسی پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں، اسے دیکھ کر مسکرائیں۔۔شہباز حیدر نے سلام کیا تو بھی عیشہ نے بازو نہ ہٹائے۔

''ماما۔۔ماما۔۔'' فوزان نے آگے بڑھ کر عیشہ کا بازو جھنجھوڑا تو اس نے تڑپ کر بازو ہٹایا۔

''فوزی۔۔تم۔۔ادھر میری جان۔۔'' وہ اگلے ہی لمحے اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی تھی، شہباز حیدر نے اس پر نگاہ ڈالی، ذرا کملایا ہوا چہرہ تھا مگر بہت محبت سے وہ فوزان کو بازو کے گھیرے میں لے کر اس کے منہ پر پیار کر رہی تھی، ان کے دل میں کوئی چیز کلک ہوئی۔

''سکول نہیں گئے۔۔'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''میں نے آپ کے پاس آنا تھا۔۔''

''بری بات اچھے بچے سکول سے چھٹی نہیں کرتے۔۔آپ شام کو آجاتے۔۔میں نے بھی اپنے فوزی کو بہت مس کیا تھا۔۔'' وہ بہت لاڈ سے اسے کہہ رہی تھی۔ فوزان اس کے بستر پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا، وہ اسے کل سارے دن کی روداد سنا رہا تھا، گزری رات کے متعلق بتا رہا تھا، تائی امی سے باتیں کرتے شہباز حیدر کا سارا دھیان اسی کی طرف تھا۔

''رات کو کس کے پاس سوئے تھے۔۔'' عیشہ کی آواز پر شہباز نے دیکھا، فوزان اس کے پہلو میں لیٹا ہوا تھا، وہ بہت محبت سے اس کے بال سنوار رہی تھی۔ اسکا سارا دھیان فوزان کے چہرے کی طرف تھا۔

''پاپا کے پاس۔۔مجھے آپ کے بغیر نیند نہیں آئی تھی۔۔پھر بابا دادو کے پاس لے کر گئے تھے، پھر انہوں نے کہانی سنائی تھی اور میں سو گیا۔۔''

''ہوں۔۔'' عیشہ نے سر اٹھا کر دیکھا، شہباز حیدر کی نظروں کا زاویہ بدلا۔

''اچھا تائی امی میں چلتا ہوں۔۔کسی سے ملنا ہے، واپسی میں فوزان کو لے جاؤں گا۔۔'' عیشہ نے خاموشی سے شہباز حیدر کو ادی اماں سے بات کرنے کے بعد باہر نکلتے دیکھا تھا۔ پھر اس نے سرہانے پہ سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

''آپ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کر رہے ہیں شہباز۔۔میں مر جاؤں گی۔۔'' وہ سسک پڑی۔ سارا دن فوزان اس کے پاس رہا تھا شام کا کھانا قیوم چچا لے کر آئے تھے، کھانا کھانے کے بعد فوزان اس کے پاس ہی بستر پر لیٹ گیا تھا۔ قیوم نے فوزان کو لے جانا چاہا تھا مگر وہ نہیں گیا تھا۔ وہ اکیلے ہی واپس چلے گئے تھے، اس وقت وہ آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی جبکہ تائی جان نماز پڑھ رہی تھیں، فوزان سو گیا تھا، شہباز حیدر کمرے میں داخل ہوئے تو رک گئے۔ سارا دن وہ اپنے کام کے سلسلے میں مصروف رہے تھے، ان کا خیال تھا فوزان گھر چلا گیا ہوگا قیوم نے انہیں فون کر کے انہیں فوزان کو لے کے آنے کا کہا تھا، اسی لیے وہ یہاں آ رہے تھے، مگر اس وقت وہ عیشہ کے ساتھ بستر پر لیٹا سو رہا تھا۔

''فوزان۔۔'' انہوں نے بستر کے قریب آ کر آواز دی تو عیشہ نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ نظریں سیدھی ان کی آنکھوں سے ٹکرائی تھیں، کتنی شاکی نگاہیں تھیں، شہباز نے لب بھینچ لیے تھے۔ عیشہ نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔

''یہ تو سو گیا ہے۔۔'' فوزان کو دیکھ کر انہوں نے کہا تو وہ چپ رہی۔

''کیسی طبیعت ہے اب تمہاری۔۔؟'' انہیں بھی شاید خیال آ ہی گیا تھا، وہ کنکھی سے دیکھ کر سر جھکا گئی۔

''بخار اترا۔۔'' بے بسی سے اس نے گہرا سانس لیتے اس نے گردن ہلا دی۔ وہ بہت چاہنے کے باوجود ان کے رویے پر بھی ان سے بے اعتنائی نہیں برت سکتی تھی۔

''تائی امی تو نماز پڑھ رہی ہیں۔۔مجھے اب چلنا چاہیے۔۔کافی دیر ہو گئی ہے۔۔''

''فوزی اٹھو۔۔گھر چلیں۔۔'' انہوں نے فوزی کو اٹھانا چاہا تو اس نے روک دیا۔

''پلیز اس کو سونے دیں۔۔اس کی نیند خراب ہوگی۔۔''

''مگر میں اسے یہاں بھی نہیں چھوڑ سکتا۔۔تم تو شاید کل ڈسچارج ہو گی۔۔''

''تو آپ اسے ایسے ہی اٹھا کر لے جائیں۔۔یہ اٹھنے کے بعد یہاں آنے کی ضد کرے گا۔۔'' اس نے الجھے لہجے میں کہا تو وہ خاموشی سے اسے اٹھانے لگے تبھی ان کا ہاتھ عیشہ کے دہکتے بازو سے چھوا تھا، یوں لگا جیسے دہکتے انگاروں کو چھو لیا ہو، انہوں نے ایک دم رک کر اسے دیکھا۔

''تمہیں تو ابھی بھی بہت تیز بخار ہے۔۔'' فوزان کو اٹھانے کے بجائے فکرمندی سے پوچھا، وہ ہنس دی۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔۔ مرنے والی تو پھر بھی نہیں۔۔"

وہ خود اذیتی کی حد پر تھی، انہوں نے لب بھینچ لیے، ایک دم احساس ندامت نے آ گھیرا۔ وہ ان کی وجہ سے اس حال کو پہنچی تھی، انہیں احساس تھا مگر۔۔

"نجیحہ پلیز۔۔" انہوں نے اسکی دکھتی کلائی پر ہاتھ رکھا تو اس نے سرعت سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"پلیز اپنے بیٹے کو لے کر جائیں یہاں سے۔۔ مجھ پر یہ مہربانیاں نہ کیا کریں۔۔ میرا دل خوش فہمیوں میں مبتلا ہونے لگ جاتا ہے۔۔ بہت نفرت کرتے ہیں آپ مجھ سے۔۔ میں اسی قابل ہوں۔۔ جائیے یہاں سے۔۔ نہیں مرنے والی میں۔۔" دھیمی جلتی سلگتی آواز تھی، وہ بغیر آواز پیدا کیے ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئی تھی، وہ اسے کچھ کہنا چاہتے تھے کوئی جملہ انکے لبوں پر آتے آتے رہ گیا۔ تائی جان کی موجودگی کا خیال کرتے انہوں نے ایک تیز قابل رحم نظر اس پر ڈال کر فوزان کو اٹھایا تو وہ کمرے سے باہر نکل گئے تھے مگر وہ مسلسل رو رہی تھی، تکیے میں منہ چھپائے شدت سے آنسو بہا رہی تھی۔

✠ ✠ ✠

وہ ہاسٹل سے آنے کے بعد دو دن دادی جان کے پاس رہی، پھر اپنا سامان لے کر واجد صاحب کے ہاں چلی آئی، اسی کے برعکس اس کے تینوں بہن بھائی ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے، وہ اکثر ان کے بے پناہ اصرار پر ان کے ہاں آ کر رہتی تھی، اب بھی خود کو پرسکون کرنے کو چلی آئی کہ وہاں بہت کوشش کے باوجود شہباز حیدر سے سامنا ہو ہی جاتا تھا اور ہر بار وہ نئے سرے سے ابھر جاتی تھی، اس کے دل کو جو خلش چبھی تھی وہ وجود کو تار تار کر رہی تھی، اس لیے ادھر آ گئی۔ یونیورسٹی بھی یہاں سے نزدیک تھی، شہباز حیدر نے اسے بری طرح نفرت سے دھتکارا تھا، اندر کی یہ تکلیف کم ہی نہیں ہو پا رہی تھی، ادھر آ کر بہن بھائیوں میں الجھ کر خود کو سنبھالنے کی کوشش میں تھی۔

فوزان اس کے بغیر کیسے رہ رہا ہے، رات کو کس کے پاس سوتا ہے، وہ فی الحال یہ نہیں سوچنا چاہتی تھی، لیکن اپنے آپ کو سمیٹ رہی تھی کہ پھر بہت پہلے جیسی ہو جائے، ابھی اسے یہاں آئے چوتھا دن ہی تھا کہ قیوم چاچا اسے لینے چلے آئے۔

"گھر چلو سب تمہیں بہت مس کر رہے ہیں۔۔ خاص طور پر فوزان تمہارے بغیر کسی اور کے قابو میں نہیں آ رہا۔ بہت مشکل ہے اسے سنبھالنا۔" انہوں نے آنے کی وجہ بتائی۔

"کیوں۔۔؟ اس کے پاپا تو اس کے پاس ہی ہیں۔۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا، وہ ہنس دیے۔ "وہ، پاپا سے زیادہ تم سے اٹیچ ہے۔۔ سارا دن تو نانی بہلا لیتے ہیں مگر رات کو اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نجانے تم اسے کیسے سلا لیتی ہو۔ رو رو کر سارا گھر سر پہ اٹھا لیتا ہے۔" انہوں نے بتایا تو جان بوجھ کر بے حس بن گئی۔

"اب ساری عمر تو میں اس کے ساتھ رہنے سے رہی۔۔" اس کے لبوں سے تلخی سے یہ نکلا، وہ مسکرا دیے۔

"وہ بعد کی بات ہے۔۔ جب تمہاری شادی ہو گی تو دیکھا جائے گا۔۔" وہ ان کا چہرہ دیکھے گئی، دماغ میں شہباز حیدر کے جملے سنسناتے رہے۔

"میں ابھی تو نہیں جاؤں گی۔۔ پہلی دفعہ کچھ عرصہ یہاں رہنے آئی ہوں، بلکہ پورا ہفتہ رکنے کا ارادہ ہے۔ فوزان کے پاپا کس مرض کی دوا ہیں۔۔ وہ اپنے بیٹے کو سنبھالیں۔۔ پھر اس کی دادی، چاچی بھی ہیں۔۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

"وہاں سب ہیں مگر تم تو نہیں۔۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔۔" ایک لمحے کو وہ آزردگی کا شکار ہوئی، پھر سنبھلی۔

"میں کچھ دن رہوں گی پھر گھر آ جاؤں گی۔۔ پلیز۔۔" فوزان کی حمایت میں وہ اس قدر گری تھی، اور اب اسے خود پر بند باندھنے تھے۔ وہ نہیں گئی تھی، مزید دو دن گزرے تھے، اس رات کھانے کے بعد وہ سب چائے پی رہے تھے، جب شہباز حیدر چلے آئے، چھ سات دنوں بعد سامنا ہو رہا تھا، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے صدیوں بعد دیکھ رہی ہو۔۔ وہ اپنی اسی کیفیت پر کنفیوز ہو گئی، سلام دعا کے بعد وہ بالکل بت کی طرح بیٹھی رہی۔

"نجیحہ۔۔ تم اپنا سامان تیار کر لو۔۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔۔" چائے کے بعد انہوں نے اس کی طرف رخ کر کے کہا تو وہ چونکی، حیران ہو کر ان کا سنجیدہ چہرہ دیکھا، وہ تو سمجھی تھی کہ وہ یونہی ابو سے ملنے آ گئے ہیں مگر۔۔

"جی۔۔؟"

"فوزان کی طبیعت بہت خراب ہے۔۔ دو دن سے بخار بہت تیز ہے۔۔ سکول بھی نہیں جا رہا۔۔ ڈاکٹر کو روز دکھا رہا ہوں مگر وہ تمہیں بہت مس کر رہا ہے۔۔ تم اسی وقت چلو۔۔ پھر کبھی رہنے آ جانا۔" انہوں نے تفصیلی بتایا تو وہ ہونٹ دانتوں تلے دبا گئی۔ فوزان سے دور رہنے کی خود ہی انہوں نے سزا تجویز کی تھی اور خود ہی اب۔۔ اندر ہی اندر فوزان کی طبیعت کا سن کر پریشان بھی ہوئی، وہ کبھی بھی خود سے اس سے اتنے دن دور نہیں رہی تھی، نجانے کیسے اپنے دل کو مار رہی تھی، صرف اور صرف اس شخص کی وجہ سے مگر اب دل فوزان کے پاس اڑ کر پہنچ جانے کو مچل اٹھا تھا۔

"بہت زیادہ طبیعت خراب ہے اس کی۔۔" فکر مندی اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔

"ہوں۔ اسی لیے تو آیا ہوں۔۔" انہوں نے نپے تلے انداز میں جواب دیا تو وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔

"میں فوزان کی وجہ سے تمہیں لے جانے پر مجبور ہوا ہوں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمہیں میں تمہاری حماقتوں سمیت نظر انداز کر رہا ہوں۔۔ تم فوزان کو سمجھاؤ۔۔ آہستہ آہستہ وہ بہل جائے گا۔" راستے میں وہ کہہ رہے تھے، وہ جو خوش فہم ہو رہی تھی، کہ شاید دل میں کہیں نرم گوشہ بیدار ہو گیا ہو، چھن سے اندر کچھ ٹوٹ گیا، آنکھیں بے وقعتی پر بھر آئیں۔

"رو کیں گاڑی یہاں۔۔ مجھے نہیں جانا آپ کے ساتھ۔۔" اپنی اس ناقدری و تذلیل پر وہ مزید چپ نہ رہ سکی، بھرائی آواز میں کہا تو شہباز حیدر نے اسے گھورا۔

"وہ آپ کا بیٹا ہے۔۔ سنبھالیں آپ خود اسے۔۔ میرے کندھے پر رکھ کر کیوں بندوق چلا رہے ہیں۔۔ آپ کو تو ذرا بھی خدا کا خوف نہیں، کوئی یوں بھی کسی کے جذبات سے کھیلتا ہے۔۔" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ شہباز حیدر خود کو خاصا بے بس محسوس کرنے لگے، سمجھ نہ آئی کہ وہ اس نالائق جذباتی دیوانی لڑکی کو کیسے سمجھائیں۔ اپنی حتی کا نتیجہ دیکھ چکے تھے جبھی نرمی۔۔" انہوں نے سر جھٹکا۔

"میں اسی لیے قیوم چاچا کے ساتھ نہیں آئی تھی اور اب آپ۔۔" اپنے آنسو صاف کرتے بے حس بنے شہباز حیدر کو دیکھا۔

"مجھے ایک دفعہ ہی جان سے مار دیں۔۔ یہ قسطوں سے مارنے کا مزہ کیوں لے رہے ہیں۔" وہ رو پڑی، شہباز حیدر نے کتنے لب دانتوں تلے دبا لیے، ان کا کوئی بھی غیر متوقع جذباتی جملہ اس کم عقل لڑکی کو مزید بکھیر سکتا تھا۔

"میں نے جان بوجھ کر محبت نہیں کی تھی، یہ جذبے تو خود دل میں جگہ بناتے ہیں۔۔ مجھے اندازہ ہوتا کہ ان جذبوں کی سزا فوزان سے دوری ہے تو خود کو روک لیتی مگر۔۔ بہت روکا تھا۔۔ یہ دل کب مانا تھا۔۔" شہباز حیدر کو لگ رہا تھا کہ ان کا ضبط جواب دے رہا ہے۔

"میں آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔۔ پلیز فوزان کو مجھ سے دور نہیں کریں۔۔" آنسو بھری آنکھوں سے وہ اس کے سامنے التجائیہ بیٹھی تھی، شہباز حیدر نے خاموشی سے ایک گہری سانس کھینچی، پھر اس کے بعد گھر آنے تک ایک طویل خاموشی تھی۔ وہ گھر آئی تو فوزان کی حالت دیکھ کر مجرم سی بن گئی۔۔ اسے خود پر ندامت ہوئی۔۔ شکایتی نظروں سے شہباز حیدر کو دیکھا، جو خود نظریں چرا گئے تھے۔ وہ مزید تلخ ہوئی۔

"کیا ہوا تھا میرے فوزی کو۔۔" اسے ساتھ لگائے اس نے محبت سے پوچھا تو وہ رونے لگا۔

"ماما کہاں تھیں آپ۔۔ پاپا کہہ رہے تھے آپ چلی گئی ہیں۔۔ واجد انکل کے ہاں، اب نہیں آئیں گی۔۔ کیوں گئی تھیں آپ۔۔ آپ کو پتا ہے میں آپ کے بغیر نہیں رہتا۔۔" لاؤنج میں اس وقت بھی موجود تھے اس نے غصے سے شہباز حیدر کو دیکھا، جو چہرہ پھیر گئے تو عیشہ واجد کا دل بھر بھر جلنے لگا۔

"اب آ گئی ہوں۔۔ اب نہیں جاؤں گی۔۔ آپ تو میری جان ہو، اپنی فوزی کو چھوڑ کر میں کہیں جا سکتی ہوں۔۔ بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔" اس نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے بہلایا تو وہ مسکرایا۔

"میرے پاس بیٹھی رہیں گی نا۔۔ کہیں نہیں جائیں گی نا۔۔" بہت ہی معصومیت تھی۔ عیشہ نے والہانہ پن سے اس کی پیشانی چومتے اسے گلے لگا لیا تھا۔

"میری جان۔۔ میرا فوزی۔۔" لاؤنج میں موجود بھی افرواسے فوزان کے ساتھ لاڈ کرتے دیکھ کر مسکرا دیے تھے۔

✠ ✠ ✠

کس طرف جاؤں، یہ سوچتی نہیں رہی
ان گنت راستے اور اکیلی تھی میں
بار ہا آئے ایسے مراحل کہ جب
تم میرے ساتھ تھے اور اکیلی تھی میں

فوزان کی بیماری نے اسے ایک نکتہ سمجھا دیا تھا کہ شہباز حیدر چاہے اسے جتنا مرضی دھتکار لیں، جتنی مرضی نفرت کا اظہار کر لیں، اپنے بیٹے کی وجہ سے اسے برداشت کرنے پر مجبور ہیں، اسی مجبوری نے اس کے اندر نئی توانائیاں بھر دی تھیں، شہباز حیدر کو یکسر نظر انداز کیے وہ ہر وقت فوزان کی ذات میں الجھی رہتی تھی۔ شہباز حیدر تک پہنچنے کیلئے فوزان وہ سیڑھی تھی، جس کے ذریعے وہ با آسانی اپنی منزل پا سکتی تھی۔ انہی دنوں اس کے لیے ایک پروپوزل آیا تھا، دادا جان کے دوست کا بیٹا تھا۔ امریکہ سے ہائیلی کوالیفائیڈ تھا، پاکستان میں ہی اپنی کنسٹرکشن کمپنی میں اچھی خاصی پوسٹ پر کام کر رہا تھا، سب کو یہ پروپوزل بہت مناسب لگا تھا، وہ خاموشی سے سب دیکھتی رہی۔ ابھی تو وہ خود کو نئے سرے سے جوڑ رہی تھی، اور اب یہ نئی مشقت۔۔ دل کو بہت کچھ ہوا مگر وہ لب سے رہی۔ وہ لوگ آئے اور اسے دیکھ کر اوکے کر گئے، انہیں عیشہ بہت پسند آئی تھی۔۔ وہ صورتحال اور اس قدر تیزی سے بدلتے دیکھ کر سن سی ہو گئی۔ وہ اس طوفان کو روکنا چاہتی تھی مگر کچھ نہ کر پا رہی تھی، اس رات فوزان کے سونے کے بعد وہ ساری رات پریشانی سے ٹہلتی رہی مگر کچھ فیصلہ نہ ہوا۔ اگلے دن ان لوگوں کی طرف سے بلاوہ بھی آ گیا کہ جب چاہیں رسماً آ جائیں، وہ مزید پریشان ہو گئی۔ دو تین دن اسی پریشانی میں گزرے تھے، ادھر سے بھی چند لوگ جا کر دیکھ آئے تھے۔۔ لڑکا انہیں بھی بہت پسند آیا تھا تقریباً دونوں کی جانب سے ہی معاملہ سیٹ ہی تھا۔۔ بس رسم ہونا باقی تھی، شادی عیشہ کے ایم ایس سی کے بعد فائنل تھی، وہ حالات کو اس قدر تیزی سے بدلتے دیکھ کر الجھ گئی۔ بہت سوچ سمجھ کر اس نے محسن جاوید (لڑکے) سے ملنے کا ارادہ کیا تھا، یونیورسٹی سے واپسی پر وہ سیدھی اس کے آفس پہنچی تھی۔

بلڈنگ کا ایڈریس اس نے باتوں ہی باتوں میں سہولت بھابی سے لیا تھا۔ اچھی خاصی بڑی کمپنی کے چیف ایگزیکٹو کی پوسٹ پر براجمان تھے، وہ کنفیوژ سی تھی اس کی سیکرٹری سے اندر اطلاع بھجوا کر انتظار کرنے لگی۔ دو تین منٹ بعد اسے اندر بلا لیا گیا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے آفس میں داخل ہوئی۔

"السلام علیکم۔۔" اتنا بڑا اقدام زندگی میں پہلی مرتبہ اٹھا رہی تھی، سو گھبراہٹ لازمی تھی۔

"وعلیکم السلام۔۔ پلیز آیئے۔۔ تشریف رکھئے" محسن جاوید نے اٹھ کر اسے ویلکم کیا تھا، وہ خاموشی سے ٹیبل کے سامنے بڑی کرسیوں میں سے ایک پر ٹک گئی۔۔

"میں عیشہ واجد ہوں۔۔" اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر بتایا۔

"جی میں جانتا ہوں۔۔" عیشہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو وہ فوراً بولا۔

"دراصل امی کے پاس آپ کی تصویر دیکھی تھی، آپ یہاں۔۔ خیریت۔۔" وہ سر جھکا گئی۔

"مجھے آپ سے ضروری بات کرنا تھی۔۔" اس نے ہمت کی۔

"جی کیوں نہیں۔۔ پہلے ٹھہریں۔۔ یہ بتائیں کیا لینا پسند کریں گی۔۔" انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر اس سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پلیز اس تکلیف کو رہنے دیں۔۔ میں یونیورسٹی سے سیدھی آئی ہوں، مجھے گھر بھی جانا ہے۔۔"

"مگر کچھ تو ہونا چاہیے نا۔۔" وہ بضد ہوا۔

"مجھے حاجت نہیں۔۔ ورنہ میں آپ کو منع نہ کرتی۔۔"

"اوکے۔۔ ایز یو وش۔۔" اس نے ریسیور واپس رکھ دیا۔

"جی کہیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔" عیشہ کا نارمل انداز دیکھ کر وہ بھی فوراً موضوع کی طرف آیا تھا۔ "آپ کو علم ہو گا آپ کو اور ہماری فیملی کس سلسلے میں سوچ رہی ہے۔۔ دیکھیں محسن صاحب! میں آپ کو کسی بھی قسم کے اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی۔۔ میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"جی۔۔؟" عیشہ کے نارمل رویے پر وہ الجھا ضرور تھا، انداز ہ تھا کہ یہ بات ہو گی۔

"اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔۔؟" اس نے سنجیدگی سے عیشہ کے چہرے کو دیکھا، وہ گردن ہلا گئی۔

"میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔۔ مجھے نہیں پتا وہ شخص میرے مقدر میں ہے یا نہیں مگر میں کسی اور شخص کی بھی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتی۔۔ چاہے وہ آپ ہی کیوں نہ ہوں۔۔ میری محبت یکطرفہ ہے۔۔ اس کے باوجود میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔۔" وہ شائستگی سے سب کہہ گئی تھی، وہ خاموشی سے عیشہ واجد کو دیکھے گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرے جذبات سے میری فیملی لاعلم ہے۔۔ میں اگر آپ کے پروپوزل سے انکار کرتی تو انہوں نے وجہ پوچھنی تھی، میرے پاس اپنی یکطرفہ محبت کا کوئی جواز نہ تھا، کہ جس کو بنیاد بنا کر میں انکار کرتی۔ اسی لیے آپ کو حقیقت کا بتانا ضروری سمجھا ہے۔ آپ میرے جذبوں سے باخبر ہونے کے باوجود اپنے والدین کی بات مانیں گے تو آپ کو مجھ سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔۔ پلیز ٹھنڈے دل سے ضرور سوچئے گا، میں آپ کے جواب کی ضرور منتظر رہوں گی۔۔" نم آلود آنکھوں، بھرائی ہوئی آواز میں کہہ کر وہ وہاں رکی نہیں تھی، چلی آئی تھی۔ آنکھوں میں نمی روڈ یے میں جذب کرتے وہ بلڈنگ سے باہر نکل کر سڑک کراس کرنے کا سوچ رہی تھی جب سیاہ گاڑی تیزی سے اس کے قریب رکی تھی۔ "عیشہ۔۔" شہباز حیدر کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ساکت رہ گئی تھی، وہ بھی شاید حیران تھا اسے یہاں دیکھ کر۔۔ وہ یونیورسٹی کے علاوہ کہیں اور بغیر بتائے اور اکیلی جاتی بھی نہ تھی۔

"تم یہاں۔۔خیریت۔۔" وہ پوچھ رہے تھے۔انداز سخت تھا۔۔وہ بوکھلا گئی، کبھی جھوٹ بولنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی مگر اب۔۔

"وہ میری ایک دوست کی بہن اس بلڈنگ میں جاب کرتی ہے۔اسی کے ساتھ آئی تھی۔۔" اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ شہباز حیدر نے چند ثانیے اسے بغور دیکھا تو وہ مزید کنفیوز ہو گئی۔

"بیٹھو۔" انہوں نے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا، وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

"آپ۔۔یہاں کیا کر رہے تھے۔" گاڑی میں خاموشی تھی، اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"کام تھا ایک۔۔ملنا تھا کسی سے مگر۔۔" اس کا مگر اتنا معنی خیز تھا کہ پھر وہ چپ رہی اور یہ چپ باقی سارا رستہ برقرار رہی تھی۔گھر آ کر وہ کاموں میں مصروف ہو گئی۔اگلے دو دن تک اس کی جان سولی پر ٹنگی رہی، وہ محسن جاوید کے جواب کی منتظر تھی، پھر اسے زیادہ انتظار بھی نہ کرنا پڑا۔۔رات کا وقت تھا، فوزان کو سلا کر وہ دودھ کا خالی گلاس کچن میں رکھنے کمرے سے نکلی تھی، جب راہداری سے گزرتے فون کی بیل بجی، اس نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔

"ہیلو۔"

"عیشہ ہیں۔۔؟" دوسری طرف سے کوئی پوچھ رہا تھا۔"جی بول رہی ہوں مگر آپ کون۔۔؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تھینک گاڈ آپ نے کال ریسیو کی۔۔میں کل سے کئی بار آپ کا نمبر ملا چکا ہوں مگر ہر بار کسی اور کی آواز سننا پڑتی تھی۔۔میں محسن جاوید بات کر رہا ہوں۔۔کیسی ہیں؟" انتہائی بے تکلفی سے کہا جا رہا تھا۔عیشہ نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"ٹھیک ہوں۔۔آپ سنائیں۔"

"الحمدللہ۔۔عیشہ آپ نے مجھے فیصلہ کرنے میں مدد دی ہے۔۔آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔۔" وہ کہہ رہا تھا، وہ چونکی، حیرت بھی ہوئی۔

"مگر کیوں۔۔؟"

"میں بھی آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔دراصل میری کسی اور سے کمٹمنٹ ہے۔مگر یلو چپقلش کی وجہ سے امی ابو نہیں مان رہے تھے، پھر آپ کی طرف سلسلہ چل نکلا، میں نے ہر ممکن کوشش کی۔۔بعد میں ہتھیار ڈال دیے تھے، اس دن آپ کی باتوں نے مجھے حوصلہ دیا، غیرت دلائی، کہ آپ لڑکی ہو کر اپنے لیے کوشش کر رہی ہیں اور میں مرد ہو کر والدین کو نہیں منا سکتا۔۔بس گھر جا کر میں نے ہر وہ حربہ استعمال کیا جس سے امی ابو مان سکتے تھے۔۔کل وہ لوگ آپ کے ہاں انکار کرنے آئیں گے۔۔"

"تھینک یو سو مچ محسن صاحب۔۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"کوئی بات نہیں۔۔کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ خوش نصیب جس کیلئے آپ اسٹینڈ لے رہی ہیں کون ہے؟"

"کیا کریں گے آپ جان کر۔۔" وہ خود اذیتی سے مسکرائی۔یکطرفہ جذبات میں جن کا فریق ثانی پر کوئی اثر نہیں اور شاید ساری زندگی بھی نہ ہو۔۔بس میں اپنے ساتھ سنسیئر رہنا چاہتی ہوں تاکہ مجھے کوئی ملال نہ رہے کہ ڈوبنے سے پہلے میں نے ہاتھ پاؤں نہیں مارے تھے۔" اس کا لہجہ خود بخود آزردہ ہو گیا۔

"اوہ! ویری سیڈ۔۔میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔۔کسی بھی قسم کی مدد کی صورت میں آپ مجھے کہہ سکتی ہیں۔" وہ پورے خلوص سے کہہ رہا تھا، وہ ہنس دی۔

"شکریہ۔۔" وہ مسکرائی پھر دو تین باتیں مزید کیں، پھر فون بند کر کے وہ کچن میں گلاس رکھ کر واپس لوٹی تو کاریڈور سے

گزرتے اس کی لاؤنج میں بیٹھے شہباز حیدر پر نگاہ پڑی۔وہ ٹی وی دیکھ رہے تھے، انہوں نے بھی پلٹ کر دیکھا تو وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔۔نجانے کس خیال سے دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

❊ ❊ ❊

اک پاکیزہ محبت کے طلبگار تھے ہم
آزما کے دیکھتے بہت وفادار تھے ہم
ہم نے بھی دامن میں خوشیوں کو سمیٹنا چاہا
شاید اسی خواہش کے گنہگار تھے ہم

محسن جاوید کے والدین نے فون کر کے اس رشتے سے معذرت کر لی تھی، بات ہی ایسی تھی کہ کتنے دن تک گھر والے ششدر رہے تھے، چند دن زور و شور سے اس موضوع پر تبصرے بھی ہوئے مگر پھر رفتہ رفتہ سب بھول گئے، کچھ دن مزید سر کے تو تائی جان کو اب اٹھتے بیٹھتے عیشہ کے رشتے کی فکر ستانے لگی۔۔وہ کوئی کم عقل، کم صورت جاہل لڑکی نہ تھی کہ رشتے میں پریشانی ہوتی مگر محسن جاوید فیملی کے انکار کے بعد وہ خوامخواہ ہی الناسید حا سوچنے لگی تھیں۔انہوں نے کئی لوگوں سے عیشہ کے رشتے کا کہہ رکھا تھا۔عیشہ سب دیکھ رہی تھی مگر خاموش تھی، اس نے سوچ لیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ شہباز حیدر کے علاوہ کسی اور کی زندگی میں داخل نہیں ہوگی، اس کے پاس انکار کا بہت اچھا جواز فوزان کی صورت میں موجود تھا سو وہ مطمئن تھی۔اس دن بھی وہ یونیورسٹی سے واپس لوٹی تو مہوش نے اسے اچھی طرح فریش اپ ہو کر ڈرائنگ روم میں چلنے کا کہا تھا، وہ تھکی ہاری لوٹی تھی، کئی دن سے اس نئے رشتے کے متعلق سن رہی تھی، اب سامنے یہ مصیبت دیکھ کر اس کے اعصاب پر جنوں بوجھ آ پڑا تھا۔

"مہوش بھابھی۔۔ضروری ہے کیا۔۔؟؟" اس کے منہ بنانے پر وہ ہنسیں۔

"ہاں بہت زیادہ۔۔دو گھنٹے سے وہ لوگ آئے بیٹھے ہیں، چائے، وغیرہ سے فارغ ہو چکے ہیں۔۔بس تم چینج کر کے فوراً اندر آؤ۔۔" اس کے رخسار پر چٹکی بھر کر مسکرا کر وہ چلی گئیں، وہ وہیں لب بھینچے کھڑی رہی۔پھر بجائے کپڑے بدلنے کے وہ اندر چلی آئی۔۔آف تھا، سوا ہی انداز میں سلام کیا۔دو عورتیں ایک لڑکی اور دو مرد تھے۔لڑکی اس سے مختلف سوال کرتی رہی، جنہیں وہ آف موڈ کے ساتھ جواب دیتی رہی۔پھر جیسے ہی اس کی جان چھوٹی وہ اپنے کمرے میں بھاگی۔۔واجد صاحب نے اپنی ساری ذمہ داری اپنے والدین پر چھوڑ رکھی تھی، عیشہ کے اندر دادا جی دادا کے سامنے انکار کرنے کی ہمت نہیں تھی اور اوپر سے شہباز حیدر کے رویے۔۔جب وہ اسے بری طرح نظر انداز کرتے تو اس کا دل لہولہان ہونے لگتا تھا، کوئی راز داں نہ تھا، جس سے وہ کہہ سن کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی۔۔اور جو باخبر تھا وہ ایک نظر ڈالنا بھی گوارہ نہ کرتا تھا۔ادھر سے یہ لوگ بھی جا کر لڑکا دیکھ آئے تھے لڑکا بینک منیجر تھا۔۔خاندان بھی بہت بھلا تھا۔۔چونکہ بالکل انجان اور غیر لوگ تھے سو عبداللہ صاحب کوئی بھی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے خوب چھان پھٹک کروا لینے کے حق میں تھے، انہوں نے جانچ پڑتال کی ذمہ داری شہباز حیدر کے سپرد کی تھی، عیشہ کو علم ہوا تو کلس کر رہ گئی۔

محسن جاوید کو اس نے کسی طرح انکار پر آمادہ کر لیا تھا مگر اب کیا کرے۔۔اسے کوئی راہ سجھائی نہ دے رہی تھی۔رات فوزان شہباز حیدر کے پاس تھا، کھانے کے بعد وہ اسے اوپر لے گئے تھے، عیشہ کا خیال تھا کہ وہ خود ہی چھوڑ جائیں گے، اب وہ اسے بلاوجہ اپنے پاس سلانے کی غلطی نہیں کرتے تھے مگر آج رات گیارہ بجے تک وہ اسے چھوڑنے نہ آئے تو وہ الجھ گئی۔نیچے بھی ایک ایک کر کے سب سو گئے تھے، اوپر والے پورشن میں بھی بالکل اندھیرا اور خاموشی تھی، عیشہ نے فوزان کے انتظار سے اکتا کر سو جانا چاہا تو بستر کو سوں دور تھی، اسے رہ رہ کر شہباز حیدر پر غصہ آنے لگا، نجانے وہ کیا چاہتے تھے۔ایک دم کسی خیال نے چونک کر پھر یہ سوچنے کے

بعد وہ کمرے سے نکل گئی۔

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی آئی۔ شہباز حیدر کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے وہ کچھ خوفزدہ تھی دروازہ کھلا تھا اس کے ہاتھ لگانے سے کھلتا چلا گیا۔

"کون۔۔؟" وہ سائیڈ پر تھی ورنہ شہباز حیدر کی نگاہ ضرور پڑتی۔ عیشہ کی طرف سے بالکل خاموشی تھی شہباز حیدر اٹھ کر دروازے کے قریب چلے آئے اسے دیکھ کر چونکے، پھر حیران ہوئے۔

"تم۔۔اس وقت۔۔؟" نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"وہ فوزی۔۔" نیم اندھیرے میں اپنے سامنے شہباز حیدر کے توانا وجود کو دیکھ کر وہ پھر ہمت ہار گئی۔ "وہ سو گیا۔" سخت لہجہ پر عیشہ نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا وہ فوراً سر جھکا گئی۔

"۔۔۔وہ مجھے آپ سے۔۔" انگلیاں چٹخاتے آ تو گئی تھی مگر اب ساری ہمت پانی کا بلبلہ ثابت ہو رہی تھی۔

"آپ دادا جان کو منع کر دیں، مجھے شادی نہیں کرنی۔۔ مجھے یہ رشتہ پسند نہیں۔۔" ہمت کر کے کہہ دیا شہباز حیدر کا دماغ بھنا اٹھا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔۔ رات کے اس پہر تم مجھے یہ بتانے آئی ہو۔۔" انہوں نے اپنے غصے کو بمشکل کنٹرول کرنے چاہا مگر کہا تھا وہ سر جھکا گئی۔

"آپ۔"

"بکواس بند کرو۔۔ جاؤ آرام سے جا کر سو جاؤ۔ فوزان سویا ہوا ہے۔۔ اگر رات کو تنگ کیا تو تمہارے پاس چھوڑ آؤں گا۔۔" اپنے غصے پر بمشکل کنٹرول کرتے انہوں نے کہا۔ اور جہاں تک اس رشتے کی بات ہے میں انکار نہیں کروں گا تم اگر خود کرنا چاہتی ہو تو تایا ابو سے بات کرو، میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔۔" سختی سے باور کروا کر انہوں نے دروازہ بند کرنا چاہا تو عیشہ نے تیزی سے اپنا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکھ کر ان کی کوشش ناکام بنا دی تھی۔

"آپ پلیز میری بات تو سن لیں۔۔" عیشہ کا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے، یوں دھتکارے جانے پر دل مچل اٹھا۔ انجام کی پروا کیے بغیر تیزی سے کہا۔

"عیشہ۔۔" شہباز حیدر دھیمی آواز میں پھنکارے۔ ساتھ والا کمرہ قیوم اور مہوش کا تھا اگر رات کے اس پہر ان میں سے کوئی باہر نکل آتا تو انہیں کتنی سبکی کا سامنا کرنا پڑتا، مگر یہ لڑکی ان نزاکتوں کو نہیں سمجھ پا رہی تھی، کسی چیز کی پروا ہی نہ تھی۔

"آپ یوں چیخ کر میری زبان روک نہیں سکتے، یوں دھتکار کر میرے اندر موجزن جذبوں کو نوچ نہیں سکتے۔۔ کیا مانگ رہی ہوں میں آپ سے۔۔ آپ کا عمر بھر کا ساتھ تو نہیں مانگ رہی اور نہ آپ کو شادی کی آفر کر رہی ہوں۔۔ جو اس طرح طیش سے مجھے دروازے سے ہی دھتکار رہے ہیں۔۔" شہباز حیدر جتنی دھیمی آواز میں پھنکارا تھا وہ اتنی ہی تیزی سے چیخی تھی۔ شہباز کا دماغ گھوما تھا، ایک دم اس کا بازو دبوچ کر اندر گھسیٹ لیا۔

"تم میں شرم نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی گھٹیا حرکت پر اتر آؤ گی۔۔" اسے دیوار کے ساتھ دھکا دے کر وہ کمرے میں سخت اضطراب سے ٹہلنے لگے تھے، عیشہ نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔

"یہ میری زندگی کا معاملہ ہے۔۔ آپ کون ہوتے ہیں مجھے مجبور کرنے والے۔۔ نہیں کرنی مجھے کسی بھی ایکس وائی زیڈ سے شادی۔۔" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بری طرح رو رہی تھی۔ ان کا دماغ الٹنے لگا۔

"تو ٹھیک ہے۔۔ تم یہ انکار اپنے باپ اور دادا کو کرو۔۔ یہاں کیوں آئی ہو۔۔" وہ پھر پھنکارے تھے، وہ قطعی لو[illegible]

[illegible]رات کے مالک نہ تھے مگر یہ لڑکی ہر بار انہیں اسی طرح جھنجوڑ رہی تھی کہ وہ بلبلا اٹھتے تھے۔ اب بھی پھنکارے تھے۔ زیرو پاور کے [illegible]کی روشنی میں سبز ہلکی روشنی میں کمرہ عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔

"آپ اس رشتے کی جانچ پڑتال کر رہے ہیں۔۔" روتے ہوئے اس نے وجہ بتائی، تو شہباز حیدر کا جی چاہا کہ اس سر[illegible]ی تم اس لڑکی کا سر پھاڑ دے۔ "تو کیا فرق پڑتا ہے۔۔" "پہلے بھی تو انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ جا کر محسن جاوید کو انکار کر آئی تھی، [illegible]بھی کوئی نیا ڈرامہ رچا لینا۔ عیشہ رونا بھول کر بری طرح حیران نظروں سے انہیں دیکھے گئی۔ جو صرف گھور رہے تھے۔ "آپ۔۔ [illegible]جانتے ہیں۔۔" اس کی حیرت کا سکتہ ٹوٹا۔

"محسن جاوید سے میری اچھی خاصی علیک سلیک ہے۔۔ اس دن میں اس سے ملنے گیا تھا، مگر اس کے آفس سے آتی [illegible]ی آواز سن کر پلٹ آیا تھا، اور اسی رات جب اس نے کال کی تھی تم سے پہلے لاؤنج میں رکھا فون میں اٹھا چکا تھا۔ محسن کو میں اچھی [illegible]جانتا ہوں، اس کی کسی سے کمٹمنٹ نہیں تھی، وہ صرف تمہاری وجہ سے انکار کر رہا تھا، اس کے والدین اس سے جس قدر ناراض ہیں، [illegible]تم اپنی حماقت کا اندازہ لگا سکو۔۔ اور اب۔۔" مٹھیاں بھینچ کر غصے سے اسے دیکھتے وہ چپ ہو گئے تو وہ پھر ہاتھوں میں چہرہ چھپا [illegible]کر رونے لگی۔

"میں مر جاؤں گی۔۔ آپ کیوں نہیں سمجھتے آپ کے بغیر میں مر جاؤں گی۔۔" وہ جذباتیت کی انتہا پر تھی، شہباز حیدر کا جی [illegible]چاہا لمحوں میں اس لڑکی کو غائب کر دیں۔

"دماغ خراب تمہارا۔۔ اور کچھ نہیں۔۔ خناس بھر چکا ہے اس میں۔۔" اس کی جذباتیت پر وہ پھر آؤٹ ہوئے۔

"یہ صرف میری ڈھیل ہے تم میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔۔ شرم تو نہ آئی تمہیں یہ سب بکواس کرتے ہوئے۔۔ [illegible]اور اپنی عمروں کا ہی خیال کر لیا ہوتا۔۔ کم از کم اتنا ہی جان لیا ہوتا کہ ہمارا آپس میں کیا رشتہ ہے۔۔ اور تم اس رشتے کے حوالے [illegible]سے لیے کتنی محترم ہو۔۔" وہ تاسف سے کہہ رہے تھے۔

"بات کرتا ہوں میں تایا جان سے۔۔ اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔۔ تمہارے ماسٹرز کا انتظار کرنے کے بجائے تمہیں کل [illegible]کریں۔۔ یہ رشتہ ہر لحاظ سے معقول ہے۔۔" انتہائی سفاکی سے کہتے شہباز حیدر نے گویا اسے آگ میں دھکیل دیا تھا، وہ [illegible]سے دیکھے گئی، پھر نفی میں سر ہلایا۔

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔۔ مجھے یہ شادی نہیں کرنی۔۔" سختی سے کہا۔

"میں ایسا ہی کروں گا۔۔" اس سے زیادہ سختی سے جواب ملا تھا۔

"میں کچھ کھا لوں گی۔۔" بنا سوچے سمجھے اس نے دھمکی دی تھی، وہ کتنے پل حیران نظروں سے اسے دیکھے گئے، پھر ایک [illegible]سے برا حال ہوا تھا۔ "تو پھر جو کچھ بھی کھانا ہے ابھی جا کر کھا لو۔۔ کیونکہ میں موقع ملتے ہی تایا ابو سے بات کروں گا۔۔" اس کا [illegible]کر باہر دھکیل کر سختی سے کہہ کر انہوں نے دروازہ بھی بند کر لیا تھا۔

"نہیں۔۔ شہباز پلیز میری بات سنیں۔۔ آپ ایسا نہیں کریں گے۔۔ مر جاؤں گی میں۔۔" ہتھیلیوں سے دروازہ پیٹتے [illegible]ں بات کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔

"مر جاؤں گی میں۔۔ خدا کے لیے شہباز۔۔" اس کی حالت اس وقت دیکھنے کے لائق تھی۔

"عیشہ۔۔" کسی نے عقب سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا، وہ ایک دم ساکن ہو گئی۔ فوراً ہوش میں آئی تو لمحوں میں [illegible]ں ہوا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔

"عیشہ۔۔" دوبارہ پکارا گیا تھا، آواز پہچان کر وہ فوراً پلٹی تھی۔ اپنے سامنے کھڑے وجود کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی تھی۔

* * *

مہوش اور قیوم دونوں نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر عیشہ کو۔۔ وہ اب بھی قالین پر گھٹنوں میں سر دیے بڑی طرح رو رہی تھی۔

"شش۔۔" مہوش نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ مزید بلکی۔

"اب بس بھی کرو بہت رو لیا تم نے۔۔" قیوم بھی پچکارا مگر اس نے آنسو تھے کے تھمنے میں ہی نہیں آ رہے تھے، بلکہ شدت آ گئی تھی۔۔ بے بسی کا احساس تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، اب کی بار تو کچھ بھی نہیں بچا تھا، رہی سہی انا عزت نفس سب کچھ تو ختم ہو گیا تھا، کچھ بھی تو باقی نہیں بچا تھا، روتی نہ تو پھر کیا کرتی۔۔

"دیکھنا ہم شہباز بھائی کا کیا حشر کرتے ہیں۔۔ بڑا رو لیا تم نے۔۔ ساری کسر نکالیں گے ہم ان کی۔۔ فکر کیوں کرتی ہو۔۔ جب دل کا سارا بوجھ ہلکا کیا ہے تو اعتماد بھی کرو۔۔ شہباز بھائی اب ہمارا مسئلہ ہیں۔۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔" مہوش چچی نے اسے بہلایا تھا، اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"وہ نہیں مانیں گے۔۔ وہ مجھ سے سخت نفرت کرتے ہیں۔۔"

"کیوں نہیں مانیں گے۔۔ ان کے تو بڑے بھی مانیں گے۔۔ دیکھنا میں کیا کرتی ہوں۔۔" مہوش نے چٹکی بجائی تھی ان کے اعتبار پر عیشہ کو کچھ حوصلہ ہوا۔

"چلو اب جاؤ، جا کر آرام سے سو جاؤ۔۔ کل میں دیکھوں گی کیا کرنا ہے۔۔ تم فکر نہیں کرو۔۔ سب نارمل ہو جائے گا۔۔" ان کے اس تعاون پر اس کا دل پرسکون ہوا۔ ان کے کمرے سے نکل کر وہ نیچے چلی آئی، اپنے کمرے میں آ کر لیٹی تو گزشتہ لمحے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ شہباز حیدر اسے کمرے سے نکالنے کے بعد وہ جب بھی دروازہ پیٹتے رو رہی تھی تو غضب سے قیوم چچا نے آواز دی تھی، وہ تو انہیں سامنے دیکھ کر زرد پڑ گئی تھی۔

"چاچو۔۔" شہباز کر گئے تو ان کندھے سے لپٹ کر جو اس دھاڑ رو دی تھی، وہ تو اس نئی افتاد پر بوکھلا گئے تھے، خاموشی سے سہارا دے کر اپنے کمرے میں لے گئے تھے، مہوش کو جگا کر صورتحال بتائی، وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں، وہ تو پہلے ہی سدھ بدھ کھو رہی تھی، تھوڑا سا محبت سے پچکارنے کی دیر تھی، وہ ایک ایک کر کے سب بتاتی گئی۔ دونوں کئی لمحے بے یقین رہے، پھر مہوش نے ہی خود کو سنبھالا تھا۔

"ارے یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔۔ عیشہ سے بڑھ کر فوزان کے لیے بھلا کوئی اور ماں ہو سکتی ہے۔۔ ہم بھی ادھر ادھر رشتے دیکھ رہے تھے۔۔ کتنے پاگل ہیں۔۔ عیشہ کے لیے شہباز بھائی کا خیال ہی نہیں آیا۔۔ بھائی صاحب نے بھی کہیں نہ کہیں شادی کرنی ہی ہے نا۔۔ ابھی انکار کر رہے ہیں، بعد میں خود ضرورت محسوس کریں گے تو پھر ابھی کیوں نہیں۔۔ تم فکر نہیں کرو بیٹا میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔" وہ فوراً پرجوش ہو گئی تھیں، اور پھر مسلسل تسلیاں دلاسے دیتی رہی تھیں۔ اب وہ کچھ پرسکون تھی۔ اسے یقین تھا کہ مہوش چچی نے وعدہ کیا ہے تو وہ سب حالات کو سنبھال لیں گی، اطمینان سے آنکھیں بند کیں تو دیر بعد نیند نے اس کی پلکیں بوجھل ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

✠ ✠ ✠

اگلے دن مہوش بھابی نے کالج سے چھٹی کی تھی، عیشہ کے یونیورسٹی جانے کے بعد شہباز حیدر نیچے اترے تھے، مہوش نے بغور دیکھا، نارمل انداز میں ناشتے سے انصاف کرتے گزری رات کے کسی بھی واقعے کا عکس ان کے چہرے سے ڈھونڈے

نہیں مل رہا تھا، عیشہ نے جو بتایا تھا ان کا خیال تھا کہ شہباز تائی امی سے ضرور رشتے کے متعلق ذکر چھیڑیں گے مگر خیریت رہی۔۔ شہباز کے چلے جانے کے بعد تائی امی، چچی دونوں ناشتہ کر رہی تھیں، مہوش بھی اپنا ناشتہ لے کر ان کے پاس ٹیبل پر آ بیٹھیں۔ یونہی ادھر ادھر کی باتوں کے دوران انہوں نے وہ بات شروع کر دی۔

"امی میں سوچ رہی ہوں کہ اب شہباز بھائی کی بھی شادی کر دینی چاہیے۔۔ جوگ لینے کو اتنا عرصہ بہت ہوتا ہے۔۔ فوزان کو تو عیشہ نے سنبھال رکھا ہے، وہ اب بڑا ہو رہا ہے، شہباز بھائی کو بھی کچھ عرصہ بعد بیوی کی ضرورت محسوس ہوگی۔ اسی لیے بہتر ہے کہ ہم ابھی سے سوچیں۔" مہوش نے بڑے سلیقے سے بات کی تھی، دونوں خواتین نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"بات تو ٹھیک ہے مگر شہباز نہیں مانتا۔۔" امی نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں نہیں مانتے۔۔ ابھی تو اک عمر پڑی ہے ان کی۔۔ یوں بغیر گھر والی کے زندگی گزرنے سے تو رہی۔۔" مہوش نے کچھ تیزی سے کہا۔ "آپ تو ماں ہیں، پیار سے سختی سے راضی کریں۔۔ ورنہ عیشہ کی زندگی اتنی ہی تھی، فوزان کو ہم سب سنبھالنے والے ہیں، خاص طور پر عیشہ۔۔ کل کو اس کی شادی کر دیں گے، پھر بھی تو فوزان تنہا ہو گا ہی نا۔۔ شہباز بھائی کو بھی اب عقلمندی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔۔"

"ہاں! بہو صحیح کہتی ہے۔۔ تم ہی کچھ زور دو، میں کئی بار کہہ چکی ہوں۔۔" تائی امی نے بھی مہوش کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"کئی بار اس موضوع پر بات کر چکی ہوں۔۔ مگر ہر بار کہہ دیتا ہے کہ مجھے بیوی اور آپ کو بہو تو مل جائے گی، اگر آنے والی نے فوزان کو قبول نہ کیا تو۔۔ عفیفہ بھابی کو بھی ہم لوگ لائے تھے، انہوں نے عیشہ کو کب اپنایا۔۔ میں اپنے بیٹے کو ساری عمر کسی محرومی میں نہیں رکھنا چاہتا۔۔" امی نے دکھی لہجے میں بتایا تو مہوش نے ایک گہری سانس لی۔

"ہاں! یہ بھی سچ ہے۔۔ فوزان کو عیشہ نے جس طرح شاید وہ رشتہ بھی نہ پالتی۔۔" انہوں نے جان بوجھ کر عیشہ کا ذکر کر دیا تھا۔

"ہاں اللہ اجر دے بچی کو۔۔ جب اس کی شادی کر دیں گے تو بڑا مسئلہ ہو گا۔۔ فوزان تو اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا، اس نے بھی اس کے لاڈ اٹھا کر ضدی بنا ڈالا ہے اسے۔۔ صرف وہی اسے سنبھال سکتی ہے۔ میں سوچتی ہوں جب وہ چلی گئی تو ہم کیسے سنبھالیں گے۔۔" امی کو اب نئی فکر ستائی تھی۔

"امی میرے ذہن میں جب سے عیشہ کے رشتے کا چکر چلا ہے، ایک خیال آ رہا ہے۔۔ اگر برا نہ لگے تو۔۔" وہ رک گئیں۔ دونوں خواتین نے دیکھا۔

"کیوں نہ ہم شہباز بھائی اور عیشہ کی۔۔" وہ جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ چکی تھیں، دونوں خواتین نے بے حد حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر مہوش کو جو کہہ رہی تھی۔

"چھوٹا منہ مگر بڑی بات والی بات ہے لیکن یہ بھی سچ ہے۔۔ جس طرح فوزان عیشہ کے ساتھ اٹیچ ہے، اگر عیشہ ہمیشہ کے لیے شہباز بھائی کی زندگی میں آ جائے تو سوتیلی کے ڈر سے شہباز بھائی شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، وہ بھی کر لیں گے۔۔ پھر ہم نے باہر بھی تو اس کی کہیں نہ کہیں شادی کرنی ہی ہے نا۔۔ اور شہباز بھائی کی بھی تو دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتی۔۔" مہوش نے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا تھا۔

"ہے تو ٹھیک بات مگر۔۔" تائی امی رک گئیں۔

"لوگ کیا کہیں گے کہ دونوں میں تیرہ چودہ سال کا فرق ہے۔۔ پھر وہ رشتہ بھی نازک سا ہے۔۔ لوگ باتیں نہ بنائیں۔۔" امی کو بھی مہوش کی بات بھائی تھی مگر خدشے بول اٹھے۔

"رشتے میں دونوں چچا بھتیجی لگتے ہیں۔۔ سگے تو نہیں ہیں نا۔۔ پھر حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کا بھی یہی رشتہ تھا۔۔ رہی بات عمر کی تو اتنا زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔۔ آپ باہر سے بھی کوئی لڑکی لائیں گے تو اس کی بھی عمر اتنی ہی ہوگی یا ایک دو سال زیادہ ہوگی۔۔ لوگوں کی تو بات ہی نہیں کریں، عیشہ کی ماں کے بعد یا وریشہ کے بعد دونوں کو لوگوں نے تو نہیں سنبھالا تھا۔ گھر کی بات ہے۔۔ جب گھر والے راضی تو کیا کریں گے لوگ۔۔" اس نے آرام سے کہا تھا۔ دونوں خواتین کے دل کو بات لگی تھی۔

"مہوش ٹھیک کہہ رہی ہے آپا۔۔ آپ بتائیں آپ کیا کہتی ہیں۔۔؟" امی نے تائی امی کو دیکھا، وہ ہنس دیں۔

"میرے لیے تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔۔ شہباز اور عیشہ اپنے بچے ہیں۔۔ اپنے گھر میں آنکھوں کے سامنے رہیں گے۔۔ وریشہ کے بعد اب عیشہ۔۔ حیرت ہے۔۔ مجھے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔۔" وہ خوش ہو کر کہہ رہی تھیں۔

"پھر آپ بھائی صاحب اور واجد سے بات کریں، میں شہباز اور اس کے ابا سے بات کرتی ہوں۔۔ گھر کی بات ہے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔۔" مہوش نے جو ذمہ داری لی تھی، وہ بااحسن نبھائی تھی، اب جو کرنا تھا ان خواتین نے کرنا تھا، وہ مسکراتے ہوئے خالی برتن اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

✠ ✠ ✠

یہ بات جب عبداللہ صاحب کے کانوں تک پہنچی تو ان کا یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ اسی شام انہوں نے واجد کو بلا کر بات کی تو وہ کتنی دیر تک چپ رہے پھر کہنے لگے۔

"اماں جی! ویسے تو سب ٹھیک ہے مگر۔۔ عیشہ اور شہباز کی عمر میں بڑا فرق ہے۔۔ شہباز ایک بچے کا باپ ہے، نجانے عیشہ راضی بھی ہو کہ نہیں؟" وہ شش و پنج میں مبتلا ہو رہے تھے۔

"عمر کی کوئی بات نہیں۔۔ باہر بھی کریں گے تو پتہ نہیں کوئی کتنی عمر والا شخص ہو۔۔ رہ گئی عیشہ کی بات تو اس سے میں خود ہی پوچھ لوں گی۔۔ تم اپنی مرضی بتاؤ۔" اماں کی بات پر وہ مسکرا دیے۔

"حرج تو کوئی نہیں ہے۔۔ عیشہ کی رضامندی لے لیں، جو جی چاہے کریں۔۔ شہباز سے بڑھ کر ہمیں اور کیا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے! میں عیشہ سے پوچھ کر رضامندی دے دیتی ہوں، آگے بچوں کی قسمت۔" انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ تائی اماں نے عیشہ سے پوچھنے کی ذمہ داری مہوش کے ذمہ لگائی تھی، مہوش ہنس دی۔

شام کے کھانے کی تیاری کے دوران مہوش نے عیشہ کو اپنی سارے دن کی کارگزاری بتائی تو کتنی دیر تک ہکا بکا رہ گئی۔

"کیا واقعی۔۔ یہ سچ ہے۔۔؟" وہ بے یقین تھی۔

"ہوں۔" مہوش نے اس کے رخسار پر چٹکی بھری تو وہ جھینپ گئی۔

"اتنی جلدی کیسے ہو گیا یہ سب۔۔" خوشی ہی ایسی تھی کہ وہ سرخ گلنار ہو گئی۔

"بس دعا دو ہمیں۔۔ کہا تھا نا کہ ہم پر چھوڑ دو۔۔ بس میں نے تائی امی اور امی کو رام ہی ایسے کیا ہے کہ خود بخود انہوں نے سارا معاملہ طے کر لیا۔۔ اب بات بڑوں میں ہے۔۔" وہ مزے سے بتا رہی تھی، وہ ابھی بھی بے یقین تھی۔

"اور شہباز۔۔" اس نے کہا۔

"آج رات امی کا ان سے بات کرنے کا ارادہ ہے، دیکھتے ہیں کیا جواب ملتا ہے۔۔"

"اگر انہوں نے انکار کر دیا تو۔۔" ایک دم وہ خدشوں میں گھر گئی تھی، مہوش ہنسی۔

"فکر کیوں کرتی ہو۔۔ ہم ہیں نا۔۔"

"خوش تو میں بھی بہت ہوں۔۔ ہو تو تم مجھ سے چھوٹی مگر رشتے میں جیٹھانی ہو گی۔۔" وہ چھیڑ رہی تھیں، وہ سرخ پڑ گئی۔

"تائی امی نے تم سے پوچھنے کی ذمہ داری مجھ پر لگائی ہے۔۔ مگر انہیں کیا پتا ان کی بھتیجی ہی تو شہباز صاحب کے عشق میں پور پور ڈوب چکی ہے۔۔" ان کی اس چھیڑ چھاڑ پر وہ بلش ہو گئی۔

"چچی پلیز۔۔" اس نے ٹوکا، وہ کھلکھلا کر ہنسیں۔

"رشتے میں تمہاری دیورانی بنوں گی۔۔ ابھی سے سوچ لو۔۔ چچی کہو گی یا۔۔" عیشہ کی بھی ہنسی نکل گئی۔

"آپ میری چچی ہیں بس۔۔"

"اور شہباز صاحب چچا۔۔ ویسے بائی دا وے۔۔ چچا سے وہ کیسے بن گئے۔۔" وہ کتنی بے باک ہو رہی تھیں۔

"مہوش چچی پلیز۔۔" اس کا شرم سے برا حال تھا۔

✠ ✠ ✠

رات شہباز گھر لیٹ آئے تھے تقریباً سبھی سو چکے تھے، امی ان سے بات کرنے کی نیت سے جاگ رہی تھیں، کھانا انہوں نے کمرے میں ہی کھایا تھا۔ کھانے کے بعد امی نے وہ بات چھیڑ دی جس کیلئے وہ اب تک جاگ رہی تھیں۔۔ اور پھر جب انہوں نے عیشہ کا نام لیا تو شہباز حیدر گنگ رہ گئے۔

"کیا۔۔ عیشہ۔۔؟" وہ حیرت زدہ تھے۔

"ہوں۔۔ وریشہ کے بعد جس طرح اس نے فوزان کو پالا ہے، مانو تو اس نے دل جیت لیا ہے۔۔ آپا لوگ باہر اس کا رشتہ دیکھ رہے ہیں۔۔ فوزان جس طرح اس کے ساتھ بہل گیا ہے، دل ڈرتا ہے کہ پتہ نہیں اس کے بعد وہ سنبھل پائے کہ نہیں۔۔ پھر تمہاری طرف سے بھی دل دکھتا ہے، تم فوزان کو سوتیلی ماں کے حوالے نہیں کرنا چاہتے مگر عیشہ کیلئے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے، اتنی سلجھی ہوئی بچی ہے وہ۔۔ یوں کہوں کہ میری تو دل کی مراد بر آئی ہے۔۔" وہ خوش تھیں، بہت خوش۔ وہ برہم ہوئے۔

"آپ ہوش میں تو ہیں۔۔ عیشہ۔۔ مائی گاڈ۔۔ جسے میں آج تک چھوٹی بچی سمجھتا آ رہا تھا، آپ اس کی بات کر رہی ہیں۔۔ سچ سچ بتائیں کہ یہ کس کی سازش ہے۔۔" غصے سے جو جی میں آیا کہہ دیا۔

"بس۔۔ بس۔۔ یہ سازش کی خوب کہی تم نے۔۔ دل میں خیال تھا، آپا اور بھائی صاحب سے بات کی، انہوں نے واجد اور عیشہ کی رضامندی لے کر ہاں کہہ دی۔۔ اب تم سے پوچھ رہی ہوں اور تم مجھے ہوش کا سنا رہے ہو۔۔" شہباز حیدر کے انداز پر وہ بھی برہم ہو گئیں۔

"یعنی کہ مجھ سے پوچھے بغیر ہی بڑوں تک بات پہنچ چکی ہے۔۔ یا اللہ" وہ بے چارگی سے ماں کو دیکھتے رہ گئے۔

"منع کر دیں۔۔ مجھے نہیں کرنی عیشہ سے شادی" شہباز حیدر نے فوراً منع کر دیا۔

"ارے کیوں منع کر دوں۔۔ عیشہ جیسی لڑکی چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملنے والی۔۔ گھر کی بات ہے تقریباً سب طے ہے۔۔ بھائی صاحب نے ہاں کہہ دی ہے۔۔ اب میں شادی کی ڈیٹ طے کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گی۔۔" شہباز کے یکسر انکار نے انہیں کر دیا تو انہوں نے بھی دو ٹوک بات کی۔

"امی پلیز۔۔ آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں۔۔ وہ بچی سی ہے۔۔ پھر میری اور اس کی عمر میں بہت فرق ہے۔۔" ماں کے رو کھے انداز پر وہ کچھ دھیمے ہوئے، تاہم بے چارگی نمایاں تھی۔

"کوئی بچی وچی نہیں ہے۔۔ پورے تیئس سال کی ہو چکی ہے۔۔ رہی عمر کی بات تو میاں بیوی میں عمر کا یہ فرق عام

ہے۔۔سب چلتا ہے۔۔'' انہوں نے پہلا اعتراض فوراً رد کیا۔

''ررغیر شادی شدہ ہے۔۔ مجھ شادی شدہ کے ساتھ کیسے ایڈجسٹ کرے گی، پھر مجھے بھی وہ بطور لائف پارٹنر پسند نہیں۔۔'' بے چارگی سے دوسرا اعتراض کیا۔ ''اس کی رائے لے چکے ہیں۔۔اسے کوئی اعتراض نہیں۔۔فوزان کو وہ پہلے ہی سنبھال رہی ہے۔۔رہ گئی پسند کی بات تو شادی کے بعد خود بخود پسند کرنے لگے گی۔۔'' ادھر سے جواب تیار تھا۔

''ور بہت امیچور ہے۔۔ان کے لیے اسی جیسا لڑکا چاہیے تھا۔۔'' وہ کس کر پھر کہا تھا۔

''خیر سے شادی کے بعد تمہارے عادات و اطوار دیکھ کر خود ہی سنجیدہ ہو جائے گی۔۔'' وہ تو جیسے پوری تیاری کر کے آئی تھیں، کسی اعتراض کو چنداں اہمیت نہ دی تھی، انہوں نے لب بھینچ لیے۔

کوئی اور بھی اعتراض ہے تو وہ بھی کر لو۔۔میں انکار نہیں سننے والی۔۔'' شہباز حیدر نے انتہائی غصے سے انہیں دیکھا، آج وہ انہیں ذرا بھی محبت جتانے والی ماں نہ لگیں۔

''آپ بھلا کون سا میرے کسی اعتراض کو خاطر میں لا رہی ہیں جو میں مزید بحث کروں۔'' شکایتی انداز میں ماں کو دیکھا، وہ ہنس دیں۔

''جب تم اعتراض ہی ادوت پتا پیٹ کرو گے تو میں بھلا کیا خاطر میں لاؤں۔ خیر سے اپنے گھر کی بچی ہے۔۔پھر عیب سے پاک اور تم جیسے کیئر سے نکالے۔۔'' انہوں نے گہرا سانس لیا۔

''پھر میں تمہارے تایا جان کو ہاں کہہ دوں۔۔'' برتنوں کی ٹرے اٹھا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ماں کے ڈپلومیٹک انداز پر وہ کوفت کا شکار ہوئے۔

''مجھے نہیں پتا۔ مگر ایک بات طے ہے، مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔۔'' اندر کا ابال ایک دم اُمڈ آیا، امی نے غصے سے بیٹے کو دیکھا۔

''شہباز! دل سے اس طرح نہیں کھیلتے۔۔دریشہ کا غم اب اتنا تازہ بھی نہیں کہ تم ہمیں نامراد لوٹا دو۔ دو سال بہت ہوتے۔ اب تو میرا خیال ہے کہ اعتراض کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ عیشہ اور دریشہ میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ خالہ مر جائے تو بھانجی، پھوپھی کی جگہ بھتیجی۔ دنیا میں ہوتا آیا ہے۔۔کئی مثالیں ہیں۔۔تم دنیا کے اکیلے نرالے تو نہیں ہو۔۔میں انکار نہیں سننے والی، جا کر بھائی صاحب کو ہاں کہہ دیتی ہوں۔'' وہ غصے سے بھنا کر کمرے سے چلی گئیں۔ شہباز حیدر نے غصے سے سرہانہ اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ جی چاہا ابھی جا کر عیشہ واجد کو جھنجھوڑ کر رکھ دیں، مگر وہ ضبط کر گئے، رات کے اس پہر وہ تو سو چکی ہوگی مگر شہباز حیدر انگاروں پر لوٹنے لگے۔

✠ ✠ ✠

شہباز حیدر کی ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی، ایک چھوٹی سی لڑکی نے انہیں اذیت سے دو چار کر رکھا تھا، صبح پہلی پو پھوٹی تو وہ بھی کمرے سے نکل آئے، نیچے آئے تو ابھی سبھی اپنے کمروں میں تھے۔ وہ عیشہ کے کمرے کی طرف چلے آئے، دروازہ لاک نہیں تھا۔ ہینڈل گھمانے سے کھلتا چلا گیا تھا، وہ اندر داخل ہوئے تو فوزان بستر پر کمبل پر لیٹا سو رہا تھا، اور وہ واش روم سے وضو کر کے نکل رہی تھی۔ اتنی صبح صبح شہباز حیدر کو اپنے کمرے میں دیکھ کر چونکی۔

''آپ۔۔؟'' وہ دوپٹہ وضو کے اسٹائل میں لپیٹا ہوا تھا۔

''تم۔۔'' عیشہ کو دیکھ کر گزری رات کی اذیت نئے سرے سے تازہ ہو گئی۔ ایک دم طیش میں قدم بڑھا کر عیشہ کے

بازو کے تیور دیکھ کر پیچھے ہٹی تھی۔

''تم خود کو سمجھتی کیا ہو۔ کہاں عذاب کی طرح مسلسل میرے پیچھے پڑ گئی ہو۔۔'' عیشہ کا گداز آستین چڑھا بازو ان کی فولادی گرفت میں جکڑ لیا گیا تھا، عیشہ ان کے تیور دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی۔

''آپ کیا کر رہے۔۔چھوڑیں مجھے۔۔پلیز۔۔'' گرفت اتنی سخت تھی کہ تکلیف سے بس چیخ نکلنے کی کسر تھی۔ اپنا بازو چھڑانا چاہا، شہباز نے مزید طیش میں آ کر جھٹکا دیا تھا، وہ بری طرح دیوار کے ساتھ جا لگی۔ ''جان سے مار دوں گا تمہیں۔۔پاگل کی بچی نے ای اور تائی ای تک بات پہنچا دی۔۔جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔۔یہ ساری تمہاری سازش ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے اس طرح کرنے سے تم مجھ سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔۔لعنت بھیجتا ہوں میں تم پر۔۔'' اس قدر غصیلے طیش بھرے لہجے میں تایا جان کی نفرت تھی۔ حیران پھٹی پھٹی نگاہوں سے بازو کی ساری تکلیف بھولے پتھر بن گئی۔ اتنی نفرت۔۔؟ اس قدر ناپسندیدگی کا اظہار۔۔؟ وہ بے یقینی سے دیکھے گئی۔

''میرا خیال تھا کہ تم عقلمندی کا مظاہرہ کرو گی۔۔کل رات جو بھی ہوا، میں تمہاری نادانی سمجھ کر نظر انداز کر گیا مگر اب۔۔تم نے اپنی نادانی... خود کا نٹے بوئے ہیں۔۔بہت برا کروں گا میں تمہارے ساتھ۔'' شہباز کے اندر کا لاوا کسی بھی طرح کم نہیں ہو پا رہا تھا، عیشہ کا وجود خوف سے برا حال ہوا۔ شہباز حیدر کا یہ روپ پہلی دفعہ دیکھنے میں آ رہا تھا۔

''میں نے کیا کہا ہے۔۔؟'' وہ رو دی۔ کچھ بازو کی تکلیف اور کچھ شہباز کا خوف، آنسو ایک ایک کر کے چہرے پر گرنے لگے۔ کچھ لمحے پہلے اس نے وضو کیا تھا، چہرہ گیلا تھا، ٹھوڑی سے گردن تک سارے چہرے پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے، سرخ و سپید چہرہ... چہرے پر چپکی کالے بالوں کی لٹیں۔۔ایک لمحے کو اس کے رو دینے پر ان کی لال گہری آنکھوں میں موجود پانی دیکھ کر ساکت ہوا تھا، اگلے ہی لمحے یہ نمی ان کے اندر کی آگ کو مزید ہوا دے گئی تھی۔

''ابھی بے حیائی میں کوئی کسر باقی ہے۔۔مائی گاڈ۔۔جو بات میں سوچتے ہوئے بھی لرز جاتا تھا وہ بات تم نے کتنی آسانی سے بڑوں تک پہنچائی۔۔نہ صرف پہنچائی بلکہ میری کسی مرضی کو خاطر میں لائے بغیر سب کچھ طے بھی پا گیا۔۔صرف ایک دن میں۔۔'' ایک لمحے کی کیفیت تھی، اگلے ہی لمحے اندرونی خلفشار نے پھر غصے کی ردا اوڑھا دی۔

''پلیز چپ کریں۔۔میں نے کسی سے بات نہیں کی۔۔قسم لے لیں۔۔آپ مجھے بے حیائی کے طعنے مت دیں۔۔میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔۔میرا جرم صرف اتنا ہے کہ آپ سے محبت کرنے کی گنہگار ہوں۔۔میرے جرم کو میری سزا تو مت بنائیں۔۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''گنہگار رہا تھا یہ شخص اسے۔۔اور اس شخص کو اپنے برے رویے کا احساس نہ تھا۔۔'' شہباز حیدر نے بھینچے ہوئے چہرے سمیت اس کے بازو سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

''تو پھر بات اتنی آگے کیسے بڑھ گئی کہ امی میری رائے کو اہمیت دیے بغیر تم سے شادی کا فیصلہ سنا گئیں۔۔'' غصہ کسی طرح بھی کم نہیں ہو پا رہا تھا۔

''مجھے کیا پتہ۔۔اپنی امی سے جا کر پوچھیں۔۔میں نے اگر ان سے ہی بات کرنا ہوتی تو اتنا عرصہ آپ کا یہ ذہنی ٹارچر برداشت کرتی۔۔'' وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر شدت سے رو دی۔ اس کی ہچکی پر شہباز حیدر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگے۔

''تم کوئی بھی ڈرامے بازی کر لو۔۔جو مرضی کر لو۔۔میں متاثر ہونے والا نہیں ہوں۔۔نبٹ لوں گا تم سے اچھی طرح۔۔'' شہباز حیدر نے اسے اچھی طرح دھمکیوں سے ڈرا دھمکا کر باہر کی راہ لی تو عیشہ نے ہاتھوں سے چہرہ اٹھا کر جلتے دروازے کو دیکھا، آنسو ایک دفعہ پھر اس کے رخساروں پر بہہ نکلے تھے۔

✠ ✠ ✠

وہ اک شخص جو کم کم میسر ہے ہم کو
آرزو ہے کہ کسی روز وہ سارا مل جائے
اسے کہنا کہ ملاقات ادھوری تھی وہ
اسے کہنا کہ کبھی آ کے دوبارہ مل جائے

حیدر صاحب کو اپنی بیگم صاحبہ سے شہباز حیدر کے عیشہ کے لیے اعتراضات کا علم ہوا تو انہوں نے شہباز سے خود بات کی۔ شہباز حیدر جنہوں نے امی کے سامنے صاف انکار کر دیا تھا، باپ کے سامنے کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ حیدر صاحب شہباز کے سامنے دنیا کی اونچ نیچ سمجھاتے رہے، رشتوں کی نزاکت، اہمیت باور کراتے رہے۔ شہباز نے لب بھینچے باپ کی سب باتیں سنیں۔

"تو پھر میں بھائی صاحب کو ہاں کہہ دوں۔۔" ایک طویل لیکچر کے بعد انہوں نے بیٹے کے چہرے کا جائزہ لیا۔ شہباز نے گہری سانس لی۔

"اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ کا یہ فیصلہ درست ہے تو جو جی چاہے کریں۔۔" ان کے اس انداز میں بھی ان کے دلی جذبات آشکار ہو گئے تھے۔ حیدر صاحب مسکرائے۔

"تمہیں فی الحال یہ مناسب نہیں لگ رہا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم خود ہمارے اس فیصلے کو سراہو گے۔" وہ اس کا کندھا تھپک کر چلے گئے تھے۔ شہباز حیدر نے لب بھینچ لیے۔

"عیشہ واجد۔۔" کچھ سوچتے سوچتے انہوں نے سر جھٹکا۔ باپ کے سامنے وہ بہت کچھ کہہ سکتے تھے مگر عیشہ واجد کی خوش قدموں کو روکنے کیلئے انہیں صرف یہی حل سجھائی دیا تھا کہ فی الحال خاموشی اختیار کریں۔۔ جو ہو رہا ہے ہونے دیں۔ عیشہ واجد سے انہیں کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی مگر۔۔

اگلے دن دونوں کی باقاعدہ بات طے ہو جانے کی خبر پورے گھر میں پھیل چکی تھی۔ اوپر نیچے سب کو پتہ چل چکا تھا۔ عیشہ یونیورسٹی سے واپس لوٹی تو چچی نے پاس بٹھا کر خوب پیار کیا۔ عیشہ تو کتنی دیر تک ورطہ حیرت میں غرق رہی۔ کل صبح کا شہباز حیدر کا رویہ اتنا آتش فشاں اور غضبناک تھا کہ وہ ڈر گئی تھی، اور اب یہ "ہاں" وہ بے یقین تھی۔ پھر اس کے لیے واقعی معلوم ہوا تھا یا پھر خواب اس نے کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا کیا وہ واقعی سچ ہو رہا تھا۔ مہوش کے کمرے میں پہنچی تو بھی بے یقین ہی رہی۔

"مہوش چچی! یہ رشتے طے ہو گیا ہے۔۔ کیا واقعی۔۔ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی۔۔"

"یہ بالکل خواب نہیں ہے۔۔ رات ابو نے خود شہباز بھائی سے بات کی تھی، پھر نیچے آ کر تایا ابو وغیرہ سے بھی بات طے ہو گئی۔۔ اب تو باقاعدہ ہاں ہوئی ہے۔۔"

"مگر وہ شہباز۔۔ انہوں نے اعتراض تو کیا ہوگا۔۔"

"ہوں۔۔ بہت سے امی بتا رہی تھیں، مگر ابو کون سا ان کے اعتراض ختم کرنے گئے تھے۔ انہیں بٹھا کر سمجھایا تھا۔ اور بس۔۔" مہوش چچی کے اس جواب پر اس کے دل کے اندر خوف پیدا ہونے لگا۔

"اس کا مطلب ہے چھوٹے دادا جان نے انہیں مجبور کیا ہے۔"

"یہ تو مجھے نہیں پتا۔۔ البتہ صبح ناشتے پر منہ بڑا سنجیدہ بنا ہوا تھا۔۔ میں نے چھیڑنا چاہا تو جھڑک دیا۔۔ پھر چائے پی کر نکل گئے تھے۔۔ مگر تم کیوں فکر کرتی ہو۔۔ تھوڑا بہت غصہ تو وہ دکھائیں گے ہی۔۔ ابو وغیرہ کہہ رہے تھے کہ شہباز کو کوئی مجبوری [illegible] شادی نہیں تو نکاح کی تقریب تو ضرور کریں گے۔۔ یوں سمجھو تم دونوں کو پکی بیڑیاں ڈالنے کا ارادہ ہے۔۔" مہوش نے آخر [illegible]

[illegible] مگر ابھی نہ سکی۔ شہباز راضی نہ تھے، صرف والدین کی وجہ سے چپ تھے، اسے یقین ہو گیا تھا۔

* * *

رشتہ طے کیا ہوا، باقی سب کچھ آناً فاناً طے ہوتا چلا گیا۔ عبداللہ صاحب اور حیدر صاحب کی مشترکہ رائے کے مطابق منگنی کی بجائے دو روز بعد نکاح کی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ شہباز حیدر نے امی کو کافی روکا تھا، کہ بات طے ہو گئی ہے، کافی ہے، اس جلدی کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ مگر وہ بھی سب پکے کام کرنے پر بضد تھے۔۔ کیا پتہ کب شہباز مکر جائے، بات طے ہونے کے بعد شہباز کا اپنا ہی رویہ تھا کہ سب کو ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خوش نہیں ہیں۔ خاص طور پر عیشہ تو ہر وقت ہولتی رہتی تھی۔ اسے کھونا محال تھا پا لینا اس سے بھی زیادہ۔

نکاح کی تقریب خاصی پر رونق تھی، قیوم کی شادی کے بعد اس گھر میں کوئی پہلی خوشی دیکھنے کو مل رہی تھی، سو سبھی خوش تھے۔ شہباز حیدر کا انداز وہی تھا۔ خاموش، سنجیدہ اور کچھ ناراض سا۔۔ وہ اس سارے شور شرابے پر خوش نہ تھے۔ مہوش عیشہ کو پارلر لے گئی تھی، جب واپس لوٹیں تو سبھی مہمان آ چکے تھے۔ تقریب کا اہتمام تھا، سارا لان جگمگا رہا تھا۔ عیشہ نکاح کے گولڈن میرون شرارے کے بھاری جوڑے کے ساتھ عام حلیے کے برعکس کوئی اور ہی چیز لگ رہی تھی۔ دادی اور مہوش نے اسے خصوصی بنائے گئے اسٹیج پر لا بٹھایا تھا۔ عیشہ سادہ سے حلیے میں دکھائی دینے والی عیشہ واجد آج پر پوری پر اپنی نگاہ کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہ بہت کنفیوز ہو رہی تھی، دل کی دھڑکن کا تو کوئی جواب ہی نہ تھا، اس نے اپنی بہن شہلا کو مسلسل اپنے پاس بٹھائے رکھا تھا۔ شہلا واجد کی دوسری بیوی کی اولاد تھی، اور پانے کی اسٹوڈنٹ تھی۔ نکاح کی تقریب کے بعد کھانے پینے کا سلسلہ چل پڑا تھا۔ نکاح سے پہلے تک وہ مسلسل خوفزدہ تھی، نکاح کے بعد وہ ایک دم پرسکون و مطمئن ہو گئی۔ شہباز حیدر اب اس کا تھا، مکمل طور پر اس کا۔ یہ بڑی پیاری خوشی تھی کہ جس کی اس نے راتوں کو جاگ جاگ کر اپنے رب سے پوری ہونے کی دعا مانگی تھی، اور آج رب نے اس کی دعا سن لی تھی۔ شہباز حیدر کو کھو دینے کا احساس بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں عیشہ۔۔" وہ اسٹیج پر بیٹھی اپنی سوچوں میں مگن تھی جب اس آواز پر ایک دم چونک کر دیکھا، اس کے سامنے محسن جاوید کھڑا تھا۔

"آپ۔۔" وہ حیران ہوئی۔

"جی۔۔" وہ مسکرایا۔ "بہت بہت مبارک ہو، یہ یقیناً شہباز بھائی ہی ہیں جن کے لیے آپ نے انکار کیا تھا۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ عیشہ نے گھبرا کر اپنے ساتھ بیٹھی شہلا کو دیکھا، جو محسن جاوید کو دیکھ رہی تھی دلچسپی سے۔۔ محسن جاوید کی پوری فیملی اس تقریب میں مدعو تھی، دادا جان کے جاوید صاحب سے تعلقات جوں کے توں تھے، اس تقریب میں محسن جاوید کو دیکھ کر حیران ضرور ہوئی تھی مگر کچھ کہہ نہیں سکی تھی۔

"بہت لکی ہیں شہباز بھائی۔۔" وہ مزید کہہ رہا تھا۔

"ویسے آپ کی تعریف۔۔؟" وہ اب شہلا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"شہلا واجد۔۔" اس نے مسکرا کر اپنا نام بتایا تھا۔

"اوہ۔۔ یعنی کہ واجد بھائی کی بیٹی۔۔" اس نے عیشہ کو دیکھا تو اس نے سر ہلایا۔

"میں ذرا امی کے پاس چکر لگا لوں، پھر آتی ہوں۔۔" اگلے ہی لمحے وہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔

"آپ نے مجھ سے انکار کرتے ہوئے جھوٹ بولا تھا، آپ کی کسی سے کمٹمنٹ نہیں تھی۔۔" محسن جاوید کی نظریں شہلا کے

تعاقب میں تھیں جب عیشہ کی اس دھیمی آواز پر متوجہ ہوا۔

"آپ کو کس نے کہا۔۔؟" دھیان سے پوچھا۔

"فوزان کے پاپا نے۔۔"

"مائی گاڈ۔ کتنا نیچرل انداز ہے۔۔"

"سچ سچ بتائیں عیشہ! آپ تو کہہ رہی تھیں کہ یکطرفہ محبت ہے مگر شہباز بھائی نے میرے انکار سے متعلق درست خبر آپ کو کیسے دے دی۔۔" وہ جھینپ گئی تھی۔

"یہ اب بھی یکطرفہ محبت ہے۔۔ بس گھر والوں کا تعاون تھا کہ آج یہ تقریب رونما ہوگئی ہے ورنہ "ان" سے تو کوئی امید نہیں۔"

شہباز، مہوش اور قیوم کے بعد یہ چوتھا شخص تھا جو اس کے دل کا راز پا گیا تھا۔ اس کا بے تکلف انداز عیشہ کو اچھا لگا تھا، دوستانہ انداز میں اس نے بھی بتا دیا۔

"ویسے شہباز بھائی جانتے ہیں۔۔" وہ پوچھ رہا تھا، اس نے گردن ہلا دی۔

"مگر مانتے نہیں ہیں نہ۔" اس کی آواز بھرا گئی، وہ ہنس دیا۔

"تو فکر کیوں کرتی ہیں۔۔ اتنا مضبوط تعلق بن گیا ہے دونوں میں۔۔ وقت کے ساتھ ساتھ مان جائیں گے۔۔" اس نے اسے دلاسا دیا تو وہ سر ہلا گئی۔

"ویسے عیشہ! آپ کی بہن بھی آپ کی طرح بہت ہی پیاری ہیں۔۔ کیا خیال ہے۔۔؟" اس کی اس بات پر اس نے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔

"کیا مطلب۔۔؟"

"آپ کیلئے انکار پر ابو ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں۔۔ شہلا کو دیکھنے کے بعد سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ ابو کو راضی کر لوں۔۔ آخر کو رشتے کروالدین ہی آتے ہیں۔۔" عیشہ نے بے حد انبساط و حیرت سے دیکھا۔

"واقعی۔" اس نے پوچھا تو اس نے فوراً سر ہلایا تھا۔ وہ پھر دو تین باتیں کر کے نیچے اتر گیا تھا، کھانے کے بعد فوٹو گرافی کا سلسلہ چل نکلا تھا، شہباز حیدر کو قیوم حیدر نے زبردستی عیشہ کے ساتھ لا بٹھایا تھا۔ واجد صاحب کا بیٹا دونوں کے مختلف پوز لینے لگا تھا۔

"چاچو پلیز! چہرے پر اسمائل لائیں۔۔ یوں لگ رہا ہے جیسے آپ کو زبردستی بٹھایا گیا ہے مار کر۔۔" وہ چھیڑ رہا تھا، شہباز حیدر کے چہرے کے سنجیدہ زاویوں میں مطلق فرق نہیں آیا تھا۔

"جیٹھ صاحب! اب ایسی بھی کیا سنجیدگی، اتنی چاند سی پیاری دلہن آپ کو دے رہے ہیں مگر مجال ہے چہرے کے تاثرات بدل جائیں۔۔" مہوش بھی سنجیدہ شکل پر تبصرہ کرنے سے باز نہیں آئی تھی، عیشہ کا دل تو شہباز کی قربت پر تمام دیواریں توڑ کر باہر آنے کو تھا۔ فوٹو گرافی کے بعد سلامی اور تحائف کا سلسلہ چلا تھا، رات کے بارہ بجے کے نزدیک تقریب اختتام کو پہنچی تھی، عیشہ کا ایک ہی زاویے سے بیٹھ کر برا حال ہو رہا تھا، کمر تختہ بن چکی تھی، مہوش اسے سہارا دے کر کمرے میں لے آئی۔

"سنو! اب کچھ نہیں اتارنا، میں آتی ہوں، شہباز بھائی بلا رہے تھے، ان کی بات سن لوں۔۔" وہ اسے بٹھا کر چلی گئی تھی، شہباز کے نام پر دل کی دھڑکن بڑی نرالی تھی، وہ خود ہی محجوب سی ہنس دی۔

"اور کتنی نفرت کریں گے مجھ سے آپ۔۔ میرے بن چکے ہیں۔۔ ایک دفعہ آپ کی زندگی میں آ جاؤں پھر ساری نفرت

دور کردوں گی۔۔ صرف ایک دفعہ۔۔" اپنے خیال پر وہ خود ہی شرما گئی۔۔ بیڈ کی پشت سے سر ٹکا کر اس نے کمر بھی تکیوں سے ٹکا کر پاؤں سیدھے کیے۔ مہوش اسے بٹھا کر خود پتہ نہیں کہاں گم ہوگئی تھی، اس نے خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کھٹکنے کی آواز پر وہ متوجہ ہوئی۔

"مہوش بچی کہاں رہ گئی تھیں آپ۔۔ مجھے کپڑے بدلنے تھے۔۔ تھکن سے برا حال ہو رہا ہے میرا۔۔" آنکھیں کھولے بغیر وہ کہہ رہی تھی، مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"آپ۔۔؟" شہباز حیدر کو اپنے سامنے کھڑے خاموشی سے دیکھتے پا کر وہ فوراً سیدھی ہوئی تھی۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔۔" اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے وہ اندر چلے آئے تھے۔ عیشہ کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا، حیرت سے شہباز حیدر کے انتہائی سنجیدہ چہرے کو دیکھنے گئی۔ وہ بستر پر بیٹھے تو اس نے تیزی سے ٹانگیں سمیٹیں، پھر چہرہ بھی جھکایا، شرم ایک دم درمیاں میں آٹھہری۔

"میں اب تک سمجھ رہا تھا کہ تمہاری دیوانگی ایک وقتی جذباتیت ہے، اسی لیے میرا خیال تھا کہ میرے تلخ رویے، ڈانٹ پھٹکار سے تمہیں عقل آجائے گی مگر۔۔" ان کی بات عیشہ کو کچھ پلے نہ پڑی تھی، وہ حیرت سے ان کا ٹھنڈا سنجیدہ لہجہ۔

"یہ رشتہ بظاہر جتنا مضبوط ہے اتنا ہی کمزور ہے۔۔ میں بھی سنجیدہ نہ ہوتا اگر گھر والے اس قدر سنجیدگی سے اس معاملے میں انوالو نہ ہوتے۔ ہمارا نکاح میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور یہی بات میں تمہیں باور کروانا چاہتا ہوں، مجھ سے تم کسی بھی قسم کی توقعات وابستہ مت کرنا۔۔ فوزان کے لیے تم میری زندگی میں داخل ہوا چاہتی تھیں، میرے گھر والوں کا بھی یہی موقف ہے، اسی لیے تم آج سے فوزان کے لیے ہی مخصوص ہو۔ رہ گئی بات رخصتی کی تو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔۔ تم نے جس طرح قیوم اور مہوش کو اپنے ساتھ ملا کر یہ سارا ڈرامہ اسٹیج کیا ہے، میرے دل میں تمہارے لیے جو تھوڑی بہت عزت افزائی تھی وہ بھی ختم ہوگئی ہے۔ تمہارے نزدیک رخصتی کی بات کوئی اہمیت رکھتی ہو مگر میرے لیے تم کل بھی کچھ نہیں تھی، آج بھی کچھ نہیں ہو، نہ ہی کل کچھ ہو گی۔۔" تلخی سے کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ عیشہ جیسے پتھرا گئی تھی، کیا محبت کرنا واقعی جرم ہے۔۔ کیا اس نے شہباز حیدر سے محبت کر کے واقعی کوئی جرم کیا تھا۔ وہ بالکل ساکت تھی۔

"میں اب تک سمجھ رہا تھا کہ تم بچی ہو۔۔ اس عمر میں دل کے تقاضے انسان کو بری طرح خوار کرتے ہیں۔۔ میں شاید تمہاری کم عمری کا ایڈوانٹیج دے کر تمہاری طرف مائل ہو ہی جاتا اگر مجھے یہ سب علم نہ ہوتا کہ یہ سب کیا دھرا مہوش اور قیوم کا ہے، جو تمہارے لیے کر رہے ہیں۔۔" اپنے کمرے میں بیٹھے وہ دونوں خود سے باتیں کر رہے تھے لیکن جس طرح وہ میرا ذکر کر رہے تھے تمہارے معاملے میں مجھے انوالو کر رہے تھے تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت تمہیں شوٹ کرا دوں۔۔" اپنے کردار کے معاملے میں وہ انتہائی جذباتی تھے، اب بھی ایک دم غصے سے کہا تو عیشہ جیسے ہوش میں آئی۔ لرز کر رہ گئی۔ ان کی آنکھیں۔۔ وہ تو دیکھ بھی نہ پائی۔

"وریشہ کے بعد تو میں نے کبھی کسی اور جانب نگاہ ہی نہ کی تھی، پھر بھلا تم جیسی کم عمر امیچور لا ابالی سی لڑکی کو کیسے اپنی طرف انوالو کر لیتا۔۔ میں نے تو ہر ممکن کوشش کی تھی کہ تم جو حماقت سر انجام دینا چاہتی ہو باز آ جاؤ مگر۔۔" وہ سخت اضطراب کا شکار تھے، کمرے میں ٹہلنے لگے۔

"مہوش اور قیوم کے سامنے تم نے میرے متعلق کیا کہا تھا جو دونوں کہہ رہے تھے کہ شہباز بھائی آخر کب تک انکار کر سکتے تھے۔۔۔ عیشہ جیسی لڑکی تو بڑے بڑوں کی سدھ بدھ کھو دیتی ہے، اگر وہ انوالو نہ ہوتے تو اتنی جلدی ہتھیار کیسے ڈال دیتے۔۔ مجھے تو لگتا ہے کہ شہباز بھائی کا ہی کوئی طرز عمل عیشہ کو اس حد تک لے جانے کا سبب بنا ہے۔۔ بولو۔۔ کیوں انہوں نے یہ بات کہی۔۔ بولو جواب دو۔۔" وہ تو خود گنگ تھی، وہ کیا جواب دیتی، شہباز کا یہ سب الفاظ دہراتے غصے سے برا حال ہو رہا تھا، انہوں نے ہمیشہ ایسی

زندگی گزار دی تھی جو ہر طرح کے الزام سے پاک تھی، مگر عیشہ کے معاملے میں مہوش کی زبانی گفتگو سن کر اس کو سخت دھچکا لگا تھا۔

"مجھے نہیں پتا انہوں نے ایسا کیوں کہا۔۔ یقین کریں۔۔ میں نہیں جانتی۔۔" شہباز سے تو وہ پہلے ہی خائف رہتی تھی، اب اس کا غصہ دیکھ کر مزید ڈر گئی، شہباز نے شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھا۔ گولڈن میرون شرارے میں وہ جیولری پہنے دلہن میک اپ میں ایک ایسی جیتی جاگتی قیامت لگ رہی تھی، شہباز حیدر نے سختی سے اپنے خیال کو جھٹک دیا۔ ایک نفرت کی نگاہ اس پر ڈالی۔

"انہیں تمہارے متعلق یہ سب کیسے علم ہوا۔۔؟" سختی سے باز پرس کی گئی تھی، وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

"اس رات جب۔۔" وہ آہستگی سے سب بتاتی گئی، وہ خشمگیں نظروں سے سب سنتے رہے۔

"میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں بتایا تھا، اس کے بعد جو بھی ہوا مہوش چچی نے ہی کیا تھا۔۔ دادی جان اور چچی جان سے بھی شاید انہوں نے ہی بات کی تھی۔۔" سر جھکائے وہ اعتراف جرم کر رہی تھی۔

"دیکھ لیا اپنی کم عقلی کا نتیجہ۔۔ تمہاری ذرا سی لغزش لوگوں کو نجانے کس انداز میں سوچنے کا موقع دے دیتی ہے۔ تمہیں شاید کوئی فرق نہ پڑے گا مگر مجھے اپنے کردار کی بڑی پرواہ ہے۔۔ جو ہو گیا وہ تو ایک طرف۔۔ آئندہ تمہاری طرف سے مجھے کچھ بھی الٹا سیدھا سننے کو ملا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" شدید غصے سے کہہ کر دروازہ دھماک سے بند کرتے چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد عیشہ کا کب کا رکا سانس بحال ہوا۔ مہوش چچی نے ایسی بات کیوں کی۔۔ کیا وہ نہیں جانتیں کہ یہ میرے یکطرفہ جذبات تھے، شہباز کا تو ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ پتا نہیں ان کے لیے اس نے کئی راتیں جاگ کر دعائیں مانگی تھیں اور آج یہ رات نصیب میں آئی بھی تھی، تو دامن میں لاکھوں نفرت سے وہ تلخ یادیں ڈال گئی تھیں، ابھی سے اتنا غصے والا انداز ہے۔۔ بعد میں پتہ نہیں کیا ہوگا۔۔ اب وہ مستقبل کے خوف سے ہلکان ہوا جا رہا تھا گویا ہو گئی تھی۔

اگلے دن صبح ہوتے ہی وہ مہوش کے پاس جا پہنچی تھی، ان سے شہباز کا رویہ بتا کر اس طرح گفتگو کا سبب پوچھا تو وہ ہنستی چلی گئیں۔

"احمق ہو تم بھی اور تمہارے وہ صاحب بھی۔۔ کل صبح اچانک وہ ہمارے کمرے کے پاس سے گزرے تو مجھے شرارت سوجھی تھی، میں نے فوراً بات پلٹ کر ایسا کہنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ سن رہے ہیں جان بوجھ کر ایسی باتیں کی تھیں، صرف ان کو یہ باور کروانے کے لیے کہ اگر وہ اس طرح چپ رہ کر اپنی ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کر رہے ہیں تو ہم بھی بے خبر نہیں اور انہوں نے اس مذاق کو اپنے انداز میں لے لیا۔۔ اوہ مائی گاڈ۔" وہ ہنس رہی تھیں، عیشہ خاموشی سے دیکھے گئی۔

"مجھے پتہ نہیں تھا وہ اتنے احمق بلکہ بیوقوف ثابت ہوں گے، بجائے ہمارے اس تعاون پر ہمارا شکریہ ادا کرنے کے وہ نئی جنگ چھیڑ کر بیٹھ چکے ہیں۔۔ کردار پر جب بات آتی ہے تو سب کو ہی غصہ لگتا ہے۔۔ یہی بات میں تمہارے حوالے سے انہیں بتانا چاہتی تھی مگر الٹی پڑ گئی ہے۔"

"پھر بھی آپ کو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔۔ وہ اتنے غصے ہو رہے تھے مجھ پر کہ حد نہیں۔۔ نجانے کیا کچھ سخت سست کہتے رہے۔۔" رات کی باتیں یاد آتے پھر سے آنکھیں بھر گئیں۔

"اوہو۔۔ رونا نہیں۔۔ میں خود بھائی صاحب سے بات کر کے معاملہ جکڑ لوں گی۔۔ تھوڑی بہت ان کی بھی برین واشنگ ہونے کی ضرورت ہے۔۔ دیکھو کیا کرتی ہوں، تم اب آرام سے رہو۔۔ نکاح ہو چکا ہے دونوں کا، کچھ نہیں کہیں گے وہ۔" انہوں نے اسے پھر سے بہلا لیا تھا۔ مہوش نے شہباز سے بھی بات کی تھی، اس کا کیا ردعمل تھا، عیشہ کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ دو دن بعد وہ

یونیورسٹی جانے کو تیار ہو کر کمرے سے نکلی تو شہباز ٹیبل پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے، نکاح کے بعد پہلا تصادم تھا، اس رات کے بعد تو وہ ان کے سامنے آنے سے بھی ڈرنے لگی تھی، انہوں نے سرسری نظر ڈالی تھی۔ چچی امی نے اس کی بلائیں لیں، پھر ناشتہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ شہباز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے وہ خاموشی سے ناشتہ کر رہی تھی، جب شہباز نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"شہباز بیٹا! آج سے عیشہ کو تم یونیورسٹی چھوڑ کر آیا کرو گے۔۔ خیر سے یہ تمہاری ذمہ داری ہے، یہ اکیلی کیوں آیا جایا کرے۔۔" عیشہ نے حیران ہو کر چچی امی کو دیکھا، شہباز نے اس حکم پر ناگواری سے اسے دیکھا تھا، وہ فوراً سر جھکا گئی۔ وہ ہمیشہ اکیلی ہی یونیورسٹی کی بس میں ہی آتی جاتی تھی مگر آج۔۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔۔" اس وقت کچن میں ان تینوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا، اسی لیے شہباز حیدر نے اپنی ناگواری نہیں چھپائی تھی۔

"شہباز۔۔" انہوں نے سختی سے ٹوکا تو عیشہ نے گھبرا کر دیکھا۔

"رہنے دیں چچی۔۔ میں چلی جاؤں گی۔۔ اور خود ہی تو جاتی ہوں۔۔ یونیورسٹی روٹ کی بس ہمارے روٹ سے ہی گزرتی ہے۔۔" شہباز حیدر کے تیوروں سے خائف ہو کر اس نے فوراً مداخلت کی تھی۔

"پہلے کی بات اور تھی۔۔ جب گھر میں شوہر کی گاڑی کی سہولت موجود ہے تو پھر تم کیوں بسوں، ویگنوں میں خوار ہو۔۔ ویسے بھی اب تم شہباز کی ذمہ داری ہو۔۔" اس نے کن انکھیوں سے شہباز کے چہرے کے تاثرات کی ناگواری جانچی۔

"میں گاڑی نکال رہا ہوں۔۔" ماں کی بات کے جواب میں کہتے وہ باہر نکل گئے تھے، عیشہ نے بے چارگی سے چچی کو دیکھا۔

"انہیں کوئی کام ہوگا۔۔ رہنے دیں۔۔" وہ خود بھی شہباز کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی مگر کہتی کسے۔۔

"کچھ نہیں ہوگا۔۔ اپنے کام پر جاتے تمہیں بھی چھوڑ دے گا۔۔ تو قیامت نہیں آ جائے گی۔۔" شہباز حیدر کے تیور وہ بھی اچھی طرح سمجھ رہی تھیں، اسی لیے تو انہوں نے یہ نیا حکم نامہ نافذ کیا تھا۔ مرے مرے قدموں سے باہر آئی تو وہ منتظر تھے، گاڑی میں بیٹھتے ہی انہوں نے تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کی تھی، عیشہ ان کے بگڑے زاویے دیکھ کر ہولتی رہی۔

"آج کے امی کے اس نئے حکم نامے کا میں کیا مطلب سمجھوں۔۔؟" سرخ سگنل پر گاڑی رکی تھی، جب نہایت تلخ آواز میں پوچھا گیا تھا۔

"جی۔۔" وہ کچھ نہیں سمجھی تھی۔

"دیکھو عیشہ۔۔ میں تمہاری اپنی زندگی میں اس حد تک بے جا مداخلت قطعی برداشت نہیں کروں گا۔۔ انسان کی برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔۔ میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرے ساتھ یہ سب نہیں چلے گا۔۔ گھر والوں کی وجہ سے تمہیں فی الحال کے لیے برداشت کرنے پر مجبور ہوں، تو میری اس مجبوری کو میری زندگی کا امتحان مت بناؤ۔۔ ورنہ پچھتاؤ گی۔۔" انتہائی سخت لہجے میں جیسے دنیا بھر کی بیزاری لیے انہوں نے اندر کی ساری تلخی اس پر انڈیلی تھی۔

"میں نے چچی جان کو منع کیا تھا۔۔" اپنی اس قدر عزت افزائی پر پہلے تو وہ ہکا بکا رہ گئی، پھر بمشکل کہا۔ ابھی تو آنسو پہلے امڈ آئے۔ ہر بار یہ شخص اسے رلا دیتا تھا۔ سگنل کھلنے پر شہباز نے گاڑی آگے بڑھا لی تھی، عیشہ کو تسلسل سے آنسو بہاتے دیکھ کر وہ الجھا۔

"کیا لوگی چپ ہونے کا۔۔" سرد آواز پر اس کے آنسو بھی ٹھہر گئے۔

"کیا مصیبت ہے۔۔ زندگی عذاب ہو کر رہ گئی۔۔" وہ اب خود سے بڑبڑا رہا تھا، عیشہ کا دل پھر بھر آیا، پھر ہاتھوں

میں چہرہ چھپا کر رو دی۔ یہ بھی زندگی کا کیسا ساتھی تھا، پتھر۔ سنگدل۔۔ کٹھور۔۔

"عیشہ۔۔" بے چارگی سے ایک طرف گاڑی روک کر اس کی طرف رخ کیا، انداز ایسا تھا کہ جیسے ایک پل میں اسے کہیں غائب کر دیں گے۔۔ یا پھر۔۔" وہ اس وقت ضبط کی انتہا پر تھے۔

"مجھے نہیں جانا آپ کے ساتھ کہیں۔۔ بس اتار دیں یہیں۔۔ چلی جاؤں گی میں خود ہی۔۔" اگلے ہی پل دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا تھا، اس سے پہلے کہ وہ نیچے اترتی، شہباز حیدر نے جھنجھلا کر غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک کر زور سے دروازہ بند کر کے لاک کیا تھا۔

"بکواس نہیں کرو۔۔ آرام سے بیٹھی رہو۔۔" غصے سے گھورتے وارن کیا گیا تھا۔

"کیوں۔۔ جب آپ کو میرا وجود اتنا ہی ناگوار گزر رہا ہے تو جانے دیں۔۔ آپ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے۔ نہیں جاؤں گی میں آپ کے ساتھ کہیں۔۔ دروازہ کھولیں۔۔" اپنی اس درجہ ہتک آمیزی اور عزت افزائی پر وہ بھی چیخ اٹھی تھی، غصے سے روتے ہوئے شہباز حیدر کو دیکھا، جو لب بھینچے اس کے اوپر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

"اس رات اتنی بری طرح بے عزت کر دیا تھا کہ میرا کوئی قصور بھی نہ تھا۔ صبوحی چچی کا مذاق میرے گلے پڑا اور اب آپ کی امی نے آپ کو کہا تھا میں نے تو کہا ہی نہیں۔۔ آپ کے پاؤں نہیں پڑی تھی کہ مجھے بھی ساتھ لے کر جائیں۔۔ آپ نے فوزان کی وجہ سے یا کسی کے کہنے پر مجھے برداشت کیا ہے تو ہر بار جتانے کی ضرورت نہیں۔۔ میں یہ اچھی طرح جانتی ہوں، پتھر ہیں آپ۔۔ میں سمجھتی تھی کہ پتھر کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے مگر آپ تو۔۔" وہ بری طرح شدت سے رو دی۔

"دروازہ کھولیں۔۔ میں چلی جاؤں گی۔ دو پیسے کے علاوہ تو میری ہر ذمہ داری میرے باپ نے نہیں سنبھالی آپ کیا سنبھالیں گے۔۔ پلیز دروازہ کھولیں۔۔ یہ احسان نہیں کریں مجھ پر۔" غصے اور بے بسی کے جذبات کا بہاؤ اترا تو بالکل چپ ہو گئی، مگر آنسو نہ رکے۔ اس کی عزت نفس پر یہ گہری چوٹ لگی تھی، جو تکلیف بھی شدید تھی۔ شہباز حیدر نے خاموشی سے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی، وہ دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے ابھی بھی رو رہی تھی، اور پھر مسلسل روتی رہی۔ حتیٰ کہ شہباز نے اس کی یونیورسٹی کیمپس کے سامنے گاڑی روک دی تھی۔ وہ اترنے لگی، مگر دروازہ لاک تھا، رخ موڑ کر شہباز کو دیکھا۔

"چہرہ صاف کرو اپنا۔۔" انتہائی سخت، بے لچک انداز میں کہا گیا تھا، اور ساتھ ہی آگے بڑھ کر دروازہ لاک کیا تھا۔

"بے فکر رہیں، میرے رونے سے آپ کے کردار پر کوئی بات نہیں آئے گی۔۔" اسی تلخی سے اس نے جواب دیا۔

"عیشہ۔۔" شہباز نے بری طرح ٹوک دیا۔ عیشہ جواباً پرواہ کیے بغیر سر جھٹک کر گاڑی سے اتر گئی تھی۔

* * *

شہباز حیدر کے لیے عیشہ کی موجودگی ناقابل برداشت تھی تو عیشہ نے بھی خود کو اتنا مضبوط کر لیا کہ شہباز حیدر کا ہونا یا نہ ہونا اس کے لیے ایک برابر ہو گیا۔ وہ اس سے محبت ضرور کرتی تھی، دونوں کے درمیان ایک مضبوط تعلق تھا، سو وہ مطمئن تھی، اور یہی اطمینان اس دن کے بعد جب شہباز کی گاڑی میں تھی کے بعد اس کے ہر انداز سے چھلکنے لگا تھا، اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب شہباز حیدر کو اپنی اس درجہ تذلیل کرنے کا موقع نہیں دے گی۔ اس نے بھی خود کو جان بوجھ کر بے حسی کی چادر اوڑھا دی تھی، فوزان کی ذمہ داری وہ اب بھی پوری خوش اسلوبی سے نبھاتی تھی، مگر شہباز حیدر کے سلسلے میں اس نے مکمل لاتعلقی اختیار کر لی تھی، ایک گھر میں رہتے ہوئے سب کی موجودگی میں یہ ممکن تو نہ تھا مگر شہباز حیدر کے سلسلے میں اس نے یہ ممکن کر لیا تھا۔

محسن جاوید کا رشتہ شہلا واجد کے لیے آیا تھا، ویسے تو یہ سب کے لیے حیرت کی بات تھی مگر عیشہ کو شاید اس رشتے کی امید تھی

اور پھر بڑوں میں یہ رشتہ فائنل ہو گیا تھا۔ دونوں طرف سے باقاعدہ منگنی کا ارادہ تھا، منگنی کے دنوں میں وہ فوزان سمیت واجد صاحب کے ہاں چلی آئی تھی، یونیورسٹی سے ادھر چلی جاتی تھی، فوزان بھی پابندی سے اسکول جا رہا تھا، منگنی کی تقریب تین دن بعد تھی، ہفتہ ہو گیا تھا اسے یہاں آئے ہوئے۔ آج کل اس کے بہت ضروری پریکٹیکل ہو رہے تھے، اس لیے روز یونیورسٹی آنا پڑ رہا تھا۔ آج بھی اسی سلسلے میں وہ آئی تھی، سارا دن مصروف گزرا تھا، تین بجے کے قریب وہ فارغ ہوئی تھی۔ شہلا کو آج شاپنگ کے لیے جانا تھا، اس نے جلدی آنے کو کہا تھا، وہ تیز تیز قدم اٹھاتے گیٹ سے باہر نکلی تھی، مگر اپنے سامنے کھڑی سیاہ گاڑی کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ بڑے ریلیکس موڈ میں گاڑی سے ٹیک لگائے، سن گلاسز لگائے شہباز حیدر منتظر تھے، جبکہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر نظر آتے شہلا اور فوزان کے چہرے۔۔

"آپ۔۔" پورے ایک ہفتے بعد دیکھ رہی تھی، سو۔۔ بھی یہاں۔۔ حیرت یقینی تھی۔

"السلام علیکم۔۔" اسے ایک اور جھٹکا لگا، بغور دیکھا، یہ شخص اس پر سلامتی بھیجتا تو دور کی بات نفرت کی نظر ڈالتے ہوئے بھی ہزار بار سوچتا تھا، وہ خاموشی سے سر ہلا گئی۔ شہلا نے بھی اسے دیکھ کر گاڑی کا شیشہ نیچے کیا۔

"آپ کے انتظار سے گھبرا کر میں آپ کو لینے آ گئی ہوں۔۔ شہباز بھائی یونہی آئے تھے، میں نے چلنے کو کہا تو چلے آئے۔۔ اب فافٹ بیٹھیں، پہلے ہی بڑی دیر ہو چکی ہے۔۔" شہلا کی بات پر اس نے ایک گہری سانس لی، ورنہ شہباز حیدر کی غیر متوقع آمد پہ جانے دل خوش فہمیوں کے کن سمندروں میں ڈبکی لگا آیا تھا۔ گاڑی کے مسکرا کر وہ آگے بڑھی، فرنٹ ڈور کھلا ہوا تھا، وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

"فوزان۔۔ آپ اسکول سے کب آئے۔۔ اور یہ یونیفارم بھی نہیں بدلا!۔۔" پچھلی طرف رخ کر کے اس نے فوزان سے پوچھا تھا۔

"یہ ایک بجے ہی آ گیا تھا، دادا جان عدیل وغیرہ کو لینے گئے تو ان کے ساتھ چلا گیا تھا، دو بجے کے قریب شہباز بھائی اسے یہیں چھوڑنے آئے تھے، کہہ رہے تھے کہ آپ کے پاس آنے کی ضد کر رہا تھا۔" شہلا نے جواب دیا تھا۔

"کھانا کھایا تھا۔۔؟"

"دادا نے کھلایا تھا۔۔ پھر پاپا نے آئس کریم کھلائی تھی۔۔ ماما میں آگے آ جاؤں۔۔؟" اس کے مسکرا کر سر ہلانے پر وہ سیٹ کی بیک سے جلدی سے اچھل کر آگے آ گیا تھا، اس کی جھولی میں بیٹھ کر بتانے لگا۔

"ماما۔۔ بابا نے پرامس کیا ہے کہ وہ آج مجھے شاپ سے اچھے اچھے کپڑے لے کر دیں گے۔۔ کھلونے بھی اور بڑا سا جہاز بھی۔۔" فوزان کے چہرے کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی، وہ مسکرا دی۔

"پاپا ماما کے بھی اچھے اچھے کپڑے لیں گے اور آپ کے بھی۔۔" اس کے مسکرانے پر وہ فوراً گاڑی ڈرائیو کرتے شہباز کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ عیشہ نے فوراً رخ بدل لیا، باہر دیکھنے لگی، اس دن کے بعد اس نے اس شخص سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔

"ہوں۔۔" شہباز نے بیٹے کے جواب میں کہا تھا۔

"ماما۔۔ آپ کیسے کپڑے لیں گی۔۔؟ بالکل ویسے لیجئے گا جیسے آپ نے اس دن پہنے تھے جب آپ دلہن بنی تھی نا۔۔ پاپا ہم ماما کے دلہنوں والے کپڑے لیں گے۔۔ ہیں نا۔۔؟" وہ شہباز کے ساتھ ساتھ اس کا بھی سر کھا رہا تھا۔ عیشہ ایک دم خفت سے دوچار ہوئی۔

"فوزی چپ کر کے بیٹھو۔۔" اس نے ٹوک دیا۔ "بڑی باتیں کرنی آ گئی ہیں تمہیں۔۔" شہباز حیدر نے رخ موڑ کر اسے دیکھا اور سرخ خفت سے دوچار چہرے پر ہنسی کے آثار تھے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی شہلا عیشہ کے فوزان کو ڈانٹنے پر ہنس دی۔

''بھلا بچے بیچارے کو کیوں ڈانٹ رہی ہو۔۔اس میں اس کا کیا قصور۔۔۔؟''

''بڑا تیز ہوتا جا رہا ہے یہ۔۔'' منہ بسورتے فوزان کو دیکھ کر اس نے اپنی خفت مٹائی تھی، ہلکی سی چپت لگائی تھی، اس کا منہ پھول گیا۔

''مجھے نہیں بیٹھنا آپ کے پاس۔۔گندی ہیں۔۔ڈانٹتی ہیں، پاپا! ماما گندی ہیں۔۔'' فوزان کو ڈانٹ کا بڑا جاتا تھا، فوراً واک آؤٹ کر جاتا تھا، اب بھی عیشہ کے ڈانٹنے پر برے برے منہ بناتا اس کی گود سے نکل کر شہباز کی گود میں جا بیٹھا تھا، شہباز نے گاڑی ڈرائیو کرتے اس کے گرد بازو لپیٹ کر سیدھا کیا تھا، پھر مسکرا کر دیکھا۔ عیشہ چپ کر کے باہر دیکھنے لگی۔ شہلا نے اپنی ضروری شاپنگ کرنی تھی، اس نے وہ کی تھی۔ شہباز حیدر نے فوزان کے لیے کچھ کپڑے کھلونے اور ضروری چیزیں لی تھیں، پھر سردیوں کا موسم تھا، اسی مناسبت سے کپڑے خریدے تھے، شہلا کے بار بار کہنے پر بھی عیشہ نے کچھ نہیں لیا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اس کے پاس پیسے نہیں تھے دادا جان واجد صاحب، دادی امی، سب ہی اسے اکثر پیسے دیتے رہتے تھے، اس وقت بھی اچھے خاصے پیسے تھے مگر دل جب مرا ہوا ہو تو کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی، شہباز حیدر ہوتے تو شاید کچھ لے لیتی مگر اب دل میں کوئی جذبہ نہ تھا، پھر اس کے پاس اچھے خاصے کپڑے موجود تھے۔ نکاح کے لیے پانچ چھ اچھے خاصے قیمتی فینسی ڈریس چچی جان نے بنوائے تھے، وہ بغیر چھوئے پڑے ہوئے تھے، وہ مطمئن تھی، مگر ان میں سے کوئی ایک پہن چکی تھی۔ وہ دونوں جیولری کی دکان میں تھیں، جب شہباز فوزان کو ان کے پاس چھوڑ کر خود چلا گیا تھا، ایک گھنٹے کے بعد ان کی آمد ہوئی تھی، ان کے ہاتھ میں کئی شاپرز تھے، شاید انہوں نے اپنے لیے شاپنگ کی تھی، شہلا کی شاپنگ مکمل تھی، صرف شہباز کا انتظار تھا، شام ہو رہی تھی، عیشہ کا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا، صبح سے پیٹ میں سلائس اور ایک چائے کے کپ کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا، اوپر سے یہ بازار کی خریداری۔۔سارا دن باہر گزار کر اب اس کا جسم درد سے چور چور ہو رہا تھا۔

واپسی میں شہباز ان کو ایک ریسٹورنٹ میں لے آئے تھے، عیشہ سیدھا گھر جانا چاہتی تھی، اسے ہوٹلوں کی یہ عیاشی بھی اچھی نہ لگی تھی مگر اب کیا کہہ سکتی تھی، اس نے شہباز حیدر سے بھی نہ بولنے کی قسم کھائی تھی، بھوک سے برا حال ہونے کے باوجود عیشہ واجد نے ایک لقمہ بھی نہیں لیا تھا۔ فوزان شہلا نے اس سے کتنی مرتبہ کچھ نہ کچھ کھا لینے کا اصرار کیا تھا، مگر پانی کے ایک گلاس کے علاوہ اس نے حلق سے کچھ بھی نہ اتارا تھا۔ شہباز حیدر اسے فوزان کی وجہ سے اپنی زندگی میں شامل کرنے پر مجبور ہوا تھا، وہ جان گئی تھی سو اس نے خود کو فوزان کی حد تک محدود کر لیا تھی، وہ اس شخص کا کوئی احسان نہیں لینا چاہتی تھی، واپسی کا سفر وہ شام کے گہرے اندھیرے میں کچھ نہ کچھ سوچتی رہی تھی۔ فوزان اسی کی گود میں تھا، وہ سارے دن کی تھکن کی وجہ سے سو چکا تھا شہلا اور شہباز کوئی نہ کوئی بات کرتے رہے تھے، جبکہ وہ بالکل گم صم تھی۔ آج شہباز حیدر جب تک ان کے ساتھ تھا قدم قدم پر اس کی موجودگی عیشہ کو ڈسٹرب کرتی رہی تھی مگر اس موجودگی میں بھی لاتعلقی تھی اور اسی لاتعلقی نے عیشہ واجد کے اندر کی رہی سہی طاقت بھی سلب کر لی تھی گھر آ کر اس نے سوتے ہوئے فوزان کو اٹھا کر سنبھال کر گاڑی سے قدم باہر رکھے تھے۔ جب شہباز نے دوسری طرف آ کر اس کے بازوؤں سے فوزان کو لے لیا تھا، وہ لب بھینچ کر اپنا بیگ کتابیں اور فائل لے کر سیدھی اپنے کمرے کی طرف آ گئی تھی، جو اس گھر میں اس کے لیے مخصوص تھا۔ شہباز حیدر فوزان کو اٹھائے دوسرے ہاتھ میں مختلف شاپنگ بیگز بھی بستر پر ڈھیر کیے۔ ان سب میں فوزان کی شاپنگ تھی مگر سبز رنگ کا وہ شاپنگ بیگ اٹھا کر شہباز نے اس کی طرف بڑھایا تھا، وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ ''یہ میں نے تمہارے لیے خریدا تھا۔۔'' عیشہ کے ہونٹوں پر بی آ ٹھہری۔

''کیوں۔۔''

شہباز نے بغور دیکھا، اس دن کی روتی بسورتی عیشہ کے برعکس کچھ مختلف سی لگی۔

''فوزان کے لیے کی تھی تو ظاہر ہے تمہارے لیے بھی کی ہے۔۔کیوں کا کیا سوال۔۔؟'' انہوں نے رعب سے کہا تھا مگر وہ ان کے رعب میں اب نہیں آنے والی تھی۔

''پلیز مجھ پر یہ احسان کرنے کی ضرورت نہیں۔۔اپنا یہ شاپنگ بیگ اٹھائیں اور لے جائیں۔۔۔مجھے آپ کی یہ خیرات نہیں چاہیے۔۔'' اگلے ہی لمحے وہ غصے سے پھنکاری تو شہباز نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔۔'' اگلے ہی لمحے ان کا ازلی غصہ عود کر آیا۔ خاص طور پر خیرات کے لفظ پر۔

''جی الحمدللہ۔۔مکمل ہوش و حواس میں ہوں اور مجھے اپنی اوقات بھی اچھی طرح یاد ہے۔۔میں نے اپنی ہی پوری کوشش کی تھی کہ بھولے سے بھی آپ کے منہ لگنے کی کوشش نہ کروں مگر آپ مجبور کرتے ہیں۔۔میرے لیے میرے باپ کا پیسہ کافی ہے۔ آپ اپنی یہ ''خیرات'' کسی اور کی جھولی میں جا کر ڈالیں۔۔'' وہ تو دو دھاری تلوار بنی ہوئی تھی۔ شہباز حیدر غم و غصے سے دیکھے گئے۔

''عیشہ۔۔'' خیرات کے لفظ پر وہ بری طرح دھاڑے تھے، وہ سر جھٹک گئی۔

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ آپ مجھے اپنے گھر والوں کی وجہ سے فوزان کی وجہ سے اپنانے پر مجبور ہوئے ہیں، اور میں صرف فوزان کے لیے مخصوص ہوں۔۔آپ کے نزدیک میری ذات کی کوئی اہمیت نہیں۔۔تو اب یہ عنایت کیوں۔۔اس لیے کہ آپ اپنے بیٹے کے حصے کی بچی کچی خیرات میری جھولی میں ڈال کر احسان کرنا چاہتے ہیں۔۔میں نے تو اس دن کے بعد آپ کی راہ میں آنا آپ کی طرف دیکھنا تو دور کی بات ذہن رادہ آنا تک چھوڑ دیا ہے۔۔جہاں مجھے گمان گزرتا ہے کہ آپ کی موجودگی ممکن ہے۔۔تو پھر یہ عنایت کیوں۔۔؟''

شہباز حیدر غصے سے اسے دیکھے گئے۔

''بس تمہارا دماغ خراب ہے، خناس بھرا ہوا ہے اس میں اور کچھ نہیں۔'' غصے سے شاپنگ بیگ بستر پر پٹختے وہ باہر نکل گئے تھے کہ عیشہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر وہ شاپر اٹھایا تھا، ان کے پیچھے لپکی تھی، وہ بغیر رکے اپنی گاڑی کی طرف چل رہے تھے۔

''کیا ہوا۔۔؟'' وہ بھی تیزی سے ان کے پیچھے بھاگی تو پیچھے سے شہلا نے آواز دی مگر وہ پلٹے بغیر ان تک پہنچی تھی، وہ گاڑی اسٹارٹ کر چکے تھے۔

''مجھے اس خیرات کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔۔میرے پاس اللہ کا دیا ہوا بہت کچھ ہے۔۔نہ ہی مجھے آپ کی اس نام نہاد قربت کی ضرورت ہے، جس کا راگ آپ الاپتے رہتے ہیں، اتنی ہی بری لگتی ہوں تو مجھے میری ذات کو تسلیم کرتے ہوئے میری بھائیوں کا ذکر کریں۔۔میں اف کر گئی تو کہیے گا۔۔مگر اس بے وجہ کا ٹھکرائے جانا برداشت نہیں کروں گی۔۔اپنے جذبوں سے بادر کر آپ کا نام مقدر میں لکھوایا ہے تو اس خیرات سے بڑھ کر حق طلب کرنے کا حق رکھتی ہوں۔۔اگر دینی ہی ہے تو مجھے میری وہ عزت دیجیے، جو بیوی ہونے کے ناطے آپ پر فرض ہے، یہ خیرات نہیں۔۔'' ان کی طرف آ کر کھڑکی میں جھک کر سب کہہ کر شاپنگ بیگ اندر پھینک کر وہ رکی نہیں تھی، تیز رفتاری سے پلٹ بھی گئی تھی۔ وہ گم صم حواس باختہ حیرت زدہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

✠ ✠ ✠

اقرار گئے، انکار گئے، ہم ہار گئے
جینے کے سب آثار گئے، ہم ہار گئے
کچھ یادیں اس کی بیچ سمندر ڈوب گئیں
کچھ سپنے اپنے رہ اس پار گئے ہم ہار گئے
اک عمر رہے ہیں جیت سے بے پروا لیکن

جب جیتنا چاہا جیون وار گئے ہم ہار گئے

وہ ابھی تک حیرت زدہ پریشان اور گم صم تھے۔ وہ جس لڑکی کو کبھی کسی خاطر میں نہیں لائے تھے، جسے ہمیشہ ڈانٹ کر کم عقل ناداں لڑکی سمجھتے رہے تھے، وہ ہی ان کی شکست کا باعث بنتی جا رہی تھی، اور وہ بھی بری طرح حیرت زدہ تھے۔ ابھی تک گم صم تھے کہ کیوں نہیں پا رہے تھے، جو حفاظتی بند باندھتے آ رہے تھے، وہ ایک دم کیوں ٹوٹتے جا رہے ہیں۔۔ ان دیکھی خواہشیں، جذبوں کا منہ زور ریلا ان حفاظتی بندھوں اور تختوں کی پروا کیے بغیر اب سب کچھ بہالے جانا چاہ رہا تھا۔ کیوں۔۔ وہ ایک دم اچانک کمزور پڑتے جا رہے ہیں۔۔ جذبے اس قدر منہ زور تھے، یا حفاظتی اقدامات بے حیثیت تھے، وہ ابھی تک حیرت زدہ تھے۔ وہ سچ ہار رہے تھے یا ابھی کوئی موقع باقی تھا۔ گزرے لمحوں کا حساب کرتے وہ خود سے بھی بے پروا ہو رہے تھے۔

کل شہلا کی رسم منگنی تھی، اس وقت سب ادھر گئے تھے مگر وہ بہت چاہنے کے باوجود ادھر نہیں جا سکے تھے، ادھر وہ بھی ان کی شکست کا سامان۔۔ جسے انہوں نے بار ہا رُلایا تھا، اور خوب رُلایا تھا، جسے اپنے لفظوں، جملوں، طنز کے نشتروں سے بارہا گھائل کیا تھا، جو ہر بار ان کے ہاتھوں بری طرح تختہ مشق بنتی تھی، ہتک کے ساتھ ذلت کا احساس اٹھاتی تھی۔ اپنے اندر کے کسی ہار جانے والے خدشے کے سر ابھارنے سے پہلے ہی وہ اسے بے عزت کر کے رکھ دیتے تھے، اور پھر بھی دل مطمئن نہ ہو پاتا تھا، ہار تو جیسے نصیب میں لکھی جا چکی تھی، وہ اس کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی، وہ ان کی بن چکی تھی، وہ ان کی زندگی میں اپنا نام منوا چکی تھی، پھر بھی وہ اسے جھڑک دیتے تھے۔ ہر بار دھتکار دیتے تھے، اور ہر بار دھتکار دینے کے بعد خود بھی تکلیف سے دوچار ہو جاتے تھے کہ ان کی طبیعت کا رنگ نہ تھا۔

دریشہ عبداللہ ان کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی، جو صرف ان کی تایازاد ہی نہیں، محبت بھی تھی، اور پھر وہ ان کی زندگی میں ایک خاص رشتے سے داخل بھی ہوئی۔ لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی، تین سال کے مختصر وقفے میں ان کی زندگی میں گل و گلزار کے باغات آباد کرنے کے بعد بے آباد بھی کر گئی۔ دریشہ کے بعد وہ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے، وقت سب سے بڑا مرہم ہے، فوزان کو عیشہ نے سنبھال لیا اور وہ اپنی ذات میں گم ہوتے چلے گئے، گھر والوں سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شادی کا اصرار بڑھا تو انہوں نے چپ اوڑھ لی۔ دریشہ کے بعد ان کا دل مردہ سا ہو گیا تھا، پھر اصرار بڑھا تو انہوں نے فوزان کا بہانہ کر کے ٹالنا شروع کر دیا، وقت رکنے کا نام تو نہیں۔۔ ہر زخم کا علاج ممکن ہے اور قدرت نے ان کے سامنے عیشہ واجد کو لا کھڑا کیا، جو ہو بہو دریشہ کی کاپی تھی۔ شکل و صورت سے لے کر عادات و اطوار میں بھی اسی جیسی، وہ سارے خاندان کی ہر دلعزیز اور محبوب لڑکی تھی۔ مگر باپ کی طرف سے بے اعتنائی کا شکار۔۔ واجد صاحب اس کا ہر لحاظ سے خیال رکھتے تھے مگر اولاد کو جو خصوصی توجہ والدین سے ملتی ہے، وہ ذرا نہ دیتے تھے۔ اس بات کا احساس سب کو تھا، اور تبھی اس کا خاص خیال رکھتے تھے، وہ پڑھنے کی شوقین تھی، سو ہر کسی نے اس کی پڑھائی کا خاص خیال رکھا تھا، وہ فوزان کے معاملے میں حد سے زیادہ حساس اور بچی تھی تو سب نے اسے فوزان کی ذات میں گم ہونے سے نہیں روکا تھا۔ اور شاید یہیں سے غلطی کی ابتدا ہوئی تھی، اور جب شہباز حیدر کو غلطی کی سنگینی کا احساس ہوا، وقت بہت گزر چکا تھا، عیشہ واجد کے دل و دماغ میں ایک واضح تشبیہ اتر آئی تھی، اور جب انہیں اپنے شک کے یقین ہونے پر مہر ثبت ہوئی تو انہوں نے حفاظتی اقدامات کرنے شروع کر دیے تھے۔ وہ اس ننھی سی لڑکی سے ڈر گئے تھے، جس کی گہری آنکھوں کے سمندر میں ان کی شکست کا سامان کرنے کے لیے کافی ہو سکتے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ جیسے وہ ان کی ذات کے گرد کھڑی بلند و بالا فصیلوں کو ڈھانے کے چکر میں ہے اور ہر بار اس کے سامنے کے بعد وہ اپنے گرد موجود فصیلوں کو مزید بلند کر لیتے تھے، وہ پتھر نہیں تھے مگر خود کو پتھر بنانے پر مجبور تھے۔ وہ بے حس نہیں تھے، مگر اپنی بے حسی کا مظاہرہ کرنے میں ہی انہیں عیشہ واجد کی بھلائی دکھائی دے رہی تھی، ایسے میں فوزان کا اس سے حد سے زیادہ لگاؤ، وہ جتنی بھی کوشش کرتے کہ فوزان کی توجہ اس کی ذات سے ہٹ کر اپنی طرف مبذول کروا لیں، انہیں اس قدر ناکامی کا سامنا کرنا

پڑتا تھا۔ اور وہ ایک ماہ جو انہوں نے انکشاف کے بعد فوزان کو اپنی طرف ملتفت کرنے میں گزارا تھا، وہ ایک ماہ بھی بیکار گیا، انہیں اپنی حماقت کا شدید احساس ہوا جب انہوں نے بہلا پھسلا کر فوزان کو اپنے پاس سلانے پر راضی کر لیا تھا، مگر آدھی رات کو اٹھنے کے بعد فوزان کا رونا دھونا، وہ سخت اذیت سے دوچار ہو گئے تھے۔ وہ ایک ماہ کا عرصہ جو انہوں نے فوزان کے لیے ہر کام کو پس پشت ڈال کر گزارا تھا، عیشہ کے ساتھ گزارے چھ سالوں کی تربیت و عادت کو بدلنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ لڑکی فوزان کی صورت میں ان کی سب سے بڑی شکست بن کر سامنے آئی تھی، وہ تلملا کر رہ گئے تھے، اس تصور سے ہی ان کا بیٹا ہی ان کے قابو میں نہیں آ رہا۔ اور اسی رات اس کے کمرے تک جاتے ہوئے فوزان کو اس کے بازوؤں میں دیتے ہوئے، اسے تلخی سے دیکھتے ہوئے غصے سے اس پر اپنے باخبر ہونے کا اظہار کرتے ہوئے انہیں ہر لمحے اپنے ہار جانے کا دھڑکا لگا تھا، اور اس دھڑکے نے انہیں مزید تلخ کر دیا تھا، دوسرے دن صبح جب وہ ان کے سامنے کھانے کی ٹرے لے کر آئی تھی، وہ پھر اس خوف سے جکڑتے چلے گئے تھے کہ یہ لڑکی باقاعدہ ان کی شکست کا اہتمام کرنے سامنے آ چکی ہے، تب انہوں نے اندر کی تلملاہٹ، خوف، ہار جانے کے ڈر کو اپنے غصے، اپنی تند مزاجی میں لپیٹ کر اس لڑکی کو بری طرح نفرت کا اظہار کرتے دھتکار دیا تھا، کچھ عیشہ واجد کے بھرپور صاف اظہار نے اس کے اندر آتش فشاں کو گویا بارود کر دیا تھا، وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں مگر خود کو کچھ بھی تلخ نفرت انگیز کہنے سے باز بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ اور تب تو حد ہی ہو گئی تھی جب انہوں نے عیشہ کے منہ پر اپنا ہاتھ اٹھا دیا تھا۔

"پلیز شہباز۔۔ میرے ساتھ یوں پیش نہیں آئیں۔۔ مجھے اتنی نفرت سے مت دھتکاریں، میں آپ کو کب مجبور کر رہی ہوں کہ میری محبت قبول کریں، کم از کم فوزان کے لیے تو اپنی زندگی میں اتنی جگہ دے دیں۔۔ قسم سے سارے زندگی کچھ نہیں مانگوں گی۔۔ مگر آپ کی نفرت نہیں سہہ سکتی۔۔ پلیز شہباز۔۔" وہ اس کا نام لے لے کر انہیں پکار رہی تھی، جس لڑکی کو انہوں نے ہمیشہ اپنی بھتیجی کے روپ میں دیکھا تھا، اس کے منہ سے یہ اظہار، یہ التجا کیسے برداشت کر لیتے۔ وہ بری طرح رو رہی تھی، سسک رہی تھی، وہ کمرے سے نکل گئے تھے اور پھر وہ سارا دن انہوں نے بہت اذیت میں گزارا تھا، اس لڑکی کے آنسو ان کے پاؤں کی زنجیر بننے کو بے تاب تھے، اس کی سسکیاں ان کے دل کے گرد بلند و بالا فصیلوں کو ڈھانے کے درپے تھیں اور اس کا ہر انداز ان کو گھائل کرنے کو کافی تھا۔ وہ سارا دن بہت مضطرب رہے تھے، رات کو لیٹ آئے تھے، اگلے دن جب اس کو ہوش و حواس سے بیگانہ بخار میں پھنکتا دیکھا تو وہ سب کچھ بھول بھال گئے تھے۔ ہاسپٹل میں اپنے باپ کے ساتھ خوار ہوئے، ڈاکٹروں کے پیچھے بھاگتے انہیں ایک دم احساس ہوا تھا کہ یہ لڑکی اتنی کمزور نہیں جتنی وہ سمجھ رہے ہیں، وہ لڑکی تو ان کی شکست کا پورا اہتمام کیے ہوئے تھی، بخار سے وہ نچڑ کر رہ گئی تھی، ہوش میں آنے کے بعد وہ ان کی طرف دیکھنے سے اجتناب کر رہی تھی، تو وہ خود بھی اس کا سامنا کرنے سے بچ رہے تھے، وہ رات انہوں نے اپنے گھر اپنے کمرے میں فوزان کے ساتھ گزاری تھی۔ اور پھر اس لڑکی کا ہر رویہ، ہر انداز یاد کرتے انہیں ندامت کا احساس ہوتا جا رہا تھا، کم از کم انہیں اس کے ساتھ اس قدر سختی سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا، گویا ان کے اندر کا انسان موم ہو رہا تھا۔

عیشہ ہاسپٹل سے آنے کے بعد اپنے باپ کے پاس چلی گئی تھی، وہ کبھی واجد صاحب کے ہاں ایک دن سے زیادہ نہیں رہی تھی، اسے چار دن ہو گئے تھے وہاں گئے ہوئے، فوزان اس کے بغیر بڑا تنگ کر رہا تھا، انہوں نے قیوم کو اسے لینے کو بھیجا تھا مگر وہ نہیں آئی تھی، انہیں خوش ہونا چاہیے تھا کہ وہ ان کے کہنے کے مطابق ان کے بیٹے کی زندگی میں معاملات سے دور ہو رہی ہے، مگر متفکر ہو گئے تھے۔ دو دن تک فوزان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی مجبوراً انہیں خود جانا پڑا تھا، وہ آ گئی تھی، انہوں نے اسے سختی کے ساتھ باور کروا دیا تھا کہ وہ اسے صرف اور صرف فوزان کی وجہ سے اہمیت دینے پر مجبور ہے۔ وہ رو دی تھی، اور گھر آ کر اس نے فوزان کو سمیٹ لیا تھا، اگلے ہی دن وہ بھلا چنگا ہو گیا تھا، ان کے اندر آندھیاں سی چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ اور انہی دنوں اس کے اندر عیشہ واجد کو پس منظر سے غائب کر دینے کی تحریک ابھری کہ وہ جاوید صاحب کے ہاں چلے گئے، وہ ان کے والد اور تایا ابا کے دیرینہ دوست تھے، انہوں

سے انہیں اپنے بیٹے محسن جاوید کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ دکھانے کی بات کی تھی، وہاں جا کر عیشہ سے بار ہا مل چکے تھے بہت خوش ہوئے اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔۔۔ ان کا مقصد عیشہ کو جلد از جلد اپنی اور فوزان کی زندگی سے دور کرنا تھا، وہ اس میں بہت حد تک کامیاب بھی تھے، اگر عیشہ واجد خود جا کر محسن جاوید کو انکار نہ کر دیتی، انہوں نے محسن جاوید کے آفس کے باہر کھڑے ہو کر عیشہ کے انکار کو سنا تھا، جی چاہ رہا تھا کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس لڑکی کا چہرہ سرخ کر دیں، وہ کون ہوتی تھی ان کے ہر عمل کو ناکام بنانے والی۔۔۔ وہ بہت مشکل سے خود پر قابو کر پائے تھے، اس نے صرف محسن جاوید کے رشتے سے ہی انکار نہیں کیا تھا بلکہ وہ آنے والا رشتہ بھی اس کے لیے پریشانی کا باعث بن چکا تھا۔ اور اس رات وہ پھر ان کے سامنے کھڑی تھی، جس طرح وہ انکار کر رہی تھی، جس طرح وہ اپنی محبت کو پیش کر رہی تھی، وہ ہکا بکا رہ گئے تھے، ان کا خیال تھا کہ ان کے رونے سے دلبرداشتہ ہو کر وہ کچھ نہ کچھ عقل کا دامن تھامے گی مگر الٹا ہو رہا تھا، ان کے ہر عمل کا ردعمل انتہائی شدید تھا، وہ ایک دفعہ پھر خود پر قابو نہ کر پائے تھے۔ غصے سے اس کی خودکشی کی دھمکی پر اشتعال میں آ کر کمرے سے نکال دیا تھا۔ وہ روتے ہوئے دروازہ پیٹ رہی تھی، انہیں پکار رہی تھی، میں مر جاؤں گی۔ اس کی آواز سے بھی لگ رہا تھا مگر انہوں نے خود کو پتھر بنا لیا، ان کی ذرا سی نرمی بھی ان کے اپنے لیے نقصان دہ تھی۔

اسی لیے ان کا خیال تھا کہ وہ تایا جان سے اس رشتے کو فائنل کر لینے کی بات کریں گے، جانچ پڑتال وہ کر چکے تھے، رشتہ ہر لحاظ سے مناسب تھا، مگر وہ وقت سے پہلے یہ بات نہ کر سکے، رات لیٹ آئے تھے، سب سو چکے تھے، امی نے ہی کھانا لا کر دیا تھا، ابھی کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ امی نے وہ بات شروع کر دی تھی جس نے ان کو بدحواس کر دیا تھا۔ ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا کہ قدموں تلے سے زمین سرک چکی ہے، وہ امی کی تجویز پر برہم ہوئے تھے، ہزار ہا اعتراضات کیے تھے، ہر ممکن بچنے کی کوشش کی تھی مگر اس بار امی بھی لگتا تھا کہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھیں، وہ اپنا فیصلہ سنا کر جا چکی تھیں اور ان کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا، اگلی صبح انہوں نے عیشہ کے کمرے میں جا کر اپنا سارا غصہ نکالا تھا، وہ پھر رو دی تھی، وہ ہر بار اسے بری طرح رلا دیتے تھے۔ اور پھر اس کے پھوٹ پھوٹ کر رونے پر مزید غصہ آنے لگتا تھا۔

وہ وضو کر کے فارغ ہوئی تھی، صبح کے وقت اپنے گیلے چہرے سمیت وہ اوس سے ڈھکا کوئی گیلا گلاب ہی محسوس ہوئی تھی، ایک دفعہ پھر ان کا دل ان کے سینے سے ذرا سا دھڑکا تھا مگر انہوں نے دل کو ڈانٹ کر عقل کا دامن نہیں چھوڑا تھا، اسے سخت سست سنا کر آ گئے تھے۔ اور پھر ان کے بے پناہ اختلاف کے باوجود یہ رشتہ طے پا گیا تھا، ابو نے ان سے اتنے سلجھے ہوئے انداز میں بات کی تھی کہ وہ بہت خواہش کے باوجود انکار نہ کر پائے تھے، اور پھر تلملا کر رہ گئے تھے۔

ان کے والدین تو جیسے منتظر ہی تھے، فوراً نکاح کی تقریب منعقد کر کے یہ رشتہ ہمیشہ کے لیے مضبوط کر لیا تھا، اور پھر یہی عیشہ واجد جو کہ اب عیشہ شہباز حیدر بن چکی تھی، عروسی لباس میں بے پناہ حسین لگ رہی تھی، ادھر اُدھر بھٹکتے ان کی نگاہ بار ہا اس کے چہرے پر چپک گئی تھی، وہ اپنے آپ کو ہر بار ڈانٹ دیتے تھے، مگر اسے دیکھنے سے باز نہیں آتے تھے۔ وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ انہیں اپنے اوپر سے اختیار اٹھتا محسوس ہوا تھا۔ اس وقت عیشہ انہیں بالکل اریشہ کی طرح ہی لگی، وہی رخسار، وہی نین نقش، وہی قد و قامت۔۔۔ وہ جو صبح مہوش قیوم کے کمرے سے گزرتے ہوئے ان کی باتیں سن کر خفا تھے، بس موقع کی تلاش میں تھے کہ وہ عیشہ کو اس سلسلے میں باز پرس کریں۔۔۔ انہوں نے مہوش سے عیشہ سے کوئی بات کرنے کو کہا تھا، مہوش نے انہیں تنگ کرنا چاہا تھا مگر انہوں نے سختی سے ٹوک دیا تو وہ بھی سنجیدہ ہو گئی اور عیشہ سے ملنے کا اہتمام کر دیا تھا، وہ اس کے کمرے میں آئے تو وہ آنکھیں بند کیے نیم دراز تھی، ان کو دیکھ کر ان کے اندر وہی کیفیت ابھری تھی، جو کچھ دیر پہلے ان کے اندر تلاطم برپا کر چکی تھی۔ وہ ان لمحوں میں بڑی مشکل سے خود پر قابو کر پائے تھے، انہوں نے فوراً مہوش کی بات والا کھاتا کھول لیا تھا، اور تبھی انہیں علم ہوا کہ یہ ساری سازش مہوش کی ہے، وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے، ایک دفعہ پھر اسے غصے سے بری طرح سنا کر وہ چلے گئے تھے۔ اور پھر ان کی زندگی کا اک نیا باب کھلا تھا۔

ہر بات، ہر معاملے میں عیشہ واجد ان کے سامنے ہوتی تھی، اس دن اس کو یونیورسٹی میں ڈراپ کرتے ہوئے انہیں بظاہر اسی پر غصہ تھا، ناراضگی تھی، انہوں نے جس طرح اس کے اعتراضات کو خاطر میں لائے بغیر یکطرفہ فیصلہ کرتے نکاح کروایا تھا وہ ان سے ناراض ہی تھے، وہ ان کی ناراضگی سے اچھی طرح باخبر تھیں، اسی لیے انہوں نے عیشہ کو ان کے ساتھ لے جانے پر کیا تھا۔

انہیں امی کی بات پر ایک دم غصہ آیا تھا، وہ اس طرح کیا ثابت کروانا چاہتی ہیں، یعنی کہ وہ اتنا کمزور ہے کہ جس بات کو وہ اب بھی "انکاری" ہے، عیشہ کے چند پل کے ساتھ سے وہ "ہاں" ہو جائے گا انہیں امی کی سوچ پر غصہ تھا، اور یہ غصہ انہوں نے سارا عیشہ پر اتارا تھا، وہ ایک روز پھر اسے رونے پر مجبور کر گئے تھے، وہ رو رہی تھی، انہیں تکلیف پہنچ رہی تھی، وہ نجانے اتنے کمزور ہوتے چلے گئے تھے کہ اب یہ لڑکی انہیں اپنے وجود کا احساس بری طرح دلا رہی تھی، اور جس طرح گاڑی سے نکلنے کے بعد ان کے پاس گئی تھی وہ حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ وہ کتنے دنوں تک خود کو اپنے اس برے رویے پر ملال کا شکار ہونے سے نہیں روک پا رہے تھے، پھر وہ شہلا کی منگنی کی وجہ سے ایک ڈیڑھ ہفتہ پہلے ہی واجد صاحب کے ہاں جا بیٹھی تھی، فوزان بھی اس کے ساتھ ہی گیا تھا۔ اس دوران انہیں بڑی شدت سے دونوں کی کمی محسوس ہوئی تھی، اس نے انہیں پتھر کیا تھا، اور پتھر پگھل رہا تھا، وہ خود بھی حیرت زدہ تھے، جس شکست سے وہ ڈرتے تھے وہ ان کا مقدر بننے کو بس چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ وہ ہار رہے تھے، انہیں اندازہ ہو رہا تھا۔ جس انا کے سامنے وہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور تھے، وہ انہیں مجبور کر رہی تھی۔ وہ فوزان کو چھوڑنے واجد صاحب کے ہاں گئے تھے۔ وہ اتفاق سے اس دن جلدی گھر آ گئے تھے، شہلا انہیں بازار لے جانے کا کہہ رہی تھی، وہ فارغ ہی تھے، سو ہاں گئے تھے وہ اسے بھی شہلا نے عیشہ کو بھی یونیورسٹی سے پک کرنے کا کہا تھا۔ وہ حیران تو ہوئے تھے مگر اظہار نہ کیا۔ انہیں وہاں بیٹھنے دیا انکار کرنا پڑا تھا، اور پھر وہ آ گئی تھی، شہباز حیدر کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ تھی، وہ اچھی طرح اس کی حیرت پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے سلام کیا تو وہ صرف حیرت سے سر ہلا کر رہ گئی تھی۔ وہ ان کے پہلو میں تھی، لاتعلقی کا اظہار کرتی ہوئی مگر لاتعلق نہیں تھی، سائیڈ مرر سے اس کے چہرے کی تحریر وہ صرف پڑھ سکتے تھے، فوزان اس کے پاس آگے آ گیا تھا، اس سے باتیں کر رہا تھا، تبھی اس کی بات پر اس نے ڈانٹ دیا تو انہوں نے بغور دیکھا تو وہ فوزان کی بات پر خفت کا شکار تھی۔ ان کے اندر ایک عجیب سی کیفیت نے سر ابھارا تھا۔ بڑی خوبصورت لگ رہی تھی، وہ خود بھی حیران تھے۔

شاپنگ کے دوران اس نے کچھ بھی نہیں لیا تھا، فوزان کی شاپنگ میں اسی نے ان کی مدد کی تھی، شہلا اور فوزان اسے کچھ نہ کچھ لینے کو کہہ رہے تھے مگر وہ انکار کر گئی تھی اور تبھی وہ ان کو جیولری والی دکان پر چھوڑ کر چلے گئے تھے، کچھ اپنے لیے اور کچھ اس کے لیے شاپنگ کی تھی۔ اور پہلی بار وہ مطمئن تھے، پہلی بار ان کا رویہ مثبت تھا، اور پہلی بار اپنی شکست کے خوف سے ان کے اندر غصے کے طوفان نے سر نہیں ابھارا تھا، اور پہلی بار ان کو اپنی یہ کیفیت اچھی نہیں لگ رہی تھی، انہیں عیشہ اچھی لگ رہی تھی، فوزان کا عیشہ کے لیے پیار اچھا لگ رہا تھا۔ وہ تھک گئی تھی، وہ محسوس کر رہے تھے، وہ خود بھی تھکن محسوس کر رہے تھے، وہ بھوکی تھی، انہیں احساس ہو رہا تھا، اسی لیے وہ ان تینوں کو اس ریسٹورنٹ میں لے آئے تھے۔ اس نے ان کے ساتھ آنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ خوش ہو رہے تھے، جس طرح اس عیشہ کا لاتعلقی کا رویہ تھا، وہ اس کی طرف سے کچھ خوفزدہ تھے مگر ان کی خوشی اس وقت ملیامیٹ ہوئی تھی جب ٹیبل پر کھانے کی موجودگی کے باوجود اس نے صرف پانی کا گلاس لیا تھا، وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھتے رہے تھے، شہلا اور فوزان اسے بار بار کھانا چکھنے کا اصرار کر رہے تھے، مگر وہ ہر بار سہولت سے انکار کر رہی تھی۔

"پلیز نہیں۔۔۔ اس وقت بالکل بھی گنجائش نہیں۔۔۔ صبح معمولی سا ناشتہ کیا تھا، تو کینٹین سے جی بھر کر کھایا تھا۔۔۔ ایک برگر، بروسٹ اور چائے پی تھی۔۔" اس کے چہرے سے بھوکا ہونے کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے، شہباز خاموش ہو گئے تھے، ان کا دل بجھ گیا تھا۔

یونیورسٹی ڈراپ کر دینے والے دن سے لے کر اب تک اس کا رویہ ایسا ہی تھا، وہ جوان کو دیکھ کر صرف رو دیتی تھی، ذرا سی

تختی پر فوراً آنکھیں بھر آتی تھیں، ان کے خوف سے وہ ہر وقت خائف رہتی تھی، یکسر بدل رہی تھی، وہ ان سے لاتعلقی کا اظہار کر رہی تھی، ان کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی، اور سب سے بڑھ کر ان کا منگوایا گیا کھانا نہیں کھا رہی تھی، انہیں اذیت ہو رہی تھی مگر چپ تھے، کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ سب ان کا اپنا بویا سامنے آ رہا تھا۔ واپسی پر جب فوزان کو اس کے کمرے میں لٹانے کے بعد انہوں نے فوزان کے سامان کے ساتھ اس کے لیے خریدی گئی چیزوں کا شاپر اس کے سامنے کیا تھا، وہ کتنی حیران ہوئی تھی، اور اک لمحے ہی میں وہ پر اتر آئی تھی، انہوں نے پہلی دفعہ اس کے لیے بہت خلوص سے کوئی چیز خریدی تھی اور اس نے اسے خیرات کا نام دیا تھا۔ وہ اس لفظ پر ایک دم طیش میں آ گئے تھے، وہ اور بھی نجانے کیا کیا بکواس کر رہی تھی، غصے سے وہ شاپر وہیں بستر پر پھینک کر آ گئے تھے۔ وہ بھی پیچھے چلی آئی تھی، وہ کار اسٹارٹ کر رہے تھے جب وہ کھڑکی میں جھک کر کہنے لگی تھی۔

"مجھے اس خیرات کی قطعی ضرورت نہیں ہے... میرے پاس اللہ کا دیا ہوا بہت کچھ ہے... نہ ہی مجھے آپ کی اس ہمدردی نفرت کی ضرورت ہے، جس کا آپ راگ الاپتے رہتے ہیں... اگر میں آپ کو اتنی ہی بری نا قابل قبول لگتی ہوں تو مجھے میری زبان تسلیم کرتے ہوئے میری برائیوں کا ذکر کریں... میں اف بھی کر گئی تو کہیے گا... مگر اس بے وجہ کا ٹھکرائے جانا برداشت نہیں کروں گی... اپنے جذبوں سے ہار کر آپ کا نام اپنے مقدر میں لکھوایا ہے تو اس خیرات سے بڑھ کر حق طلب کرنے کا حق رکھتی ہوں، اگر کچھ دینا ہی ہے تو مجھے میری وہ عزت دیجیے جو بیوی ہونے کے ناطے آپ پر فرض ہے... یہ خیرات نہیں..." وہ حیرت سے گنگ رہ گئے تھے، بالکل حواس باختہ، ہم ہار... اور یہ سکتہ ابھی تک برقرار تھا۔ اس وقت گھر میں صرف ان کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا، سب ... کے ہاں گئے ہوئے تھے، اور انہیں رہ رہ کر وہ یاد آ رہی تھی، جنہیں ہار جانے کے خوف سے انہوں نے کبھی انسان ہی نہ سمجھا تھا، ڈیل کرنے کا کوئی لمحہ ہاتھ سے نکل جانے نہ دیا تھا۔ جسے ہر لمحہ ہر پل اپنی نفرت سے سلگاتے رہے تھے اور آج اگر وہ ان کے سامنے بجائے رونے دھونے کے پوری عزت و وقار کے ساتھ آ کھڑی ہوئی تھی تو وہ حیران رہ گئے تھے، اس کا یہ روپ ان کو چاروں شانے چت کر دینے کو کافی تھا۔

اقرار گئے ، انکار گئے ، ہم ہار گئے
اک عمر رہے ہیں جیت سے بے پروا لیکن
جب جیتنا چاہا جیون وار گئے ہم ہار گئے

وہ لب بھینچ کر رہ گئے، انہیں آج اپنی یہ مکمل ہار بری نہیں لگ رہی تھی، نہ ہی اس ہار کے اعتراف نے ان کے اندر کا ظلم ... کیا تھا، وہ اک میٹھی سی کسک محسوس کر رہے تھے، ایک دھیمی سلگتی آگ جو انہیں حیات بخش ذائقے سے متعارف کروا رہی تھی۔ انہوں نے اپنے بستر کی سائیڈ ٹیبل سے البم نکال لیا۔ یہ نکاح کے دن کی تصاویر تھیں جو مہوش بھابی نے ان کو تھمائی تھیں، انہوں نے غصے سے بغیر دیکھے اندر ڈال دی تھیں مگر اب ان تصویروں کو دیکھنے کو دل مچل رہا تھا۔ ہر تصویر میں اس کا روپ نرالا تھا، عروسی لباس، میک اپ میں بھاری جیولری سمیت وہ اچھی خاصی ڈرا سی لگ رہی تھی۔ ہر تصویر کو بغور دیکھنے کے بعد ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

"اگر کچھ دینا ہی ہے تو مجھے میری وہ عزت دیجیے جو بیوی ہونے کے ناطے آپ پر فرض ہے... یہ خیرات نہیں..." وہ تمام تر لاتعلقی کے باوجود وہ اپنے دل کی بات کہنے سے باز نہیں آئی تھی۔ ان کے اندر اک نشہ سا اترنے لگا۔

کم عمر لڑکی کی محبت کا واحد حقدار ہونا جو پوری جی جان سے ان پر مرتی ہو۔ اس کا نشہ بھی عجیب ہوتا ہے، انہیں احساس ہو رہا تھا۔ تصویروں کو سائیڈ پر رکھتے وہ ہنس دیے تھے، آج بہت عرصے بعد وہ دل سے کھلکھلا کر ہنسے تھے، ورنہ خود کو تو بقول نعیشہ کے نہاد نفرت کی زد میں رکھ کر بھول گئے تھے۔

"میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں... میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی... پلیز مجھے یوں بری طرح نفرت سے مت دھتکاریں..." کبھی کا کبھار دبی دبی سسکتی آواز میں یہ جملہ ان کے اندر اک آگ لگا گیا تھا۔ انہیں احساس ہوا کہ وہ اس کم عمر دیوانی لڑکی سے کتنی زیادتیاں کر چکے ہیں۔ کسی خیال سے چونک کر انہوں نے واجد صاحب کے گھر کے نمبر ملائے، کال ریسیو کرنے والی واجد صاحب کی بیگم تھیں، سلام دعا کے بعد انہوں نے فوزان سے بات کروانے کو کہا تھا۔

"السلام علیکم بابا..." وہ فوراً بات کر رہا تھا، وہ مسکرا دیے۔

"وعلیکم السلام... کیسے ہو... ماما کیسی ہیں...؟"

"ٹھیک ہوں... ماما شہلا آپی کو مہندی لگا رہی ہیں..."

"تم سوئے نہیں... اتنی رات ہو گئی ہے..." انہوں نے ٹائم دیکھا، گیارہ بج رہے تھے۔

"میں سو گیا تھا، یہاں اتنا شور ہے... آنکھ کھل گئی تھی... بابا آپ کیوں نہیں آئے... یہاں سب ہیں... بہت مزہ آ رہا ہے..."

"میں کل آؤں گا... آپ اپنی ماما سے بات کروائیں..."

"اچھا بابا..."

تھوڑی دیر بعد نعیشہ کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو..."

"نعیشہ..." وہ رک گئے، ذہن بالکل خالی ہو گیا۔

"جی فرمائیے... کیسے زحمت کی..." اپنے عزیزوں میں وہ ان پر طنز کرنا ضرور سیکھ چکی تھی، انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔

"تمہارا ایم ایس سی مکمل ہونے میں کتنے ماہ باقی ہیں..." سنجیدگی سے پوچھنے پر دوسری طرف موجود نعیشہ حیران ہوئی۔ یہاں بھلا ایم ایس سی کا کیا ذکر... وہ بھی اس وقت...

"جی...؟"

"جی ہاں... کتنے ماہ باقی ہیں...؟" انہوں نے دوبارہ دہرایا۔

"تین ماہ بعد ایگزام ہو رہے ہیں... کیوں خیریت...؟" نعیشہ حیران تھی کہ رات کے اس پہر اسے ان کے ایم ایس سی سے کب سے دلچسپی ہونے لگی کہ یوں کال کر کے پوچھا جا رہا تھا۔

"میں بھی حساب لگا رہا تھا کہ تین چار ماہ مجھے تمہیں بیوی کے ناطے عزت دینے میں کتنا تکلیف دہ انتظار کرنا ہوگا کہ تمہیں بھی دی گئی عزت خیرات نہ لگے۔"

"جی...؟" اب تو نعیشہ کے حقیقتاً طوطے اڑ رہے تھے، کچھ بھی سمجھ نہ پائی تھی۔ یہ شخص اس پر ایسا مہربان ہی کب تھا کہ وہ اعتبار کرتی۔

"ویسے تمہیں مجھ تک پہنچنے کے لیے فوزان کو قابو کرنے میں مشکل تو بڑی ہوئی ہوگی..." وہ مزید کہہ رہے تھے، دوسری طرف نعیشہ کو تو گویا پتنگے لگے تھے۔

"دماغ ٹھیک ہے آپ کا... فوزان کے سلسلے میں آپ میرے جذبات کی توہین کر رہے ہیں..." وہ کلس کر رہ گئی، شہباز نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

"تم نے بھی تو میری کی گئی شاپنگ کی چیزیں قبول نہ کر کے کی ہے... وہ کس زمرے میں آتی ہے" وہ اسے صرف ستانے

کے موڈ میں تھے، دوسری طرف عیشہ واقعی برہم ہوگئی۔

"اور جو آپ میرے ساتھ ایک عرصہ سے کرتے آرہے ہیں، وہ کس کھاتے میں ڈالیں گے۔۔" وہ چیخ ہی تو پڑی تھی، وہ ہنس دیے۔

"میں تو ایسا ہی ہوں۔۔ منع کیا تھا تمہیں۔۔ اب بھگتو بھی۔۔ اپنے سے بڑی عمر کے شخص سے دل لگاؤ گی تو یہی حال ہو گا۔۔"

"آپ کو میرے احساسات کا پتہ ہے، اسی لیے آپ مجھے دل لگانے کی سزا دے رہے ہیں۔۔ میری قسمت پھوڑنے کو بھی مجھے آپ جیسا پتھر ملا تھا۔۔ مگر کب تک۔۔ کسی نہ کسی دن آپ کو اپنی غلطی کا احساس تو ہوگا۔۔" اگلے ہی لمحے شکایت کا شکار ہوتے اس کی آواز رندھ گئی۔

"میں آپ سے جتنا بھی برا سلوک کروں، آپ کے برابر نہیں ہو سکتی۔۔ آپ تو۔۔" وہ واقعی رو دی۔ شہباز کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا، کم از کم اب تو رلانے کے موڈ میں نہ تھے، صرف ستانا مقصد تھا۔

"مجھے میری باتوں کے طعنے دیتے ہیں۔۔ اللہ کرے آپ بھی۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی، ایک دم فون بند کر دیا تھا۔ شہباز حیدر کو تاسف نے آگھیرا، مگر اگلے ہی لمحے پھر کچھ سوچ کر مطمئن ہو گئے۔

* * *

اگلے دن اس نے بلیک خوبصورت ایمبرائیڈری سے مرصع شیشوں کے کام والا سوٹ پہنا تھا، یہ اس کے نکاح کے جوڑوں میں سے ایک تھا، خوبصورت جیولری میک اپ سمیت وہ اپنے خوبصورت سراپے کے ساتھ بہت پیاری لگ رہی تھی، کہنیوں تک مہندی کی بیل بوٹوں سے سجے الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں بہت بھلے لگ رہے تھے، چوڑیوں گجروں کی دلکشی نے اس کے حسن کی جگمگاہٹ کو چار چاند لگا دیے تھے، رات کی تقریب تھی، گھر کے اندر ہی سارا انتظام کیا گیا تھا، مہمانوں کی آمد کے بعد خوب گہما گہمی ہو گئی تھی، محسن جاوید نہیں آیا تھا، نہ ہی ان کے خاندان میں کسی لڑکے لڑکی کو ایک جگہ بٹھا کر تقریب کرنے کا رواج تھا۔ وہ کافی متحرک تھی، ادھر سے ادھر آتے جاتے عیشہ کی رات شہباز حیدر آئے تھے، مردوں میں ہی مصروف رہے تھے، چونکہ مردوں کے لیے بیٹھنے کا انتظام صحن میں کیا گیا تھا تو کم ہی سامنا ہو رہا تھا۔ عیشہ نے بھی شکر ادا کیا کہ نجانے کب کیا وہ شخص کہہ دے۔ رات دس کے قریب مہمان واپسی کے لیے ہو لیے تھے، ان کے جانے کے بعد اچانک عیشہ کو یاد آیا کہ کافی دیر سے اس نے فوزان کو نہیں دیکھا، شاید گھنٹہ ڈیڑھ سے۔۔ لاسٹ ٹائم اس نے شہباز حیدر کو فوزان کو اٹھائے مردوں والے حصے میں جاتے دیکھا تھا، اس کے بعد فوزان اسے نظر نہیں آیا تھا، اس نے جس سے بھی پوچھا اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ حقیقتاً پریشان ہو گئی، دیگر لوگ بھی پریشان ہوئے۔

"کہاں جا سکتا ہے بچہ۔۔"

"کہاں نکل گیا بچہ۔۔" چچی جان بھی پریشان تھیں۔

"وہ مجھ سے آئس کریم کھانے کی ضد کر رہا تھا، میں اسے ٹال رہی تھی، پتہ نہیں کہیں خود سے ہی باہر نہ نکل گیا ہو، اسے تو یہاں کے راستوں کا بھی پتہ نہیں۔۔" عیشہ کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا، بس رونے کی کسر باقی تھی۔

"فکر نہیں کرو۔۔ پتہ کرواتے ہیں۔۔" حیدر صاحب اسے تسلی دے کر باہر نکل گئے تھے، عیشہ کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد یاسر بھاگتا آیا۔ کچھ دیر پہلے وہ فوزان کو ڈھونڈنے نکلا تھا۔

"رو فوزان۔۔"

"کہاں ہے وہ۔۔؟" وہ فوراً بے تاب ہوئی۔

"شہباز چاچو کی گاڑی میں۔۔ وہ اسے آئس کریم کھلانے لے کر گئے ہوئے تھے۔۔ ابھی آئے ہیں، باہر ہی گاڑی میں ہیں۔۔" وہ بتا رہا تھا، عیشہ کو ایک گونہ سکون ہوا تو دوسرے ہی لمحے شہباز کا خیال آتے ہی وہ بھنا اٹھی۔

"وہ باہر آپ کو بلا رہے ہیں۔۔" وہ ابھی تھی کہ یاسر کے اس پیغام پر باقی سب نے بھی سکون کا سانس لیا تھا، اسے شہباز حیدر سے اس قدر غیر ذمہ داری کی امید نہ تھی، کم از کم بتا کر تو جاتے۔ سب کے سامنے پیغام ملا تھا، اکیلے میں تو شاید غصے سے انکار کر دیتی، چپ کر کے وہ باہر چلی آئی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد گیٹ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ گاڑی سامنے ہی کھڑی تھی، اسے آتے دیکھ کر شہباز نے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا، دوسری طرف واجد صاحب کھڑے تھے۔

"بیٹھو۔"

"جی۔۔؟" وہ جو فوزان کی وجہ سے چلی آئی تھی، رک گئی، باپ کو دیکھا، وہ مسکرائے۔

"جلدی چھوڑ جانا یار۔۔ پہلے ہی فوزان کی وجہ سے تم نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔۔" اس کے دیکھنے پر واجد صاحب شہباز حیدر کو کہہ کر اندر چلے گئے تھے۔

"سنا نہیں بیٹھو۔۔" دوبارہ کہا گیا تو وہ غائب دماغی سے بیٹھ گئی۔

"آپ کے پاس تھا تو کم از کم کہیں لے جانے سے پہلے بتا دیا ہوتا۔۔ سب پریشان ہو کر رہ گئے تھے۔۔ فوزان کی گمشدگی اب پے۔۔" وہ الجھی تھی۔ فوزان سو چکا تھا، شہباز کے ساتھ ہی فرنٹ پر تھا مگر اس کی جھولی میں تھا، شہباز نے مسکرا کر دیکھا۔

"میں تمہارے سامنے ہی لے کر گیا تھا۔۔ پتہ تو ہے تمہیں۔۔"

"مگر بتا کر نہیں گئے تھے، میں سمجھی تھی کہ آپ شاید باہر مردوں میں ہی لے کر گئے ہیں۔۔" فوزان کا سر اپنی جھولی میں رکھ کر اس کی ٹانگیں اس نے سیدھی کیں۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں۔۔ اور مجھے کیوں لے کر آئے ہیں۔۔؟" تھوڑی دیر بعد عیشہ کے حواس کام کرنا شروع ہو گئے تھے، باہر ہر سو پھیلے گہرے تاریک اندھیرے کو دیکھا اور اندر شہباز حیدر کو۔۔

"رات تم نے فون کیوں بند کر دیا تھا۔۔" اس کے سوال کو نظر انداز کر کے پوچھا تھا، وہ چونکی۔

"تو آپ مجھے رات فون بند کرنے کی سزا دینے یہاں لے کر آئے ہیں۔۔" وہ بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ شہباز حیدر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مچل گئی۔

"میں آپ کو اتنا برا نہیں سمجھتی تھی۔۔ میرا خیال تھا کہ آپ کے نزدیک میری تھوڑی بہت تو عزت ہوگی مگر آپ تو۔۔" وہ شہباز حیدر کی مسکراہٹ سے کچھ اور ہی سمجھی تھی۔ ایک دم روہانسی ہوئی۔ شہباز کا قہقہہ بے ساختہ تھا، وہ مزید خائف ہو گئی۔

"یہ ہنس کیوں رہے ہیں۔۔؟" وہ ہونق ہو گئی۔ شہباز نے بغور دیکھا، شرارتی مچلتی مسکراہٹ ہونٹوں پر رقصاں تھی۔ سیاہ خوبصورت لباس میں مٹے مٹے میک اپ میں آنکھوں میں نمی تھی، وہ ابھی بھی بے حد دل نشین لگ رہی تھی۔

"رات فون بند کرنے کے بجائے میری بات سن لیتی تو اس وقت اتنی بدگمان نہ ہوتیں۔" گاڑی سائیڈ پر کھڑی کر کے اس کی طرف رخ کیا تھا، عیشہ کا دماغ سنسنا اٹھا۔ شہباز حیدر کا لہجہ کیا آنکھیں تک بدلی ہوئی تھیں۔

"آپ۔۔" وہ کچھ کہنے کی کوشش میں سختی سے لب سی گئی۔

"نہیں! فوزان کی آئس کریم کھلانے کی ضد پر اسے لے کر گیا تھا، مگر راستے میں کچھ جاننے والے مل گئے تو دیر ہو گئی۔۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہ تھا کہ تم لوگ پریشان ہوں گے۔۔ تم لوگوں کا بھی میری طرف دھیان نہیں گیا تھا ورنہ کال کر کے پوچھ لیتے تو

پتہ چل جاتا۔۔۔ بہرحال واپسی پر واجد بھائی مل گئے تھے، وہ فوزان کو ہی ڈھونڈنے نکلے تھے، میرے ساتھ ہی گھر آئے ہیں، اس لیے پوچھ کر ان کی اجازت سے ہی تمہیں لے کر آیا ہوں۔۔۔"

"کیوں۔۔۔؟" ایک دم وہی لاتعلقی لہجے میں اتر آئی۔

"بھئی بیوی ہو میری اور آج اس لباس میں لگ بھی بہت خوبصورت رہی ہو۔۔۔" شہباز کا بظاہر انداز نارمل تھا مگر لہجے میں شرارت رچی ہوئی تھی، عیشہ ایک دم کنفیوز ہو گئی، وہ اس لہجے کی عادی کب تھی۔ انہوں نے اس کے شرماتے روپ کو مسکرا کر دیکھتے اس کی چوڑیوں سے بھرا مہندی بھرے سے مہکتا ہاتھ تھاما، وہ لرز گئی۔۔۔ گھبرا کر چہرہ دیکھا۔

"مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم آج زیادہ پیاری لگ رہی ہو یا نکاح کے دن زیادہ خوبصورت تھیں، یا عام گھریلو سادہ حلیے میں دل کے زیادہ پاس لگتی ہو۔۔۔" عیشہ عام اعصاب کی مالک نہ بھی ہوتی تو بھی ان جھٹکوں سے بے جان ہو جاتی۔ خوف سے اسے دیکھا۔ یہ شخص تو مسکرا کر بات کرنا تو دور کی بات، کبھی ایک نظر کے بھی روادار نہ تھے اور اب اس کا یہ روپ۔۔۔

"ویسے بے یقینی سے کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔ بھئی میں شہباز ہی ہوں۔۔۔" شرارت سے بھرپور انداز تھا، وہ الجھ گئی، پھر اگلے ہی پل سارا حوصلہ جواب دے گیا۔

"پلیز ختم کریں اپنا ڈرامہ۔۔۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ آپ میرے جذبوں سے اس طرح کھیلیں۔۔۔ میں نے آپ کی نفرت قبول کی ہے، وہ روپ ہی میرے لیے کم تکلیف دہ تھا جو اب یہ نیا انداز۔۔۔ یہ نیا ڈرامہ رچا بیٹھے ہیں۔۔۔ محض مجھے اذیت دینے کو۔۔۔" اگلے ہی لمحے وہ رو دی۔ شہباز نے حیرت سے دیکھا، پھر ایک دم بازو سے اپنی طرف کھینچا، گود میں فوزان تھا، وہ صرف ان کی طرف لڑھکی تھی۔ انہوں نے اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کیا۔

"شٹ اپ۔۔۔ کوئی ڈرامہ نہیں کر رہا ہوں۔۔۔ میں تو تمہیں یہ سب رات کو ہی کہنا چاہتا تھا۔۔۔ تمہیں میں نے اتنا ستایا، اتنی تکلیف دی، تمہاری ذرا سی لاتعلقی نے وہ کام کر دکھایا جو تمہاری اتنے عرصے کی محبت نہ کر دکھائی۔۔۔ میں تمہارے سامنے ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں تم سے عمر میں بڑا تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی ہو۔۔۔ میرا خیال تھا کہ میاں بیوی ہم عمر ہوں تو انڈر اسٹینڈنگ اچھی رہتی ہے، زندگی پرسکون اور خوشگوار گزرتی ہے۔۔۔ ابھی تم نادانی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔۔۔ ہو سکتا ہے بعد میں جذبات کا زور کم ہو اور تمہیں احساس ہو کہ تم غلطی پر تھیں، تو بعد میں پچھتانے سے بہتر تھا کہ تم ابھی سے کچھ سوچتیں۔۔۔ زندگی جذبات کے سہارے گزرنے والی نہیں ہے۔۔۔ تم ہمیں بہت عزیز ہو، تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی ہو، کم از کم میرے نزدیک تو یہ ممکن نہیں تھا۔۔۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے خود کو سخت کر لیا، میں جتنی سختی کا مظاہرہ کر رہا تھا، تمہاری محبت اتنی ہی منہ زور طوفان کی طرح آگے بڑھتی جا رہی تھی، میں ڈر گیا تھا، تم سے نہیں خود سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے اندر توڑ پھوڑ ہوتی محسوس ہو رہی تھی، تمہارے معاملے میں کمزور پڑ رہا تھا، میرے دل و دماغ میں اک جنگ سی چھڑ چکی تھی، جس کی وجہ سے تمہیں بارہا میں نے سخت رنج، تکلیف اور اذیت سے دوچار کیا تھا، میرے اندر کا اشتعال دن بدن بڑھتا جا رہا تھا، اور ہر بار میرا غصہ تم پر نکلتا تھا، میں ہارنا نہیں چاہتا تھا مگر ہار رہا تھا اور تمہاری ذرا سی لاتعلقی میری رہی سہی انا کو بھی توڑ پھوڑ گئی۔ ایسے میں تم مجھے یہ کہو کہ میں ڈرامہ کر رہا ہوں تو بڑے شرم کی بات ہے میرے لیے۔۔۔" وہ ہکا بکا، پتھر کی طرح ساکن، بغیر پلکیں جھپکائے سن رہی تھی، شہباز حیدر کا چہرہ جس پر جذبے اپنا عکس دکھا رہے تھے، دیکھ رہی تھی، مگر بے یقین تھی، کیا یہ شخص واقعی سچ کہہ رہا ہے، یہ میرا کوئی خواب ہے۔ میری یہ محبت، میرا یہ بدلا انداز، میری توجہ، خیرات نہیں ہے۔۔۔ یہ وہ حق ہے جو میرے نکاح میں ہونے کی حیثیت سے تم ڈیزرو کرتی ہو۔۔۔ کیا اب بھی نہیں مانو گی میں ہارا ہوں تمہاری دیوانگی، محبت کے سامنے۔۔۔ میں نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔۔۔ اب بولو میری حقیری محبت قبول کرو گی۔۔۔ مجھے میری تمام غلطیوں سمیت اپنی محبت کے وسیع دامن میں سمیٹ کر مجھے مالا مال کرو گی۔۔۔ بولو کرو گی۔۔۔" اس نے دونوں ہاتھ تھامے تھے شہباز حیدر یہ بھی بھول گئے

[illegible] کہ وہ اس وقت کہاں ہیں، عیشہ کی آنکھوں سے آنسو بہتے چلے گئے تھے، وہ سر جھکا گئی۔

"بس اب نہیں رونا۔۔۔ بہت رُلایا ہے میں نے تمہیں۔۔۔ تمہاری محبت نے میرے مردہ احساسات کو اک نئی زندگی دی ہے۔ ریشم کی وفات کے بعد میں نے اپنے تمام جذبوں امنگوں خواہشوں کو بھی اس کے ساتھ دفن کر دیا تھا کہ اب یہ دل کوئی اور نگر آباد نہیں کرنا چاہتا۔ طلب خواہش ہر چیز مٹ گئی تھی، تمہارے وجود نے میرے اندر پھر وہ پرانی امنگ پیدا کی ہے تمہارے نام سے۔۔۔ تمہارے وجود سے۔۔۔ میں نے ابا جی اور واجد بھائی سے بات کر لی ہے۔۔۔ تمہارے ایگزام کے انتظار میں میں مزید صبر نہیں کر سکتا۔۔۔ بعد میں بے شک ایگزیمز دیتی رہنا، بس اگلے ماہ تک رخصتی ہو جانی چاہیے۔۔۔ بولو خوش ہو نا۔۔۔؟"

عیشہ کا ابھی بھی برا حال تھا، وہ تو سب کچھ سمجھ کر بھی ناسمجھ تھی، اس کی بے یقینی دیکھ کر شہباز حیدر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی، اس کے آنسو اپنی پوروں سے صاف کرتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لیا تو وہ چونکی، جیسے ایک دم خواب سے بیدار ہوئی ہو۔۔۔ یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔۔۔ سچ مچ حقیقت۔۔۔ زخم دینے والا مہربان ہو گیا تھا۔۔۔ اس سے لاتعلقی کا مظاہرہ کرنے والا تعلق داری کا اظہار کر رہا تھا۔ دھتکارنے والا نوازشوں پر آمادہ تھا، وہ شہباز حیدر کی اس قربت پر جھینپ گئی، دل دھک دھک کرنے لگا، اس نے بے اختیار شہباز کا بازو جھٹکا، ساری صورتحال سمجھ میں آئی تو چہرہ گلنار ہوتا چلا گیا۔ شہباز نے دل چسپی سے اس کا یہ روپ دیکھا۔ یہ روپ بھی پاگل کر دینے والا تھا۔

"افسوس! تمہیں شاید خوشی نہیں ہوئی۔۔۔" انداز سراسر چھیڑنے والا تھا، وہ خفیف ہو گئی، پھر فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"وہ رخصتی۔۔۔ اتنی جلدی۔۔۔ ابھی تو میں نے پیپرز۔۔۔" شہباز حیدر کی وارفتہ مچلتی نگاہوں کی زد میں الجھ کر وہ جملہ بھی نامکمل چھوڑ گئی۔

"خدا کو مانو بیوی۔۔۔ ایک منٹ نہیں صبر کرنے والا میں۔۔۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ تمہیں اس روپ میں سیدھا اپنے بیڈ روم میں لے جاؤں مگر۔۔۔ تم ہو کہ۔۔۔" وہ شہباز حیدر کے اس قدر کھلے ڈلے انداز پر حواس باختہ ہوئی۔ خوف و شرم سے لرز اٹھی۔ سرخی سے چہرہ تپنے لگا۔ اس نے محبت کی بازیابی کی دعا مانگی تھی، اللہ نے اس کی سن لی تھی، اتنی شدت تھی شہباز کی محبت میں، وہ سر نہ اٹھا پائی، جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"تم تو یوں خوفزدہ ہو رہی ہو جیسے میں۔۔۔" اس کی گھبراہٹ سے لطف لیتے ہوئے شہباز حیدر نے اس کا کندھا تھاما تو وہ کانپ اٹھی۔

"پلیز گھر چلیں۔۔۔ ابو انتظار کر رہے ہوں گے۔" کانپتی لرزتی آواز میں کہتے اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔ شہباز کھلکھلا کر ہنسا۔

"واجد بھائی جانتے ہیں اس وقت میرے جذبات کیا ہو رہے ہیں۔۔۔ کوئی نہیں انتظار کر رہے ہوں گے۔۔۔ تم اپنے شوہر کے ساتھ ہو، اعتبار کرو یار۔۔۔ ہم دل ہارے ہیں۔۔۔ اور بے ایمانی تو اپنی عادت ہے ہی نہیں۔۔۔ اب یہ لرزنا کانپنا بند کرو۔۔۔ یقین نہیں آتا کہ میری محبت میں پاگل دیوانی ہر چیز کی پروا کیے بغیر میرے سامنے اظہار کرنے والی اس قدر شرم کی پوٹلی بھی ہو سکتی ہے۔۔۔" شہباز حیدر نے ہلکے پھلکے انداز میں اس کا اعتبار اسے لوٹانا چاہا تھا۔ وہ سختی سے لب بھینچ گئی، ہاتھ ہٹا کر دیکھا، وہ مسکرا دیے۔ اس شخص کی قربت سوہان روح تھی، تو یہ قربت۔۔۔ اور یہ محبت۔۔۔ یہ مسکراہٹ۔۔۔ "اپنائیت و محبت سے چھیڑنا، وہ مسکرا رہے تھے، کھلکھلا رہے تھے، اپنے ساتھ اسے بھی ہنسنے پر مجبور کر رہے تھے، اور عیشہ جو ان کی نگاہوں کی وارفتگی، جملوں کی معنی خیزی، آپس کی قربت سے پزل ہو رہی تھی، ایک دم پرسکون ہو کر سیٹ کی شیٹ سے سر ٹکایا، اس کے دل میں یقین بھرتا چلا گیا کہ

اب یہ شخص اس کا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی کا ہے

وہ اس کی محبت کی بلا شرکت غیرے تنہا مالک ہے
وہ اس کا دل جیتنے میں کامیاب ہو گئی تھی
کام مشکل تھا مگر وہ فاتح تھی
یہ دل بھی اس کا تھا اور شہباز حیدر بھی
زمانے کو چلنے دو چلو ایک ساتھ چلتے ہیں
نئی دنیا بسانے کو چلو ایک ساتھ چلتے ہیں
ہمیں جیون کا ہر لمحہ تمہارے نام کرنا ہے
یہی وعدہ نبھانے کو چلو ایک ساتھ چلتے ہیں

ختم

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا

تیرے رنگ، رنگ، تیرے رنگ رنگ
میں جہاں بھی جاؤں دنیا میں
تیرے جلوے ہیں تیرے رنگ سنگ
تیرے جلوے ہیں میرے سنگ سنگ

"پلیز میڈم کہکشاں! آپ ان بچوں کی باڈی لینگویج تو درست کروا دیں۔" بچوں کی ریہرسل دیکھتے ہوئے وہ کہکشاں کی طرف متوجہ ہوئی۔

"زوبا! آپ رائٹ اس طرف لیں گی۔ یاد رہے۔"

اس نے زوبا کو کندھوں سے تھام کر صحیح پوزیشن میں کھڑا کیا۔

تُو نے عطا کیا، نہ شکر کیا
تُو نے اور دیا اور دیتا ہی گیا
دیتا ہی گیا، دیتا ہی گیا

میوزک پورے کمرے میں اپنا اثر قائم رکھے ہوئے تھا۔ طلبہ سمیت وہ بھی اس کے زیر اثر تھی۔

"ارسلان بیٹے! آپ بازو کو ٹھیک نہیں گھما رہے۔ دائیں سے بائیں طرف لے کر سر سے اوپر گزار کر پھر گول چکر بنانا ہے تاکہ سب بچوں کے بازوؤں کا ایک گول دائرہ بن جائے جب کہ دوسرا یہ دایاں ہاتھ اس طرح سینے پر ہے کہ عاجزی کا اظہار ہو، رائٹ؟"

ارسلان کو غلط ریہرسل کرتے دیکھ کر اس نے سمجھایا تو وہ فوراً الرٹ کھڑا ہو گیا۔

تُو نے عطا کیا، نہ شکر کیا
تُو نے اور دیا اور دیتا ہی گیا
رُخ موڑ دیے دریاؤں کے
میں نے ہواؤں میں اڑنا سیکھ لیا
میں نے ہواؤں میں اڑنا سیکھ لیا
میری اگلی نظر ستاروں پہ، پھر بھی تیرے سہاروں پہ

آواز کی لے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی سُر ملا رہی تھی ساتھ ساتھ بچوں کو ریہرسل کرتے دیکھتی جارہی تھی۔

"اوکے..... ذن! ویری ویل..... کہکشاں! آپ نے تو کمال کر دیا۔ بہت اچھا ٹیبلو ہوگا۔ بس خیال رہے کہ بچے کی بھی قدم پر لڑکھڑائیں نہیں اور ان کی باڈی لینگویج بالکل درست ہوں۔ جب تک فنکشن نہیں ہو جاتا مزید ریہرسل کرواتی رہیں۔"

"یس میڈم۔" اس کی ہدایت پر کہکشاں نے فوراً سر ہلایا۔ وہ کمرے سے نکل آئی۔ ابھی وہ کوریڈور سے گزر رہی تھی کہ گیٹ سے پولیس جیپ اندر آتے دیکھ کر رک گئی۔ عبدالباری کو باہر نکلتے دیکھ کر اس کی بھنویں تن گئیں۔

"ہیلو..... گڈ آفٹرنون ڈیئر۔" وہ رانئل کو دیکھ کر تیزی سے ڈگ بھرتا اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔

"ہیلو۔" رانئل نے بھی لٹھ مار انداز میں اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔

"بابا اور امی کہاں ہیں؟" رانئل کے چہرے پر ناگواری کے واضح تاثرات رقم تھے۔ وہ سب دیکھ چکا تھا پھر بھی پوچھنے سے باز نہیں آیا تھا۔ رانئل نے اس سوال پر عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔

"امی گھر جا چکی ہیں اور بابا آفس میں ہیں۔" وہ اسے ہرگز جواب نہیں دینا چاہتی تھی مگر جواب دیے بنا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ کسی بھی لیے کسی بھی حرکت پر اتر سکتا تھا۔ اپنی عزت اسی میں تھی سو مجبور تھی۔

"یہ ہر وقت مجھے دیکھتے ہی تمہارے چہرۂ شریف پر بارہ کیوں بج جاتے ہیں۔ اتنی بری شکل تو نہیں ہے میری۔" وہ اس کا مزید ضبط آزمانے کو اس کے سامنے آن کھڑا تھا بغیر لیے تھا۔

رانئل نے زہر بھری نظروں سے گھورا اور بغیر جواب دیے آگے بڑھنے لگی تھی لیکن بازو اس کی مضبوط گرفت میں آ گیا تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے، چھوڑو مجھے!" وہ بلبلا کر غصے سے بولی تھی۔ اس کی رنگت مزید آتش فشانی بن گئی تھی۔ عبدالباری نے بغور چہرہ جانچا تھا۔

"تم سے کس نے کچھ پوچھا ہے۔" روئی کی طرح نازم بازو میں اپنی انگلیاں پیوست کرتے ہوئے اس نے رانئل کو جھٹکا دیا تھا اور وہ یوں سرعام اس توہین و تذلیل پر ششدر رہ گئی۔ اردگرد کلاس روم تھے تقریباً سبھی دروازے وا تھے۔ کھڑکیاں اوپن تھیں۔ وہ بالکل وسط میں تھے، چند ایک ٹیچرز تو باہر دروازے کے پاس آ کر یہ سین ملاحظہ کرنے لگی تھیں اس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔

"میں تمہارے لاک اپ میں بند کوئی مجرم یا ملزم نہیں ہوں کہ جس کے ساتھ تم جس طرح مرضی سلوک کرو اور میں خاموش رہوں۔ ظلم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اور تم اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہو۔ بہتر ہے یہاں تماشا دکھانے کے بجائے میرا بازو چھوڑ دو۔" اس نے اس کے پولیس وردی میں ملبوس بھرپور سراپے پر ایک طنزیہ کاٹ دار نظر ڈال کر کہا تھا۔

"چلو ملزم نہیں ہو تو بنا لوں گا مگر خیال رکھو، بہت چلنے لگی ہے تمہاری یہ زبان۔ اسے کنٹرول میں رکھو، ایسی زبانیں مجھے کاٹنا بھی آتی ہیں۔" جواباً وہ اس سے زیادہ درشتی و تلخی سے بولا تھا۔

"اپنی زبان کو لگام دو....." ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کر وہ سرعت سے بھاگی تھی۔ جتنی تذلیل وہ یوں سرعام کر چکا تھا کم تھی کیا۔

وہ ایک دم آفس میں داخل ہوئی اور صوفے پر گر گئی تھی۔ بابا جو اس کے اچانک داخل ہونے پر اسے صرف دیکھ رہے تھے اس کے دھواں دھار رونے پر فوراً چونکے۔ ایک دم اپنی سیٹ چھوڑ کر اس کی طرف آئے تھے۔

"کیا ہوا رانئل؟" اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، ایک دم دروازہ کھول کر عبدالباری بھی اندر داخل ہوا تھا۔ وہ چپ ہو گئی۔

"تم..... اس وقت یہاں.....؟" بابا کا رانئل کی طرف سے دھیان ہٹ گیا تھا۔ عبدالباری کی نظریں آنسو بہاتی رانئل پر تھیں جس نے اسے دیکھتے ہی نفرت سے منہ موڑ لیا تھا۔

"ہاں ایک کام تھا، اسی لیے یہاں آنا پڑا۔" عبدالباری رانئل کے ساتھ ہی صوفے پر ٹک گیا تھا۔ رانئل فوراً اٹھ کر سامنے صوفے پر جا بیٹھی تھی جب کہ بابا نے کچھ ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔

"کیسا کام؟" بابا برداشت کر گئے تھے تحمل سے پوچھا تھا۔

"میری امیر الدین سے ملاقات ہوئی ہے۔ نواز اس کا بیٹا میرے لاک اپ میں ہے، بس یہی خبر سنانے آیا تھا۔" کہتا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا، وہ حیران رہ گئے۔

"کیا.....؟" بابا اور رانئل دونوں اسے دیکھتے رہ گئے جو مزے سے انکشاف کر کے دونوں کے چہروں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ جمائے پاؤں ہلا رہا تھا۔

"آپ کا کیا خیال تھا میں اتنی جلدی اپنے حق سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ اس نواز کو اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ وہ کہیں بھی منہ دکھائے اور آپ رانئل کے لیے زمین سے آسمان تک چاہے خاک بھی چھان لیں کسی اور کے نام کا اسے کبھی نہیں ہونے دوں گا۔" وہ تلملاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ بابا صوفے پر گر سے گئے۔ رانئل ایک دم اٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

"یہ کیا کر دیا تم نے..... نواز بہت اچھا لڑکا تھا۔" اس سے بابا (سجاد علی صاحب) کو اپنی آواز بھی قطعی اجنبی لگی تھی۔

"یہ سب کرنے کے لیے تو آپ نے مجھے مجبور کیا ہے۔ سیدھی طرح دل کی بات کی تھی جو آپ کی سمجھ میں نہیں آئی، بہرحال میں اس وقت اس موضوع کو ڈسکس کرنے نہیں آیا، صرف اطلاع دینا تھی۔ فون پر بھی دے سکتا تھا مگر تب آپ کے تاثرات کیسے دیکھ پاتا شاید..... امی کو بھی بتا دیجیے گا اور یہ بھی خاطر جمع رکھیے کہ اس دفعہ آپ ڈھیل دی کہ منگنی ہو گئی تھی، اگلی دفعہ اتنی ڈھیل بھی نہیں دوں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تو..... پھر تم کیا کرو گے؟ جان سے مار دو گے ہمیں..... تو پھر مار دو..... مگر کان کھول کر سن لو تم رانئل کے قابل ہی نہیں ہو۔ اس قابل ہوتے تو پھر رونا کس بات کا تھا۔ اس کا نام لینے سے پہلے خود کو اس کے قابل تو بناؤ۔" بابا اپنے جوان، طاقت ور، بہادر اور بدلحاظ، تند مزاج اور بگڑے ہوئے بیٹے کو گھور رہے تھے۔ "بہت غلط کھیل کھیل رہے ہو تم۔ کیوں آہیں لینا چاہتے ہو اس یتیم کی۔ محبت تم سے شادی کرنا چاہتی تو سختی تو نہیں کر سکتا اس پر۔ عاقل ہے، بالغ ہے، پھر بھی اس پر ظلم کا یہ پہاڑ توڑوں بھی تو کس بنیاد پر؟ تمہیں..... کیا ہو تم؟ دنیا بھر کے آوارہ، رشوت خور اور بھی نہ جانے کون کون سی اخلاقی برائیاں ہیں تم میں۔"

"آپ..... آپ....." وہ اپنی مٹھیاں بھینچ گیا تھا۔ "ابھی تو نواز پر صرف چوری کا مقدمہ ڈالا ہے، اگر آپ نے یا ان میں کسی نے بھی یہ رشتہ ختم نہ کیا تو پھر قتل عمد کے کیس میں تھرو آؤٹ پھانسی کے پھندے پر لٹکوا دوں گا۔ پھر نہ کہیے گا کہ عبدالباری نے بتایا نہیں۔ رانئل اگر میری نہ ہوئی تو کسی کی بھی نہیں بننے دوں گا..... آئندہ خیال رکھیے گا۔" جس طرح وہ دندناتا ہوا آیا تھا اسی طرح چلا بھی گیا تھا، یوں جیسے دنیا اس کی ٹھوکروں کی زد میں ہو۔ سجاد علی صاحب بے دم ہو کر خالی دروازے کو تکتے رہ گئے۔

* * *

وہ اپنے کمرے میں زاہدہ بیگم کی گود میں سر رکھے مسلسل رو رہی تھی۔

"بس صبر کرو رائیل بیٹی!" انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا۔ "تم ہی بتاؤ کیا کروں میں۔ وہ میرا ہی بیٹا ہے، میرے بیٹے نے اس کے یہ ہاتھ ٹوٹے ہیں جو آج کم زوروں پر ظلم و ستم روا رکھے ہوئے ہیں۔ کتنی مظلوم اور بے بس ہوں میں اسے کوئی بددعا بھی نہیں دے سکتی۔ آخر کو میرے خون سے سینچا ہوا پودا ہے جو آج اس قابل ہو گیا ہے کہ لوگوں کو ٹھوکروں کی زد میں رکھے ہوئے ہے۔"

"بس بڑی امی! میں نے کبھی انہیں کچھ نہیں کہا، آج تو حد ہو گئی۔ سر عام سب کے سامنے میرا بازو پکڑا تھا، ذلت سے مر جانے کو جی چاہ رہا ہے میرا۔" اسے ابھی تک یہ غم ہی نہیں بھول رہا تھا، دوسرا غم کیا خاک مناتی۔ انہوں نے چہرہ صاف کیا، بھابی بھی موجود تھیں۔

"کیا پتہ تھا کہ جس بیٹے کو بڑے ناز و نعم سے، دودھ مکھن کھلا کر اپنا خون پلا کر پال رہی ہوں وہ ایسا ہو گا۔" انہوں نے اسے بازوؤں میں لے کر چہرہ چوما تھا۔

"بس چپ ہو جاؤ..... آنے دو اس نامراد کو، پوچھوں گی کس گناہ کی سزا ہے وہ۔ کیا جرم کیا ہے میں نے..... آخر جان کیوں نہیں چھوڑ دیتا ہماری۔ پہلے ہی ہم اس کی یہ حرکتیں دیکھ کر مر گئے ہیں..... عزت، آبرو و شرافت سب مٹی میں رل گئی ہے۔ برسوں کی کمائی نیک نامی خاک ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں کیا چاہتا ہے۔ کیوں نہیں ہمیں ہمارے حالوں پر چھوڑ دیتا۔" رائیل ان سے ہٹ کر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر بیٹھی رہی۔

"ایک ہمارا گھرانہ تھا، لوگ مثالیں دیتے تھے اور اب یہی ہمارا گھرانہ ہے کہ رہی سہی عزت بھی مٹی میں مل گئی ہے۔ نا معلوم جانے عبدالباری کیا کروائے گا..... وہ رو رہی تھیں، بھابی نے آگے بڑھ کر انہیں کندھوں سے تھام لیا۔

"میں تو فوراً ہار گئی تھی۔ بڑے ابو بیٹے ہی منہ ماری کرتے رہے ہیں، جب دوبارہ آفس میں گئی تو بڑے ابو سخت تکلیف میں تھے۔"

"بس بیٹی! اپنے ہی نصیب خراب تھے کس سے شکوہ کریں۔ بری صحبت انسان کو کیا بنا دیتی ہے..... سب دیکھ رہے ہیں، اپنی طرف سے تو پوری کوشش کی تھی۔" انہوں نے ایک سرد آہ کھینچی تو رائیل چپ ہو گئی۔ اب کہنے سننے کو بچا بھی کیا تھا۔

"آپ یہ انگوٹھی واپس کر دیں..... میں نہیں چاہتی کوئی بے گناہ میری وجہ سے مارا جائے۔ زیادہ سے زیادہ لوگ یہی کہیں گے نا کہ یہ منگنی بھی ٹوٹ گئی۔ مجھے قطعی پروا نہیں، بس اب اس قصے کو ختم کریں۔ دنیا میں ہزاروں ایسی لڑکیاں ہیں جن کی شادیاں نہیں ہوتیں، ان کی بھی زندگی گزر جاتی ہے، میری بھی گزر جائے گی۔ آپ پر بوجھ نہیں بنوں گی، اگر زیادہ بات بگڑی تو دانش بھائی کے پاس سعودیہ چلی جاؤں گی۔ کتنی مرتبہ وہ بلا چکے ہیں۔" اس نے اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتار کر امی کی گود میں رکھ دی۔ وہ انگوٹھی دیکھ کر مزید رونے لگیں اور رائیل مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔

سوائے عبدالباری کے، رات کو اس وقت سب ہی گھر پر تھے۔ بابا کمرے میں تھے، بلڈ پریشر ابھی بھی نارمل نہیں تھا۔ فرقان بھائی ان کے پاس ہی تھے۔ رمشا اور فہد دونوں سو چکے تھے۔ مسلسل رونے سے سر بھاری ہو رہا تھا، وہ کچن میں آ گئی۔ بہت بھوک لگ رہی تھی، پیٹ سے کیسی رشتے۔ چاول ڈال کر کھانے لگی، کھاتے ہوئے بھی مسلسل ذہنی رو بھٹکی ہوئی تھی۔ کسی بھی خیال پر گرفت نہیں رہی تھی۔ چائے بنا رہی تھی جب عبدالباری کی جیپ کا ہارن سنائی دیا۔ آج پھر وہ تین راتیں باہر گزار کر گھر آیا تھا۔ وہ گھونٹ گھونٹ بھرتی چائے کی طرف متوجہ رہی۔

عبدالباری ایک دم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ ابھی بھی فل یونی فارم میں تھا۔ عبدالباری کو دیکھتے ہی بڑی امی نے چہرہ موڑ لیا تھا۔ بھابی سر جھکا گئی تھیں اور وہ اس کے یوں دندناتے انداز میں کمرے میں داخل ہونے پر گھورنے لگی تھیں۔

"السلام علیکم..... "احسان کرنے والا انداز تھا۔ "آپ دونوں یہاں بیٹھی ہوئی ہیں اور میں سارے گھر میں ڈھونڈ رہا ہوں۔" وہ کمرے میں آ گیا تھا۔ رائیل نے بمشکل ضبط کیا تھا۔ دن بدن اس کے انداز و اطوار ناقابل برداشت ہوتے جا رہے تھے۔

"کیوں کوئی کام تھا ہم سے؟" بڑی امی ابھی بھی خاموش تھیں۔ بھابی نے ہی پوچھا تھا۔ وہ جو بغور رائیل کے تیور جانچ رہا تھا، ہنسنے لگا تھا۔

"کیوں بھابی جان! بغیر خیریت کے آپ کو یاد نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے آج تین، چار دنوں بعد گھر آیا ہوں تو سامنے کوئی نظر نہیں آیا۔ ہو تجسس فطری امر ہے۔" وہ کافی لاپروائی سے کندھے اچکاتے کہہ رہا تھا۔ رائیل مہر بہ لب رہی۔ امی نے ایک بھرپور شکایتی نظر اپنے بیٹے پر ڈالی جس پر ان کی تربیت کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا، صرف باپ دادا کا نام ڈبو رہا تھا۔

"بھابی! میں بابا کے پاس جا رہی ہوں، جب کمرہ خالی ہو جائے تو بتا دیجئے گا۔" رائیل کے لئے اس سے زیادہ اس کی موجودگی برداشت کرنا ناممکن تھا۔ چائے کا مگ ایک طرف رکھ کر بستر سے اتری تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی پیش قدمی کرتی عبدالباری نے ایک دم سامنے آ کر اس کا راستہ روک لیا تھا۔

"عبدالباری.....! یہ کیا حرکت ہے..... راستہ دو رائیل کو۔" امی کو سخت ناگوار گزرا تھا جو اتنی دیر سے خاموش ناراض بیٹھی تھیں، ایک دم کہہ اٹھیں۔

"ضرور راستہ دوں گا، پہلے ایک دو حساب ہیں وہ تو کلیئر کر لوں۔" پر عبدالباری کو تو جیسے ماں کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔ بھابی اور امی نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا جب کہ رائیل ضبط کے آخری سرے پہ تھی۔

"تو کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟ نواز کا کیس ختم ہو سکتا ہے اگر تم ہاں کر دو۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر رائیل کا چہرہ تکنے لگا جو بری طرح خود پر جبر کرتی اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

"اس سے کیا پوچھتے ہو، مجھ سے پوچھو....." امی ایک دم بستر سے اتر کر رائیل کو پیچھے کر کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ "کیا سودے بازی کرنا چاہتے ہو تم..... مجھ سے کرو۔" اسے انہوں نے بری طرح گھورا تھا۔

"آپ میں کون سا انصاف ہے جو آپ سے سودے بازی کروں گا۔" اس نے بھی تلخی سے کہا تھا۔ "اگر ذرا بھی میری پروا ہوتی تو ان سودے بازی پر نہ اترتا۔" اس کا لہجہ زہر خند تھا۔ امی جو نہ جانے کب سے بھری بیٹھی تھیں، انہوں نے ایک دم عبدالباری کا گریبان پکڑا تھا۔

"کون سے انصاف کی بات کرتے ہو تم..... تم اس قابل ہی کہاں ہو کہ تم سے کوئی انصاف کرے۔ پہلے اپنے کرتوت دیکھو، اپنے گریبان میں جھانکو سوچو کن لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہو۔ کوئی شریف النفس تمہیں اپنی بیٹی دے گا، نام پر تو تھوکے گا بھی نہیں اور چلے ہو میری رائیل کا نام لینے۔ زبان کھینچ لوں گی میں تمہاری، اگر ظلم کے لئے اٹھنے والے یہ ہاتھ میرے شکم میں ڈھل سکتے ہیں تو میں انہیں توڑ بھی سکتی ہوں۔ سنا تم نے!" انہوں نے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"امی جان پلیز چھوڑیں..... کس سے سر کھپا رہی ہیں۔ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ اگر اسے اتنی سمجھ ہو تو یہ سب کرے ہی کیوں۔ رائیل غیر تو نہیں، اپنی عزت ہے۔ یوں سر عام چور اہے پر تو نہ لائے۔" بھابی آگے بڑھ آئی تھیں۔ رائیل ہاتھوں میں چہرہ چھپا گئی۔ آج پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ بڑی امی عبدالباری پر اس طرح برہم ہو رہی تھیں ورنہ ہمیشہ صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتی تھیں، وہ بھی صرف رائیل کی خاطر۔

"نہیں چھوڑوں گی کنری میں اسے..... کس گناہ کی سزا ہے یہ..... لے لے یہ انگوٹھی۔ خوش ہو جائے، توڑ دی ہے رائیل نے یہ منگنی بھی..... اب کیا چاہتا ہے یہ....." انہوں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئی انگوٹھی عبدالباری کے منہ پر دے ماری تھی جو چہرے پر

لگنے کے بعد زمین پر جا گری تھی۔ بڑی امی اس کا گریبان چھوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''کیا ہوا......؟'' فرقان بھیا جو شور کی آوازیں سن کر گھبرا گئے تھے، فوراً بھاگے آئے تھے۔

''ہونا کیا ہے......؟ اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں کہ مجھ نصیبوں جلی نے ایسے بیٹے کو جنم دیا۔'' رائبل نے بڑی امی کو تھام لیا۔ فرقان بھائی بھی عبدالباری کو دیکھ کر سب سمجھ گئے تھے۔

''کیوں آئے ہو اب تم یہاں...... یہ تماشا دیکھنے کہ اس ذلت کے بعد ہم کیسے زندہ ہیں۔ اگر ہمارا تماشا دیکھنے کا شوق تمہیں یہاں تین، چار دن بعد کھینچ لایا ہے تو جاؤ جا کر ابو کا تماشا دیکھو، تمہارے دیئے گئے زخموں سے کس طرح تڑپ رہے ہیں۔'' فرقان بھیا نے کہا تھا۔ رائبل پھوٹ پھوٹ کر روتی بڑی امی کو کندھوں سے تھام کر باہر لے گئی تھی۔ عبدالباری نے جھک کر زمین پر گری انگوٹھی اٹھالی۔ فرقان بھائی کو لگا کہ جیسے وہ صرف بکواس کر رہے ہیں۔ اس پتھر کو تو جیسے پرواہ ہی نہ تھی۔ بے پناہ طیش آیا۔ عبدالباری سے مزید سر پھوڑنا فضول تھا۔ وہ ایک غصیلی نگاہ ڈال کر دروازے کی طرف بڑھے۔

''کنزیٰ! تم بھی اپنے روم میں چلو...... کوئی ضرورت نہیں ایسے شخص کے منہ لگنے کی۔'' انہوں نے بھائی کو حکم دیا اور دونوں چلے گئے تو وہ غصے سے کھڑا انگوٹھی کو گھورتا رہا۔

''آئی ڈیم اٹ...... بے پناہ فرسٹیشن سے اس نے ہاتھ کا مکا دیوار پر مارا تھا۔

✠ ✠ ✠

رائبل کے والد عبدالودود صاحب اور سجاد علی دونوں سگے بھائی تھے۔ شروع ہی سے دونوں خاندان ایک گھر میں ہی رہتے تھے۔ سجاد علی صاحب کے صرف چار بچے تھے، دو بڑی بیٹیاں عصمہ اور حفظہ دونوں شادی شدہ تھیں، پھر فرقان تھے، ان کی بھی شادی ہو چکی تھی پھر عبدالباری تھا۔ عبدالودود صاحب کے صرف دو ہی بچے تھے دانش جو شادی کے بعد سعودیہ چلے گئے تو وہیں کے ہو کر رہ گئے تھے جب کہ وہ امی ابو کی وفات کے بعد پاکستان میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ دوسرے وہ شروع سے ہی اس گھر میں رہی تھی۔ ایک دفعہ بھائی کے ساتھ سعودیہ گئی تو صرف چند ماہ ہی رہ سکی، اجنبی ماحول کی بیزاری نے جلد ہی اسے واپس لوٹا دیا، پھر دوبارہ جانے کو دل بھی نہیں چاہا تھا۔

عبدالباری اور اس کی عمروں، مزاجوں بلکہ انداز و اطوار اور عادات وغیرہ میں بھی بہت فرق تھا۔ عبدالباری اس سے عمر میں کافی بڑا تھا جب وہ چھٹی میں تھی تو عبدالباری نے ایف اے کا امتحان کلیئر کیا تھا۔ وہ شروع سے ہی لائق تھا، پوزیشن ہولڈر رہا تھا۔ اس کے والد عبدالودود سرکاری ملازم تھے اور سجاد علی آرمی میں تھے۔ پاکستانی فوج کے لئے ان کی بہت اعلیٰ و نمایاں خدمات تھیں اسی لئے وہ نہ صرف جذبہ حب الوطنی سے لبریز تھے بلکہ انہوں نے اپنی اولاد کی تربیت بھی ان ہی خطوط پر کی تھی۔ جب تک عبدالباری ان کے زیر سایہ رہا تھا، بہت فرماں بردار، مؤدب اور شریف لڑکا تھا۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد سجاد علی صاحب نے اپنا ذاتی سکول کھول لیا تھا جہاں ان کا اچھا وقت گزرنے لگا تھا، جب تک انہوں نے عبدالباری پر توجہ دی تھی وہ ٹھیک رہا تھا مگر جیسے ہی انہوں نے اپنا ہاتھ کھینچا وہ بھی قابو سے باہر ہو گیا۔

عبدالباری کا شمار کبھی بھی نارمل بچوں میں نہیں رہا تھا۔ اس کے اندر شروع سے ہی ایک اضطرابی کیفیت پائی جاتی تھی۔ جنونی، منتقمانہ سوچ کا حامل فرد تھا۔ اوائل عمری میں اس کی تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی تھی، کیڈٹ اسکولز اور ہاسٹلز وغیرہ میں رہنے سے وہ کافی سدھر گیا تھا مگر جب تعلیم کے بعد اس نے سول سروس جوائن کی تو وہ بگڑنا شروع ہو گیا تھا۔ ایس پی کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد اس کی سرگرمیاں مشکوک ہو گئی تھیں۔ بابا، جنہوں نے اپنی ساری زندگی محبت، شرافت، دیانت داری، ایمان داری، حب الوطنی، وفاداری جیسے اصولوں کا پرچار کرتے گزاری تھی ان کے لئے یہ سرگرمیاں بہت تکلیف دہ تھیں۔ سب نے اپنی طرف سے بھرپور

ہو چکی تھی کہ وہ سدھر جائے مگر اب جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ سب پر حاوی تھا۔ رشوت خوری، غنڈہ گردی اور ظلم و جبر کا جو بازار وہ گرم کئے ہوئے تھا ان سے ان کا دل اب اچاٹ ہونے لگا تھا۔ رہی سہی کسر اب اس کی اس ضد نے پوری کر دی تھی۔

برسوں پہلے سجاد صاحب نے جب عبدالباری نے انٹر میں پوزیشن لی تھی تو سرسری لہجے میں عبدالودود سے رائبل کے لئے بات کی تھی، تب عبدالودود وقت آنے پر دیکھا جائے گا کہہ کر ٹال گئے تھے۔ نہ جانے عبدالباری کو اس بات کی کیسے بھنک پڑ گئی تھی کہ پیچھے ہی رائبل نے بی اے کا امتحان دیا تھا اس نے اپنا مدعا بیان کر دیا تھا۔ ایک سال پہلے ہی رائبل کے والدین کا انتقال ہوا تھا، اب ساری ذمہ داری سجاد علی یا پھر دانش کے کندھوں پر تھی۔ سجاد علی اور امی نے رائبل سے بات کی تو اس نے انکار کر دیا اور پھر کیا تھا رائبل، عبدالباری کی ضد بن گئی تھی۔ وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا چاہے اسے اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے۔

رائبل کی پہلی منگنی کنزیٰ بھابی کے کسی کزن فیصل سے ہوئی تھی، بظاہر کوئی بات نہیں ہوئی تھی مگر نہ جانے عبدالباری نے فیصل کو کیسے اور کیوں راضی کر لیا تھا کہ اس نے والدین کی پرواہ کئے بغیر رائبل سے منگنی توڑ دی تھی پھر اب دو ماہ پہلے ہی اس کا رشتہ سجاد علی صاحب کے دوست امیر الدین کے صاحبزادے نواز سے طے ہوا تھا، رشتہ طے کرتے وقت انہوں نے مختصراً امیر الدین کو اپنے بیٹے کی ضد سے متعلق بتا دیا تھا سو دو ماہ گزرنے کے باوجود منگنی برقرار تھی عبدالباری کا ہر حربہ استعمال کرنے کے باوجود۔ لیکن اب اس نے جو طریقہ اختیار کیا تھا اس سے رائبل مجبور ہو گئی تھی کہ وہ یہ رشتہ ختم کر دے۔

✠ ✠ ✠

وہ کمرے کی کھڑکی کھولے مسلسل کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔ دل کی حالت عجب سی تھی۔ نہ ہی کوئی خواب تھا اور نہ ہی کوئی تصویر۔

اس کی آنکھیں بس ساکت سی تھیں۔ اپنی کم نصیبی کا ایک درد اندر ہی اندر بہہ رہا تھا۔ اب شاید تا عمر اس درد سے چھٹکارا نہیں تھا۔ عبدالباری کا خوف اس کی دہشت، اس کے کچھ بھی کر گزرنے کا انداز ایسا ہی جان گسل تھا کہ بہت مجبور ہو کر اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا۔ اب ایک دفعہ پھر اس کی ذات اشتہار بننے والی تھی مگر اب اس نے سوچ لیا تھا مزید کوئی ذلت، کوئی رسوائی، کوئی جبر نہیں سہنا۔ خاموشی سے یہاں سے دانش بھیا کے پاس چلے جانا ہے۔

وہ کھڑکی بند کر کے باہر نکل آئی تھی۔ ابھی اس کا ارادہ بڑی امی کے کمرے میں جانے کا تھا جب اپنے کمرے سے عبدالباری کو نکلتے دیکھ کر رک گئی۔ وہ اس وقت شاید ڈیوٹی کے لئے نکل رہا تھا۔ فل یونی فارم میں تھا، اپنے دھیان میں تھا، رائبل کو نہیں دیکھا تھا۔ رائبل تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ آئی تو وہ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر چونکا۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے۔'' وہ آج پہلی دفعہ بہت عرصے بعد بغیر کوئی حوالہ دیئے کہہ رہی تھی۔ عبدالباری کے لئے یہ امر بہت حیران کن تھا۔ اس نے بغور رائبل کو دیکھا۔ نہ جانے ضد تھی کہ کیا تھا؟ طلب اسی چہرے پر آ کر ختم محسوس ہوتی تھی۔ حسین خدوخال سے سجا بھرپور حسن لئے دلکش و دلفریب، سرخ تمتماتا چہرہ، گہری موٹی موٹی آنکھوں پر سایہ فگن لانبی پلکیں اور ان کے سوجے سرخ ہونے ڈورے۔ ایک بھرپور کشش تھی اس چہرے میں۔ نہ جانے عبدالباری کی نظر کی وسعت اتنی محدود تھی یا پھر اس چہرے کا تاثر ہی اتنا بھرپور تھا کہ ساری دنیا کا حسن اس چہرے پر آ کر ختم ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ عبدالباری کی نظروں کی تپش سے یہ ساحرانہ نقش و نگار سے سجا پر شکن وجود نا قابل برداشت لہر کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ رائبل کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں پھوڑ دے۔ جب سے اس نے اپنا نام اس کے منہ سے سنا تھا ایک نفرت سی ہونے لگی تھی۔ عبدالباری کی نگاہوں میں سوائے بے خیالی کے کچھ اور نظر آتا ہی نہیں تھا۔ کچھ غصے اور کچھ عبدالباری کی نظروں کی گرفت سے وہ مزید سرخ سی ہو گئی تھی۔ عبدالباری نے بھرپور توجہ سے دیکھا۔ چہرے سے صاف

لگ رہا تھا کہ وہ ساری رات ایک پل کو بھی نہیں سو سکی۔ آنکھیں علیحدہ، مسلسل گریہ وزاری کی کہانی سنا رہی تھیں۔ عبدالباری نے بھرپور انداز میں اس کا یہ روپ نظروں میں بسایا تھا۔ رانیل بمشکل برداشت کر پا رہی تھی ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ خود پر اس قدر بے باکی و بے غیرتی سے اٹھنے والی آنکھوں کو نوچ ڈالے۔ وہ ایسا کر بھی رہتی اگر سامنے عبدالباری نہ ہوتا۔

"خیریت؟" اس کے صبر کا امتحان بہت تھا۔ بہت باریک بینی سے اس کے تاثرات نوٹ کرتے ہوئے مسکرا کر طنزاً پوچھا تھا۔

رانیل نے کاٹ دار نظر ڈالی۔ "بھلا تمہاری موجودگی میں کوئی خیریت ہوسکتی ہے۔" دل ہی دل میں سوچا۔

"تم یہ نواز والا قصہ ختم کرو، جو تم چاہتے ہو وہ ہو گیا ہے۔ اصولاً تو تمہیں اسے رات کو ہی چھوڑ دینا چاہیے تھا کیونکہ تمہاری ڈیمانڈ کل ہی پوری ہو گئی تھی مگر اس کے والد کا فون آیا ہے وہ اب بھی تمہارے لاک اپ میں بند ہے...... آخر چاہتے کیا ہو تم؟" وہ چیخ گئی تھی۔ کافی تلخی سے پوچھا تھا۔ جواباً رانیل کی پریشانی و تفکر کی پروا کیے بغیر وہ مسکرایا۔ وہ مزید سلگ گئی۔

"میں کیا چاہتا ہوں......؟" پر سوچ انداز میں دہرایا۔ "کاش رانیل بیگم! تم یہ سوال اس وقت پوچھتیں جب تم نے میرے لیے انکار کیا تھا۔ میری ڈیمانڈ کیا ہے تم بخوبی جانتی ہو...... میں کیا چاہتا ہوں تم بے خبر نہیں ہو۔" وہ اس کی طرف بڑھ آیا تھا۔

رانیل لب بھینچے کھڑی رہی۔

"نواز کا اتنا درد ہے تمہارے سینے میں...... اس کے لیے اتنا تڑپ رہی ہو اور جو میں چاہ رہا ہوں اس کے لیے کبھی نظر اٹھا کر دیکھا نہیں......" وہ اس سے ہر قسم کی توقع کر سکتی تھی، اس وقت تو حد تھی۔ وہ اس کی کیفیت محسوس کر کے مسکرایا تو وہ انگاروں پر لوٹنے لگی۔
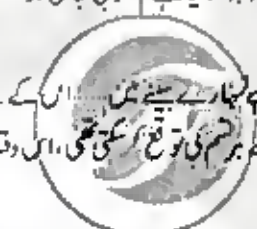
"تم نواز کو کب چھوڑ رہے ہو......؟" وہ صرف اتنا ہی پوچھ سکی۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے...... تمہارے حوالے سے رشتے داری تو ٹکی ہی، کچھ عرصہ نوازی بھی نبھانا چاہتا ہوں تاکہ تم رشتے داری کی نوعیت پر غور تو کرسکیں...... اتنا تو جان لے کہ کس سے الجھا ہے...... اسے اندازہ تو ہونا چاہیے ناں کہ عبدالباری کی منظور نظر اتنی سستی تو نہیں۔" وہ اس کے انداز گفتگو، الفاظ اور لب و لہجے پر آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے گئی۔ کتنا غلط تھا یہ شخص، کتنا کریہہ اور دھوکے باز...... وہ دکھ سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ گئی۔

"کتنا ظلم کماؤ گے اور؟ مت آہیں لو کسی مظلوم کی...... جس عہدے پر تمہیں اتنا گھمنڈ ہے وہ بھی ہمیشہ تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔ اللہ بھی ہے، اس کو مت بھولو...... تم جیسے لوگوں کا انجام بہت عبرت ناک ہوتا ہے۔ ایسے درندے ہو تم کہ جس میں انسانیت نام کو نہیں۔" وہ غصے سے خود پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔ اسے سب سناتے ہوئے ہانپنے لگی تھی جب کہ وہ صرف مسکرایا تھا۔

"ویل ڈن...... بہت اچھا بول لیتی ہو تم تو...... یہ جوہر بھی چھپا رکھے ہیں تم نے اپنے اندر، علم ہی نہیں تھا مجھے۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ اچھا سا سرپرائز دوں......" وہ ہونٹوں میں مسکراہٹ دبائے خاموش ہوا تھا اور وہ بھونچکا ہو کر دیکھتی رہ گئی یعنی کچھ اثر نہیں تھا۔

"مگر کیا کروں اگر انعام دینے لگا تو تم انعام دیکھ کر ناراض ہو جاؤ گی۔ چلو پھر کبھی سہی، ساری عمر تمہیں ہی سننا ہے...... یہ لو، دیکھو تمہارے چکر میں میرا کتنا وقت نکل گیا ہے۔ میرے پاس اس وقت بالکل بھی وقت نہیں ہے مائی ڈیئر! پھر کبھی بات کروں گا...... او کے ٹیک کیئر، اللہ حافظ!"

اس کے بت بنے وجود پر ایک گہری نظر ڈال کر گہری مسکراتی نگاہوں سے دیکھتے انگلیوں سے رخسار کو چھوتے اسے اپنے راستے سے ہٹا کر وہ آگے بڑھا تو وہ بھی جیسے چونکی۔

"دیکھو...... باری! پلیز میری بات سنو...... تم اسے چھوڑ دو...... اس کا باپ ہارٹ پیشنٹ ہے، ماں بھی بیمار ہے۔ وہ لوگ

مر جائیں گے۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا ہے...... اسے چھوڑ دو پلیز......" اس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کبھی اس پتھر دل احساس و رحم سے عاری شخص کے سامنے گڑگڑائے گی بھی۔ اس کا راستہ روکے کھڑی ہوئی تھی، آنسو لگاتار بہنے لگے تھے۔

"لگتا ہے وہ رقیب روسیاہ بہت اہم ہو گیا ہے تمہارے لیے...... یہ آنسو، یہ انداز۔ ہیں ہاں......" وہ اس گوہر افشانی پر کچھ کہہ بھی نہ سکی۔

"دیکھو...... ابھی سے سوچ لو...... محبت وحبت کے چکر میں مت پڑنا ورنہ زندہ نہیں چھوڑوں گا اسے......" بے رحم، سنگ دل لہجہ ہو گیا تھا۔

"بکواس مت کرو تم...... انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"رانیل......" عبدالباری نے رانیل کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کچلنے لگی۔ "چلو جاؤ کیا یاد کرو گی...... پہلی دفعہ اپنی زبان سے کچھ مانگ رہی ہو، بھلے وہ تمہارا رقیب ہی سہی...... ان آنسوؤں کا کچھ تو پاس رکھنا ہے۔ مگر خیال رہے میری جان ایسی آئندہ کبھی صورت حال پیش نہ آئے۔ یہ تو زندہ بچ رہا ہے۔ کسی اور کو سانس لینے کی مہلت بھی نہیں دوں گا۔ عقل مند ہو، اشارہ ہی کافی ہے...... سمجھیں تم!"

رانیل کو ایک طرف ہٹا کر وہ نکل گیا تھا۔ اس نے بمشکل اپنی برستی آنکھیں صاف کیں اور عبدالباری کے غرور، گھمنڈ سے اٹھتے قدم دیکھتی رہ گئی۔

* * *

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" بابا نے پوچھا تھا تو وہ سر ہلا گئی۔

"ٹھیک ہے۔ میں فرقان سے کہتا ہوں وہ تمہارے جانے کے انتظامات کر دے۔" اس وقت سب ہی سوائے عبدالباری کے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے جب اس نے دانش بھائی کے پاس جانے کا فیصلہ سنایا تھا۔ کچھ دیر تو سب پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا تھا مگر پھر اس خاموشی کو بابا نے توڑا تھا۔ فرقان بھائی نے صرف اسے دیکھا تھا، بابا اسی خاموشی سے اٹھ کر لاؤنج سے نکل گئے۔

"تم عبدالباری کے لیے مان جاؤ...... شاید اسی طرح میرا بیٹا سدھر جائے۔" اگلے دن بڑی امی نے اس سے کہا تو وہ حیران ہو کر دیکھے گئی۔ "میں کیا کروں...... میرا دکھ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اتنا بڑا کیا، پالا پوسا، اچھی تربیت کی، کیا صرف اس لیے کہ اس عمر میں آ کر وہ بگڑ جائے...... وہ تمہاری طلب کر رہا ہے، ہوسکتا ہے تمہارے ذریعے اللہ اسے ہدایت دے دے۔ وہ راہ راست پر آ جائے، غلط صحبت سے نکل آئے۔" وہ کتنی خوش فہم تھیں۔ رانیل نظریں چرا گئی۔ وہ صرف ایک خوش فہمی کی خاطر ساری زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتی تھی۔

"رانیل......" انہوں نے پکارا تو وہ چہرہ پھیر گئی۔

"مجھ سے وہ چیز طلب مت کریں بڑی امی، جو میں دے نہ سکوں۔ ہوسکتا ہے اب آپ کی خاطر میں مان جاؤں مگر ساری زندگی آپ کے بیٹے کے ساتھ گزارنا بہت مشکل ہے۔ مجھ میں نہ ہی اتنا حوصلہ ہے اور نہ ہی دم خم...... اگر میں ان کی ضد نہ ہوتی تو شاید کچھ سوچ بھی، جب انسان ضد پر اتر آئے تو رشتوں کا تقدس اور احترام باقی نہیں رہتا۔ آپ نہ جانے کون سا رشتہ نبھانا چاہتی ہیں۔" وہ ناخوش ہو گئی تھی۔ ایک طرح سے رانیل نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹی! زبردستی نہیں...... ماں ہوں ناں، خوش فہم ہوں۔ صرف اپنے بیٹے کا سوچ رہی ہوں، تمہاری پروا نہیں کی...... معاف کرنا۔ اللہ تعالیٰ تمہارا نصیب اچھا کرے۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

رات کو عبدالباری کچھ جلدی آ گیا تھا۔ رانیل کچن سمیٹ کر باہر نکلی تو وہ لاؤنج میں بابا اور بڑی امی کے ساتھ کسی بحث میں
الجھا ہوا تھا۔ وہ جب بھی گھر لوٹتا تھا ایک ہنگامہ ضرور برپا ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی نہ جانے موضوعِ بحث کون تھا۔
"تو پھر آپ نے طے کر رکھا ہے کہ میری بات نہیں مانیں گے۔" وہ غصے سے بڑے بابا سے کہہ رہا تھا۔ رانیل جو اندر
داخل ہو رہی تھی یہ سن کر وہیں رک گئی۔
"تم غلط ضد پر اڑے ہوئے ہو۔ رانیل سے تمہاری شادی کبھی نہیں کروں گا۔ مجھے یہ گوارا ہے کہ وہ ساری عمر یوں ہی
رہے مگر یہ گوارا نہیں کہ وہ تم جیسے ناہنجار اور آوارہ صفت انسان کی بیوی بنے۔ وہ ہیرا صفت لڑکی تمہارے قابل ہی کہاں ہے۔"
"ہونہہ...... یہ اگر آپ کی ضد ہے تو پھر میری بھی ضد ہے۔ اگر اس کی شادی مجھ سے نہ ہوئی تو پھر میں اسے اس قابل بھی
نہیں چھوڑوں گا کہ وہ کسی اور کی بن سکے۔" یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں دنیا جہاں کا غرور و تکبر سمٹ آیا تھا۔ رانیل اور بڑی
امی اپنی جگہ کانپ سی گئیں۔
"خدا کو کچھ عبدل...... کیا بگاڑا ہے اس بے چاری نے تمہارا۔ کیوں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہو اس کے۔" ان کے الفاظ
سن کر اگر بڑے بابا غصے سے گھورنے لگے تھے تو بڑی امی رونے لگیں۔
"میں زبان سے کہہ رہا ہوں کہ ہر حال میں رانیل سے شادی کرنا ہے۔ وہ کہیں نہیں جائے گی اور نہ ہی میں اسے کہیں
جانے دوں گا۔ میں صرف ایک ہفتے کے لیے ایک ضروری کام سے کراچی جا رہا ہوں...... واپس آؤں تو کوئی فیصلہ کر لیجئے گا ورنہ..."
وہ رک گیا تھا۔ رانیل کو لگا اس کا ورنہ اس کے بدن سے روح کھینچ لے گا۔
"بابا جان! اگر دیکھا آپ نے کبھی ہے تو آنکھیں میں نے بھی بند نہیں کی ہوئیں۔ رانیل کم عمر یا کوئی بچی نہیں ہے کہ
میری ضد نہ سمجھ سکے...... سمجھا دیں اسے جو چیز ایک دفعہ میری نظر میں آ جائے تو پھر وہ صرف اور صرف میری ہوتی ہے۔ بے وجہ وارننگ
کی ضرورت ہے اسے ورنہ ساری عمر پچھتائے گی...... بتا دیں اسے کہ باعزت طریقے سے اس سے نکاح پڑھوانا چاہتا ہوں---" وہ
بابا کے سامنے کوئی لحاظ و مروت رکھے شرم و حیا کے بغیر کہہ رہا تھا۔ انہیں بے پناہ غصہ آ گیا۔
"بکواس بند کرو تم...... بے شرم، بے حیا...... ذرا بھی خیال نہیں تمہیں کہ کس کے بارے میں یہ الفاظ کہہ رہے ہو۔ لوگ
عزت کی خاطر جانیں تک دے دیتے ہیں اور تم ہو کہ گھر کی عزت کو ہی داغ دار کرنے پر تلے ہوئے ہو...... نہیں کروں گا میں تم سے اس
کی شادی...... بھیج رہا ہوں میں اسے اس کے بھائی کے پاس۔"
"میں نہیں تلا ہوا آپ تلے ہوئے ہیں...... وہ کہیں نہیں جائے گی۔ میں اسے کہیں نہیں جانے دوں گا۔" وہ بڑے بابا سے
زیادہ غصے میں بولا تھا۔
"بکواس نہیں کرو...... دفعہ ہو جاؤ یہاں سے...... کس رشتے اور کس ناتے تم اسے روکو گے، جب میں اسے بھیجوں گا اور
اس کا بھائی اسے اپنے پاس بلوائے گا تو تم کون ہوتے ہو روکنے والے...... چلے جاؤ یہاں سے...... بہت برداشت کر لیا میں نے
تمہیں۔ آئندہ میرے گھر میں قدم رکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ مجھے زمانے بھر کی آوارہ ایسی بے شرم و حیا اولاد کی قطعی ضرورت
نہیں۔ کوئی تعلق نہیں میرا تم سے......" بڑے بابا سب کہہ گئے تھے۔ امی رونے لگیں۔
"تعلق اس طرح توڑنے سے کبھی ٹوٹا نہیں کرتے...... ابھی تو میں جا رہا ہوں مگر اب ان شاء اللہ کوئی انتظام کر کے ہی آؤں
گا۔ دیکھتا ہوں کون بھجواتا ہے اسے یہاں سے۔" رانیل خاموشی سے دروازے سے ہٹ گئی۔ کمرے میں آ کر بستر پر یوں گری جیسے
بدن میں جان تک نہ ہو۔
دو ہفتے لگے تھے، اس کے جانے کی سب ہی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ عبدالباری کراچی سے واپس لوٹا تو کافی پریشان

تھا۔ جاتے ہوئے جو دھمکی دے کر گیا تھا ابھی تک کوئی عمل درآمد نہیں ہوا تھا اس کی طرف سے، فکر مند تو سب ہی تھے مگر عبدالباری کی
طرف سے سکون رہا تو سب مطمئن سے ہو گئے۔
آج اس کی فلائٹ تھی، فرقان بھائی اسے ایئرپورٹ چھوڑنے جا رہے تھے۔ عبدالباری کے سوا سب ہی گھر پر تھے۔ ان
کی جدائی کے خیال سے سب ہی اشک بار تھے۔ خود اس کی اپنی حالت بھی رو رو کر بری ہو رہی تھی۔
"اپنا خیال رکھنا، سب کو سلام کہنا۔" بڑی امی نے خاص تاکید کی تھی۔ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔
"چلو رانیل! بہت کم وقت رہ گیا ہے۔" فرقان بھائی نے کہا تو سب سے مل کر وہ باہر آ گئی۔
سارا راستہ وہ خاموش رہی تھی۔ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے بھی وہ چپ سی تھی۔
اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ چیک کروانے کے مرحلے میں وہ بری طرح چونکی تھی جب وہاں موجود لڑکی نے اس کی سیٹ کینسل
ہو جانے کا کہا تھا۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے...... میری سیٹ کیسے کینسل ہو سکتی ہے؟" وہ بے پناہ متفکر ہو چکی تھی۔ وہ لڑکی دوسری طرف متوجہ ہو گئی
تو اس نے پیچھے پلٹ کر فرقان بھائی کو دیکھا۔ پریشانی سے برا حال تھا۔ مزید کچھ پوچھے بغیر وہ ان کی طرف بڑھ آئی۔ ساری بات بتائی
تو وہ بھی فکر مند ہو گئے۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے...... بھلا سیٹ کیسے کینسل ہو گئی؟" وہ بھی حیران تھے۔
"تم یہاں بیٹھو، میں معلوم کرتا ہوں۔" وہ اسے بٹھا کر کاغذات لے کر چلے گئے تھے۔ وہ ہراساں سی بیٹھی انگلیاں چٹخاتی
رہی۔ کچھ دیر بعد لوٹے تو لب بھینچے ہوئے تھے۔
"کیا ہوا؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"کچھ نہیں...... تم آؤ میرے ساتھ۔" وہ اسے لے کر وہاں سے نکل آئے تھے۔ واپسی کے راستے پر گاڑی ڈالی تو وہ انہیں
دیکھنے لگی۔
"کیا بات ہے بھائی...... کیا ہوا؟" وہ مزید صبر نہیں کر سکی تھی۔
"بہت اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے عبدالباری...... زندہ نہیں چھوڑوں گا میں اسے۔" ان کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی
تھیں۔ وہ کچھ بھی اور نہ سمجھی کی کیفیت میں انہیں دیکھے گئی۔ مزید کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہو سکی تھی کہ دونوں گھر آ گئے۔
گھر میں قدم رکھتے ہی دونوں کا پہلا سامنا عبدالباری سے ہی ہو گیا تھا۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ سامنے ہی
امی، بابا اور کنزی بھابی تھیں۔ سب کے چہروں پر ایک عجب سی بے بسی رقم تھی شاید وہ بھی باخبر ہو چکے تھے۔
"کچھ جلدی نہیں آ گئے آپ لوگ...... میرا تو خیال ہے آج رانیل کی فلائٹ ہے۔ کیوں رانیل؟" وہ مسکراتے ہوئے
پوچھ رہا تھا۔ کیسی فاتحانہ مسکراہٹ تھی اس کے ہونٹوں پر اور رانیل خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔
"تم...... تم......" فرقان بھائی طیش میں آگے بڑھے تھے۔ "بہت اوچھا وار کیا ہے تم نے...... بہت کمینگی پر اتر آئے ہو
تم۔" اپنی جیب سے کچھ کاغذات نکال کر انہوں نے عبدالباری کے چہرے پر دے مارے تھے، باقی سب ساکت تھے۔ شاید ان پر یہ
اذیت پہلے ہی گزر چکی تھی۔ رانیل کچھ نہ سمجھ پا رہی تھی۔ اس کا ذہن بالکل خالی ہو رہا تھا۔
"مجھے الزام دینے کا آپ لوگ حق نہیں رکھتے، میں نے پہلے ہی باخبر کیا تھا آپ کو۔"
"باخبر کیا تھا تو پھر یہ کیا ہے؟ کیوں ہمیں بے عزت کرنے پر تلے ہوئے ہو......" بھائی نے کاغذات اٹھا کر دوبارہ اس کی
آنکھوں کے سامنے لہرائے تھے۔ رانیل بے دم سی آگے بڑھی۔

"کچھ نہیں...... صرف اتنا بتانا چاہتا تھا کہ اگر صحیح طریقے سے مجھے میری چاہت حاصل نہ ہو تو میں غلط طریقے بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ یہ تو صرف جھوٹے کاغذات ہیں، میں اصلی بھی تیار کروا سکتا ہوں۔ اگر آپ لوگ اور رائبل مان جائیں تو ٹھیک ورنہ یہی کاغذات اصلی ثابت ہو سکتے ہیں۔" وہ نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ رائبل کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ امی کے پاس کرسی پر گر گئی تھی۔

"فرقان! اسے کہو یہ یہاں سے دفع ہو جائے۔ جو کرنا تھا یہ کر چکا ہے۔ اب میں اسے اپنے گھر میں مزید برداشت نہیں کر سکتا...... آج یہ نکاح کے جھوٹے کاغذات لے آیا ہے، کل یہ گواہ لے آئے گا۔" بابا مزید برداشت نہیں کر سکتے تھے، اندر کھڑی ہوئی رائبل بری طرح چونکی...... تو...... وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔

"یہ جھوٹے سہی مگر اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ کسی کو روک سکتے ہیں......" ایک چبھتی ہوئی نظر اس نے رائبل پر ڈالی تھی۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ انتظام کر لیں...... اب بھی کہہ رہا ہوں، یہ کاغذات جھوٹے سہی مگر رائبل کہیں نہیں جائے گی۔ آج رک گئی ہے، کل میں انتظار نہیں کروں گا۔" کتنا سفاک اور ظالم تھا وہ۔ ذرا بھی ماں باپ کی پروا نہیں تھی۔ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک گئی تھی۔

"قانونی طور پر تو میری بیوی کو کہیں بھیجنے کا کیا، اپنے گھر رکھنے کا بھی حق نہیں رکھتے آپ...... یہ صرف ایک قدم اٹھایا ہے میں نے۔ اگر چاہتے ہیں آپ کہ سب کچھ ہو جائے تو سمجھائیے اسے اور خود کو بھی۔ اب میں کچھ بھی نہیں دیکھوں گا۔ یہ کاغذات اسے میری بیوی ثابت کرتے ہیں اور اس جھوٹ کو آپ بھی ثابت نہیں کر پائیں گے۔"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے...... جاؤ جو کرنا ہے کر لو۔" بابا نے آگے بڑھ کر گریبان سے پکڑ کر اسے باہر دھکیلا تھا۔

"آپ غلط کر رہے ہیں...... بہت پچھتائیں گے......" وہ یہ ذلت برداشت نہیں کر سکا تھا۔

"جاؤ...... دفع ہو جاؤ یہاں سے...... گم کرو اپنی یہ منحوس صورت...... جو بھی کرنا ہے کر لینا۔" بابا بے پناہ طیش میں تھے۔ فرقان بھائی کی بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔

"تو ٹھیک ہے...... یوں تو پھر یوں ہی سہی......" وہ کاغذات جیب میں ڈالے باہر نکل گیا تھا۔ اتنی دیر سے خود پر ضبط کرتی رائبل بڑی امی کے سینے میں منہ چھپا کر ضبط کھو گئی تھی۔ بابا اور فرقان بھائی نے بے بسی سے دیکھا۔

عبدالباری اس قدر گر سکتا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس سفاک نے اس کے راستے میں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے بو دیے تھے۔ وہ جدھر بھی قدم رکھتی تھی پاؤں چھلنی چھلنی ہوئے جاتے تھے۔ بابا نے بہت کوشش کی تھی اپنے تعلقات استعمال کر کے اسے کسی نہ کسی طرح یہاں سے بھجوا دیں، اب کے عبدالباری نے جو قدم اٹھایا تھا وہ سب پر حاوی تھا۔ اب انہیں اس کی طرف سے کسی اچھائی کی امید نہیں تھی مگر رائبل جیسی اچھی لڑکی کو اپنے ہاتھوں سے کنویں میں بھی نہیں دھکیل سکتے تھے۔ ان کا ہر حربہ بے سود رہا تھا۔ رائبل کے لیے تو جیسے زندگی عذاب سی بن کر رہ گئی تھی۔

آج کتنے دنوں بعد وہ اسکول آئی تھی۔ چند گھنٹے گزرے تو طبیعت اچاٹ ہونے لگی۔ اسکول سے گھر تک کا فاصلہ پندرہ منٹ کی واک پر مشتمل تھا۔ وہ ہمیشہ پیدل ہی عبور کر لیتی تھی۔ وہ بابا کو بتا کر خاموشی سے نکل آئی۔ ابھی اس نے صرف اسکول کی چار دیواری ہی کراس کی تھی جب عقب سے آتی گاڑی نے اس کے بالکل قریب بریک لگائی تھی۔ وہ جو اپنے ہی خیالوں میں چل رہی تھی اچھل کر پیچھے ہٹی۔ دہل کر پلٹ کر دیکھا، عبدالباری گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا۔

"ہیلو مائی ڈیئر...... کیسی ہو...... میں تمہیں ہی لینے اسکول جا رہا تھا۔ آؤ بیٹھو۔" اس کے قریب آ کر اس نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کی آفر کی تھی۔

"نہیں...... شکریہ......" عبدالباری کو تو دیکھ کر ویسے بھی اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ کوئی اعتبار، بھروسہ، یقین بھی تو

پانی نہیں بچا تھا۔ ہر حد تو وہ پار کر چکا تھا۔ عزت تک تار تار کرنے پر تلا ہوا تھا پھر وہ اس کی پروا کیوں کرتی۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے...... گھر آیا تھا، علم ہوا محترمہ اسکول میں ہیں...... سوچا تمہیں پک بھی کر لوں گا اور بات بھی ہو جائے گی...... آؤ نا......" وہ یوں لگاوٹ کا مظاہرہ کر رہا تھا جیسے دونوں کے درمیان تعلقات بہت خوش گوار ہوں۔

"نہیں...... جب میں نے کہہ دیا شکریہ تو پھر شکریہ...... جاؤ یہاں سے۔ راستہ چھوڑو میرا...... مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی" وہ غصے سے کہہ کر جانے لگی تھی جب عبدالباری نے اس کی کلائی پکڑی۔ وہ سرعت سے پلٹی۔

"کیا بدتمیزی ہے......" اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے آزاد کرایا۔ چہرہ اس جرأت پر لال انگارہ ہو گیا تھا۔

"بدتمیزی نہیں میڈم رائبل صاحبہ! حق رکھتا ہوں...... آفٹر آل نکاح کے کاغذات تمہیں میری بیوی شو کرتے ہیں...... خواہ وہ جھوٹے ہی......"

"چٹاخ......" اس سے پہلے کہ وہ جملہ مکمل کرتا، رائبل کا ہاتھ اس پر اٹھ گیا تھا۔

"انتہائی رذیل، کمینی فطرت کے حامل گھٹیا انسان ہو تم......" وہ غصے سے سرخ انگارہ ہو رہی تھی۔ برداشت کا مادہ بھی تو چھلک ہی گیا تھا۔

عبدالباری حیرت سے اس دھان پان سی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کی جرأت اتنی بڑی تھی اور حوصلہ اتنا بلند تھا کہ کسی کو بھی خاطر میں نہ لانے والے عبدالباری کے گال پر اس کے ہاتھ کا نشان ثبت ہو چکا تھا۔

"میرا ارادہ پہلے تم سے صرف بات کرنے کا تھا مگر تم [illegible] ہو۔ اب صبر نہیں کروں گا...... بہت تماشا بنا لیا، اب عمل کروں گا۔ آؤ......" عبدالباری نے اس کا بازو تھاما تھا، وہ ہراساں ہوئی۔ جرأت تو اس نے واقعی بہت بڑی کی تھی، اب وہ نہ جانے کیا کرے۔

"پلیز باری...... چھوڑو میرا ہاتھ...... مجھے تمہارے ساتھ کہیں نہیں جانا۔"

مگر وہ تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اسی طرح بازو دبوچے گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ فرنٹ ڈور کھول کر اسے اندر دھکیل کر لاک کر کے خود بھی دوسری طرف آ بیٹھا۔

"باری پلیز...... یہ سب کیا ہے......؟ کچھ تو خیال کرو...... کیوں کر رہے ہو تم ایسا......؟" اس کی طرف دیکھتے وہ رو رہی تھی جب کہ دوسری طرف کوئی پروا ہی نہ تھی۔ پتھر تاثرات لیے اس نے گاڑی ڈرائیو کی۔

"باری...... گاڑی روکو...... اگر بات ہی کرنا چاہتے ہو تو گھر چلو...... پلیز کہیں اور نہیں......" عبدالباری کو مخالف سمت میں گاڑی ریورس کر کے فل اسپیڈ کرتے دیکھ کر وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ مجال ہے اسے اثر ہوا ہو۔ رائبل کا دل کانپ رہا تھا کسی انہونی کے خیال سے ہی۔

"باری......" تھوڑی دیر بعد بالکل نامانوس راستے دیکھ کر اس نے اس کا کندھا بری طرح جھنجھوڑا مگر وہ بے مہر بنا ایک نظر ڈال کر سامنے دیکھنے لگا تھا۔ چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔

"بہت بدنیت ہو تم......" وہ روتے ہوئے صرف یہی کہہ سکی تھی۔

عبدالباری اسے جہاں لے کر آیا تھا وہ جگہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر دوسری طرف سے آ کر گاڑی کا لاک کھول کر دروازہ وا کیے اسے دیکھنے لگا تھا جس کا رونا کسی بھی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ نہ جانے اتنے آنسو اس کی آنکھوں میں کہاں سے آ سمائے تھے۔

"چلو آؤ...... اترو۔" اس نے اس کا بازو تھاما جو رائبل نے بری طرح جھٹک دیا۔

"مجھے کہیں نہیں جانا..... اپنے گھر جانا ہے۔"

"تو میری جان تمہیں اپنے گھر ہی تو لایا ہوں۔ یہ دیکھو، یہ واقعی تمہارا گھر ہے۔" اس کے مسلسل بہنے والے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے وہ کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

"نہیں..... مجھے صرف اپنے گھر جانا ہے..... امی کے پاس....." وہ اب بچوں کی طرح ہچکیوں میں رو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے..... مرضی ہے تمہاری..... جب رونا بند کر لو اور عقل ٹھکانے آ جائے تو اندر آ جانا..... اب یہی تمہارا سب کچھ ہے۔ اس گھر کے علاوہ اب تمہیں کہیں اور پناہ نہیں ملے گی۔ مائنڈ اٹ ڈیئر!" ایک جابر نظر اس پر ڈال کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ وہ سکا بکا رہ گئی۔ کتنے پل آہستگی سے گزر گئے تھے۔ گاڑی سے اتر کر وہ اندر بڑھنے کے بجائے گیٹ کی طرف بڑھی۔ وہاں گارڈ بھی موجود تھا اس کے باوجود گیٹ کھولنے لگی تھی۔

"آپ بی بی اندر چلی جائیں..... ہمیں دروازہ کھولنے کا حکم نہیں۔" اس کے ہاتھ رک گئے۔

"تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے..... میں جاؤں گی..... گیٹ کھولو۔" وہ چیخی تھی۔

"معاف کریں بی بی! ہم صاحب کے حکم کے بغیر گیٹ نہیں کھول سکتا۔" وہ بے بسی سے دیکھے گئی۔

"دیکھو..... جانے دو مجھے..... تمہاری بھی کوئی بیٹیاں ہوں گی..... مجھے جانے دو..... خدا تمہارا بھلا کرے گا۔" وہ اس کی منت پر اتر آئی تھی۔ ہاتھ جوڑے کھڑی تھی، جب گارڈ روم میں کا انٹر کام بج اٹھا تھا۔ وہ فوراً سننے لگا تھا۔

"آپ اندر چلی جائیں..... صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" انٹر کام رکھ کر وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ ہارے ہوئے انداز میں اسے دیکھے گئی، وہ نظریں پھیر گیا۔

"یہ کس کا گھر ہے؟" اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"صاحب لوگ کا۔" وہ حیران رہ گئی۔ یہ بلند و بالا عالی شان عمارت عبدالباری کی ملکیت تھی۔ کیا رشوت کی کمائی اتنی زیادہ ہوتی ہے؟ وہ محو حیرت تھی۔ یہ گھر، گاڑی اور بھی نہ جانے کیا کیا عیاشیاں تھیں۔

"یہاں کون کون ہے؟" زخمی ہاتھ قدم کے ٹھوکر پر پوچھا۔

"صرف صاحب ہوتے ہیں..... کبھی کبھار ان کے دوست آ جاتے ہیں..... اب وہ اکیلے ہیں۔"

"یا اللہ! یا مالک! کیا کروں.....؟"

وہ جانتی تھی عبدالباری کو اس پر کبھی بھی رحم نہیں آ سکتا تھا، اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر کے وہ اندر بڑھی تھی۔ اندر ایک ملازم اسے مل گیا تھا جو اس کی باری کے کمرے تک رہنمائی کر گیا تھا۔

"صاحب اندر ہیں..... آپ چلی جائیں۔" وہ چلا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر ساکن سی کھڑی رہی، آہستگی سے دروازہ دھکیل کر دہلیز پر قدم رکھا تو وہ سامنے ہی بستر پر منہ کے بل لیٹا ہوا نظر آیا۔

"آ گئیں تم..... مجھے پتہ تھا تم ضرور آؤ گی۔"

لائٹس آف تھیں، بیڈ کے دونوں سائیڈز کے لیمپ روشن تھے۔ عجب ماحول ہو رہا تھا کمرے کا۔ وہ چند پل کے لیے خالی ذہن اور خالی نظریں لیے اسے دیکھے گئی جو کروٹ بدل کر تکیے کے سہارے نیم دراز ہوا تھا۔

"عجیب لڑکی ہو تم..... لڑکیاں مرتی ہیں میری ایک نظر کے اشارے کے لئے اور تم ہو کہ....." وہ ہنس رہا تھا۔ "نہ جانے کیسی پتھر ہو تم، ایک عرصے سے تم پر وقت ضائع کر رہا ہوں، تمہاری جگہ کوئی اور ہوتی تو اتنی پتھر نہ ہوتی۔" کتنا توہین آمیز نخوت بھرا انداز تھا۔ وہ کٹ کر رہ گئی۔

"نعوذ باللہ....." اس کا سچا قلب کانپ کر رہ گیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ جو کچھ چاہتا تھا اور وہ جو کچھ نظر آ رہا تھا۔ یہ اس کی ماں اور بابا کی تربیت تو نہیں تھی۔ اگر ان کی یہ تربیت ہوتی تو وہ کچھ اور ہوتا۔ نگاہ میں اتنی شرم و حیا ہوتی تو سوچ تک پاکیزہ ہوتی اور یہاں اس کے دل میں اس کے لیے صرف نفرت ہی نفرت تھی۔

"کیوں لے کر آئے ہو تم مجھے یہاں..... کیا چاہتے ہو اب تم..... تماشا تو مجھے بنا دیا ہے، جی بھر کر بدنام کر رہے ہو۔ جینے کے قابل نہیں چھوڑی تم نے اب کون سا تیر تمہارے ترکش میں باقی رہ گیا ہے جو آزمانا چاہتے ہو....."

"صرف ایک تیر، اپنے ترکش کا آخری تیر..... تمہیں اپنے نام کرنا ہے۔ یہی ضد ہے میری۔ بس یہی چاہتا ہوں میں تم سے۔" وہ بستر سے اتر آیا تھا۔

"ہونہہ....." وہ نفرت سے اسے دیکھتی رہی جب کہ دہلیز سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھی تھی۔ وہ آنکھوں میں بے پناہ نفرت لیے ہوئے تھی۔ "ماں باپ کی عزت کا جنازہ نکال کر تم صرف اپنی ضد پوری کرنا چاہتے ہو..... حیرت ہے، کیسی بے رحم اولاد ہو تم..... ماں باپ ہر لمحہ تمہارے لئے مر رہے ہیں۔ راتوں کو بھی اٹھ اٹھ کر صرف اور صرف تمہاری ہدایت کے لئے گڑگڑاتے ہیں، تمہاری خیر و سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں اور تم ہو کہ انہیں صرف مارنے پر تلے ہوئے ہو..... کتنے ظالم ہو تم..... ذرا بھی تمہیں ان پر رحم نہیں آتا۔"

"آتا ہے اسی لئے تو سیدھے راستے سے تمہیں اپنانا چاہتا تھا، آج بھی میرا مقصد ان سب کی رضا سے تم سے بات کرنے کا تھا۔ بہر حال، طریقہ تو یہ بھی نہیں..... بس اب یہ ضد چھوڑ دو، آج ہر حال میں وہی ہو گا جو میں چاہوں گا۔" وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹی تھی۔ اعتبار تو اس بے اعتبار پر تھا ہی نہیں لیکن اس وقت وہ کھڑی بھی تھی اسی کی دہلیز پر تھی اس کے رحم و کرم پر، کوئی بھی لمحہ اسے شیطان کا بہروپ دے سکتا تھا۔

"جو چاہتے ہو، وہ گھر جا کر کر لینا۔ مجھے ابھی صرف گھر جانا ہے۔" اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے وہ گویا ہوئی تھی۔

"نا..... اب گھر جانے والی بات نہیں کرنا۔ ہاں جانے ضرور دوں گا مگر میری خواہش پوری ہونے کے بعد..... تاکہ نہ کوئی تمہیں پچھتاوا رہے اور نہ ہی کوئی ملال مجھے رہے..... ورنہ یہیں رہو، ہر چیز ملے گی..... میری توجہ، مہربانی، محبت....." وہ دلکشی سے مسکرا رہا تھا۔ رابیل کا جی چاہا مردانہ خوب صورتی سے سجا اس کا چہرہ نوچ ڈالے۔ بظاہر کتنا خوب صورت اور متاثر کن تھا مگر باطن کتنا گھناؤنا اور قابل نفرت تھا۔ اس کا جی متلانے لگا۔

"تم غلط کر رہے ہو..... سب غلط کر رہے ہو..... پچھتاؤ گے ساری عمر....." بچاؤ کا کوئی راستہ نہ دیکھ کر وہ رو پڑی تھی۔ سارا وجود پتے کی مانند لرزنے لگا تھا۔ عبدالباری چند لمحے اس کے وجود کو یکتا رہا تھا پھر اس نے آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا تو وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔

"میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی..... اللہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی، یوں جیسے بچاؤ کا ہر راستہ مسدود ہو گیا ہو۔ "انتہائی بدنیت ہو تم..... اللہ کرے مر جاؤ تم....." خلوص دل سے بددعا دی تھی۔

"جب اللہ کے پاس جائیں گے میری جان تو دیکھ لیں گے..... اس وقت تو صرف تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے ملائمت سے دوبارہ کندھوں سے تھام لیا تھا۔ اس دفعہ وہ کوئی مزاحمت بھی نہ کر سکی تھی۔ "خواہش تھی کہ اسی طرح تمہیں اپناؤں جس طرح عام لوگوں کی شادی ہوتی ہے مگر تم سب لوگ یہی چاہتے تھے۔ سوری میری جان! تمہارے ان آنسوؤں کا میں کوئی سدباب نہیں کر سکتا، ہاں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ تھوڑی دیر میں نکاح خواں اور گواہان وغیرہ کا بندوبست ہو جائے گا۔ خود کو ذہنی طور پر تیار کر لو..... اگر تم میری بات یہاں آنے سے پہلے سن لیتیں تو اس افراتفری کے بجائے نکاح کی ساری کارروائی اپنے گھر میں کرواتا۔ خیر بری جگہ تو یہ

ابھی نہیں...... مائنڈ میک اپ کرلو...... جو ہو گیا سو ہو گیا......'' وہ کہہ رہا تھا۔ وہ اذیت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔

''جب تم نے اللہ کی نافرمانی کرنے کی ٹھان ہی لی ہے، موت تمہارے نزدیک ایک کھیل ہے تو پھر ان معاملات میں تمہیں نکاح کی کیا ضرورت پڑ جاتی ہے...... بڑے خود مختار ہو تم تو پھر یہ ڈرامہ بھی کیوں رچا رہے ہو...... نعوذ باللہ جو بے طاقت و اور زبردست ہونا......'' اس کے باتھوں کو نفرت سے جھٹکتے وہ طنز کرنے سے باز نہیں آئی تھی اور وہ ہنس دیا تھا۔

''بقول تمہارے میں نام کا مسلمان ہوں مگر ہوں تو سہی ناں...... یہ نکاح کا ڈرامہ بھی صرف اور صرف تمہارے لئے رچانا چاہتا ہوں...... ورنہ تم کبھی بھی اختیار سے باہر نہیں رہی ہو۔ یہ زبردستی بہت پہلے کر چکا ہوتا......'' رائنل کا جی چاہا کہ وہ ڈوب مرے...... کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ یا تو وہ اس سامنے نظر آنے والے شخص کو شوٹ کر دے یا پھر اپنے وجود کو مٹا ڈالے...... لیکن کوئی بھی راہ باقی نہیں بچا تھا لیکن وہ اتنی بے بس و مجبور تھی کہ انتہائی خواہش کے باوجود کچھ بھی نہ کر سکی سوائے رونے کے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

''جب سب کچھ طے کر ہی چکے ہو تو پھر ایک کام کرو۔ فرقان بھائی اور ابا کو شامل کرلو...... ورنہ میں ساری عمر ان کے سامنے نظر نہیں اٹھا سکوں گی...... اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں گی۔'' ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ کہہ رہی تھی۔ وہ بغور دیکھتا رہا تھا پھر اس کا موبائل بجا تو وہ باہر نکل گیا۔

☩ ☩ ☩

نہانے کے بعد وہ وضو کر کے باہر نکلی تو عبدالباری منہ کے بل سرہانے میں سر دیئے ابھی بھی گہری نیند میں مدہوش تھا۔ اسے دیکھ کر رائنل کے چہرے کے اعصاب کشیدہ ہو گئے تھے۔ سارے جسم میں نفرت کا زہر پھیلنے لگا تھا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے جائے نماز بچھا کر کھڑی ہو گئی۔ نماز ادا کر کے ابھی جائے نماز لپیٹ ہی رہی تھی کہ عبدالباری کا موبائل بج اٹھا تھا۔ وہ نظر انداز کئے کچھ دیر کمرے میں ادھر سے ادھر چکر لگاتی رہی۔ بیل ایک دفعہ مکمل ہو کر دوسری دفعہ پھر شروع ہو گئی تھی۔ عبدالباری نے مسلسل ہونے والی فون پر بھی سر نہ اٹھایا تو وہ آگے بڑھی۔ سکرین پر دوشن نمبر دیکھتے ہی وہ خوش ہو گئی۔ فوراً یس کا بٹن پش کر دیا تھا۔

''السلام علیکم......'' اس نے کہا۔

''وعلیکم السلام...... جیتی رہو، کیسی ہو......؟'' دوسری طرف سے بڑی امی تھیں۔ رائنل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کتنا فاصلہ آ گیا تھا درمیان میں۔

''جی رہی ہوں...... ابھی تک زندہ ہوں...... آپ کیسی ہیں؟'' ابھی تو صرف ایک رات گزری تھی مگر لگ رہا تھا کہ جیسے برسوں گزر گئے ہوں ان کو دیکھے ہوئے۔

''جی رہی ہوں میں بھی...... ساری رات ایک پل کو بھی آنکھ نہ لگی۔ یہی غم کھاتا رہا کہ میرے بیٹے نے تم پر کیا پہاڑ توڑا ہے...... کیا گزر رہی ہوگی تم پر...... میں نے تمہیں ہمیشہ بیٹی سے بڑھ کر چاہا ہے...... مجھے معاف کر دینا...... جو بھی ہوا اچھا نہیں ہوا'' وہ مسلسل رو رہی تھیں۔ رائنل نے ایک نظر کروٹ بدلتے عبدالباری کو دیکھا پھر ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کئے۔

''آپ کا کیا دوش ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں، کیا کرے گا اب، ضد تو اس کی پوری ہو گئی ہے۔ مارنے سے تو رہا...... ابا کو بھی حوصلہ دیجئے گا۔ کل تو بہت تکلیف میں تھے وہ۔ اب بی پی کی کیا کنڈیشن ہے؟'' اب جیسی بھی زندگی گزرنی تو تھی نا۔ روتے ہوئے بھی اور جیتے ہوئے بھی۔ کچھ حوصلہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ دوسری طرف سے گہری سانس سنائی دی تھی۔

''کل سے بہتر ہے مگر ابھی بھی بستر پر ہی ہیں...... ورنہ عبدل نے تو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔'' وہ خاموش رہی

وہ عبدالباری کو دیکھتی رہی جو گہری نیند میں تھا۔

''تم آؤ گی نا...... ضرور آنا...... ہم سب ناشتے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ ذرا عبدل سے بھی بات کرواؤ پوچھوں تو سہی کس گناہ کی سزا دے رہا ہے وہ مجھے۔'' اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ عبدل کو نفرت سے دیکھ کر منہ پھیر گئی۔ بمشکل اپنے اوپر ضبط کر سکی۔ بستر کے قریب جھک کر اس کو آواز دی۔

''عبدالباری...... باری......'' اب تو اس کا نام لینے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ پہلے ہی نفرت کیا کم تھی، اب مزید بڑھ گئی تھی۔ ایک رات ہی سارے راز کھول گئی تھی۔ حریم بیٹے، سننے یا دیکھنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ سارے بدن پر ایک ناگواری سی چھائی ہوئی تھی۔ جھک کر اس کا بازو سختی سے جھنجھوڑ ڈالا۔

''ہوں...... کون...... کیا ہے؟'' نیند شاید بہت گہری تھی۔ ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھتے گردن ہلاتے پوچھا تھا۔ پتہ نہیں وہ ایسا بے حس کیوں ہو گیا تھا ورنہ بڑے بابا یا بڑی امی ایسے تو نہیں تھے۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

''امی کا فون ہے...... بات کرنا چاہتی ہیں وہ......'' ادھر باپ ماں مر رہے تھے اور ادھر وہ اپنی فتح مندی کا جشن منانے میں غرق اپنی ہی خوشی میں مست تھا۔ اسے رہ رہ کر اس کی بے حسی پر دکھ ہو رہا تھا۔

''ہوں...... اتنی صبح صبح...... اور...... رو......'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ لپکتے ہوئے فون پکڑا کر پلٹنے لگی تھی جب اس نے بازو تھام لیا تھا۔

''کہاں چلی ہو...... ادھر بیٹھو......'' اپنے قریب گرا لیا تھا۔ وہ کوئی احتجاج بھی نہ کر سکی۔ بھلا اب احتجاج کرنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔

''ہیلو......''

''عبدل۔'' امی نے پوچھا تھا۔

''جی بول رہا ہوں......'' بیزاری سے کہا تھا۔

''سو رہے تھے کیا؟'' انہوں نے بیزاری نوٹ کر کے پوچھا تھا۔

''ظاہر ہے سو رہا تھا، اب اتنی صبح صبح بیل ہو تے سے تو رہا۔'' آواز جھنجھلائی تھی اس بے معنی سوال پر۔ رائنل صرف دیکھ...... رہی جب کہ بازو ابھی بھی اس کی گرفت میں تھا۔

''میں ناشتے پر تم دونوں کا انتظار کر رہی ہوں...... ناشتا گھر آ کر کرنا۔'' امی نے دعوت دی تھی۔ وہ حیران ہوا۔

''اتنی صبح...... حیرت ہے، کیا بابا نے آپ کو اجازت دے دی ہے مجھے گھر بلوانے کی......'' وہ طنز پر اتر آیا تھا۔

''تم نے جو کیا ہے ساری عمر کھاؤ رستے رہیں گے...... تمہارے دیئے زخم بھلائے نہیں جا سکتے۔ ہمیں پروا ہے تو صرف رائنل کی...... کیا کیا ارمان نہیں تھے اس کے لئے ہمارے دل میں اور تم نے کیا کر دیا ہے۔ نہ اسے زندہ رہنے کے قابل چھوڑا ہے اور نہ مرنے...... جیتے جی مار ڈالا ہے تم نے ہمیں۔ ایک داغ ساری عمر سفید براق سر پر رہے گا۔ بڑی خواہش تھی کہ اسے اپنے ہاتھوں سے تمہاری دلہن بناؤں سب ملیامیٹ ہو گئے ہیں...... اب اسے لے کر آ جانا۔ یہ نہ ہو وہ ترستی رہے ہمارے لئے اور یہ ہی کون ہمارے علاوہ اس کا۔ اپنے ہاتھوں سے سب کچھ خوشی خوشی کیا ہوتا تو کوئی دکھ نہ ہوتا...... یہ دن بھی دیکھنے تھے ہمیں......'' وہ مسلسل کہتے رو بھی رہی تھیں۔ عبدالباری اس جذباتی بلیک میلنگ سے جھنجھلا گیا۔

''حد ہوتی ہے۔ کیا محبت ہے آپ کی بھی...... ساری ہمدردیاں اسی کے ساتھ ہیں۔ میں تو جیسے کچھ لگتا ہی نہیں ہوں آپ کا۔ کیا کوڑے کے ڈھیر سے اٹھایا تھا مجھے...... اب کیوں رو رہی ہیں۔ یہ سب آپ کا ہی کیا دھرا ہے، مجھے الزام نہ دیں۔ جتنا انتظار

میں نے کیا ہے وہ میری ہی شرافت ہے۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا، اگر مان لیتے تو کبھی اتنا بڑا قدم نہ اٹھاتا۔ اگر آپ کی خواہش تھی تو میری بھی خواہش تھی کہ سب عزت کے ساتھ ہو جائے۔ آپ لوگوں کو ہی عزت کا سودا گوارا نہیں تھا۔ اب جو ہوا ہے بھگتیے۔"
رائیل پر ایک تیز سی نظر ڈال کر وہ فون پر امی سے مخاطب ہو رہا تھا۔ رائیل اس کی ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری والی عادت پر تلملانے لگی۔ عبدل کو تو ماں باپ کے احساسات کی بھی ذرا پروا نہ تھی۔ کوئی شرمندگی نہ تھی۔ معافی تلافی کا کوئی لفظ نہ تھا۔ کیسی بے حسی تھی یہ......

"شاباش بیٹے! شاباش...... تم یہ کہہ سکتے ہو۔ اولاد ہو نا خوب آزماؤ ماں باپ کا دل کیا ہوتا ہے، جب اپنی اولاد پیدا کرو گے تو پوچھوں گی......" وہ پھر رونے لگی تھیں۔ "خوش رہو...... ماں باپ کے دل میں اولاد کے لئے صرف دعائیں ہی دعائیں ہوتی ہیں چاہے وہ کچھ بھی کر لیں مگر تم نے تو دعا دینے کے بھی قابل نہیں چھوڑا۔ اس بدنصیب کا دکھ لاتا ہے۔ پھر کہہ رہی ہوں اس کو لے کر ضرور آ جانا...... یہ نہ ہو میں بوڑھی انتظار کرتی رہ جاؤں۔" انہوں نے خاص تاکید کر کے فون بند کر دیا تھا۔ اس نے موبائل آف کر کے بستر پر پھینکا۔

"ہونہہ......" چہرے کے تاثرات سخت کبیدہ خاطر ہو چکے تھے۔ "یعنی حد ہوتی ہے...... مجھے ہی الزام......" وہ با آواز بلند بڑبڑایا تھا۔ "تم نے میرا موبائل کیوں ریسیو کیا تھا......" وہ اب اپنا سارا غصہ رائیل پر نکالنا چاہتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر جھنجھلنے لگی۔ اپنا بازو اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکالا۔

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تمہارا موبائل ریسیو کرنے کا۔ مسلسل بیل ہو رہی تھی جب تم سوئے پڑے تھے، مجھے تو پکڑنا ہی تھا نا......" جب یہ طے ہو چکا تھا کہ رہنا اب اسی شخص کی معیت میں گزارنی ہے تو پھر کیوں دب کر رہے۔ اسی سوچ نے اسے لب کشائی پر مجبور کر دیا تھا۔ عبدل کے جو راز دا کھوا دور گرمیاں تھیں ان کی موجودگی میں وہ اب لب سی کر زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔

"ہم......" عبدل نے اس کے نئے روپ کو عجیب انداز میں گھورا تھا۔

سر پر دوپٹہ نماز کے اسٹائل میں ابھی بھی لپٹا ہوا تھا۔ بلیک دوپٹے کے اندر چھپا چہرہ نور کا ہالہ لگ رہا تھا۔ چہرہ کل کی نسبت اب قدرے بہتر تھا۔ آنکھیں مسلسل گریہ وزاری سے اب بھی سوجی ہوئی تھیں۔ سرخ رنگ ہو رہی تھیں مگر آنکھوں کے برعکس چہرے پر ایک عجب سا نور تھا۔ وہ چند ثانیے بک ٹک دیکھتا رہا...... یہ لڑکی اس کی سب سے بڑی ضد تھی، اب بیوی بن چکی تھی۔ اس لڑکی کی خاطر اس نے کسی بھی جائز، ناجائز کی پروا نہیں کی تھی، اب وہ اس کی دسترس میں تھی اس کے باوجود ایک کمی سی تھی۔

"آئندہ میرا موبائل ریسیو کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔" وہ اسے تنبیہ کر کے بستر سے اتر گیا تھا۔ رائیل اس کی پشت کو گھورتی رہی۔

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے" لہجہ اب بھی زہر خند تھا۔ اس نے پلٹ کر گھورا۔ ایک دن کے وقفے سے کیا کچھ بدل گیا تھا۔ کل اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ آج اس انداز میں یہاں ہوگی۔ کل جب وہ اسے زبردستی لے کر یہاں آیا تھا تو اس کے ارادے دیکھ کر وہ جان گئی تھی کہ وہ کچھ بھی کرے وہ اب اسے جانے نہیں دے گا۔ وہ ہر حال میں عزت کی زندگی چاہتی تھی، جہاں تک ہو سکا تھا اس نے اپنا بھرم رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اب عبدالباری کے ارادے اس کے حوصلے پست کئے دے رہے تھے سو وہ مجبور ہوگئی تھی۔

عبدالباری نے اس کی بات کا بھرم رکھا تھا۔ امی بابا اور فرقان بھائی کو بلوا لیا تھا۔ وہ اصل صورت حال سے قطعی بے خبر تھے۔ اصل معاملے کی خبر تو انہیں یہیں آ کر ہوئی تھی۔ نہ جانے کیا کہہ کر وہ انہیں ساتھ لایا تھا۔ سب نے اسے سمجھانے کی پوری کوشش کی تھی مگر وہ اسے کسی بھی قیمت پر چھوڑنے پر راضی نہیں تھا صرف ایک ہی رٹ تھی کہ نکاح ہوگا تو ابھی ہوگا ورنہ وہ یہیں رہے گی۔ مجبوراً

نصیب ہار گئے تھے۔ بابا کو کتنی تکلیف ہو رہی تھی، ایک دم ان کا بلڈ پریشر ہائی ہوا تھا۔ نکاح کے بعد وہ سب چلے گئے تھے۔ امی اسے بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھیں، ان کا خیال تھا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا کم از کم رخصتی ہی عزت کے ساتھ ہو جائے مگر وہ اس پر بھی راضی نہیں ہوا تھا۔ بہت مایوس ہو کر وہ لوگ گئے تھے۔ وہ کل سے یہیں تھی۔ وہ اس پر اپنے سارے شوق پورے کر چکا تھا مگر دکھ تھا کہ کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ احساس زیاں تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"تیار ہو جاؤ...... گھر چلنا ہے۔" باتھ روم سے نکلنے کے بعد عبدالباری نے اسے سوچوں سے باہر لا پٹخا۔ وہ غسل لے چکا تھا۔ وہ اسے بس تکتی رہی۔

"میں کچھ بکواس کر رہا ہوں رائیل بی بی!" اسے اپنی طرف یوں گھورتے دیکھ کر اس نے ٹوکا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں تیار ہوں......" جوتا پہن کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ عبدالباری نے اسے سر سے پاؤں تک جانچا۔

"کپڑے تو چینج کر لو...... اسی حلیے میں جانے کا ارادہ ہے کیا؟" اس کے بلیک سلوٹوں والے لباس کو ناقدانہ نظروں سے دیکھتے اس نے ٹوکا۔

"میں جب کل گھر سے نکلی تھی تو یہی پہنا تھا، مجھے نہیں علم تھا کہ واپسی پر کسی عقوبت خانے میں جانا پڑ جائے گا۔ فی الحال مجبوری ہے میرے پاس یہی ایک لباس ہے۔" تلخی سے جواب دیا تھا۔ عبدالباری کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال بن گیا۔

"بہت چلتی ہے تمہاری زبان...... اب بیگم صاحبہ! ذرا اسے قابو میں رکھا کرنا۔ میں عادی نہیں ہوں اس لہجے کا، اس قسم کی گفتگو مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ بہت برداشت کیا ہے تمہارا یہ زہر خند لہجہ اب بالکل نہیں کروں گا...... میں رعایت دینے والوں میں سے نہیں ہوں۔" اس کے سامنے آ کر شہادت کی انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی گئی۔ وہ بے خوفی سے سر جھٹک گئی۔

"برداشت نہیں تھی تو پھر یہ رشتہ ہی کیوں باندھا ہے تم نے...... عادی نہیں ہو تو بن جائیں ایس پی صاحب! اگر پہلے یہ لہجہ نہیں سنے تو کیا فرق پڑتا ہے، اب سن لیں، مجھے تو عادت ہے اسی زہر خند لہجے میں بات کرنے کی اور ساری عمر کروں گی۔"

"تو پھر کان کھول کر سن لو تم بھی...... مجھے یہ زبان کاٹنا بھی آتی ہے...... سمجھیں تم!" اس کے بازو کو جھنجھوڑ کر اس نے اسے بستر پر دھکیلا تھا۔

"تو انتظار کس بات کا ہے...... دیر کیوں کر رہے ہو...... میں تو منتظر ہوں، کاٹو زبان میری...... میں بھی تو دیکھوں تم کس حد تک اپنی جنونیت کا مظاہرہ کر سکتے ہو۔ کس حد تک گر سکتے ہو......" آنسو بے اختیار چھلک آئے تھے۔

"رائیل......" وہ لب بھینچ گیا۔ عبدالباری جو ساری رات اس کے آنسوؤں سے نہیں پگھلا تھا، اب رک گیا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا۔

"تم...... تم......" عجب مجنونانہ انداز میں آگے بڑھ کر اس نے اسے کندھوں سے تھام کر خود میں بھینچ لیا تھا۔

"یوں بولو گی تو کسی دن واقعی میرے ہاتھوں سے ضائع ہو جاؤ گی۔" رائیل کے آنسوؤں کی روانی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ وہ کس طور پر اب توجہ پر آمادہ تھا۔ زخم دے کر عبدالباری کی اب یہ مرہم لگانے والی ادا وہ قطعی نہ سمجھ سکی تھی۔

گھر آئے تو سب آ کے نارمل انداز میں ہی ملے تھے۔ بابا سوئے ہوئے تھے، بھابی وغیرہ سے مل کر کھانے کے بعد وہ لاؤنج میں آ بیٹھی تو امی اور بھابی بھی وہیں آ گئیں۔ فرقان بھائی البتہ ناشتے کے بعد آفس کے لئے نکل گئے تھے۔

"تم ساتھ چلو گی یا ابھی ٹھہرنا ہے۔" کچھ دیر بعد عبدالباری جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں...... یہ کہیں نہیں جائے گی، یہ اب یہیں رہے گی۔ تم نے جہاں بھی جانا ہے جاؤ...... مگر اب خیال رکھنا یہ اب اسی گھر میں رہے گی سب کے ساتھ۔" اس کی بجائے جواب امی نے دیا تھا۔

''کیوں......؟'' وہ حیران ہوا۔ ''ہرگز نہیں...... میرے لئے جب آپ کے گھر میں جگہ نہیں تو پھر اس کے لئے بھی نہیں۔ تم اٹھو رائبل! چلو......'' وہ ہمیشہ اپنا ہی حکم چلاتا تھا۔

''کب تم نے ہمیں اپنا سمجھا ہے۔ اپنا سمجھا ہوتا تو یوں نہ کرتے...... اب تمہارا تو مجھے کوئی بھروسہ نہیں ہے اور اس کو تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دوں...... خدا جانے کیا کرتے پھرتے ہو تم اور کیا سلوک کرو گے اس کے ساتھ بھی۔ تم جیسے لوگوں کا نہ کوئی دین ہوتا ہے اور نہ ہی ایمان، جس کے نزدیک ماں کی کوئی عزت نہیں وہ کیا جانے بیوی کی عزت کیا ہوتی ہے۔'' امی نے گویا اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ وہ غصے سے دیکھتا رہا۔

''یہ کہیں رہے گی بلکہ تم بھی اب اپنے آپ کو سنوارو...... اکیلے نہیں رہے ہو اب بھی تم لوگوں کا گھر ہے...... تم بھی یہاں رہو گے۔'' امی نے فیصلہ سنایا تھا۔

''اچھا...... حیرت ہے...... بابا نے اجازت دے دی ہے مجھے بھی اس گھر میں رہنے کی۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

''وہ باپ ہیں تمہارے، دشمن نہیں...... ویسے بھی جیسی تمہاری سرگرمیاں ہیں رائبل کو اس گھر میں اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتے ہم...... جیسے تم ہو ایسا ہی تمہارا حلقہ احباب بھی ہوگا۔ تم سے اچھائی کی کوئی امید نہیں اوروں سے خاک ہوگی۔'' امی نے غصے سے اسے اس کا اصل چہرہ دکھایا تھا۔

''حد ہوتی ہے...... زبردستی ہے کیا...... یعنی اب میں آپ کے اشاروں پر چلوں......'' وہ تلملا یا تھا۔

''ایک تم نے اپنی کی ہے، اب ہماری، ہاں ...... غلط نہیں کہہ رہی ہیں۔ ٹھنڈے دل سے سوچو تو تمہیں ہمارا فیصلہ معقول ہی لگے گا۔ تم تو سارا دن نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے پھرتے ہو، کبھی تو راتوں کو بھی غائب ہوتے ہو۔ یہ زبان کس کے سہارے ہوگی...... چاہے تمہارے پیچھے کوئی چور آئے یا ڈاکو، تمہیں کیا پرواہ ہوگی...... اپنی سرگرمیاں ختم ہوں گی تو تمہیں کچھ اور دکھائی دے گا۔''

اب کہ وہ چپ ہو گیا تھا۔ رائبل نے اس کا چہرہ دیکھا، کیسی بے بسی رقم تھی اس کے چہرے پر۔ یعنی اتنا کچھ کرنے کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح بے بس ہو گیا تھا۔

''ٹھیک ہے مگر مجھ پر کوئی پابندی لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری اپنی زندگی ہے، اپنی ذاتیات ہیں میں کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کروں گا۔''

وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔

عبدالباری نے اپنی ضد پوری کر لی تھی، اب بابا وغیرہ کا مشترکہ فیصلہ تھا کہ ولیمہ بھی ہو جائے ان کا۔ فرقان بھائی کا وسیع حلقہ احباب تھا۔ پھر رشتے داری بھی تھی۔ وہ کس کس سے چھپاتے۔ رائبل کی خاطر وہ مجبور تھے۔ کچھ بھرم بھی رکھنا تھا نکاح جیسے بھی ہوا تھا، وہ لوگ ٹال مٹول کر گئے تھے مگر اب آئندہ کے متعلق راہ ہموار کرنے کو وہ سب سوچ رہے تھے۔ دانش بھیا کو اصل صورت حال سے لاعلم ہی رکھا گیا تھا۔ بس دونوں کے نکاح کی اطلاع دی تھی، باقی تفصیل حذف کر دی گئی تھی۔ اب ان کا ولیمہ تھا جو بڑے خاصے پیمانے پر ہوا تھا۔ لوگ، رشتے دار، دوست احباب اس قدر خفیہ نکاح کرنے پر استفسار کر رہے تھے۔ وہ سب لوگوں کو بس کسی نہ کسی طرح مطمئن کرتے رہے تھے جب کہ اندر ہی اندر برا حال ہو رہا تھا۔ ایک تماشا سا بن گیا تھا اور جو تماشے کا سبب تھا وہ شاداں و فرحاں لوگوں سے مل رہا تھا، یوں جیسے کچھ انوکھا نرالا ہوا ہی نہیں۔ خدا خدا کر کے ولیمے کی تقریب اپنے انجام کو پہنچی تھی، سب نے شکر ادا کیا۔ تقریب کے اختتام پر وہ لباس بدل کر ابھی بیٹھی ہی تھی کہ بھابی، حفظہ اور عصمہ وغیرہ آ گئیں۔ بھابی ساتھ چائے بھی لائی تھیں، چاروں خاموشی سے پینے لگیں۔

''آج تم بہت خوبصورت لگ رہی تھیں رائبل...... پہلے کبھی بھی تمہیں یوں بنے سنورے دیکھا ہی نہیں تھا۔ پہلی مرتبہ تم اس قدر سجی ہو۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے حور زمین پر اتر آئی ہو۔ ایمان سے ہم تو حیران تھیں......'' بھابی چائے پیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ وہ بمشکل مسکرا سکی۔ حفظہ اور عصمہ وغیرہ بھی مسکرا رہی تھیں۔

''عبدالباری بھی بہت جچ رہا تھا...... دونوں ساتھ بیٹھے غضب کے لگ رہے تھے۔ آہ...... کاش ظاہر کی طرح اس کا باطن بھی خوبصورت اور دلکش ہوتا۔'' عصمہ نے دکھ سے کہا تھا۔ سب کچھ دیر تک خاموش سی ہو گئیں تو کچھ وقفے کے بعد حفظہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔

''رائبل! اب ہماری ساری امیدیں اللہ کے بعد تم ہی سے ہیں۔ وہ جن راستوں پر چل رہا ہے ان سے اسے تم ہی واپس لا سکتی ہو۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ تمہارے سامنے ہے، اس کے مزاج کے ہر رنگ سے تم واقف ہو۔ اس کی نیچر، عادات و اطوار اور اس کی سرگرمیاں کچھ بھی تو تم سے چھپا ہوا نہیں۔ ہم نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ نارمل انسانوں جیسی زندگی گزارے مگر سب تدبیریں اکارت گئی ہیں۔ اس نے سب جائز و ناجائز بھلا کر تم سے شادی کی ہے۔ تم ہی وہ واحد ہستی ہو جو اسے بدل سکتی ہو۔ اس کی زندگی میں تبدیلی لا سکتی ہو۔'' حفظہ رندھی ہوئی آواز میں اسے سمجھا رہی تھی۔ وہ چپ رہی۔

''آپ کے لئے یہ کہنا آسان ہے مگر آپ سب کیا جانیں برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے۔ میں کس اذیت میں ہوں، کون جانے۔ ابھی تک تو میں یہ بھی نہیں جان سکی کہ آپ کے بھائی کی نظروں میں میرا اصل مقام کیا ہے۔ ابھی تک تو میں صرف اس کے لئے ایک ضد ہی ہوں۔ صرف ایک انتقام ہوں۔ نہ جانے میرا اصل مقام کیا ہے۔ ابھی تک تو میں اس کو تسکین پہنچانے والی جیتی جاگتی انا ہوں۔'' وہ بہت منفی انداز میں سوچ رہی تھی۔ آج جس جس طرح لوگوں نے ان کے اور باری کے متعلق کرید کرید کر پوچھا تھا، اس سے اس کے اندر کا اشتعال بڑھ گیا تھا۔ اس کے اندر کی لڑکی کا دم ہی گھٹنے لگا تھا۔ جو کچھ بھی تھی مگر اب بدنام ہو گئی تھی۔ یہ دکھ ہی بہت بڑا تھا، بہت ازیت دے رہا تھا۔

''کتنے عرصے بعد ہم نے اس کی نظروں میں پرانی جوت دیکھی ہے۔ وہی عزت، وہی احترام دیکھا ہے اس کی آنکھوں میں جو کبھی یہاں آنے پر وہ ہمیں دیا کرتا تھا۔ وہ بدل سکتا ہے اگر تم کوشش کرو۔'' عصمہ بھی کہہ رہی تھی۔

''کیسے کوشش کروں!؟ اگر ضد کے بجائے کوئی جذبہ ہوتا تو شاید میں اپنی ذات کی اتنی بے توقیری اور عزت نفس کی اس قدر پامالی برداشت بھی کر لیتی۔ اب یہ دکھ ہی کم نہیں ہوتا کہ میں صرف ایک ضد تھی۔ چاہے جانے کی خواہش کے نہیں ہوتی اور یہاں تو ایک لمحہ بھی نہیں سوائے بے عزتی کے۔ ہر شوق، ہر لگن، ہر خواہش ہی مر گئی ہے۔ اب تو اپنا آپ ایک بت کی مانند لگتا ہے جس سے عبدالباری صرف اور صرف اپنے نفس کی خواہش پوری کرتا ہے ورنہ درمیان میں تو کچھ بھی نہیں۔'' آج کے تجربے نے اسے بہت دکھی اور زود رنج کر دیا تھا۔ کچھ کہنے سے خود کو پھر بھی باز رکھا تھا۔

وہ سب کچھ دیر مزید بیٹھی تھیں۔ عبدالباری کمرے میں داخل ہوا تو وہ تینوں اسے شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکل گئی تھیں۔ وہ بستر درست کر کے دراز ہو گئی۔ نماز وہ لباس بدلتے ہی پڑھ چکی تھی اب صرف سونے کی خواہش تھی۔

''کیا مصیبت ہے، اس گھر میں پرائیویسی نام کی کوئی چیز ہی نہیں...... جسے دیکھو دندناتا ہوا کمرے میں گھسا ہوا ہے۔'' کوٹ اتار کر بیڈ پر اچھالتے وہ سخت غصے میں تھا۔ آنکھیں کافی سرخ ہو رہی تھیں شاید باہر کسی سے کوئی بات ہوئی تھی، وہ یہی اندازہ لگا کر چپ چاپ اسے دیکھے گئی جس کے نزدیک اس کے وجود کی اہمیت دو کوڑی کی بھی نہیں تھی۔ پھر وہ کس بنیاد پر اس سے کچھ پوچھتی۔ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کچھ پل گزرنے کے بعد وہ بھی بستر پر آ گیا تھا۔

''تم نے اتنی جلدی لباس بدل لیا، میرا انتظار بھی نہ کر سکیں۔'' اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ کہہ رہا تھا۔ وہ کتنے دنوں

سے یہ سب برداشت کر رہی تھی۔ جب سے نکاح ہوا تھا اس کی یہی روٹین تھی مگر آج کے تجربے نے اندر نس نس میں اترتی اذیت اور اشتعال نے اس کا ذہن بدل دیا تھا۔ پہلے وہ اس کے ہاتھ نہیں روکتی تھی مگر اب اس کے ہاتھ برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ سارے بدن میں تکلیف کی لہر اترتی چلی گئی تھی۔ وہ بستر پر بیٹھ کر اس پر جھکا تھا۔ اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لینا چاہتا تھا لہجہ بگڑ بدل گیا تھا، آنکھوں میں واضح طلب سی اتر آئی تھی۔

"چھوڑو مجھے..... اپنے غلیظ، ناپاک ہاتھ نہیں لگاؤ مجھے۔" شاید اب ضبط کا پیمانہ چھلک گیا تھا۔ اب وہ اپنے وجود کی مزید توہین برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ بپھرے ہوئے انداز میں اس کے ہاتھوں کو جھٹک دیا تھا۔

"کیا بکواس کرتی ہو تم....." یوں ہتک آمیز انداز میں اپنے ہاتھ جھٹکے جانے پر وہ بھی برداشت نہیں کر پایا تھا۔ وہ بستر سے اترنے لگی تھی، اس نے فوراً بازو پکڑ کر دھکیلا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو.... ؟ یہ کیا تماشا ہے.... یہاں لیٹو....." اسے کھینچ کر بستر پر گرایا تھا۔ رائیل کا تن بدن سلگنے لگا۔

"تماشا کیا؟ دنیا سے تم کیا جانو..... سارے عالم میں میری ذات کا اشتہار لگوا کر تم مجھے تماش بین کا لقب سنا رہے ہو۔" آج رائیل کا ہر انداز ہی نرالا تھا۔ وہ حیران بھی تھا۔ جب احتجاج کرنے کا وقت تھا تب وہ چپ چاپ سب سہہ گئی تھی اور اب.....

"رائیل! بند کرو اپنی بکواس....." وہ آہستہ آواز میں چیخا تھا۔ شاید اسے گھر میں موجود مہمانوں اور لوگوں کی پرواہ تھی جب کہ رائیل کو اب کسی کی بھی پرواہ نہیں تھی۔

"کیوں کروں اپنی بکواس بند..... میں کہہ رہی ہوں چھوڑو مجھے..... اپنے ناپاک ہاتھوں کو صرف اپنے تک محدود رکھو..... اتنے دنوں سے سہہ رہی ہوں یہ ذلت، اب برداشت نہیں کروں گی۔" وہ اونچی آواز میں چیخی تھی، ساتھ ہی آنسو بھی بند توڑ کر باہر نکل آئے تھے۔ رائیل نے عبدالباری کی مضبوط چٹانی گرفت سے اپنا بازو چھڑوانے کی کوشش بھی کی تھی۔

"آہستہ بولو..... ورنہ حلق سے سانس کھینچ لوں گا..... اسی لئے میں اس گھر میں رہنے کے حق میں نہیں تھا..... جانتا نہیں اور صبر جل جائے گی تو ویسے بھی اس گھر میں تمہارے بہت خیر خواہ ہیں....." رائیل کے منہ پر اپنا کھردرا ہاتھ رکھ کر وہ غرایا تھا۔ رائیل صرف بے بس چڑیا کی طرح پھڑپھڑا سی گئی۔ آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر دائیں بائیں گرنے لگے۔ عبدالباری نے اس کے منہ سے ہاتھ اٹھایا تو وہ اسے پیچھے دھکیل کر بستر سے اتری۔

"بہت برداشت کر لیا ہے میں نے..... اب نہیں کروں گی۔ انسان ہوں، بت نہیں..... کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے..... اف میرے خدا! اتنی تذلیل، اتنی توہین..... کوئی تقدس ہی نہیں تمہارے نزدیک اس رشتے کا..... اصل پاکیزگی کیا ہوتی ہے تم جیسے نفس پرست، رشوت خور انسان کیا جانیں..... تم نے مجھے بے غیرتوں کی طرح گھر کی چار دیواری سے نکال کر چوراہے میں سر عام برہنہ پا کھڑا کر دیا اور میں چپ رہی، خاموش ہو گئی..... صرف اس لئے کہ تم ضد پر اترے ہوئے ہو اور اگر میں نے کچھ کیا تو رہا سہا بھرم بھی ختم ہو جائے گا مگر آج جو تذلیل لوگوں کی نظروں میں، میں نے دیکھی ہے، جو باتیں میرے کانوں نے سنی ہیں اور جو نظریں میرے وجود نے برداشت کی ہیں، وہ میں مزید نہیں سہہ سکتی..... ختم کرو اپنا یہ کھیل....."

"چٹاخ....." ابھی وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ عبدالباری کا زناٹے دار تھپڑ اس کے نرم و نازک رخسار کو سلگا گیا تھا۔ اس کی بولتی ایک دم بند ہوئی تھی۔

"شٹ اپ..... بہت کر لی تم نے اپنی بکواس..... اب ایک لفظ مزید نہیں سنوں گا..... بیوی ہو تم میری، یاد رکھو؟ کوئی غلط لفظ نہیں سنوں گا....." اس کا انداز مالکانہ حقوق کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ "میں نے ابھی تم پر ہاتھ نہیں اٹھایا، اب بھی صرف تمہاری بکواس کا نتیجہ ہے..... آئندہ ایسی بکواس کی تو زبان گدی سے کھینچ لوں گا....." اس کا بازو تھام کر اسے بستر کی جانب

دیا تھا اس طرح کہ وہ منہ کے بل بستر پر جا گری تھی۔ وہ شدت سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"کیوں کروں اپنی بکواس بند..... کیا ہے ہمارے درمیان، صرف ضد..... جب خاص کچھ ہے ہی نہیں تو کیوں برداشت کروں یہ سب..... صرف ایک ضد تھی میں تمہارے لئے..... اب تمہاری تحویل میں، تمہاری دسترس میں ہوں..... فاتح ہو تم، میرے وجود پر ملکیت کا جھنڈا گاڑ کے روز جشن مناتے ہو تم..... نہ جانے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو تم..... میں یہ سب سہہ لیتی، سب برداشت کر لیتی اگر تمہارے نزدیک میرے وجود کی نہیں میرے کردار کی کوئی اہمیت ہوتی۔ محبت نہ سہی، احترام کا جذبہ ہی ہوتا..... وفا اور یقین کا نہ سہی، اس رشتے کا تقدس ہی پامال نہ کرتے تم..... مگر..... تم تو انتہائی بدنیت و بدفطرت انسان ہو..... تم پر تو تھوکا جا سکتا ہے، کبھی گلے نہیں لگایا جا سکتا....."

رخسار آگ کی طرح دہک رہا تھا جب کہ زبان شعلے اگل رہی تھی۔ نرم و نازک روئی جیسے رخسار کی اسکن سرخ ہو چکی تھی۔ انگلیوں کے نشان بہت واضح تھے۔ وہ منہ کے بل ابھی بھی دراز تھی، سب کہہ رہی تھی۔ کوئی خوف، کوئی ہراس دامن گیر نہیں تھا۔ عبدالباری کچھ دیر لب بھینچے کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر آگے بڑھ کر سائیڈ پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی بھرا تھا۔

"لو یہ پانی پی لو....." وہ اب بالکل خاموش تھی۔ اس پکار پر بھی سر نہیں اٹھایا تھا شاید سب الفاظ ختم کر چکی تھی۔ اندر اٹھنے والا طوفان اپنی طغیانی سمیت کر مدھم پڑ چکا تھا۔ وہ اس کے قریب بیٹھا تھا، ہاتھ سے اس کا رخ سیدھا کیا تھا۔ آنکھیں قاتل ہو رہی تھیں۔ چہرے پر اپنی بے حسی کے نشان دیکھ کر نہ جانے اندر کیا کچھ ہوا تھا۔

"پانی پی لو....." گلاس اس کے ہونٹوں کے قریب لے جاتے نرمی سے کہا تھا۔

"مجھے نہیں پینا....." اس نے سختی سے جھٹکنا چاہا تھا، عبدالباری نے دوسرے ہاتھ سے اس کا بازو تھام لیا۔

"میں نخرے اٹھانے یا ناز برداری رکھنے والوں میں سے نہیں ہوں، بلکہ کرانے والوں میں سے ہوں، سو چپ چاپ پانی پی لو ورنہ....." نرم لہجہ لمحے ہی بھر پھر سخت و کرخت ہو گیا تھا۔ رائیل نے عجیب نظروں سے دیکھا تھا پھر گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ سانس اکھڑ رہی تھی سو پانی پینا مجبوری تھی۔

"گڈ گرل....." وہ فتح مندی سے مسکرایا تھا۔ رائیل نظریں پھیر گئی، پھر خالی گلاس سائیڈ پر رکھ کر وہ لائٹ آف کر کے بستر پر آ گیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اسے پھر اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس دفعہ کوئی مزاحمت نہیں ہوئی تھی شاید چیخ کر رو کر وہ اپنے دل کا غبار نکال چکی تھی یا پھر اس کے اندر لڑنے کی ہمت ہی اس قدر کم تھی۔

⁜ ⁜ ⁜

وہ اسکول میں تھی جب عبدالباری کا فون اس کے لئے آیا تھا۔ تین دن سے وہ گھر نہیں آیا تھا۔ کوئی فون، کوئی اطلاع تک نہ تھی۔ اس نے پتہ کروایا تھا فرقان بھائی سے تو معلوم ہوا کہ وہ اس شہر میں بھی نہیں ہے، کہاں ہے کسی کو کچھ علم نہیں۔ اس کی طرف سے ایک فطری سی پریشانی بہر حال تھی۔ وہ اردو کا پیریڈ لے رہی تھی جب اطلاع ملی تھی۔ وہ سب چھوڑ چھاڑ فون سننے آفس میں آ گئی تھی۔

"عبدل کا فون ہے۔" بابا ریسیور تھما کر آفس سے نکل گئے تھے۔

"ہیلو....." وہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"رائیل! میں نے گھر فون کیا تھا تو پتہ چلا کہ تم اسکول میں ہو۔" بغیر سلام دعا کے وہ اس کی آواز پہچانتے ہی کہہ رہا تھا۔

"بس گھر میں فارغ تھی اسی لئے چلی آئی۔" اس نے بے تاثر لہجے میں بتایا۔

"اچھی بات ہے..... مزاج یار میں کچھ تو تبدیلی آئے گی۔" دوسری طرف سے دل جلایا گیا تھا۔ وہ سلگ سی گئی۔ کچھ سخت

کہنے سے بمشکل زبان کو روکا۔

"کیسے فون کیا؟" تین دن سے کوئی رابطہ نہ تھا اسی لئے اصل مقصد کی طرف آ گئی۔ لہجے میں ایک واضح تلخی تھی جسے شاید وہ بھی نوٹ کر گیا تھا۔

"کیوں...... بغیر کسی وجہ کے میں تمہیں فون نہیں کر سکتا...... نصف بہتر ہو تم میری۔"

"اچھا اتنی جلدی یاد آ گیا کہ ہمارے درمیان ایسا کوئی رشتہ بھی ہے...... مزید کچھ اور بھی یاد ہے کہ نہیں......" اس نے تلخی سے پوچھا تھا جب کہ اندر بلبلا رہی تھی کہ چپ رہو مگر نہ جانے کون سا احساس تھا جو یہ سب اگلوا گیا تھا۔ شاید آنکھ سے آنسو بھی بہنے لگے تھے۔ آج کل اپنی بے وقعتی اور توہین کا احساس ہر احساس پر حاوی ہونے لگا تھا۔

"خیریت بیگم صاحبہ! اتنی مرچیں کیوں چبا رہی ہیں......" عام انداز میں دونوں بات کرنا جیسے جانتے ہی نہ تھے۔ دوسری طرف سے بھی وہی انداز اختیار کیا گیا تھا۔ وہ مزید سلگ گئی۔

"اگر واقعی ہمارے درمیان ایسا کوئی رشتہ ہے تو پھر پوچھ سکتی ہوں کہ تم اس وقت کہاں سے فون کر رہے ہو اور تین دن سے کہاں تھے؟ کوئی اطلاع، کوئی خبر نہیں یہاں سب، خاص طور پر بڑی امی کس قدر پریشان ہیں۔ بار بار مجھ سے پوچھ چکی ہیں کہ مجھے کچھ علم ہوتا تو میں بتاتی۔ مجھے تو ابھی تک یہ نہیں علم کہ کیا اوقات ہے میری؟ کیا حیثیت ہے میری؟ بتانے سے اگر تمہاری کوئی توہین ہونی تھی تو کم از کم کوئی اطلاع ہی کر دی ہوتی یا پھر کوئی نشان تک چھوڑا ہوتا کہ دوسروں کو خواہ مخواہ شرمندگی برداشت نہ کرنا پڑتی...... مانا کہ یہ نئی بات نہیں مگر رشتے بدلنے سے اوقات کار اور عادات و فرائض بھی بدل جاتے ہیں۔ کاش اتنا تو جان لیا ہوتا......" وہ جانتی تھی اس بے حس پر کچھ اثر نہیں ہو گا مگر پھر بھی سب کہہ گئی تھی۔ دوسری طرف وہ مسکرایا تھا۔

"یہ ہر وقت تمہیں اپنی حیثیت کی کیوں فکر رہتی ہے۔ اپنے نام تو تمہیں لکھوا چکا ہوں، بابا نے ولیمہ کروا کے لوگوں کو بتا دیا ہے، اب کس بات کی گنجائش ہے۔ اگر اطلاع نہ دینے کا صدمہ ہے تو جب جا رہا تھا اس وقت خاموش رہنے کے بجائے پوچھ لیتیں تو ظلم ہو جاتا۔ بہرحال امی سے فون پر بات کر چکا ہوں۔ تمہیں فون اس لئے کیا ہے کہ رات آٹھ بجے تک تیار رہنا، ایک جگہ دعوت ہے۔ کوئی اچھا سا لباس زیب تن کر لینا۔ سوگ کی حالت میں نہ دیکھوں تمہیں میں" اسے کسی بھی خاطر میں نہ لاتے اپنی کہے جا رہا تھا۔ رائبل کا جی چاہا کہ ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر فون بند کر دے یعنی کوئی وقعت ہی نہیں تھی اس کے رونے کی عبدالباری کی نظروں میں۔ نرا پتھر تھا وہ۔

"کیسی دعوت......؟ کس نے انوائٹ کیا ہے؟"

"چند دوستوں نے مل کر انوائٹ کیا ہے...... شادی کے سلسلے میں دعوت دی ہے۔ کتنے دنوں سے کہہ رہے تھے میں فارغ نہیں تھا۔ آج رات فراغت ہی فراغت ہے سو ہامی بھر لی۔ تم اچھی طرح ڈریس اپ ہو جانا۔ میں تمہیں پک کر لوں گا۔" وہ چپ چاپ سنتی رہی جب کہ دل اندر ہی اندر دعوت کا پس منظر اور دینے والوں کے متعلق جان کر سخت کبیدہ خاطر ہوا تھا۔

ایک دو باتیں اس نے مزید کی تھیں پھر فون بند کر دیا۔ دعوت میں جانے کا نہ ہی اسے شوق تھا اور نہ ہی کوئی اشتیاق۔ عبدالباری پر جب اعتبار و بھروسہ ہی نہیں تھا تو اس کے دوست جائیں بھاڑ میں...... اس نے نہ جانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ بیزاری میں اپنا آپ برباد نہیں کر سکتی تھی، خاص طور پر مردوں کے سامنے جانے سے اسے ہمیشہ ایک چڑ سی ہوتی تھی۔

گھر آ کر اس نے گھر والوں سے دعوت کے متعلق بالکل ذکر نہیں کیا تھا۔ آمنہ اس کی بچپن کی دوست تھی، اکثر دونوں ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی رہتی تھیں۔ بھابی کو اس نے راضی کر لیا تھا، شام ہوتے ہی تیار ہو کر دونوں آمنہ کے گھر آ گئی تھیں۔ دو گھنٹے سکون سے گزرے تھے، واپسی میں گھر چلنے کے بجائے اس نے ڈرائیور کو شاپنگ سینٹر چلنے کو کہا تھا۔

"اس وقت...... بھلا یہ کون سا وقت ہے۔ ایک تو تم بے وقت گھر سے نکلی ہو اب یہ بے وقت کی شاپنگ...... کل کر لینا۔" بھابی نے منع کیا تھا۔

"نہیں بھابی! مجھے آج ہی شاپنگ کرنی ہے، میرے پاس جو لباس ہیں وہ باری کو پسند نہیں۔ کسی دعوت میں چلتے ہوئے سو سو باتیں سننا پڑتی ہیں۔ اولڈ فیشن کہہ کر ہر لباس میں سو سو کیڑے نکالے جاتے ہیں۔ یہ کام میں آج ہی نمٹانا چاہتی ہوں۔" اس نے عبدالباری کا نام لے کر بھابی کو لاجواب کر دیا تھا۔ اس دوران وہ کچھ وقت مزید سکون سے گزارنا چاہتی تھی۔ موبائل اپنا آف کر چکی تھی، بھابی کا موبائل اس نے ساتھ لانے ہی نہیں دیا تھا یہ کہہ کر ایک ہی کافی ہے۔ سو عبدالباری کی طرف سے چند گھنٹے سکون سے گزرے تھے۔

واپسی میں انہوں نے آئس کریم کھائی تھی، گھر لوٹتے لوٹتے بھی گیارہ کا وقت ہو گیا تھا۔ جیسے ہی گاڑی رکی سامنے ہی بڑی امی پریشانی سے ٹہلتے مل گئیں۔

"کہاں رہ گئی تھیں تم دونوں......؟" چھوٹتے ہی انہوں نے پوچھا تھا۔

"خیریت......" انہیں اس قدر پریشان دیکھ کر بھابی نے پوچھا تھا۔

"رائبل! تمہیں عبدل نے کسی دعوت میں چلنے کو کہا تھا، پھر تم گھر سے کیوں نکلیں۔ تمہاری غیر موجودگی میں اس نے زمین آسمان ایک کر دیا تھا۔ وہ تمہیں انتظار کر کے ابھی نکلا ہے، کئی بار تمہارے موبائل پر بھی ٹرائی کرتا رہا ہے وہ آف کیا ہوا تھا تم نے۔" وہ متفکر لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

"میرے پاس ان کی شایان شان کپڑے نہیں تھے اس لئے شاپنگ کرنے نکل گئی تھی بس کچھ دیر ہو گئی۔" وہ خود پر کوئی الزام نہیں لینا چاہتی تھی۔

"عبدل بہت غصے میں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ تم جان بوجھ کر گھر سے نکلی ہو۔ اب آئے تو آرام سے بات کرنا۔ تمہیں اس کے غصے کا اندازہ تو ہے نا......" وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔

"وہ کب غصے میں نہیں ہوتا...... اپنے گریبان میں جھانکنے کے بجائے دوسروں کو ہی نشانے پر رکھا ہوا ہے۔ خود تو تین دن بعد گھر آیا ہے، یہ تک نہیں بتایا کہ گیا کہاں تھا۔ اب مجھ پر غصہ آ رہا ہے، ہاں جان بوجھ کر میں گئی تھی۔ بہت برداشت کر لیا اس کی حاکمیت کو اب نہیں کروں گی۔ آئے تو بتا دیجئے گا اسے" غصہ تو اصل میں اسی بات کا تھا، جو منہ میں آیا کہہ دیا، کوئی بھی پروا نہ کی کہ بڑی امی یا بھابی کیا کہیں گی۔ عبدالباری کے روم میں جانے کے بجائے اپنے کمرے میں آ گئی جو کبھی شادی سے پہلے اس کے استعمال میں تھا۔

"جی حضوری کر کے تو اب زاویے کو سر چڑھایا ہوا ہے۔ پہلے ہی کنٹرول کیا ہوتا تو یہ دن تو نہ دیکھنے پڑتے۔" الٹا سیدھا کوستے اس نے تمام شاپنگ بیگز بیڈ پر اچھال دیئے۔ بھوک بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی، بالکل نظر انداز کئے وضو کر کے جائے نماز پر کھڑی ہو گئی۔

صبح نو بجے کے قریب وہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔ بھوک سے برا حال تھا، کچن میں آ کر اپنے لئے کھانا نکالا تھا۔ بھابی اس کے انداز دیکھ کر خاموش رہیں۔ وہ خاموشی سے ناشتہ کرتی رہی۔

"بہت دیر تک آج تم سوتی رہی ہو...... عبدل کتنی مرتبہ تمہارا پوچھ چکا ہے۔" وہ چائے پی رہی تھی جب بھابی نے اطلاع دی تھی۔ وہ چونک گئی۔

"وہ آفس نہیں گیا ابھی تک......" وہ دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئی۔

"جب ادھکلی میں سر دیا تو پھر موصل سے کیا ڈرنا۔" آخری گھونٹ حلق میں اتار کر وہ کمرے میں چلی آئی۔ عبدل کی دروازے کی طرف پشت تھی، وہ فون پر کسی سے مخاطب تھا۔

"نہیں بتاتا تو تم زبان کاٹ دو اس کی...... چھری او جیز دو، اس کے فرشتے بھی بتائیں گے۔ مجھے ہر حال میں اس کی زبان کھلی چاہیے۔ چند گھنٹوں کے اندر، ورنہ میں تم لوگوں کے ہاتھ سلامت رہنے کی گارنٹی نہیں دوں گا۔ انڈر اسٹینڈ!"

اتنا وحشیانہ لب و لہجہ تھا، وہ ٹوک انداز میں ایک خاص تحکم لپٹا ہوا تھا۔ وہ لرز کر رہ گئی۔ اس کا یہ نیا روپ اس کے سامنے تھا۔ فون بند کر کے وہ پلٹا تھا۔ اسے کمرے میں دیکھ کر رک گیا۔

"اوہ...... تو آ گئیں رانیل صاحبہ!" وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ "کیسی گزری رات......" وہ خاموش رہی۔ "کل جب میں نے کہہ دیا تھا کہ تم مجھے ہر حال میں تیار ملو تو پھر گھر سے کیوں نکلیں۔" دیکھنے کا انداز بھی نہایت سفاک و وحشیانہ تھا۔

"بس میرا دل نہیں چاہتا تمہارے ساتھ کہیں بھی جانے کو۔" اس نے سادہ لہجے میں پر اعتماد انداز میں کہا تھا۔ عبدل کا جی چاہا کہ کھینچ کر اسے طمانچہ رسید کر دے۔

"تم یہ بکواس اس وقت بھی کر سکتی تھیں جب میں نے فون پہ اطلاع دی تھی۔" یہ پوچھتے ہوئے اس کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا جب کہ وہ اسے کسی بھی خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔

"ہاں دے سکتی تھی اگر یہ یقین ہوتا کہ تم میرے انکار کو مان جاؤ گے جب کہ اس کے برعکس تم یہ کرتے کہ رات کو لے جانے کے بجائے تم مجھے ضد اور انتقام میں آ کر اسی وقت اسکول سے لے جاتے...... اور میں تمہارے ساتھ کہیں بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔"

"رانیل! تم خود کو کیا چیز سمجھتی ہو خود کو۔" وہ اس وقت عبدالباری کے غصے سے ذرا بھی مرعوب دکھائی نہیں دے رہی تھی اور اس وقت اسے یہی بات سب سے زیادہ چبھ رہی تھی۔ اس نے رانیل کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ "میرے سامنے بڑے بڑوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں اور تم ہو کہ......"

رانیل کو لگا اس کے کندھے عبدالباری کے ہاتھوں تلے کٹ جائیں گے۔

"میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں تمہاری زرخرید نہیں ہوں...... بیوی سمجھتے ہو تو بیوی کی طرح رکھو۔ طوائف یا بازاری عورت نہیں ہوں جو تمہارے یا تمہارے دوستوں کے دل بہلانے کا سامان کروں۔ میری اپنی بھی ایک ذات ہے، پسند اور ناپسند کے معیار ہیں جو تمہاری سرگرمیاں اور حرکتیں ہیں ویسے ہی انداز تمہارے دوستوں نے بھی اپنا رکھے ہوں گے۔ جب تمہیں برداشت کرنا میرے لیے ناممکن ہے تو پھر اور لوگوں کو کیوں کروں...... یہ بات میری بجائے تمہیں سمجھنی چاہیے تھی۔" وہ اس کے ہاتھوں کو جھٹکے کی قدم دور ہٹتے بے خوفی سے کہہ گئی۔

"رانیل! تم میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو......" عبدالباری کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بے خوفی اور نڈر انداز میں چلتی رانیل کی زبان کو ایک لمحے میں کاٹ دے۔ کب عادت تھی اسے ایسے لہجے سننے کی اور اوپر سے رانیل کی باتیں...... اس رات بھی اس کی زبان نے اسے آؤٹ کر دیا تھا، اس وقت تو اور بھی برا حال ہو رہا تھا۔

"بس رانیل بیگم...... اب کسی بھول میں مت رہو۔ بہت ڈھیل دی ہے میں نے تمہیں۔ اس گھر میں تمہیں لے کر رہنے پر راضی صرف اس لیے ہوا تھا کہ مجھے امی کی محبت مار گئی تھی لیکن اب تمہیں اس گھر میں رکھنا بہت بڑی غلطی ہو گی اور مجھے غلطیاں کرنے کی عادت نہیں...... کہنے کے بجائے عمل کرتا ہوں۔ سمیٹ لو اپنی چیزیں اور چلو یہاں سے......" عبدالباری نے رانیل کا بازو تھام کر الماری کی طرف دھکیلا تھا۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بمشکل بچا سکی تھی۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی...... تم مجھے کہیں نہیں لے جا سکتے۔" پہلی دفعہ اس وقت اس کا لہجہ لڑکھڑایا تھا۔

"اچھا......" عبدالباری چند ثانیے تک دیکھتا رہا تھا۔ عبدالباری کے تیور ان لمحوں میں رانیل کو ناقابل فہم لگے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ تم کوئی چیز نہیں لینا چاہتی تو نہ سہی...... یوں ہی سہی...... چلو آؤ......" اس نے اس کی کلائی تھام لی تھی۔

"اب نہیں باری! اس دفعہ نہیں...... چھوڑو مجھے......" اس نے اپنا بازو چھڑانے کی سخت کوشش کی تھی مگر بری طرح ناکام ہوئی تھی۔ مقابل کی گرفت فولاد کی مانند سخت تھی۔ وہ اسے لے کر باہر نکل آیا تھا۔

"باری...... پلیز...... زبردستی نہیں کرو......" وہ پوری جان سے چیخی تھی۔ راستے میں بھابی مل گئیں۔ اس وقت امی اور بابا اسپتال میں تھے اور فرقان بھائی آفس میں۔

"کہاں لے جا رہے ہو عبدل تم رانیل کو؟" رانیل کو روتے، چیختے اور عبدل کو اسے کھینچ کر لے جاتے دیکھ کر بھابی ایک دم ٹھٹھک کر آگے بڑھی تھیں۔

"مت جائیے بھابی آپ سامنے سے...... یہ سمجھتی ہے میں بہت گھٹیا ہوں۔ اس گھر کی چار دیواری کے علاوہ یہ میرے ساتھ کہیں بھی محفوظ نہیں...... اور اب میں اسے دکھانا چاہتا ہوں کہ میں کس قدر گھٹیا ہوں...... اور کس حد تک گر سکتا ہوں۔" عبدالباری کا انداز کسی بھی احساس و رحم سے عاری سفاک و برہنہ تھا۔ بھابی کچھ بھی نہ سمجھ سکیں۔ رانیل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"معاملہ کیا ہے......؟" انہوں نے مداخلت کی تھی۔

"بہت شوق ہے اسے خود کو طوائف اور بازاری عورت سمجھنے کا، وہاں اس کی اوقات اور اپنی زندگی میں کیا مقام ہے، بتانے لے جا رہا ہوں...... امی آئیں تو بتا دیجئے گا کہ میں اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا ہوں......" ایک زہر بھری نظر رانیل پر ڈال کر وہ پھر اس کی کلائی کھینچتا اپنے ساتھ گھسیٹتا آگے بڑھ گیا تھا۔

"عبدل...... بات سنو، پلیز...... رکو......" بھابی پیچھے آوازیں دیتی رہ گئی تھیں مگر اس نے کان نہیں دھرا تھا۔ اسے گاڑی میں دھکیل کر زن سے گیٹ سے گاڑی نکال کر لے گیا تھا۔

❋ ❋ ❋

کتنے دنوں سے رانیل کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ کچھ بخار تھا، زکام نے الگ حالت خراب کر رکھی تھی اور اوپر سے وقت بے وقت کے چکر...... یہاں آ کر وہ صرف بیمار ہو کر رہ گئی تھی۔ عبدالباری نہ صرف اسے یہاں لے کر آیا تھا بلکہ باہر کی دنیا سے جیسے ہر طرح کا تعلق ہی ختم کر دیا تھا۔ قید، بیماری، اذیت و تنہائی کی سزا کیا ہوتی ہے وہ اب سمجھ سکی تھی۔ عبدالباری کو اس کی دن بدن بگڑتی حالت کا ذرا احساس نہیں تھا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر انجان بن جاتا تھا۔ کتنی دفعہ اس کی موجودگی میں چکرا گئی تھی مگر مجال ہے جو ہمدردی کا جذبہ جاگا ہو۔ گھر سے امی، بابا، فرقان بھائی، بھابی وغیرہ سب ہی کتنی دفعہ آ چکے تھے، ہر ایک نے اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی تھی کہ معاملے کو سلجھا سکیں لیکن عبدالباری ان کی بات کیا سنتا بلکہ اس نے تو ان کو رانیل سے بھی ملنے نہیں دیا تھا۔ وہ ایک قیدی بن کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنے سارے افسرانہ حربے شاید اسی پر آزمانا چاہتا تھا۔

عبدالباری کے کچھ دوست آئے ہوئے تھے، ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھا۔

"پہلی دفعہ تم یہاں نہیں تھے اور کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ تمہارے محکمے نے بہت تنگ کیا ہوا ہے، ہر چوکی پر روک کر تفتیش شروع کر دیتے ہیں۔ اس دفعہ ذرا خود دیکھو کون لوگ ہیں وہ...... باس کا بھی یہی حکم ہے۔" تنویر کہہ رہا تھا، اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور بریف کیس پر جو کہ نوٹوں سے بھرا میز پر رکھا تھا۔

"ٹھیک ہے..... تم پاس سے کہہ دینا کام ہو جائے گا، میں خود جانچ پڑتال کر لوں گا۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔" بریف کیس بند کر کے بارى نے ایک طرف رکھ دیا تھا، تنویر مسکرا دیا۔

"مجھے یقین تھا تم انکار نہیں کرو گے۔ یہ تو صرف ایڈوانس ہے، باقی رقم کام ہونے کے بعد ہوگی۔ جو چاہو گے ملے گا، تم تو یاروں کے یار ہو۔ باس بڑی تعریفیں کرتا ہے تمہاری۔ بڑا مقام ہے تمہارا۔"

عبدالباری کے چہرے پر صرف ایک پل کو مسکراہٹ آئی تھی پھر معدوم ہو گئی۔ رانیل جو ادھر یوں ہی آ نکلی تھی، دروازے پر ہی ٹھٹک گئی۔ یہ چہرے اس کے لئے بالکل اجنبی تھے، فیصلہ نہ کر پائی کہ کیا کرے، اندر جائے یا نہیں۔

"عبدالباری! سنا ہے یار شادی کر لی ہے تم نے۔ بڑے بے مروت نکلے، ویسے کے لڈو تک نہ کھلائے۔ ایک راز کی بات ہے۔ سنا ہے لڑکی بڑی اعلیٰ نسل کی چنی ہے تم نے، ایک دفعہ ماجد نے ذکر کیا تھا کہ تم خوار ہو رہے ہو کسی کے لئے مگر یقین نہیں آیا تھا، تم اس ٹائپ کے ہو بھی نہیں۔ کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں" جبار پوچھ رہا تھا جو تنویر کے ساتھ ہی آیا تھا۔ عبدالباری کے ماتھے پر اس کے ذکر سے کچھ بل ابھرے تھے مگر واضح نہ ہو سکے۔

"ہوں....." وہ صرف ہنکارا بھر سکا تھا۔

"تمہارے وکیل سے پچھلے دنوں ملاقات ہوئی تھی، اسی نے انکشاف کیا تھا، نکاح کے کاغذات پہلے بنوائے تھے اور شادی بعد میں کی تھی۔ ویسے بڑے تیز نکلے تم تو، بڑے پائے کا عشق کیا ہے تم نے۔ ہم تو تمہیں خشک مزاج ہی سمجھتے رہے۔ جہاں کہیں کسی لڑکی کا ذکر آیا تم یوں پہلو بچا کر نکلے کہ بس جانے ہی نہ۔ اس جماعت کو اور اب..... سچ کہوں تمہاری اس عشق والی شادی نے بڑا حیران کیا ہے۔" جبار نے مزید کہا تھا، اب کے عبدالباری کی پیشانی کی لکیریں بہت واضح تھیں۔

"ویسے یار دیدار تو کرواؤ، ہم بھی تو دیکھیں کون ہے وہ حور شمائل جس نے ہمارے یار کے دل کو فتح کر لیا ہے۔ یوں ہوش اڑائے ہیں کہ اب اسے یاروں کی بھی یاد نہیں آتی..... اگر کبھی فون کریں تو ریسیو نہیں کرتے....."

رانیل کو اس شخص کی باتیں ناقابل برداشت لگ رہی تھیں۔ صرف اور صرف عبدالباری کا ردعمل دیکھنا چاہتی تھی۔

"یار عبدالباری! بلواؤ تو سہی..... سنا ہے اپنی گھر میں رکھا ہے تم نے اسے بھی۔ بڑی خوب صورت ہے وہ اور تو اور وہ تمہارے....."

"بس....." عبدالباری جو اتنی دیر سے خاموش تھا ایک دم صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ اٹھا کر جبار کو روک دیا تھا۔ وہ کچھ مزید بکواس کر رہا تھا مگر عبدالباری کی چنگھاڑ پر الفاظ حلق میں ہی اٹک گئے تھے۔

"میں اتنی دیر سے اگر تمہاری بکواس سن رہا ہوں تو صرف اس لئے کہ مجھے پچھلی دوستی کا لحاظ ہے ورنہ میری بیوی کے متعلق ایک بھی بات کہنے والے کی اس وقت یہاں لاش تڑپ رہی ہوتی۔" عبدالباری نے آگے بڑھ کر جبار کا گریبان پکڑ لیا تھا جب کہ وہ وہیں ہونٹوں پر ہاتھ رکھے ہکا بکا رہ گئی۔ باری کا ردعمل اس کی توقع کے برعکس تھا۔

"وہ قانونی و شرعی طور پر میری بیوی ہے۔ میں نے اسے جیسے بھی حاصل کیا ہو وہ تمہارا نہیں میرا مسئلہ ہے۔ آئندہ میرے سامنے آتے ہوئے سو مرتبہ سوچنا....." لہجے میں سفاکی ہی سفاکی تھی۔ جبار ہراساں ہو گیا تھا۔ عبدالباری کا ردعمل بہت شدید اور غیر متوقع تھا۔

"یار کیا کرتے ہو..... نا سمجھ ہے یوں ہی کہہ گیا ہے..... اب چھوڑو بھی۔" صورت حال خراب ہوتی دیکھ کر اس کا دوست تنویر آگے بڑھا تھا۔

"تو پھر لے جاؤ اسے، آئندہ یہ مجھے نظر نہ آئے۔ سمجھا لینا اسے اگر اس نے میرے متعلق کوئی الٹی سیدھی بکواس کی تو

زندہ رہنے کی گارنٹی نہیں دوں گا۔" اسے جھنجوڑ کر پیچھے دھکیل دیا تھا۔ وہ صوفے پر جا گرا تھا۔ عبدالباری کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ رانیل کو لگا وہ کسی بھی لمحے ان لوگوں پر گولی چلا دے گا، وہ اتنا ہی وحشی تھا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اسے حقیقتاً عبدالباری سے بہت خوف محسوس ہوا تھا۔

"تم کول ڈاؤن رہو..... آئندہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ یہ تمہیں نظر نہیں آئے گا۔" تنویر اس کے تیور دیکھ کر اسے بہلا رہا تھا۔

"تم جاؤ یہاں سے اور اسے بھی لے جاؤ۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا تھا اور رخ بھی بدل گیا تھا۔ تنویر، جبار کو لے کر باہر نکل گیا تھا۔

وہ کمرے میں ابھی بھی اسی طرح ساکت سی بیٹھی ہوئی تھی، پاؤں نیچے لٹک رہے تھے، دونوں ہاتھ گود میں تھے۔ وہ اضطراری انداز میں کبھی ہونٹ کاٹنے لگتی تو کبھی انگلیاں مروڑنے لگتی۔ وہ مسلسل باری کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔ وہ جیسا بھی تھا، وہ جو بھی کرتا رہا تھا، اس کا جو بھی رویہ تھا، جو بھی عادات و اطوار اور سرگرمیاں تھیں ان سب کے برعکس اس نے آج جو بھی دیکھا اور سنا تھا وہ قطعی مختلف تھا۔ دل اس حقیقت پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ عبدالباری کے دل میں اس کا تھوڑا بہت احترام موجود ہے۔ وہ تو سوچے بیٹھی تھی کہ یہ شخص ہر جذبے، ہر احساس سے عاری ہو چکا ہے۔

آنسو آہستہ آہستہ اس کے رخساروں پر بہنے لگے تھے۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی، خاص طور پر عبدالباری کے لئے تو کبھی بھی نہیں مگر اب اسے اپنے اوپر اختیار نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر قبل دیکھا جانے والا واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ اس کے دل و دماغ پر اپنے نقش چھوڑ گیا تھا۔

عبدالباری کمرے میں داخل ہوا تو ایک منظر ٹھٹکا دینے والا تھا، جس حرکت دونوں پاؤں نیچے لٹکائے دونوں ہاتھ گود میں رکھے بستر پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

"کیا ہوا.....؟ اب کون مر گیا ہے جس کا سوگ منا رہی ہو۔" وہ اس کے قریب آیا تھا۔ الفاظ تھے کہ پتھر، رانیل کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

"اگر ماں باپ کا سوگ منا رہی ہو تو جتنا عرصہ انہیں مرے ہوئے ہوا ہے اس میں انسان خود بخود سنبھل جاتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے زخموں کو کرید رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا گئی۔ نہ جانے کون کون سے دکھ یاد دلا رہے تھے۔ عبدالباری دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک کر دوزانو اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ شدت سے رو رہی تھی۔ پورا وجود ہل رہا تھا، جب عبدالباری نے اس کے چہرے سے ہٹا کر دونوں ہاتھوں کو اپنے فولادی ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

"اگر اس بات کا سوگ منا رہی ہو کہ میں مر کیوں نہیں رہا تو میری جان! تم صرف اپنی جان کو نقصان میں ڈال رہی ہو۔ میں اتنی جلدی اور آسانی سے نہیں مروں گا..... ابھی تو مجھے اپنا بہت سارا گھٹیا پن اور کالے کرتوت تمہیں دکھانے ہیں..... ابھی سے کمزور پڑنے لگی ہو۔ ابھی دیکھا ہی کیا ہے تم نے۔ شاباش..... سوگ منانا بند کرو، کچھ آنسو سنبھال کر رکھو شاید دنیا کو دکھانے کے لئے کسی میری میت پر بہانے پڑ جائیں..... "رانیل کے ہاتھوں کو ہونٹوں سے چھوتے ہوئے دلکش انداز میں یوں ہی تھامے چہرہ اوپر کرتے وہ مسکرا رہا تھا۔ موت اس کے لئے صرف ایک مذاق تھی، وہ اور ٹوٹ ٹوٹ کر رو دی تھی۔ اس وقت وہ اپنی کیفیت خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ دل پر اختیار سا اٹھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مزید ستم یہ تھا کہ وہ بالکل سامنے بیٹھا کتنے قریب تھا۔ عبدالباری کی سانسوں کی گرماہٹ، ہاتھوں کی حدت اور لمس اس کے وجود کو پگھلائے دے رہا تھا۔ عجیب بے قراری نے آ لیا تھا۔

"بند کرو یہ تماشا..... میں ان آنسوؤں سے پگھلنے والا نہیں ہوں۔ اگر تم یہ سوچے بیٹھی ہو کہ میں تمہارے ڈرامے سے متاثر

ہو کر تمہیں واپس اسی گھر میں لے جاؤں گا تو یہ تمہاری سخت بھول ہے۔ عبدالباری ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا کہ پانی کے ان قطروں میں بہہ جائے...... کنٹرول کرو خود پر۔" درشتی سے اسے ڈانٹتے اس نے اسے کندھوں سے جکڑتے جھنجوڑ ڈالا تھا۔ پھر اسے پیچھے دھکیل کر اٹھ کر وارڈ روب کی طرف بڑھا۔

"کیا پکایا ہے تم نے؟" کپڑے نکالنے کے بعد وہ کھانے کی بابت پوچھ رہا تھا۔

وہ بمشکل سر اٹھا پائی تھی۔ آنکھیں قاتل رنگ ہو رہی تھیں اوپر سے بہتے آنسو کسی قیامت سے کم نہ تھے۔ وہ نفی میں سر ہلا گئی تھی۔ کتنی کمزور لگ رہی تھی وہ اس وقت۔ آنکھوں کے گہرے نین کٹورے مقابل کو چاروں شانے چت کر دینے کو کافی تھے۔ دل کو کچھ ہوا تھا شاید...... سخت خول چٹخا تھا شاید...... وہ جھنجلا کر آگے بڑھا تھا۔ لباس بستر پر پھینک کر وحشیانہ انداز میں اس کا بازو تھام کر مقابل کھڑا کیا تھا۔

"کہا ہے نا...... بند کرو یہ ناٹک...... ابھی زندہ ہوں، جب مر جاؤں تو تب جتنا چاہے جی بھر کر رو لینا تم...... رابیل جانم! ابھی تمہارا ہنسنا اور رونا صرف اور صرف میری مرضی سے ہوگا...... سمجھیں تم......" وہ اس پر حلق کے بل چیخا تھا۔

"باری...... میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے...... مجھے اپنے جسم سے اپنی روح نکلتی لگ رہی ہے۔ پلیز...... باری......!!!"

اس کے سینے پر سر رکھ کر اور شدت سے ضبط کھو بیٹھی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے خود آگے بڑھ کر باری کی قربت اختیار کی تھی۔ وہ بھی اس حالت میں جب کہ جسم بخار سے پھنک رہا تھا۔

باری ان لمحوں میں کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا اور پھر کچھ سمجھنا چاہتا تھا بس کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا۔ رابیل کی یہ دیوانگی اس کی قربت اور خود سپردگی کا یہ انداز بالکل نیا تھا۔ بہت کچھ کہتا ہوا تھا۔ رابیل کے نرم و نازک وجود کی مہک اتنی دلکش و سحر طاری کرنے والی تھی کہ وہ اپنے اندر کے اشتعال اور غصے کو دباتے ہوئے اس کے گرد حصار کھینچ بیٹھا تھا۔ رابیل کا وجود کتنا گرم تھا، ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے آگ کی دہک رہی ہو۔

"باری پلیز! مجھے کھلی ہوا میں جانے دو...... باری! دیکھو...... ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔" اس کی شرٹ کو دونوں ہاتھوں سے دبوچے وہ اپنے اختیار میں بھی نہیں لگ رہی تھی۔ آنسوؤں کی نمی عبدالباری کے سینے میں ایک ٹھنڈک سی اتارتی جا رہی تھی کہ لمحوں میں اس کا موڈ کافی بحال ہوا تھا۔ یکسر بدلا تھا۔

"ہوں...... تم اپنا حلیہ درست کرو پھر چلتے ہیں باہر۔" وہ جب سے اسے لے کر یہاں آیا تھا پہلی بات نرمی سے کی تھی۔

اس نے بہت نرمی سے اسے خود سے جدا کیا تھا۔

رابیل خود بھی اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔ یہ صرف آج کا واقعہ دیکھ کر نہیں ہوا تھا، کتنے دنوں سے یہی حالت ہو رہی تھی۔ کئی بار وہ یوں ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بلاوجہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ جاتی تھی۔ شاید آج کل بخار اور زکام رہنے لگا تھا اسی وجہ سے حوصلہ کم پڑتا جا رہا تھا اوپر سے اس پر جان چھڑکنے والے پیارے بھی اس سے دور تھے۔ عبدالباری کا سرد رویہ الگ اس کی روح کو گھائل کیے دے رہا تھا۔ آج وہ کتنے دنوں بعد یوں ٹوٹ کر مہربان ہوا تھا۔ دل کو ایک سکون سا ہوا تھا۔

عبدالباری، رابیل کو لے کر پہلے شاپنگ سینٹر گیا تھا وہاں سے چھوٹی موٹی چیزیں لی تھیں پھر وہ اسے لیے ریسٹورنٹ میں آ گیا۔

"کیا لو گی......؟" مینو دیکھتے ہوئے اس نے چپ چپ سی افسردہ رابیل سے پوچھا۔ وہ نفی میں سر ہلا گئی۔ عبدالباری خود ہی مینو لکھوانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد کھانا سرو کر دیا گیا تھا۔

عبدالباری روسٹ پر طبع آزمائی کر رہا تھا جب کہ رابیل تھوڑی سی بریانی پلیٹ میں ڈالے کھا رہی تھی۔ ابھی اس نے چند لقمے ہی لیے تھے جب اسے زبردست ابکائی آئی تھی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے ایک دم اٹھی تھی۔

"کیا ہوا......؟" اسے تیر کی طرح اٹھتے دیکھ کر عبدالباری حیران ہوا تھا۔ وہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اردگرد نظر دوڑائی کچھ سمجھ نہ آئی کہ کیا کرے جب کہ اب اسے منہ بھر کر قے آئی تھی۔ وہ ہاتھ منہ پر رکھنے کے باوجود خود کو سنبھال نہ سکی فوراً زمین پر گری تھی۔ باری ایک دم اٹھا تھا، اردگرد کی ٹیبلز پر موجود افراد اور ہوٹل کی سروس بھی متوجہ ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا ہے...... کچھ تو بتاؤ......" رابیل کا وومٹنگ سے برا حال تھا جب عبدالباری نے اسے کندھوں سے تھام کر سہارا دیا تھا۔

"باری......!" رابیل نے اس کی شرٹ دبوچی تھی جب کہ گرفت انتہائی سخت تھی کہ حد نہیں۔ وہ سخت متوحش ہوا۔

"رابیل......!"

"باری......" وہ حواس کھو چکی تھی شاید تکلیف ناقابل برداشت تھی۔

"رابیل......" وہ دیوانوں کی طرح اس پر جھکتے چیخا تھا وہ ہوش میں کہاں تھی جو جواب دیتی۔ وہ پاگلوں کی طرح اسے جھنجوڑنے لگا۔

"فوڈ پوائزننگ......" اس کے ذہن میں سب سے پہلی یہی بات آئی تھی۔

"رابیل اٹھو...... آنکھیں کھولو...... رابیل......" اس کا نازک وجود سمیٹے اس کو اپنا بھی کچھ ہوش نہیں تھا، ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے جسم سے جان نکل رہی ہو۔

وہ اسے کسی قیمتی متاع کی طرح فوراً بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے باہر بھاگا تھا جب کہ رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ ہوٹل کے کھانے میں ضرور کچھ غلط ہوگا۔

اسپتال کے کوریڈور میں سخت بے چینی و بے قراری سے ٹہلتے ہوئے بہت فکر مند تھا۔ ویسے تو ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد تسلی دی تھی مگر اسے سکون نہیں آ رہا تھا۔ رابیل کو کسی اور روم میں لے جایا گیا تھا اور ابھی تک وہ روم میں ہی تھی۔ نہ جانے وہ حواس میں تھی یا نہیں، وہ یکسر لاعلم تھا۔ وہ لیفٹ اینڈ رائٹ کرتے پلٹا تھا جب کمرے سے اس کا بلاوا آ گیا تھا۔ وہ فوراً اندر داخل ہوا تھا، رابیل بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں، ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ ابھی بھی حواس میں نہیں تھی جب کہ ایک فیمیل ڈاکٹر اپنی ٹیبل پر موجود تھی۔

"ڈاکٹر! خیریت؟" وہ صرف اتنا ہی پوچھ سکا تھا۔ ڈاکٹر کے ہونٹوں پر ایک دلکش سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"یس...... آپ اتنے پریشان کیوں ہیں...... شی از آل رائٹ۔" اسے کچھ سکون ملا تھا، ایک گہری سانس لی تھی۔ "لگتا ہے بہت محبت کرتے ہیں اپنی بیوی سے آپ۔" ڈاکٹر کے ہونٹوں پر اگرچہ پیشہ ورانہ مسکراہٹ تھی مگر انداز چھیڑنے والا تھا۔ وہ بس بے نظر بلا ارادہ اس پر ٹھہر گئی، جو بے خبر تھی۔ اسے آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ اسے رابیل کی اتنی چاہ و طلب کیوں ہے۔ دل بس اسے دیکھ کر اتنا پرسکون کیوں ہو جاتا ہے۔ محبت جیسی لغویات پر اسے کبھی یقین نہیں تھا بس ہمیشہ دل کو یہی باور کرایا تھا کہ وہ اس کی ضد ہے۔ محبت کی کتنی اہمیت ہوتی ہے؟ اس حقیقت کا اندازہ اسے اس وقت ہوا تھا جب ولیمے کی رات رابیل نے محبت کی بات کی تھی۔ الفاظ اگرچہ ڈھکے چھپے تھے مگر مفہوم واضح تھا اور اب جو ڈاکٹر کہہ رہی تھیں وہ حیران کن تھا۔

"کیا ہوا انہیں...... ان کی طبیعت اتنی خراب کیوں ہوئی...... کہیں کوئی فوڈ پوائزننگ کا مسئلہ تو نہیں؟"

"نہیں...... شی از پریگننٹ۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔

وہ منہ کھولے ہکا بکا رہ گیا۔ اس پوائنٹ تک تو اس کی رسائی ہی نہیں ہوئی تھی۔

"کیا......" وہ کئی ثانیے تک حرکت بھی نہ کر سکا۔ "دوبارہ کہیے آپ کی بات کا کیا مطلب ہے......؟" وہ بے یقینی تھا۔ وہ کیا سمجھا تھا اور معاملہ کیا نکلا تھا اور نہ وہ تو ہوٹل کی انتظامیہ کی درگت بنانے کا سوچ رہا تھا اور یہاں......

"آپ اتنے شاکڈ کیوں ہو رہے ہیں...... آئی ایم رائٹ...... شی از ریکلی پریگننٹ۔ یوں سمجھیے کہ آپ باپ بننے والے ہیں۔"

عبدالباری نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ان لمحوں میں نہ جانے کیا ہوا تھا، کیفیت یکسر بدل رہی تھی۔ انکشاف اگرچہ حیران کن تھا مگر بے پناہ خوش کن تھا۔ فرطِ انبساط سے وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ گیا۔

"پہلا کیس ہے ان کا اسی لئے آپ کی وائف بہت ویک ہو رہی ہیں۔ فرسٹ ٹائم ہو جاتا ہے ایسے۔ چند ماہ تک یہ کنڈیشن رہے گی پھر ٹھیک ہو جائیں گی۔ کمزوری سے یہ بے ہوش ہو گئی ہیں، ڈرپ لگا دی ہے۔ اس وقت یہ ٹرنکولائزر کے زیر اثر پرسکون ہیں۔ ان کی بی پی بہت لو ہو رہا تھا اور بخار بھی کافی زیادہ تھا۔ تین، چار گھنٹے بعد ڈرپ اتار دی جائے گی، کچھ میڈیسن ہیں، منگوا لیں ان کی صحت کا بہت خیال رکھیں۔ ٹینشن وغیرہ سے تو بالکل دور رکھیں۔ کوشش کریں یہ خوش رہا کریں...... صبح تک فارغ ہو جائیں گی پھر آپ انہیں گھر لے جایئے گا۔"

مطلوبہ میڈیسن والا پرچا اسے تھما کر دیگر ہدایات جاری کیں اور پھر کمرے سے رخصت ہو گئیں۔ وہ بستر کی طرف آ گیا۔

ایک گھنٹہ پہلے وہ کافی تکلیف میں تھی اور اب کیسی پرسکون نیند سو رہی تھی۔

"رانیل......" اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ ہولے سے پکارتا اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا جب کہ رات کافی گہری ہو گئی تھی۔

وہ اسے لے کر گھر آ گیا تھا، امی بابا کے پاس۔ دن پر لگا کر گزرنے لگے تھے، سب کچھ جیسے ایک دم ٹھیک ہو گیا تھا۔ عبدالباری، اس کا رویہ، انداز و اطوار، سب کچھ یکسر بدل گیا تھا۔ سب ہی اس کی اس کایا پلٹ پر بہت خوش تھے، بے پناہ خیال رکھنے لگے تھے۔ رانیل کے لئے یہ سب کچھ حیران کن تھا مگر کبھی کبھار وہ الجھن کا شکار ہو جاتی تھی۔ کوئی طنز، کڑوی کسیلی بات، کوئی زور زبردستی، کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ اس کے رویوں کی عادی ہو چکی تھی، اب یہ انداز ہضم نہیں ہو رہے تھے۔ وہ بہت حلیم و مہربان سا انسان بن گیا تھا۔ حتیٰ کہ اسی حالت میں دو ماہ پر لگا کر گزر گئے تھے۔

آج رات وہ کتنے دنوں بعد گھر لوٹا تھا، جہاں وہ یکسر بدلا تھا اس کی یہ عادت نہیں بدلی تھی بغیر کچھ بتائے غائب ہو جانے والی بات۔ رات کے اس پہر سب ہی اپنے کمروں میں سونے جا چکے تھے۔ رانیل کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی، جب اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہوا تھا، اسے جاگتے ہوئے دیکھ کر چونکا تھا۔

"تم سوئی نہیں......" گھڑی دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ وہ بستر کی طرف آ گیا۔ وہ جب بھی گھر لوٹتا تھا کافی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ آج کچھ بھی نہ تھا۔ رانیل جو عادی ہو چکی تھی، کچھ حیران ہوئی تھی۔ جواباً صرف سر ہلا دیا جب کہ دل چاہ رہا تھا کہ کچھ بھی خیال کیے بغیر اس سے الجھ پڑے۔ وہ اتنے دنوں سے کہا تھا؟ کیوں تھا؟ یہ جاننا اس کا حق تھا مگر وہ مصلحتاً خاموش تھی۔ عبدالباری نے بستر کے قریب ہی کھڑے کھڑے ٹوپی، بیلٹ اور اوپری قمیص اتار کر بستر پر پھینکی تھی۔ وہ کافی حد تک ٹینس لگ رہا تھا۔ چہرے پر جامد تاثرات رقم تھے۔ وہ کچھ بھی نتیجہ اخذ نہ کر سکی۔ شرٹ اتارنے کے بعد وہ وارڈ روب سے لباس نکالنے لگا تھا۔

"کھانا کھائیں گے؟" وقت تو کھانے کا نہیں تھا مگر پوچھ گئی۔

"نہیں، میں کھا آیا ہوں...... تم سو جاؤ۔ آرام کرو۔" وہ پرسکون تھا مگر وہ چونک گئی تھی، اتنا ٹھہرا ہوا لہجہ کبھی بھی نہیں، کچھ تشویش سے اسے دیکھا تھا۔ وہ کپڑے لے کر باتھ روم میں چلا گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر اس کی ٹوپی، بیلٹ اور شرٹ اتار کر ان کی جگہ پر رکھیں پھر بستر کے کنارے ہی ٹک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ نہا کر نکلا تھا۔

"تم ابھی تک نہیں سوئیں...... طبیعت خراب ہو جائے گی تمہاری۔" وہ پریشانی سے گویا تھا۔

"پوچھ سکتی ہوں کہ اتنے دن جناب کہاں رہے جب کہ آفس سے بھی چھٹی لی ہوئی تھی۔"

وہ تولیے سے بال رگڑ رہا تھا جب اس نے پوچھا تھا۔ وہ تولیہ صوفے پر پھینک کر بستر پر آ گیا۔

"یہیں تھا اسی شہر میں...... کچھ معاملات تھے۔ دوسرے گھر پر ہی تھا۔"

"جھوٹ بول رہے ہیں آپ...... کسے بہلا رہے ہیں، مجھے یا خود کو...... آپ اس شہر میں تھے ہی نہیں۔ جب بھی اس گھر میں پتہ کروایا علم ہوا کہ جناب نے کئی دن سے ادھر قدم بھی نہیں رکھا۔ آپ کے آفس اور گھر کے فرقان بھائی کتنے چکر لگا چکے ہیں۔ کتنی مرتبہ آپ کے سیل، ہر جگہ ٹرائی کر چکی ہوں۔"

"تو پھر؟" رانیل کے یوں جرح کرنے پر اس نے چونک کر پوچھا تھا۔

"تو پھر یہ کہ میں جاننا چاہتی ہوں آپ کی اصلیت کیا ہے؟ ان سرگرمیوں کا پس منظر کیا ہے؟ کن لوگوں کے لئے اور کیا کرتے ہیں آپ؟" وہ پہلے سے زیادہ بے خوف و نڈر ہو گئی تھی۔ وہ لب اکڑ گیا تھا۔

"تم اپنے کام سے کام رکھا کرو...... ہر وقت ادھر ادھر تجسس مت دکھایا کرو۔ آئندہ اس گھر سے وہاں کوئی بھی نہیں جائے گا۔ بیچ دیا ہے میں نے وہ گھر...... اب میرا وہاں سے کوئی تعلق نہیں...... میں کیا کرتا ہوں اور کیا نہیں، تمہارے لئے یہ جاننا ضروری نہیں...... سکون سے آرام سے اس گھر میں رہو...... کسی شے کی کمی بھی ہو تو بتاؤ، اور بتاؤ کیا چاہتی ہو تم......" قطعی لہجہ تھا، وہ لب کاٹ گئی۔

"میرے لئے یہ سب جاننا بہت ضروری ہے...... بیوی ہوں آپ کی، حق رکھتی ہوں......" اگلے ہی پل وہ پھر چٹخ کر گئی تھی۔ عبدالباری کو بے پناہ غصہ آیا۔

"کیا چاہتی ہو تم...... یہ جو میں اتنے دنوں بعد گھر لوٹا ہوں وہ بھی نہ آیا کروں......" انداز خونخوار تھا۔ وہ قطعی متاثر نہ ہوئی تھی جب کہ آج وہ کتنے دنوں بعد یہ پرانا مرنے مارنے والا انداز دیکھ رہی تھی۔

"یہاں سب کو ایک فکر ہوتی ہے...... سب مجھ سے پوچھتے رہتے ہیں کہ کہاں ہوتے ہو تم...... جب کہ میرے فرشتوں کو بھی تمہاری سرگرمیوں کا علم نہیں ہوتا...... پھر میں انہیں کیا جواب دوں۔"

"کوئی نئی بات تو نہیں ہوئی جو سب فکرمند ہوتے ہیں...... مجھے میرے حال پر چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔"

"کتنے بے حس اور بے ضمیر ہیں آپ باری، ذرا بھی احساس نہیں کسی کا حتیٰ کہ اپنی آنے والی اولاد کا بھی نہیں۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ عبدالباری اب کے کچھ بھی نہ بول سکا۔

"تین دن پہلے بڑے بابا کی طبیعت اچانک سخت خراب ہو گئی تھی سو آپ کا پتہ کروایا تھا۔ آفس سے علم ہوا کہ چھٹی پر ہیں اور باقی جگہوں پر بھی کوئی نام و نشان نہیں تھا...... آپ کی ذات پر صرف تنہا آپ کا حق تو نہیں...... صرف یہ انداز اپنا کر خود اپنی ذات کو کارنر تو نہیں کر رہے...... زبردستی ہی سہی کوئی اور بھی آپ کے سفر میں ہم راہ ہے۔ ابھی تو میں تنہا ہوں، کل کو ایک اور وجود آ جائے گا پھر کیا کروں گی، کبھی تو دیکھ لیا کریں...... اس پہلو سے بھی سوچ لیا کریں۔" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ وہ کیا

کہنا چاہتی تھی، سمجھانے کے اصل مقصد کے پیچھے کیا کارفرما تھا، وہ بغور دیکھے گیا۔

"جن لوگوں کے لئے آج آپ کام کرتے ہیں...... جن کی خاطر آپ اس وطن کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں، کبھی یہ اندازہ لگایا ہے وہ کون ہیں؟ ان کا دین ایمان کیا ہے؟ روپے کی ہوس اتنی نہیں ہونی چاہئے کہ انسان جائز و ناجائز، حلال و حرام، صحیح اور غلط کا فرق بھی نہ جان پائے۔ جس طرح ہر کلمہ گو مسلمان نہیں، ہر انسان انسان نہیں ہے۔ یہ حقیقت مت بھولیں، ایک نہ ایک دن انسان کو مرنا بھی ہے، دنیا کے بادشاہوں کے سامنے نہیں۔ کل کائنات کے رب کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ اس دن یہ ساری بے غلط کاریاں، یہ حلقہ احباب کسی کام نہیں آئیں گے حتیٰ کہ نصیحتیں کرنے والے، رو رو کر دعائیں مانگنے والے، ساری ساری رات آپ کی فکر میں دبلے ہونے والے ماں باپ اور یہ دنیاوی رشتے بھی کام نہیں آئیں گے۔ اگر اس دن کچھ کام آئیں گے تو وہ انسان کے اپنے اعمال ہیں۔ اس دن بتائیں آپ جیسے لوگ کیا کریں گے۔ جب دونوں ہاتھوں سے خالی ہوں گے، ہاتھوں میں گناہوں کی ایک لمبی فہرست کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔" اتنی سی عمر میں سوچ اس حد تک پختہ و راسخ تھی۔ سمجھانے کا انداز کتنا سحر طاری کرنے والا تھا، وہ کچھ جوش اور کچھ جذبے سے سب کہتی گئی تھی۔ دل نشین لہجہ سماعتوں میں جیسے رس گھولتا گیا تھا۔ وہ جو یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا اس کے اس طرح سراپا سوال بننے پر مسکرا دیا تھا۔ وہ اور چڑ گئی تھی۔

"پتہ نہیں کیسے بے حس انسان ہیں...... میں ہی پاگل ہوں جو پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں۔" وہ بڑبڑا کر بستر سے اترنے لگی تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس نے خونخوار ہو کر دیکھا۔

"کیا ہے......؟" لہجہ اس سے زیادہ خونخوار تھا۔

"جب میں قیامت کے روز دونوں ہاتھوں سے خالی ہوں گا تو کہوں گا یہ جو لڑکی ہے یہ میری بیوی ہے...... جو بڑی متقی تھی، اپنے نکاح میں لیا تھا، اگر میں نے دنیا میں کوئی نیک کام کیا ہے تو وہ یہی ہے۔ بعض ماں پر ہی بچے جاتے ہیں، ماں جیسی ہوگی اولاد بھی ویسی ہوگی، کل قیامت کے دن تمہارا سر بلند ہوگا۔ نیک صالح بیوی بھی اس کا بڑا انعام ہوتی ہے۔" حد ہے اس پر تو رابیل کے کچھ سمجھانے کا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ ہاتھ کھینچ کر ایک دم موڈ میں آیا تھا۔ آنکھیں شرارت پر آمادہ تھیں۔

"باری پلیز...... میں اب یہ سب برداشت نہیں کروں گی۔ اولاد کی اصل شناخت ماں نہیں ہوتی باپ ہوتا ہے۔ باپ کا کردار اور اعمال اسے تربیت دیتے ہیں۔" عبدالباری کی باتوں سے رابیل کا دماغ بھی بھنا گیا تھا۔ آج اس کا یہ موڈ فیصلہ کن تھا۔

"آج فیصلہ ہوگا...... یا تو اپنی سرگرمیاں ترک کر دیں یا پھر مجھے چھوڑ دیں۔ میں آپ جیسے کرپٹ، دھوکے باز، غدار وطن کے ساتھ کبھی زندگی نہیں گزار سکتی...... ساری زندگی رونے سے بہتر ہے آج ہی فیصلہ کر لیں۔" اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے وہ پہلے سے زیادہ اشتعال میں تھی۔ باری مسکرا دیا۔

"رابیل میری جان! یہ ہمیشہ تم کا صیغہ استعمال کرنے والی زبان کو اب کچھ عرصے سے کیا ہو گیا ہے۔ اب مجھے "آپ" کا یہ صیغہ ہضم نہیں ہو رہا...... اتنا ادب، رابیل ڈیئر، اتنا احترام۔ او مائی گاڈ...... پلیز چیک مائی ہارٹ پلیز۔ کہیں فیل ہی نہ ہو جائے۔" وہ اپنے موڈ میں واپس آ چکا تھا۔ وہ جو سر کھپا رہی تھی دیکھتی رہ گئی۔ کتنے دنوں کی سنجیدگی و خاموشی کی ردا چھٹ گئی تھی۔ وہ لب کاٹنے لگی۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ چکا تھا۔ رابیل کے ہاتھ کے نیچے عبدالباری کا دل تھا جو خوب صورت لے میں دھڑک رہا تھا۔ وہ نظریں پھیر گئی۔

"چھوڑیں مجھے......" خوامخواہ جھنجلانے لگی جب کہ وہ مخمور لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"اے رابیل...... آج کا یہ دل کا مکین کتنے دنوں بعد لوٹا ہے، کچھ نظر کرم نہیں کرو گی...... یہ لہجہ، یہ انداز چھوڑو، یہ تو زندگی کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ کچھ ایسا خاص ہو کہ دل و روح سیراب ہو جائے۔" وہ لفظوں کا کھلاڑی پل میں اسے پانی پانی کر گیا تھا۔ اس

کے اندر باہر ایک ہلچل سی مچا گیا تھا۔ وہ روہانسی ہو گئی۔

"اللہ ہی آپ جیسے بندوں سے نمٹے......" سارا اعتماد، ساری جرأت عبدل کی ایک نگاہ کی نذر ہو گئی تھی۔ اب تو صرف بے بسی و لاچاری باقی تھی۔

"آئی لو یو...... رنگیلی آئی لو......" عبدل کی سرگوشیانہ آواز اس کے کان کے قریب گونجی تھی۔ اس نے آہستگی و نرمی سے اس کے گرد گھیرا تنگ کیا تھا، جیسے وہ بہت قیمتی شے ہو۔ بلور کی مانند نازک و حساس۔

❋ ❋ ❋

ناشتہ سجا کر کمرے میں لوٹی تو عبدل ابھی بھی بے خبر تھا۔

"باری اٹھیے...... ناشتہ تیار ہے۔" اسے جگا کر وہ جلدی جلدی کمرے کی چیزیں سمیٹنے لگی۔ وہ اٹھنے کے بجائے کروٹ بدل کر پھر غافل ہو گیا تھا۔ ڈریسنگ کی چیزیں درست کر کے بیڈ کے قریب آئی تو عبدل کے موبائل کی بیپ بجنے لگی۔ ایک نظر گہری نیند میں غرق عبدل پر ڈال کر اس نے موبائل اٹھا لیا۔

"توبہ ہے...... سوتا ہوتا ہے تو ساری دنیا کی خبر بھول جاتے ہیں...... اگر دیسیو کر لوں تو پھر جان کو آ جاتا ہے۔" عبدل پر کچھ بگڑ رہی تھی۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"عبدالباری اچھا نہیں کیا تم نے ہمارے ساتھ۔" یس کا بٹن پش کرتے وہ ابھی ہیلو بھی نہ کہہ پائی تھی جب کوئی اجنبی مردانہ آواز سنائی دی تھی۔ وہ لب سی گئی۔

"ہمارے اعتماد، ہمارے بھروسے کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے تم نے۔ سب کچھ کر لینے کے بعد اب ہم سے تعلق توڑ کر تم سکون سے نہیں جیو گے...... قبر کی تاریکیوں میں نہ پہنچایا تو ہمارا نام بدل دینا۔ زندگی کا گھیرا تنگ کر دیں گے ہم تم پر...... پانچ کروڑ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ قرض لینے اور بکنے والے بہت ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ رقم، گھر، گاڑی اور دوسری آسائشیں واپس کر کے ہم سے کٹ گئے ہو۔ اگر تم ہمیں دھوکہ دے رہے تھے تو اناڑی ہم بھی نہیں تھے۔ ہمارے پاس بھی تمہاری ایک ایک حرکت، ایک ایک ملاقات کی نہ صرف فوٹو گرافس موجود ہیں بلکہ آج تک تم جو بھی ہمارے لئے کرتے رہے ہو ان سب کے واضح ثبوت ہیں ہمارے پاس بمعہ ویڈیو کلپس۔ ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ نتائج کے ذمہ دار تم ہو گے...... یہ آخری وارننگ تھی اب کوئی رعایت نہیں دوں گا......" وہ ساکت کھڑی تھی موبائل اسی طرح کان سے لگائے جب کہ فون کرنے والا فون بند کر چکا تھا۔

عبدالباری نے کروٹ بدلی، آنکھ کھلی تو بے ساختہ نظر رابیل پر ٹھہر گئی۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ٹھٹکا، کمبل ہٹا کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا بات ہے...... ایسے کیوں کھڑی ہو...... کس کا فون تھا؟" موبائل اس کے ہاتھ سے جھپٹنے والے انداز میں چھینتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ وہ اسے دیکھنے لگی، پہلے تو عبدالباری نے موبائل کی اسکرین دیکھی وہ آف تھی پھر اسے دیکھا۔

"بتاتی کیوں نہیں، کس کی کال تھی؟" موبائل چیک کرنے سے پہلے اس نے پھر درشتی سے پوچھا۔ وہ پھر بھی چپ رہی جب کہ چہرے کی رنگت سفید ہو چکی تھی۔ وہ مس کالز اور ریسیو کالز چیک کرنے لگا تھا۔ آخری ریسیو کال پر وہ ٹھٹکا۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی وارن کیا تھا کہ میرا سیل ریسیو نہیں کرنا...... میں...... کیا بات ہوئی ہے۔" نمبر دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹی۔ کال کرنے والے کی گفتگو خاص طور پر دھمکی آمیز انداز اسے اپنے زیر اثر لئے ہوئے تھا اور اب عبدل کا لہجہ......

"کیا بات ہوئی ہے......اس قدر شاک میں کیوں ہو......؟ بتاؤ......" عبدالباری کی زیرک نگاہیں رائیل کی کیفیت لمحوں میں بھانپ گئی تھیں۔ کندھوں سے تھام کر پوچھا تھا۔ وہ نفی میں گردن ہلا گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ کیا بتائے۔

"کیا جاننا چاہتے ہیں مجھ سے...... جس نے کال کی ہے اس سے پوچھیں یا خود سے۔" اس کے ہاتھوں کو جھٹک کر وہ صوفے پر جا بیٹھی۔ ایک دم بہہ آنے والے آنسوؤں کو صاف کیا۔ عبدالباری پریشانی سے دیکھتے پاس آ گیا۔

"پلیز رائیل بتاؤ...... میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔" وہ اس وقت بہت بے بس سا محسوس ہو رہا تھا۔ رائیل نے اسے مختصرا سب بتا دیا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا لب بھینچے، مٹھیوں کو کھولتے بند کرتے اس کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔

"اب تو بتا دیں...... یہ سب کیا ہے...... ؟ کیا کر رہے ہیں آپ؟ اور کون ہیں یہ لوگ......؟" وہ اس کے سامنے تن کر کھڑی ہوئی تھی۔

"بتا دوں گا تمہیں بھی...... بڑا شوق ہے تمہیں میرے ہر کام میں ٹانگ اڑانے کا...... کروں گا تمہارا یہ شوق بھی پورا۔ ابھی کچھ دن انتظار کر لو۔" اسے ایک طرف ہٹا کر وہ باتھ روم میں جا گھسا تھا۔ وہ اس کے الفاظ کو تولنے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ آفس میں تھا جب اس کا پرسنل سیل بج اٹھا تھا۔ اس پر آنے والا نمبر بہت خاص تھا، وہ ایک دم چونک گیا تھا۔ ارد گرد نظر ڈالی پھر فورا باتھ روم میں گھس گیا۔ کتنے دنوں سے اسے اس کال کا انتظار تھا اور آج انتظار ختم ہو گیا تھا۔

"ہیلو...... ایس پی عبدالباری از سپیکنگ!"

"سر...... میں۔ ارقم...... ایک خاص اطلاع ہے......"

"ہاں بولو...... میں سن رہا ہوں۔"

"سر حالات بہت بگڑ چکے ہیں، دشمنوں کو ہماری ساری پلاننگ کی خبر ہو چکی ہے۔ حالات ساز گار نہیں...... وہ آپ کے متعلق کوئی ایکشن لینے کی سوچ رہے ہیں۔ ان لوگوں کا نیٹ ورک اب سمٹنے لگا ہے...... ہو سکتا ہے جلد ہی وہ کوئی قدم بھی اٹھا لیں۔ آپ کو جلد ہی کوئی ایکشن لینا ہو گا ورنہ یہ ملک بہت خطرے میں ہے۔"

"ہوں...... کوئی اور بات؟" اس نے پوچھا تھا۔

"یس سر! میں نے کچھ خاص نقشے تیار کیے ہیں وہ ہماری خاص رہنمائی کریں گے۔ اس کے علاوہ کچھ بہت اہم ثبوت بھی ہاتھ لگے ہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے...... تم اپنی جگہ پر رہنا میں خود تم سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ سیک اپ میں ہوں گا، کوڈ ورڈز کا استعمال کروں گا، خیال رکھنا۔ اب فون بند کرو...... میں کسی بھی وقت تم سے ملوں گا۔"

"یس سر......" دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا تھا۔ وہ روم میں آ گیا۔ اس کا بہت بڑا مسئلہ جیسے حل ہو گیا تھا۔ اب اسے فائنل ایکشن لینے کی ضرورت تھی۔ ساری کارروائی مکمل تھی۔ اس نے خفیہ لاکرز میں سے ضروری ڈاکومنٹس نکالے تھے انہیں اچھی طرح چیک کیا تھا، ایک فائل بنائی تھی، پھر لاکرز بھی بند کر دیے تھے۔

اب اسے ارقم سے ملنا تھا، کچھ سوچتے ہوئے وہ آفس سے نکل آیا۔ ہاتھ میں ایک فائل تھی جو بہت ضروری تھی۔ ارادہ اس کو گھر میں رکھنے کا تھا، گھر آیا تو رائیل لان میں پودوں کے ساتھ مصروف تھی۔ اسے دیکھ کر سب کام چھوڑ چھاڑ مالی بابا کو چند ہدایات دے کر اس کی طرف آ گئی۔ خوب صورت سراپے میں ایک واضح تبدیلی با آسانی محسوس کی جا سکتی تھی۔ عبدالباری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ ٹھہری تھی۔ اسے دیکھ کر دل میں خود بخود ایک تراوٹ سی اترنے لگی تھی۔ من چاہی، باکردار، باحیا بیوی کا نشہ شاید اتنا ہی ہوتا ہے، وہ روح تک سرشار سا ہو گیا تھا۔

"السلام علیکم...... خیریت...... آج اس وقت گھر پر؟" اس فون کال کے بعد وہ کافی بہتر ہو گئی تھی۔ عبدالباری کے ساتھ اس کا رویہ خود بخود بدل گیا تھا۔ درمیان میں کتنے دن گزر گئے تھے، تقریبا ایک ڈیڑھ ماہ کا عرصہ اور اس دوران میں اس نے اسے اب کچھ نہیں کہا تھا مگر ایک خلش سی پھر بھی برقرار تھی۔ وہ اپنا آپ کھل کر کھول ہی نہیں رہا تھا، وہ منتظر تھی مگر مجال ہے جو اثر ہوا ہو۔

"وعلیکم السلام...... ہاں بس ایک کام تھا، میں کمرے میں ہوں کوئی ڈسٹرب نہ کرے مجھے۔" اسے ہدایت خاص کر کے وہ کمرے میں جا گھسا۔ وہ کچن میں آ گئی۔ عبدل نے ڈسٹرب نہ کرنے کا کہا تھا سو وہ کچن میں آ کر کباب تلنے لگی۔ صبح اس نے قیمہ ابال کر آمیزہ تیار کر رکھا تھا۔ ساتھ میں آلو کے تیار کیے گئے خستہ اور کرارے رولز تھے۔ چائے بنا کر ٹرے سجا کر وہ کمرے میں چلی آئی۔

عبدالباری بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے کچھ کاغذات تھے۔ کوئی چارٹ پھیلائے پنسل سے نشان وغیرہ لگا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات آ ٹھہرے۔

"میں نے کہا تھا کہ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔" جیسے ہی اس نے ٹرے بستر پر رکھی عبدالباری نے کہا۔

"آپ نے کوئی کے لیے کہا تھا، میرے لیے نہیں......" کیسا پر اعتماد و مان بھرا انداز تھا، اس کے ہاتھ رک گئے۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے نقشہ اٹھا لیا۔ عبدالباری نے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"میرے کاموں میں ٹانگ اڑانے والی تمہاری یہ عادت نہیں جائے گی...... ویسے بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔" مسکراتے ہوئے کاغذات فولڈ کر کے ایک طرف رکھے۔

"کیوں......؟" غصہ تو بہت آیا مگر کنٹرول کر گئی۔ آخر وجہ تو بتانا تھی کیوں نہیں؟

"کیوں کہ عقل موٹی ہے...... بمشکل ہی کچھ سمجھ پاتی ہو...... سامنے کی بات نظر نہیں آتی اور لگی ہو ادھر ادھر ٹانگیں اڑانے۔" انداز اب شرارتی تھا۔ وہ حقیقتا پریشان تھی۔

"آپ سے زیادہ عقلمند ہوں...... پھر آپ نے بھی کون سا کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے جو مجھے سمجھ نہیں آئی...... ہمیشہ تو خود کو ایک راز کی طرح رکھا ہے، کوئی لاکھ سر پھوڑے مگر اثر کہاں ہے۔" وہ ناراض سی ہو گئی تھی پھر چائے ڈال کر جانے لگی تو اس نے بازو تھام لیا۔

"کدھر چلی ہو ڈیئر...... بیٹھو۔" توجہ خاص تھی مگر وہ متاثر نہ ہوئی۔

"سوری...... میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔" چہرہ پھر بھی نہیں موڑا۔ انداز لوٹ لینے والا تھا وہ کھل کر مسکرایا۔

"جب کہا تھا عقل میں بات نہیں آئی تھی اور اب ڈسٹرب ہو گیا ہوں تو میرے آتشیں شوق کو بڑھا کر جا رہی ہو...... اب ادھر آؤ۔" جھٹکا دیا تھا، وہ اس کے ساتھ جا لگی۔ ذو معنی بات سے پورے بدن میں ایک سنسنی خیز لہر دوڑ گئی تھی۔

"آج تمہیں چیک اپ کے لیے جانا تھا، وزٹ کیسی رہی؟" ناراض سے چہرے کو اپنی طرف پھیرتے بہت لگاوٹ سے پوچھا تو وہ کاٹ کھانے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"جب آپ کو مجھ سے یا میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تو پھر یہ زبانی بناوٹی مظاہرے بھی مت کیا کریں...... بہت کھلے اور بہت برے لگتے ہیں مجھے ایسے لوگ۔" کڑوی تو وہ شروع سے ہی تھی اب بھی کوئی لحاظ و مروت رکھے بغیر اس کے ہاتھوں کو پیچھے ہٹا کر اپنا توازن بحال کر کے کاٹ دار لہجے میں کہا تھا۔ عبدالباری کو صبح کا واقعہ یاد آ گیا جب اس نے اسے جلدی گھر آنے اور ساتھ چلنے کو کہا تھا چونکہ آج اسے کچھ ضروری کام تھا، عجلت میں تھا سو انکار کر دیا تھا تب تو رائیل چپ ہو گئی تھی مگر اب اس کی یہ ناراضگی کافی تنی تنی سی تھی۔

"بتایا نہیں تم نے کیا کہا ڈاکٹر نے...... گئی بھی تھیں یا نہیں؟" چائے اٹھا کر سپ لیتے ہوئے اس نے دوبارہ پوچھا تو وہ منہ

پھلائے بتانے لگی۔

"ممی تھی بھابی کے ساتھ۔ کچھ خاص نہیں کہا ڈاکٹر نے، وہی پرانی باتیں کہ ان دنوں کچھ خاص احتیاط کرنا ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ منتھلی چیک اپ ضرور کروایا کروں اور ادھر ادھر کی ہدایات تھیں۔" وہ نظریں جھکائے بتا رہی تھی، وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"رائنل! یہ کچھ ضروری ڈاکومنٹس ہیں آفس میں یہ محفوظ نہیں تھے گھر لے آیا ہوں، لاکرز میں رکھ لینا۔ کسی بھی لمحے مجھے ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" بیگ میں سب کاغذات رکھ کر اس نے چمڑے کا بیگ اسے تھما دیا۔

"حیرت ہے...... مجھ پر اعتماد کر رہے ہیں...... اگر میں ان کو کھول کر دیکھ لوں تو کہیں گے کہ میں ٹانگ اڑاتی ہوں ہر کام میں...... ویسے بتا ہی دیں...... کیا ہیں یہ کاغذات۔" انداز اگرچہ چڑانے والا تھا مگر اب بھی تجسس سے بھرپور تھا۔ وہ محظوظ ہوا تھا۔

"بے فکر رہو...... دیکھ لینا، تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ بس کچھ ضروری کاغذات ہیں۔" کباب اور رولز پر ہاتھ صاف کرتے عبدالباری نے کہا تو وہ چپ ہو گئی۔

"ویسے یار رائنل! یہ کباب اور رولز تم نے بنائے ہیں...... تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کا ذائقہ ہی الگ سا ہوتا ہے۔ خود بخود پہچان ہو جاتی ہے۔" وہ تعریف کر رہا تھا، وہ بمشکل مسکرا سکی پھر اسے بغور دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے بیگم صاحبہ! ایسے کیوں دیکھ رہی ہو...... کیا کچھ زیادہ ہی اچھا لگ رہا ہوں یا بہت پیار آ رہا ہے مجھ پر......"

وہ سر جھکائے ہوئے تھا مگر اچانک سر اٹھا کر سوال داغا تھا اور وہ کھلاتی کی فورانفی میں سر ہلا یا تھا۔

"نہیں...... میں تو بس ویسے ہی...... ہی......" اس سے کوئی بات ہی نہ بن پڑی۔ وہ کھل کر مسکرایا۔ وہ جھینپ گئی۔ بلاشبہ وہ بھی گئی بر ہر انداز، ہر رنگ نرالا تھا۔ کون بدن نکھرتی چلی آ رہی تھی۔ خوب صورت تو پہلے بھی حد سے سوا تھی مگر اب یوں لگتا تھا کہ جیسے کائنات کا سارا حسن اس کے وجود میں آ سمایا ہو۔ شاید ماں بننے کا اعزاز تھا یہ۔

"سنو رائنل! تم خوش ہونا...... چند ماہ بعد بھیا بھابی کی طرح ہماری بھی اولاد ہوگی۔ ہیں ناں...... وہ دن کتنا خوب صورت ہوگا......" وہ چشم تصور میں نہ جانے کہاں گم تھا۔ اس خیال سے ہی خوش ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

"ظاہر ہے، ماں بننے کی خوشی کس عورت کو نہیں ہوتی...... اسی خیال سے میری روح سرشار ہونے لگتی ہے کہ جنت لمحہ بہ لمحہ میرے قدموں تلے سرکتی آ رہی ہے۔" وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ" شاید اسی لئے کہا گیا ہے مگر ڈر بھی لگتا ہے، ان نامعلوم وقت سے۔ یہ مقام، یہ رتبہ، کیا اس کے لائق ہوں؟ اللہ بہت رحیم و کریم ہے۔ کہیں زندگی کی بساط میں کوئی مہرہ الٹا نہ چل جائے ہم سے۔ نہ جانے وقت کے دامن میں ہمارے لئے کیا ہے۔ اولاد پیدا کرنا شاید اتنا مشکل امر نہیں، اس کی بہتر تربیت کرنا مشکل مرحلہ ہے۔ ماں باپ کی ذرا سی چوک، تھوڑی سی غفلت اولاد کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔"

عبدالباری چپ کا چپ رہ گیا تھا، صرف اس کو دیکھتا رہا تھا جس کا ایمان بہت پختہ تھا، یقین بہت راسخ تھا، سوچ بہت شفاف اور پاکیزہ تھی ورنہ اتنی کم عمری میں وہ بھی اس تجربے سے گزرتے ہوئے لڑکیاں اتنی پختگی اور گہرائی سے بھلا کب سوچتی ہیں۔ رائنل کی یہی خوبی تو اسے متاثر کرتی تھی۔

"میں چلتی ہوں۔ باہر دیکھوں مالی بابا نے کیا کیا ہے۔" وہ بیگ لے کر وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی تھی۔ بیگ کو لاکر میں رکھا تھا اور پھر باہر نکل گئی تھی۔ عبدالباری کتنی دیر تک دروازے کو تکتا رہا تھا جب کہ ہونٹوں پر ایک خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

رائنل کا خیال تھا کہ وہ پرانے راستوں کو چھوڑ چکا ہے مگر آنے والے دنوں میں وہ دن رات گھر سے غائب اپنا معروف رہا کہ وہ کچھ اندازہ بھی نہ لگا سکی۔ عجیب معمہ بن کر رہ گیا تھا وہ اس کے لئے، کچھ بھی سمجھانے بجھانے کا اس پر اثر نہیں ہوتا تھا۔

"ایسے لوگ بمشکل ہی سدھر سکتے ہیں۔ جرم کی دنیا ہی ان کی آخری پناہ گاہ ثابت ہوتی ہے، اگر کوئی لوٹنا چاہے بھی تو نہیں

نکلنے" عبدالباری کی مشکوک سرگرمیوں سے وہ سخت شاکی ہو گئی تھی۔ ہر وقت یہی سوچ کر کڑھتی رہتی، سوائے عبدالباری کے کچھ اور سوجھتا ہی نہیں تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا وہ اپنے آپ کو نارمل رکھے مگر ہر گزرتا لمحہ اس کو صرف اور صرف ٹینشن دے رہا تھا۔

دو دن ہو گئے تھے عبدالباری نہ صرف گھر سے غائب تھا بلکہ اس شہر سے بھی غائب تھا۔ وہ ضروری کام کا کہہ کر گیا تھا واپسی کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ رائنل اور گھر والوں کی جان سخت مشکل میں تھی۔ وہ جیسا بھی تھا بہر حال خون تھا اپنا، پھر رائنل کے لئے تو وہ بہت اہم تھا۔ پہلے پہل اس نے اسے واقعی کوئی اہمیت نہیں دی تھی مگر جب سے ایک تیسرا وجود دونوں کے درمیان آیا تھا وہ خاصی بدلنے لگی تھی۔ اب نہ صرف وہ اس کے وجود کا مالک تھا بلکہ اس کے ہونے والے بچے کا باپ تھا یہی سوچ ہر جذبے پر حاوی تھی۔

صبح صبح ناشتے کی ٹیبل پر سب ہی بیٹھے تھے۔ وہ کھانا لے کر آئی تو بابا اور فرقان بھائی دونوں ہی اخبار میں غرق تھے۔ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ اخبار کا ایک پیج اس نے بھی تھام لیا۔ پہلا صفحہ پلٹا تھا، دوسرے پیج پر نظر پڑتے ہی وہ حیران سی رہ گئی۔ جوں جوں پڑھتی جا رہی تھی حیرتوں کے سمندر میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

"باپ...... بابا...... بھائی...... یہ......" اس نے فوراً باقی لوگوں کو بھی اخبار کی طرف متوجہ کیا۔ امی، بابا، بھابی اور فرقان بھائی سب ہی متوجہ ہوئے تھے۔ انہوں نے اخبار تھام لیا تھا۔

"ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے والا ایک گینگ اپنے پورے گروہ سمیت گرفتار......" فرقان بھائی نے باآواز بلند پڑھا۔ جب کہ وہ دوسرے اخبار دیکھنے لگی۔ دوسروں کے اندر بھی تقریباً یہی خبریں چھپی تھیں۔

"اس گینگ کے افراد مختلف غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھے، بچوں کا اغوا، اسمگلنگ، تخریبی کارروائیوں میں پیش پیش تھے۔ ایک عرصے سے کچھ ہاتھ ان کو بے نقاب کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ گزشتہ روز پورا گروپ گرفتار کر لیا گیا۔ مزید تفصیلات کچھ یوں ہیں کہ......"

فرقان بھائی کی آواز میں جوش نمایاں تھا جب کہ ابھی کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہی تھیں۔

"ایس پی عبدالباری ایک عرصے سے ان لوگوں کے متعلق ثبوت اکٹھے کر رہے تھے۔ بہت خفیہ پیمانے پر یہ کام ہو رہا تھا۔ خاص طور پر ایس پی عبدالباری اس علاقے میں تعینات ہی اسی کام کے لئے ہوئے تھے۔ انڈر گراؤنڈ کے لوگوں سے تعلق رکھنے کی بنا پر بہت جلد جرائم کی دنیا کے اصل مہروں تک جا پہنچے۔ اس کے لئے انہیں سخت مصائب اور دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر ان کا جذبہ ہر چیز پر حاوی ہو گیا، اصل لوگوں تک پہنچنے کے بعد انہوں نے فوراً ایکشن لیا تھا۔ گزشتہ روز بھاری نفری کے ساتھ انہوں نے دشمن اشر پسندوں پر دھاوا بول دیا تھا۔ بھاری مقدار میں اسلحہ، بچے وغیرہ بازیاب ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے چند سپاہی وطن کے کام آ گئے مگر ان کا خون وطن کی آنے والی نسلوں کو ایک بہت بڑے خطرے سے بچا گیا ہے۔" امی اور بھابی وغیرہ شاکڈ سی بیٹھی تھیں۔ اگلے چند لمحوں میں وہ سب ہر بات بھلائے صرف اور صرف اخباروں کو چاٹ رہے تھے۔ یقین کسی کو بھی نہیں آ رہا تھا مگر نیچے دی گئی تصاویر اور خبر پڑھ کر وہ حیران تھے۔

"ہم کتنا غلط سمجھتے رہے اور وہ کیا نکلا...... وہ سب خفیہ پیمانوں پر کام کر رہا تھا اسی لئے تو کچھ بتا تا نہیں تھا اور ہم سمجھتے رہے کہ وہ راہ راست سے بھٹک گیا ہے۔" امی کی آنسوؤں سے بھری آواز پر اس نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ نہ جانے کب سے آنسو بہہ رہے تھے۔ احساس زیاں اور پچھتاوا تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"ہمارا کیا قصور ہے۔ اس کی سرگرمیاں ہی ایسی مشکوک تھیں۔ ہم ہی اندازہ نہ کر سکے۔ کتنی بار کہا تھا اس نے کہ وہ ایسا کچھ بھی نہیں کرے گا جس سے ہمارے سر جھکیں مگر ہمیں ہی یقین نہیں آتا تھا وہ اتنا حساس اور اتنا وطن پرست ہوگا۔ سوچا بھی نہیں تھا۔" فرقان بھائی بھی نہ جانے کون کون سی بات یاد کر کے پچھتا رہے تھے۔

"میرا دل کہتا تھا وہ غلط نہیں ہے، ہماری تربیت بری نہیں تھی...... وہ سب کچھ جان بوجھ کر کرتا رہا۔ ہمیں چڑاتا رہا اور ہم پاگل بنتے چڑتے رہے، یہ سوچتے رہے کہ وہ اب کبھی نہیں سدھر سکتا...... کسی اور پہلو سے کبھی سوچا ہی نہیں۔" بابا بھی رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے اور رانیل بھی کہ اس کی زبان پر تالے لگ گئے تھے۔ سب سے زیادہ بے یقینی و بے اعتباری تو اس کی جانب سے رہی تھی۔ کب کبھی آنکھ کھول کر عقل استعمال کرتے اس پر کبھی سوچا تھا، کیا کچھ غلط الفاظ اس کے لئے استعمال نہیں کئے تھے۔ کرپٹ، دھوکے باز، رشوت خور اور بھی نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی تھی اور وہ تھا کہ سب کتنے آرام سے سنتا رہا تھا، صرف ایک دفعہ اشتعال میں آ کر وہ اسے یہاں سے لے گیا تھا مگر اس کا سلوک کبھی بھی نامہربانوں والا نہیں رہا تھا۔ اس کے ساتھ تو وہ ہمیشہ سے مخلص رہا تھا اور اب تصویر کا یہ رخ، وہ چپ سادھے رہ گئی تھی۔

اس مشن پر جانے سے پہلے جب اس نے اس کے حوالے کئے گئے ڈاکومنٹس لئے تھے تو اس نے اس پر کس کس انداز میں طنز کے تیر نہیں اچھالے تھے، جواباً وہ برا مانے بغیر مسکراتا رہا تھا، سو طرح سے اسے چڑاتا رہا تھا اور وہ چڑتی بھی رہی تھی، ایسے غدار وطن سے لے کر غاصب اور بھی نہ جانے کیا کچھ کہا تھا۔ پھر وہ چلا گیا تھا اور اب......

بھائی، بابا اور وہ خود باقی سارا دن اس کے موبائل پر ٹرائی کرتے رہے تھے مگر وہ تھا کہ ریسیو ہی نہیں کرتا تھا۔ سارا دن گزر گیا اور وہ نہ لوٹا۔ اگلے دن کے اخبارات بھی اس کے کارنامے سے بھرے پڑے تھے۔ ہر جگہ اس کی تصاویر تھیں، مسکراتی ہوئی، جھلملاتی ہوئی۔ سب ہی اس سے ملنے کو بہت بے چین و بے قرار تھے اور وہ تھا کہ اگلا سارا دن بھی گزر گیا مگر واپس نہیں آیا تھا۔ بھائی نے ایک دو دفعہ اس میں بھی ٹرائی کیا تو وہاں بھی نہیں تھا۔ سب جہاں خوش تھے وہیں اس کی طرف سے متفکر بھی تھے۔

مغرب کے بعد کا وقت تھا جب وہ گھر میں داخل ہوا تھا۔ کتنے دنوں بعد گھر لوٹا تھا، عجب سا سکون تھا دل میں۔ جانتا تھا اس نے بہت سے لوگوں کا دل دکھایا ہے، بہت ستایا، تڑپایا ہے، دانستہ و نادانستہ گناہ گار ضرور تھا۔ امی، بابا، اس کی طرف سے سخت شاکی و بدگمان تھے۔ بہن بھائی سب ہی کا معترض تھا، خاص طور پر سب سے زیادہ رانیل کا۔ نہ جانے کیا کیا اسے کہتا اور کیا کچھ اس کے ساتھ کرتا آیا تھا۔

لاؤنج میں جائے نماز بچھائے امی نماز کے بعد تسبیح کر رہی تھیں، بابا بھی وہیں تھے جب کہ باقی لوگ اسے نظر نہ آئے۔

"امی!...... بابا......!" آج کتنے عرصے بعد وہ اپنے خاص محبت بھرے انداز میں ادب سے ان سے مخاطب ہوا تھا۔ وہ دونوں تڑپ کر دیکھنے لگے تھے۔ کتنا انتظار کروایا تھا اس نے انہیں۔

"عبدالباری......" امی چونکی تھیں پھر جائے نماز سے اٹھ کر آگے بڑھ آئی تھیں۔ بے اختیار اس کے چوڑے چکلے سڈول وجود کو اپنے ناتواں بازوؤں میں لے لیا تھا۔

"ہم سے چھپاتے رہے...... بھنک تک نہ پڑنے دی ہمیں...... کیا کچھ نہیں کہا ہم نے تمہیں کبھی کچھ تو کہا ہوتا...... اشارہ ہی کر دیا ہوتا...... اصل بات بتائی ہوتی اور ہم بھی کتنے نادان اور کم فہم تھے، کچھ بھی نہ سمجھ سکے...... ہمیشہ تمہیں غلط سمجھتے رہے...... شک کرتے رہے تم پر...... برا بھلا کہتے رہے......" امی رو رہی تھیں۔ بابا بھی آنکھوں میں نمی لئے اس کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ امی کو ایک طرف ہٹا کر ان کی طرف بڑھا۔ انہوں نے گرم جوشی سے بازو وا کر کے اسے سینے میں بھینچ لیا تھا۔

"مجھے تم پر فخر محسوس ہو رہا ہے بیٹے! تم نے میری تربیت کی لاج رکھ لی۔ میرا سر فخر سے بلند کر دیا، اس وطن کی مٹی کے سامنے......" آواز رندھی ہوئی تھی۔ خوشی و انبساط کے جذبات سے لبریز تھی۔ عرصے بعد وہ ان کے سینے سے لگا تھا۔ فخر، مان، غرور اور اعتماد کچھ اور بڑھنے لگا تھا۔

"یہ سب کیا تھا......؟ ہمارے جذبات سے کیوں کھیلتے رہے......" خود سے جدا کر کے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام

کر پیشانی چومتے ہوئے پوچھا تھا، وہ مسکرا دیا پھر ان کو لے کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ شروع سے لے کر اب تک کی ساری روداد تفصیل سے سنانے لگا تھا۔ اتنے عرصے کی محنت کا ایک ایک لمحہ، حرف بہ حرف...... پوری سچائی کے ساتھ، کچھ بھی چھپائے یا جھوٹ بولے بغیر۔

"رانیل کہاں ہے......؟" کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کا خیال آیا۔ امی سے پوچھا۔

"نماز پڑھنے کمرے میں گئی تھی، اندر ہی ہوگی......" اپنا چہرہ صاف کرتے انہوں نے بتایا۔

وہ کمرے میں آ گیا۔ رانیل جائے نماز بچھائے بیٹھی ہوئی تھی۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ کپکپاتے لبوں سے اپنے اللہ سے ناتا جوڑے ہوئے تھی۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ کر صوفے پر جا بیٹھا۔ دعا مانگ کر جائے نماز لپیٹ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دوپٹے کو ڈھیلا کرتے وہ پلٹی تھی، جب عبدالباری کو کمرے میں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"باری...... آپ......" وہ وہیں ساکت ہو گئی۔

"کیوں میرا آنا پسند نہیں آیا...... یا میرا زندہ سلامت آنا شاک زدہ کر گیا ہے...... دعائیں تو بڑی مانگی ہوں گی میرے مرنے کی...... مگر افسوس......" ہونٹوں پر ایک بھرپور مچلتی مسکراہٹ سجائے آنکھوں میں شوخ جذبات لئے عبدالباری نے گوہر افشانی کی تھی۔ وہ تڑپ کر دیکھنے لگی۔ آنکھیں لمحوں میں چھلک آنے کو بے تاب ہو گئیں۔

"بہت خراب ہیں آپ......" ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

عبدالباری آگے بڑھ آیا تھا۔ دونوں مضبوط توانا بازوؤں میں اس کے نازک سے پیکر کو سمیٹ لیا۔ سارا وجود ہچکی کی زد میں لرز رہا تھا، وہ لے کر بستر پر آ بیٹھا۔

"ہمیشہ یوں ہی کیا ہے...... میرے جذبات سے ہمیشہ اسی طرح کھیلتے ہیں، موت مذاق ہے آپ کے لئے......" روتے ہوئے ہچکیوں میں اس نے بھرپور شکوہ کیا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"ساری غلطیاں آپ کی ہیں...... سارے قصور آپ کے ہیں...... ہمیں دھوکہ دیتے رہے...... حقیقت کیا ہے، کبھی بتائی ہی نہیں......" سسکیوں سمیت وہ کہہ رہی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر اس کے بس چپ ہونے کا منتظر تھا۔ وہ یوں رو دھو کر استقبال کرے گی امید نہیں تھی۔ تصور میں تو اس کا طنز برساتا، تاک تاک کر وار کرتا، کڑوی کسیلی باتیں سناتا سراپا تھا اور اب وہ ساون بھادوں بنی ہوئی تھی۔ رو دھو کر دل کا غبار اچھی طرح نکال کر فارغ ہوئی تو آنکھیں بے رحمی سے رگڑیں۔

"آئم سوری......" پتہ نہیں وہ کس بات پر نادم تھی۔ وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

"یہ ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی...... اتنے دن سے کہاں تھے؟ گھر کیوں نہیں آ رہے تھے؟" لہجہ ابھی بھی ناراضگی لئے ہوئے تھا۔ وہ ہنس دیا۔

"دھیرج سے جان عزیز...... سب بتاتا ہوں۔" انداز تخاطب پر وہ چڑ گئی مگر مصلحتاً چپ رہی۔

"کہانی یوں ہے کہ......" وہ شروع ہوا تھا۔ وہ بغور سننے لگی وہ پہلی دفعہ اپنا آپ کھول رہا تھا یوں حرف بہ حرف۔

"جب میں نے یہ سروس جوائن کی تو ہر قدم پر یہی حالات تھے، جہاں ہاتھ ڈالتے کرپشن ہی کرپشن تھی۔ کچھ عرصہ میں صرف دیکھتا رہا تھا، کیا کیا ارادے، کیا کیا مقاصد لے کر میں اس فیلڈ میں نہیں آیا تھا مگر سب ملیا میٹ ہو گئے۔ جذباتی تو میں شروع سے ہی تھا سو میں نے اپنے طور پر اپنی مرضی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ یہاں صرف بے انصافی اور لوٹ مار کا راج ہے۔ کوئی دیانت دار بندہ چلتا ہی نہیں، حکام اعلیٰ سے لے کر ایک عام کانسٹیبل تک اسی بیماری میں مبتلا ہے جسے میری تمہاری زبان میں جرم کہا جاتا ہے۔ جہاں کالی بھیڑیں ہیں وہیں کچھ نیک اور وطن پرست لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ مجھے ڈی آئی جی ایاز سرفراز سے مل کر ہوا۔ وہ

صحیح معنوں میں ایک محب وطن شخص تھا، کراچی سے ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا تھا، آتے ہی اس نے ہمیں کال کی تھی خفیہ میٹنگ تھی۔ اس میٹنگ میں انہوں نے ہمیں اپنی پوری پلاننگ سے آگاہ کیا تھا۔ اس وطن کو شرپسندوں کے اثر سے پاک کرنا تھا۔ مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی، میرا ریکارڈ ابھی تک بالکل صاف تھا شاید اسی لئے انہوں نے مجھ پر اتنا بڑا اعتماد کر لیا تھا، ہر بات سے آگاہ کیا تھا۔ میرے ساتھ میرے چند وفادار بھی شامل ہیں جن میں میرا ایک خاص ساتھی ارقم خان سرفہرست ہے۔ اس کا پورا خاندان ایک تخریب کاری کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا اب اس کا مقصد ان لوگوں کو چن چن کر ختم کرنا تھا، جو اس کے خاندان کی بربادی کے ذمہ دار تھے۔ شروع سے ہی میری ارقم سے بہت اچھی دوستی تھی، اس کا دکھ مجھے دل کی گہرائیوں سے محسوس ہوتا تھا میں جب بھی ارقم کی جگہ خود کو رکھ کر سوچتا تو میرا تن بدن سلگنے لگتا تھا۔ ہم لوگوں کو اپنے انداز و اطوار بدلنا تھے تاکہ کسی کو بھی ہماری کارروائیوں پر شبہ نہ ہو۔ سو آہستہ آہستہ ہم لوگ ان شرپسندوں کے گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔ ہر جائز و ناجائز کام کرنے لگے تھے۔ اس دور میں دین و ایمان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں صرف بددیانتی و بدامنی کا راج ہے، روپے پیسے کو ہی خدا سمجھا ہوا ہے۔ بد سے بدنام برا کے مصداق ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ ڈی آئی جی صاحب کا پورا تعاون ہمارے ساتھ تھا سو کوئی ہم پر ہاتھ نہیں ڈالتا تھا پھر ہماری ریپوٹیشن بھی ایسی تھی کہ کسی کو ہم پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ایک عرصے سے ہم اس مقصد کے پیچھے خوار ہو رہے تھے، صرف چند ماہ پہلے ہی ڈی آئی جی صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا تھا شاید ہم کچھ عرصہ اس راز کو مزید راز ہی رکھتے اگر اکرام رحمن کی صورت میں ایک نیا ڈی آئی جی ہم پر تعینات نہ ہوتا۔ جس طرح اتنے لوگوں میں ایک نیاز فراز نیک انسان نکلا تھا اسی طرح اکرام رحمن کالی بھیڑ ثابت ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ ہماری ساری پلاننگ پر لگ گئے تھے۔ وہ ہمیں دبانے لگا تھا اب اتنے عرصے سے کی گئی محنت میں یوں اکارت نہیں جانے دینا چاہتا تھا اسی لئے کوئی فائنل قدم ابھی اٹھانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اکرام رحمن دشمنوں کے ہاتھوں بک گیا۔ ہماری ساری پلاننگ کی خبر دشمنوں کو ہو گئی تھی سو مجھے ان لوگوں سے ہر تعلق ختم کرنا پڑا تھا۔ تمام ثبوت و شواہد ہمیں حاصل ہو چکے تھے اب ارادہ صرف فائنل قدم اٹھانے کا تھا۔ وہ کال جو تم نے ریسیو کی تھی وہ بھی صرف ہمیں دھمکی دینے کو تھی تاکہ ہم ڈر کر اپنے مقصد سے پیچھے ہٹ جائیں...... اسی لیے میں تمہیں منع کرتا تھا کہ تم کال ریسیو مت کیا کرو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے میری فیملی کا کوئی فرد کسی تکلیف سے دوچار ہو مگر تم اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور تھیں نا۔'' وہ مسکرا رہا تھا، وہ اسے گھورتے لگی پھر بھی کچھ نہ کہا۔

''ہم پر بہت دباؤ تھا اور اب جب میں اپنے مقصد کے اتنے قریب تھا تو کیسے ہار مان لیتا سو ہر کام بہت جلدی سمیٹا تھا۔ فائنل قدم اٹھایا تو رزلٹ ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اس وطن کے افسران اگرچہ بے ضمیر ہیں مگر عوام ابھی مردہ نہیں ہوئے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اکرام رحمن ہم پر کوئی دباؤ نہ ڈالے اسی لئے مجھے مجبوراً سب کچھ میڈیا کے سامنے لانا پڑا تھا۔ اب جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔ میڈیا نے ہمارے اس اقدام کو بہت سراہا ہے، پاکستانی عوام بہت پرجوش ہیں، ہمارے حوصلے ایک دم بہت بلند ہو گئے ہیں۔

میرا ارادہ فوراً گھر رابطہ کرنے کا تھا مگر ایک شرمندگی سی تھی، دانستہ و نادانستہ میں بہت کچھ غلط کام کر چکا ہوں صرف اور صرف برائی کو اس کی جڑ سے اکھاڑنے کے لئے۔ اس سلسلے میں تم سب لوگوں کو بھی بہت تکلیف پہنچائی...... سو بہت چاہنے کے باوجود گھر نہ آ سکا اور اب جو بھی جیسا بھی ہوں تم سب کے سامنے ہوں۔'' وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

''جس شخص کی شہرت ایک دفعہ بری ہو جائے، کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرتا۔ پتہ نہیں تم لوگوں کا کیا ری ایکشن ہوتا...... یقین بھی کرتے یا نہیں...... بس اسی سوچ میں الجھا رہا......'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ رائبل نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ ابھی تو صرف ایک گرہ کھلی تھی، کچھ اسرار ابھی باقی تھے۔

''یقین کرنے یا نہ کرنے کا سوال تو ایک طرف رہتا ہے۔ میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے آپ نے وہ کس زمرے میں آتا

ہے۔ ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے، کسی سے نظر ملانے کے قابل نہیں چھوڑا مجھے...... کوئی یوں بھی کرتا ہے۔ کبھی بھی آپ کو اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا۔ بھولے بھٹکے سے کبھی تسلی و تشفی کا ایک لفظ نہ بولا۔ زور و زبردستی کیا کچھ نہیں کیا، ہمیشہ میرا دل جلاتے رہے، الٹی سیدھی باتیں کرتے رہے...... اگر ان باتوں کو سوچوں تو ایک پل کو بھی یقین نہ آئے مگر جذبات سے نکل کر دیکھوں تو شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں بچتی اب...... پوچھ سکتی ہوں ناں جو میرے ساتھ کیا وہ کیا تھا۔'' اس کے پاس شکووں کا ایک دفتر موجود تھا۔ وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔

''تو پھر میں کیا کرتا رائبل جان!...... تم مجھے شروع سے ہی اچھی لگتی تھیں، کبھی اظہار نہ کیا کیوں کہ ہماری تربیت ان خطوں پر ہوئی ہی نہیں تھی دوسرے دل کو یہ تسلی بھی تھی کہ اپنی چیز ہو جب خواہش کروں گا پا لوں گا، کون سا تم کہیں بھاگی جا رہی ہو۔ ابھی تعلیم کا سلسلہ چل رہا ہے۔ بس خود کو ہی سیٹ کرتا رہا۔ اسی مسئلے پر الجھا رہا۔ کبھی توجہ ہی نہ دی کہ فرض کی خاطر جو میں غلط شہرت حاصل کر رہا ہوں یہ تمہارے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن آ کھڑی ہو گی۔ جب امی، بابا سے بات کی تو تم نے انکار کر دیا جس وجہ سے انکار کیا تھا وہ مجھے قابل قبول نہ تھی۔ ایک ضد سی بندھنے لگی تھی مجھے تم سے۔ تم تک رسائی کا ہر راستہ بند نظر آنے لگا، اوپر سے امی، بابا اور بھابی، بھائی بھی تمہارے موقف کی طرف داری کر رہے تھے۔ میں اس اہم موڑ پر آ کر جب تک کامیابی کے امکانات بہت روشن تھے تو کوئی حماقت افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ ارادہ تھا کہ تم سب کو اعتماد میں لے لوں گا مگر پھر ارادہ بدل دیا، سیدھی طرح تم حاصل نہیں ہو رہی تھیں اوپر سے تم نے سعودیہ جانے کا فیصلہ کر کے میری ضد کو آواز دی تھی۔ میں شاید کچھ عرصہ انتظار کر لیتا مگر اب ناممکن تھا۔ میں تمہیں روک نہیں سکتا تھا کوئی رشتہ نہیں تھا میرا تم سے سو مجبوراً مجھے جھوٹا نکاح نامہ حاصل کرنا پڑا تھا پھر جو بھی کیا جائز و ناجائز طریقے سے، یہی سوچتا رہا کہ جب بھی حقیقت کھلے گی تم سب لوگ مجھے معاف کر دو گے۔ صرف ایک یہی سوچ پر کاربند سب کرتا گیا۔'' وہ سب بتاتے ہوئے ہنس دیا تھا، وہ خفگی سے دیکھنے لگی۔

''ضد میں بھی انسان اصول و ضوابط کا خیال کر لیتا ہے، یہ کیسی ضد یا پسند تھی کہ وہ بھی نہ دیکھا۔'' وہ اتنی جلدی کیسے مان جاتی کہ وہ اس کی ضد نہیں پسند تھی۔ غصہ بے پناہ آیا تھا۔

''ارے رائبل یار! اتنی خفگی...... میرا خیال تھا کہ جب حقیقت کھلے گی تب اگلے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے مگر تم تو......'' وہ ہنسنے لگا تھا۔ ''وہ کہتے ہیں نا کہ محبت و جنگ میں سب جائز ہے۔ ضد تو بعد میں بنی تھی، محبت تو اول روز سے ہی تھی...... محبت میں تو انسان کے سب گناہ بخش دیے جاتے ہیں...... اور تم ہو کہ......'' وہ ہنسی روک کر رائبل کے سرخ چہرے کو بغور تکنے لگا۔

''یہ محبت تھی...... ایسی ہوتی ہے محبت...... میرے رونے گڑگڑانے کسی بھی منت سماجت کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا تھا، اوپر سے اتنی گھٹیا باتیں کرتے تھے مر جانے کو جی چاہتا تھا اور اب بہلا رہے ہیں کہ محبت ہے...... مجھے بے وقوف نہ بنائیں بچی نہیں ہوں...... سب سمجھتی ہوں......'' اس نے زچ ہوتے اس کے صبیح پر رونق چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔

''بے وقوف ہی نہیں کم علم بھی ہو۔ اوپر سے محترمہ کو دعویٰ ہے کہ مجھ سے زیادہ عقل و فہم کی مالک ہیں۔ جس نام کی کوئی چیز نہیں ہے تم میں۔ ہاں میں کرتا ہوں تم سے محبت...... دعویٰ کرنے کے بجائے عملی مظاہرے کرتا ہوں۔ غازی بن کر لوٹا ہوں، جس مشن پر گیا تھا وہاں تمہارے بیوہ ہونے کے سو فیصد چانسز تھے۔ شکر کرو زندہ سلامت لوٹا ہوں...... تو اب بتاؤ اب شروع کروں عملی مظاہرہ تاکہ محترمہ کو اچھی طرح یقین آ جائے......'' آنکھوں میں بے پناہ شرارت سموئے گمبھیر لہجے میں کہتے اس کے دل کی دھڑکنوں میں تلاطم برپا کرتے رائبل کی جان مشکل میں ڈال گیا تھا۔

''انتہائی بدنیت ہیں آپ......'' اسے بری طرح گھورتے وہ یہی کہہ سکی۔ عبدالباری کے ہاتھ جھٹکتے اس سے کافی دور ہو گئی۔ وہ ان الفاظ پر قہقہہ بار ہوا تھا جو وہ کئی بار پہلے بھی دہرا چکی تھی۔

"رائیل...... رکو تو...... کہاں جا رہی ہو...... اتنی جلدی بھاگ رہی ہو۔ محبت کا عملی مظاہرہ تو دیکھتی جاؤ...... ابھی تو جان عزیز! دل کے بہت سے راز کھولنے ہیں۔" وہ فل موڈ میں تھا، سرمستی لئے گویا تھا۔ وہ دھیان دیئے بغیر باہر نکل گئی کہ ابھی اسی میں عافیت تھی۔

وہ ایک دم بے پناہ محبتوں کے حصار میں آ گئی تھی۔ زندگی کتنی خوب صورت ہو گئی تھی۔ ایک درد سا دل میں ہر وقت رہتا تھا اب وہ ختم ہو چکا تھا۔ عبدالباری کی ساری زندگی کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے تھی۔ اب کوئی راز، راز نہیں تھا۔ ہر طرف محبتیں ہی محبتیں تھیں۔ عبدالباری کی محبتوں، شدتوں، بے چینیوں وبے قراریوں کا بادل ہر لمحہ ٹوٹ کر برسنے کو بے تاب ہوتا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اک گوہر نایاب منتخب کیا تھا، اپنی گزشتہ تمام باتوں، اعتراضات اور بے ذوقیوں پہ ہر لمحہ شرمندگی محسوس ہوتی تھی بلکہ اب تو اس سوچ سے ہی دل کی دھڑکن تھمنے لگتی تھی کہ اگر عبدالباری کے علاوہ کوئی اور زندگی میں آ جاتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔

اس کے بعد عبدالباری اب تندہی سے نئے کارنامے سرانجام دے رہا تھا۔ افسران بالا نے اس پر اچھا خاصا دباؤ ڈالا تھا مگر وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس کیس کی کامیابی پر عبدالباری اور اس کے ساتھیوں کو بھاری اعزازات، انعامات اور تمغۂ امتیاز سے نوازا گیا تھا۔ ہر طرف عبدالباری کا بول بالا تھا۔ سبھی افسران بالا بھی دیر کو خاموش ہو گئے تھے اسی لئے عبدالباری اب سرعام بغیر کسی کی پروا کئے ہر کام ڈنکے کی چوٹ پر سرانجام دینے لگا تھا۔ آج کل بھی کسی اہم کیس پر وہ کام کر رہا تھا۔ کسی بچے کے اغوا کا کیس تھا، اس کے پیچھے پورا ایک گروپ کام کر رہا تھا۔ دن رات ایک کئے وہ اس کیس کو حل کرنے پر لگا ہوا تھا۔ اب صرف فائنل اسٹیپ اٹھانے کی دیر تھی۔ اب اس کے راتوں کو غائب رہنے پر کسی نے بھی اعتراضات نہیں کئے بلکہ سب ہی اب فکرمند رہنے لگے تھے، اس کی کامیابی کے لئے دعائیں کرنے والے بے شمار ہاتھ ہوتے تھے۔

عبدالباری گھر کے قریب پہنچا تو رائیل سامنے ہی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ کوئی نغمہ چل رہا تھا، پورے لاؤنج میں آواز نمایاں تھی۔

"ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان"

رائیل پوری طرح منہمک تھی، وہ آگے بڑھ آیا تھا۔

"السلام علیکم رائیل جان......!" پرجوش انداز تھا، وہ چونک کر پلٹی عبدالباری کو دیکھ کر مسکرا دی۔

"وعلیکم السلام...... اس وقت گھر پر کیسے؟" وہ ٹی وی کی آواز دھیمی کر کے اٹھ کھڑی ہوتی۔

"کیا کروں...... تمہارے بنا آفس میں بھی ایک پل کو سکون نہیں ملتا...... دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر تم تک پہنچ جاؤں اور دیکھ لوں آپ سامنے ہوں۔" بے تابانہ انداز میں والہانہ پن لئے اس کے گرد مضبوط بازوؤں کا حصار کھینچتے ہوئے وہ انتہائی محبت سے کہہ رہا تھا۔ ہر گزرتا پل دونوں کی محبت میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ وہ تو اپنے آپ کو سنبھال لیتی تھی مگر عبدالباری کب کوئی بات چھپا کر رکھنے والا تھا، جب سے اپنا آپ عیاں کیا تھا تو پھر کچھ نہیں چھپا رہا تھا۔ وہ اس کی قربت کی گرمی میں بول بھی نہ سکی۔

"رائیل! تمہاری آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں...... جب بھی تمہاری آنکھوں میں دیکھتا ہوں مجھے اپنا آپ بھولنے لگتا ہے۔ نہ جانے تم کیا ہو...... میری ساری سدھ بدھ ختم کر دی ہے تم نے...... کسی کام کا نہیں رہا میں۔" وہ ارد گرد کو فراموش کئے کہہ رہا تھا۔ رائیل پسینے پسینے ہو گئی۔

"کیا کرتے ہیں آپ...... بھابی گھر پر ہیں...... آج وہ اپنے کمرے میں ہیں۔" اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے وہ بمشکل کہہ پائی ورنہ کچھ بولنا مشکل تھا۔ اس کی قربت کا نشہ ایسے ہی سر چڑھ کر بولتا تھا۔

"اچھا......" اس نے آہستگی سے اسے خود سے جدا کیا، بغور تکنے لگا۔ وہ پزل ہونے لگی۔

"آپ بیٹھیں میں کھانے کو کچھ لاتی ہوں......" اس کی نظروں کی وارفتگی سے گھبرا کر اس نے کھسکنا چاہا تھا مگر عبدالباری نفی میں سر ہلا گیا۔

"کھانے کا میرے پاس وقت نہیں...... بس تمہیں ملنے آیا تھا۔" وہ اسے اپنے حصار میں لئے صوفے پر جا بیٹھا۔ وہ کوئی مزاحمت بھی نہ کر سکی جب کہ بھابی گھر پر تھیں اور عبدالباری کو کوئی پروا ہی نہ تھی۔

"تمہارے ہاتھ بھی کتنے خوب صورت ہیں...... نرم و نازک روئی کے گالوں جیسے......" رائیل کے ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرتے آنکھیں بند کئے وہ گم تھا۔ رائیل نے گھبرا کر اردگرد دیکھا پھر ہاتھ کھینچ لئے۔ عبدالباری نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

"کتنی ظالم ہو تم...... میں تمہاری دید کے لئے اتنی دور سے بھاگا آ رہا ہوں اور تم...... کہ......" اس نے کچھ خفگی سے کہا مگر پھر اگلے ہی لمحے ٹون بدل گیا۔

"تم نے کبھی سوچا ہے۔ اگر کبھی میں نہ رہوں تو تم میرے بغیر کیا کرو گی......"

وہ اتنی غیر متوقع گفتگو اور وہ بھی اتنی سنجیدگی سے شروع کر دے گا، اسے اندازہ نہیں تھا۔ رائیل نے بوکھلا کر دیکھا۔

"کیا بات ہے...... یہ ایک دم مرنے کا شوق کیوں ہو رہا ہے۔" اپنے آپ کو نارمل کرتے پوچھا۔

"فرض کر رہا...... اگر میں واقعی مر جاؤں...... بھئی دوسری شادی کے چانس تو کچے ہیں ناں......" آنکھوں اور چہرے پر واضح شرارت چمک رہی تھی۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔

"عبدالباری......" وہ بہت کم اسے پورے نام سے پکارتی تھی ورنہ باری ہی کہتی تھی۔ وہ مسکرایا۔ اس وقت رائیل کا غصہ دیکھنے کے قابل تھا۔

"بھئی...... فرض کر رہا ہوں ناں...... بیوہ کو اسلام دوسری شادی کا حق دیتا ہے۔" وہ اب بھی شرارت پر آمادہ تھا۔ رائیل نے کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔

"یہ تو میں بعد میں دیکھوں گی کہ کیا حق حاصل ہے اور کیا نہیں...... پہلے یہ تو بتائیں یہ موت کا بھوت ایک دم سر پر کیوں سوار ہونے لگا ہے......" وہ فوراً دو دو ہاتھ کرنے پر تل گئی تھی۔ عبدالباری کا ہنس ہنس کے برا حال ہونے لگا۔

"باری......" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"جی باری کی جان......" وہ فوراً سنجیدہ ہوا تھا۔ "دراصل تھوڑی دیر بعد میں ایک اہم ریڈ پر جا رہا ہوں...... ایک بچے کی بازیابی کا کیس ہے...... کافی بڑا گینگ ہے۔ کبھی اتنا دل نہیں گھبرایا اسی لئے تم سے ملنے گھر آ گیا تھا۔ دعا کرنا، کامیاب لوٹوں...... حالات خطرناک ہیں۔ زندگی اور موت کا کچھ علم نہیں...... پہلے مجھے موت کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی مگر ابھی میں اپنے بچے کو دیکھے بغیر نہیں مرنا چاہتا......" کتنی حسرت تھی اس کے لہجے میں۔ وہ حیران رہ گئی۔ کس قدر سنجیدہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوف زدہ ہوتی مگر پھر بھی حوصلہ دینے کو کہنے لگی۔

"حد ہوتی ہے کم ہمتی اور بزدلی کی بھی۔ جب اس فیلڈ میں ہیں...... تو کیا پتہ کون سی گولی کب زندگی سے جدا کر دے۔ اس کے باوجود بزدلوں والی باتیں کر رہے ہیں۔ اگر موت کا اتنا ہی خوف سر پر سوار ہے تو مت جائیں جس طرح دوسرے افسر ہاتھ پر ہاتھ دھرے ضمیر فروش بنے بیٹھے دونوں ہاتھوں سے جیبیں بھر رہے ہیں، آپ بھی بھر لیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا اس وطن کے نونہال جو کہ کل کے معمار وطن وہ بک جائیں گے، جہاں اتنے گناہ ہو رہے ہیں صرف فائلوں تک محدود ہیں انہیں بھی کسی فائل میں بند کر کے ردی سے گرد لگا کر ایک کونے میں رکھ دیں۔ جہاں اتنے لوگ وطن کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں وہیں آپ بھی بے ضمیر بن جائیں۔ یہاں چوری ہو یا ڈاکہ کسی کا بچہ اغوا ہو یا قتل اعلیٰ حکام کے سر پر جوں تک نہیں رینگتی۔ آپ بھی خاموش ہو جائیں...... بے فکر ہو جائیں...... یہ ملک جس کے لیے لاکھوں قربانیاں دی گئی ہیں، برباد ہو یا مسمار......" اس کا لہجہ آخر میں کتنا کڑوا اور زہر خند ہو گیا تھا۔

"نہیں رائیل! میں ایسا نہیں ہوں۔ میرا تو خود دل چاہتا ہے کہ اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے والوں کو چن چن کر واصل جہنم کر دوں۔ نیست و نابود کر دوں... مگر بہت بااختیار ہونے کے باوجود میرے ہاتھ ابھی بھی بندھے ہوئے ہیں۔ اب مجھے ایاز سرفراز جیسا رہبر نہیں ملے گا۔ سی ایس پی تیمور ثقلین سے لے کر ڈی آئی جی اکرام رحمٰن تک میری جان کے دشمن ہیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا کہ وہ مجھے صفحہ ہستی سے ہی مٹا دیں۔ تم مجھے بزدلی کا طعنہ مت دو، میں اس میدان میں ایک مقصد لے کر آیا تھا شہادت کا رتبہ یا پھر فتح...... زندگی سے کبھی اتنا پیار نہیں ہوا تھا جتنا اب تم سے بچھڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ ہر لمحہ زندہ رہنے کی خواہش بڑھتی جا رہی ہے۔ جب بھی خیال آتا ہے کہ اگر میں مر گیا تو بھی اپنے بچے کو دیکھے بغیر تو آخری سانس تک ایک تشنگی سی دل میں رہے گی۔" وہ پرعزم تھا مگر آخر میں اس کا لہجہ ٹوٹ سا گیا تھا۔ رائیل کی آنکھیں چھلکانے کو بے تاب ہو گئیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ اسے روک دے کہ وہ ایسی باتیں مت کرے مگر دل خود بھی چاہ رہا تھا کہ آج اس سے جی بھر کر باتیں کرے۔ وہ جس مقصد کے لیے نکل رہا ہے وہاں نہ جانے اس کے لیے کیا ہو۔

"اب ایسی باتیں کر کے اپنا مقصد اور عزم مت کھوئیں...... خوش خوش جائیں، اپنی طرف نہیں دیکھیں۔ ان ماؤں کی طرف دیکھیں نہ جانے کتنی ماؤں کی گودیں ایسے ہاتھ برباد کر چکے ہیں...... کل جب ہمارا بچہ ہوگا تو کیا پتہ کون سے ہاتھ اس کی طرف لپک آئیں۔ بہتر یہی ہے کہ ان ہاتھوں کو ابھی سے کاٹ دیں۔" وہ بہت حوصلے سے اسے سمجھا رہی تھی۔

"تم...... کتنی حوصلہ مند ہو...... تمہیں دیکھ کر مجھے تم پر رشک آتا ہے...... کبھی نہیں تم ڈگمگائیں۔ اب بھی تم میری راہ کی کرن اور روشنی ہو...... میری محبت ہو......" عبدالباری نے بہت جذب سے اسے خود میں سمیٹ لیا تھا۔ آنسو بہنے کو بے تاب تھے۔ وہ بمشکل پیچھے دھکیل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی جب کہ جسم جان کنی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ کتنا عزیز ہو گیا تھا وہ اسے۔ اب اس کے بغیر رہنے کا تصور ہی سوہان روح تھا۔

"ابھی نکل رہے ہیں......؟" خود کو کمپوز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں...... بس دعا کرنا۔" عبدالباری نے اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔

کچھ دیر بعد وہ چلا گیا۔ وہ جیسے جیسے دور ہو رہا تھا رائیل کی نگاہوں میں آنسو بھرتے جا رہے تھے۔

"اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو...... اللہ آپ کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ اس وطن کے دشمنوں کو نیست و نابود کرنے۔" اس کے ہونٹ دعا کر رہے تھے۔

* * *

اس دفعہ بھی عبدالباری سرخرو و کامیاب لوٹا تھا، پورا گروہ گرفتار کر لیا گیا تھا صرف دو افراد بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ یہ سب اپنے طور پر کر رہا تھا۔ تیمور ثقلین سی ایس پی کی طرف سے اس پر بہت دباؤ تھا مگر وہ کسی کی بھی نہیں سن رہا تھا۔ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لا رہا تھا چونکہ اس کا گزشتہ ریکارڈ بے داغ تھا سو اس کے متعلق کوئی عملی قدم بھی نہیں اٹھا رہا تھا۔ وہ ہر کیس بہت احتیاط سے حل کرتا تھا۔ گزشتہ واقعات کی طرح اس نے اس کیس کی بھی پریس میں اور پورے میڈیا کے ذریعے کوریج کروا دی تھی سو کوئی بھی اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے سو بار سوچ رہا تھا جب کہ اس دفعہ اس نے جن لوگوں کو گرفتار کیا تھا انہوں نے ڈی آئی جی اکرام رحمٰن کے متعلق کافی کچھ اگلا تھا۔ عبدالباری کا اب اگلا ٹارگٹ اکرام رحمٰن تھا مگر وہ اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہر طرح سے تسلی کر لینا چاہتا تھا۔ مضبوط اور ٹھوس شواہد کی روشنی میں پکے ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔

وہ اپنے آفس میں تھا جب ارقم کی کال آئی تھی۔ وہ فوراً نکل کھڑا ہوا تھا۔ ارقم کے پاس اکرام رحمٰن کے متعلق کافی ثبوت تھے۔ ادھر ادھر کی بھاگ دوڑ میں عبدالباری کا سارا دن نکل گیا تھا۔ شام کے قریب وہ گھر لوٹا تھا، سامنے سب ہی پریشان و متفکر دکھائی دیے تھے۔

"کیا ہوا......؟" بھابی، امی اور رائیل کو روتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"صبح فہد اسکول گیا تھا اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ ان کے اسکول سے پتہ کروایا تو علم ہوا کہ کوئی دو آدمی تمہارا نام لے کر اسے لے گئے تھے۔" بابا نے بتایا وہ حیران و ششدر رہ گیا۔

"تھوڑی دیر پہلے کچھ نامعلوم لوگوں کا فون آیا ہے...... سخت دھمکیاں دے رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے اگر تمہیں فہد زندہ سلامت چاہئے تو تم ان کے گرفتار کیے ہوئے آدمیوں کو چھوڑ دو......" وہ چپ کا چپ جڑا رہ گیا۔ رائیل اپنے بچے کی بات کر رہی تھی اور یہاں وہ ہاتھ ان کے گھر پر بھی پہنچ گئے تھے۔ فرقان بھائی نے بتایا۔

"امی، بھابی کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ رائیل...... رائیل جس کی اپنی حالت ان دنوں کچھ ایسی تھی کہ اسے جتنا بھی ٹینشن وغیرہ سے دور رکھا جاتا اتنا ہی بہتر تھا مگر وہ اپنی حالت کی پرواہ کیے بغیر بھابی اور امی کے ساتھ تسلی دل جوئی کر رہی تھی۔

"رابطہ کرنے کے لیے انہوں نے کوئی میسج وغیرہ تو چھوڑا ہوگا......" فہد تو اسے بھی بہت عزیز تھا۔ یہ اور بات تھی کہ کبھی آگے بڑھ کر مظاہرہ نہیں کیا تھا اور اب......

"یہ نمبرز لکھوائے تھے انہوں نے۔ ہم نے ایک دو دفعہ ان نمبروں کو ٹریس کروانے کی کوشش کی ہے مگر کوئی رسپانس ہی نہیں مل رہا......" بابا نے اسے ایک پرچہ تھمایا تھا۔ وہ بغور دیکھنے لگا۔

"بے فکر رہیے اور حوصلہ کیجئے۔ میں دیکھتا ہوں...... انشاء اللہ فہد زندہ سلامت گھر آئے گا۔" پرچہ جیب میں ڈال کر وہ باہر نکل گیا تھا۔

"باری...... رکو......" ابھی وہ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا جب رائیل کی آواز پر رک گیا۔ پلٹ کر اسے دیکھا، رو رو کر آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ بڑی سی چادر میں اپنے وجود کو چھپائے وہ اس کے قریب آئی تھی۔

"خیال رکھیے گا...... کسی بھی لمحے جذباتی نہ ہو جائیے گا...... ایک طرف وطن کے دشمن ہیں تو دوسری طرف فہد...... بس ہمیں فہد چاہئے زندہ و سلامت...... کچھ بھی کریں بس وہ ہمیں لا دیں ورنہ بھابی رو رو کر مر جائیں گی......" ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ رو پڑی تھی۔ عبدالباری نے لب بھینچ لیے تھے۔

"حوصلہ رکھو...... انشاء اللہ وہ مل جائے گا۔" آگ جب گھر کو لگتی ہے تو علم ہوتا ہے کہ اس کی تپش کیا ہے۔ اس نے اس

سے دعویٰ بہت بڑا کیا تھا اور آج...... عبدالباری اس کا کندھا تھپتھپا کر چلا گیا تھا۔ خون کے رشتوں کی کشش اور دکھ کتنا گہرا ہوتا ہے، پیچھے وہ ڈبڈبائی آنکھوں سمیت اسے دیکھتی رہی۔

عبدالباری نے ان لوگوں سے رابطہ کیا، مصالحت کی کوئی راہ نکالنا چاہی مگر وہ کسی بھی طرح آمادہ نہ ہوئے۔ جہد کے بدلے ان کی ڈیمانڈ بہت بڑی تھی۔ اس نے بڑی جان جوکھوں سے یہ کیس حل کیا تھا، بہت سا دباؤ برداشت کیا تھا حتیٰ کہ موت کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے بے خوف و خطر آگ میں کود پڑا تھا۔ ایک طرف اگر وطن کی باگ ڈور سنبھالنے والے نونہالوں کا مستقبل خطرے میں تھا، مٹی کا قرض تھا تو دوسری طرف عزیز از جان بہن تھی۔ وہ کبھی بھی رشتوں کے متعلق اتنا حساس نہیں ہوا تھا سوائے رابیل کے مگر اس موڑ پر آ کر وہ الجھ گیا تھا۔

”وطن سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں...... جب یہ وطن ہی نہیں ہوگا، اس کی باگ ڈور سنبھالنے والے ہاتھ ہی نہیں ہوں گے تو پھر کیا ہم اور کیا ہمارے بچے......“ خود سے لڑتے لڑتے ایک فیصلہ ہو گیا تھا۔ خون کی کشش سے زیادہ وطن کی محبت جیت گئی تھی۔ ایک نئے عزم، ایک نئے ولولے کے ساتھ وہ میدان میں اترنے کے لئے تیار تھا۔ تیاری ہر طرح سے مکمل تھی، زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ بہتر تدبیر تو کر سکتا تھا اور وہ آخری دم تک اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں تھا۔

جدید دور تھا، سب لوگ بہروپ بدلے ہوئے تھے۔ پوری پلاننگ کی گئی تھی۔ کی تو پہلے بھی کوئی نہیں ہونے دیتا تھا اس دفعہ خاص تیاری کی گئی تھی۔ بہت خفیہ پیمانے پر کارروائی کی گئی تھی۔ زمین کی تہہ تک جا کھنگالا تھا۔ فہد صحیح سلامت مل گیا تھا مگر وہ خود اس ریڈ میں بری طرح زخمی ہوا تھا۔

ارقم، فہد کو گھر لے گیا تھا۔ گھر کے ارد گرد پولیس کا سخت پہرا لگوا دیا گیا تھا۔ خود تو وہ اس حالت میں بھی نہ تھا کہ کچھ کر سکتا۔ ارقم کو سخت تاکید کی تھی کہ گھر والوں کو اس کے زخمی ہونے سے قطعاً بے خبر رکھا جائے اور ارقم نے اور دوسرے ساتھیوں نے اس کے کام کو بخوبی سرانجام دیا تھا۔ پیچھے گھر والے قطعی بے خبر تھے، سب یہی سمجھے ہوئے تھے کہ وہ کسی نہ کسی کام میں الجھا ہوگا البتہ فون پر ایک دو دفعہ بات کی تھی جس سے گھر والے مطمئن ہو گئے تھے۔

اسے اسپتال میں تیسری رات تھی، ڈاکٹر نے اسے او کے کر دیا تھا اور بیڈ ریسٹ کی تاکید کی تھی۔ رات اسپتال میں گزارنے کے بجائے اس نے ارقم سے چھٹی لینے کی بات کی تھی۔ دو بجے کے قریب وہ گھر پہنچا تھا، ارقم اسے گھر چھوڑ کر چلا گیا تو وہ کمرے میں آ گیا۔ گیٹ پر چوکیدار تھا، اس نے دروازہ کھولا تھا، اسے ایک دو خاص تاکیدیں کر کے وہ اندر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ رابیل سوتی ہوگی مگر اسے جائے نماز پر کھڑے دیکھ کر رک گیا۔ وہ شرٹ اتار کر صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ جولائی کا مہینہ چل رہا تھا، گرمی خاصی زوروں پر تھی۔ ڈاکٹر کی دی گئی میڈیسن سے غنودگی طاری ہو رہی تھی مگر وہ اتنی جلدی رابیل سے بات کئے بغیر سونا نہیں چاہتا تھا۔ سلام پھیر کر پلٹ کر رابیل نے دیکھا، عبدالباری کو روم میں دیکھ کر حیران ہوئی۔ عبدالباری کی اس وقت جو حالت تھی وہ زیادہ شاک زدہ کر گئی۔ سینے، بازو پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ بہت سرعت سے اس کی طرف آئی تھی۔ اس دن سے غائب تھا، فہد کو بھیج دیا تھا، خود نہیں آیا تھا۔ فون پر ایک دو دفعہ بات ہوئی تو سب خیریت سے کہہ کر تسلی دے دی مگر اب یہ حالت...... وہ آنکھیں بند کئے نیم دراز تھا۔

”بادی......!“ وہ گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ باری نے بوجھل آنکھیں کھول دی تھیں۔

”یہ سب کیا ہے باری......؟“ اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے وہ پوچھ رہی تھی جب کہ آنکھیں بس بہنے کو بے تاب تھیں۔

”ایک قرض تھا محبتوں کا، رشتوں کا، خیال ہی نہ رہا اور یہ حالت ہو گئی۔ اب دعا ہے کہ کسی طور مٹی کا قرض بھی اتار دوں...... صد شکر میں خود غرض نہ بنا ورنہ یہ محبتیں بہت بڑا خراج مانگ رہی تھیں۔ بس اب تو وطن کی راہوں کو اپنے خون سے منور کرنا

باقی ہے۔“ وہ بوجھل آواز میں بوجھل آنکھیں لئے نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ اس کی حالت رابیل کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ کب دیکھا تھا اس نے کبھی اس شیر جوان مرد کو یوں اس حالت میں۔ غنودگی طاری تھی اس پر۔ رابیل نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

”باری...... ہوش کریں...... پلیز بستر پر چل کر لیٹیں۔“ روہانسے لہجے میں کہا گیا تھا۔ باری اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ رابیل نے اپنے کمزور سے وجود کا سہارا دیا تھا۔ لیٹ کر وہ بمشکل آنکھیں کھول کر مسکرایا۔

”اسی لئے میں گھر نہیں آ رہا تھا...... جانتا تھا اس حالت میں دیکھ کر تم سب لوگ پریشان ہو جاؤ گے۔“ اسے مسلسل آنسو بہاتے دیکھ کر باری نے ٹوکا تو وہ ضبط کھو گئی۔

”تو پھر میں کیا کروں...... بتائیں مجھے، میں کیا کروں......؟“ وہ اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ جبکہ یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ اس کے سینے پر زخم ہیں۔

”رابیل......“ درد ناقابل برداشت ہوا تو اس نے اپنے کندھے سے اس کا سر ہٹایا۔ عبدالباری کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر وہ خود ہی نادم ہو گئی تھی۔

”آئم سوری...... کیسے ہوا یہ سب؟“ خود پر کچھ قابو پا کر پوچھا۔ عبدالباری نے آہستہ آہستہ اسے ساری تفصیل کہہ سنائی۔

”بس زخم ہیں...... چند دنوں میں نارمل ہو جائیں گے...... اسپتال میں سخت گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹروں کی مسیحائی سکون نہیں دے رہی تھی۔ تمہیں دیکھنے کی طلب تھی بس رات کے اس پہر سب چھوڑ چھاڑ کر تمہاری مسیحائی میں چلا آیا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ کتنی شدت تھی جذبوں میں، وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ پائی۔ بس اس کا سر اپنے ہاتھوں سے سہلانے لگی۔ اس کے ہاتھوں کی نرماہٹ تھی شاید کہ وہ بہت جلد غافل ہو گیا تھا۔

وہ جب تک ٹھیک نہیں ہو گیا چھٹی پر ہی تھا۔ گھر کا سب ہی اس کے آگے پیچھے اس کی خاطر مدارت میں لگے ہوئے تھے۔

پورے ایک ہفتے بعد اس نے آفس کا دوبارہ چارج سنبھالا تھا۔ بہت سے کام تھے نمٹانے والے پھر ارقم اس کا رائٹ ہینڈ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ چند دن وہ بہت مصروف رہا تھا۔ بچوں کو اغوا کرنے والے گروہ کا مقدمہ باقاعدہ جاری کروا کر پوچھ گچھ کے بعد ان کا کیس عدالت میں چل رہا تھا۔ وہ بہت مصروف تھا، اوپر سے وہ اکرام رحمٰن کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہ دفتر میں تھا جب اس کے سی ایس پی تیمور شکین کا فون آ گیا تھا۔

”تمہاری کارروائیاں دن بدن ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں ایس پی عبدالباری!“ تیمور شکین کافی برہم لہجے میں گویا تھا۔

”خیریت سر...... میں سمجھا نہیں......“ اس کا انداز اگرچہ مؤدب تھا مگر کسی بھی خوف سے عاری تھا۔

”تمہارے خلاف کئی شکایتیں آ رہی ہیں...... تم اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔ ہم چپ ہیں ورنہ تمہارے ہاتھ باندھنا مجھے خوب آتا ہے۔“

”تو پھر رُکے کیوں ہیں...... میرے ہاتھ بالکل صاف ہیں، کسی بات کا کوئی خوف نہیں ہاں البتہ آپ اپنی فکر کریں۔ سنا ہے کرسی سے بڑا پیار ہے آپ کو......“ وہ بھلا اپنے باپ سے نہیں ڈرا تھا اب کیا خاک ڈرتا۔

”تم عبدالباری پچھتاؤ گے...... سن لو...... ڈی آئی جی صاحب آج کل میں تمہارا فیصلہ کرنے والے ہیں......“ وہ غرایا تھا۔ وہ ہنس دیا۔

”ضرور، میں بھی منتظر ہوں ڈی آئی جی کس حد تک جا سکتے ہیں۔ خوش خبری سنا دیجئے انہیں بھی کرسی بڑی پیاری ہے، میں

بھی آج کل میں کچھ انوکھا کر دکھانے والا ہوں۔" اس نے بھی دھمکی دی تھی اور فون بند کر دیا تھا۔

اس نے دھمکی دی تھی۔ اکرم رحمٰن اور تیمور ثقلین نے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا اور جواباً وہ بھی خاموش رہا تھا۔ وہ ہوا کا رخ دیکھ رہا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص چکر میں تھے، وہ کسی کی پروا کئے بغیر اپنے کام کر رہا تھا۔ تیمور ثقلین اور اکرام رحمٰن بالکل خاموش تھے۔ اسے ان کی خاموشی بہت کھٹک رہی تھی مگر وہ بالکل پہل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ اس وقت گھر پر تھا، نہا کر نکلا تھا جب اس کے موبائل کی اسکرین چمکنے لگی تھی۔

"ہیلو......"

"بہت خطرناک کھیل شروع کیا ہے عبدالباری......! میں خاموش تھا صرف اس لئے کہ میں مصالحت چاہتا تھا اور تم نے......"

"ہرگز نہیں ڈی آئی جی صاحب، آپ خاموش نہیں تھے اندر ہی اندر مجھے ختم کرنے کی سازشیں کر رہے تھے۔ ہاں البتہ چپ ضرور تھے صرف اس لئے کہ تم اپنی کرسی بچانے کے چکر میں ہو۔ میرے پاس تمہارے متعلق جو ثبوت ہیں وہ اتنے ٹھوس اور جامع ہیں کہ تم لاکھ کوشش کر لو مگر اپنا بچاؤ نہیں کر پاؤ گے...... تیمور ثقلین اور تم جیسے دس اور بھی آ جائیں تو عبدالباری کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ میں یا میرا ایمان اتنا کمزور نہیں کہ تم جیسے لوگوں کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈر جاؤں...... اپنا بوریا بستر سمیٹ لو، آج سے تمہارے دن گنے جا چکے ہیں۔" اسے اچھی طرح سنا کر موبائل آف کر کے بڑبڑانے لگا تھا۔ رائیل کمرے میں آئی تو اس کا موڈ آف دیکھ کر حیران ہوئی۔

"خیر ہے جناب! یہ موڈ شریف اتنا برہم کیوں ہے جب کہ ابھی کچھ دیر پہلے آپ کو اچھے خاصے رومینٹک موڈ میں چھوڑ کر گئی تھی۔" چائے کا کپ اسے تھما کر اس نے چھیڑا تو وہ مسکرا اٹھا۔

"کچھ نہیں یار...... تم بھی بس نا......" وہ بستر پر بیٹھ کر چائے پینے لگا تھا۔

"باری! کیا بات ہے، پریشان ہیں......" چائے پیتے ہوئے بھی وہ الجھا ہوا تھا۔ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"ہوں...... نہیں...... ہاں ڈاکٹر کیا کہہ رہی تھیں۔" آج وہ ڈاکٹر سے چیک اپ کروا کر آئی تھی، اسی بابت وہ پوچھ رہا تھا۔

"اگلے ماہ کی چودہ یا پندرہ کی ڈیٹ دی ہے۔ ویسے تو ڈاکٹر مطمئن ہی ہے۔"

وہ سر ہلا گیا تھا، انداز اب بھی پرسوچ تھا۔

"کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں...... نہیں...... بس لگتا ہے تیمور ثقلین اور اکرام رحمٰن مل کر کوئی پروپیگنڈہ کر رہے ہیں میرے خلاف۔ ارقم کو ان کے پیچھے چھوڑا ہوا تو ہے میں نے مگر صورت حال واضح نہیں ہو رہی۔" وہ بتانے لگا تھا۔

"بہت غلط کھیل ہے یہ...... مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ آپ کچھ دن خاموش ہو جائیں...... دیکھیں تو سہی وہ کیا کرتا ہے پھر کوئی قدم اٹھائیں۔"

"تمہارا مطلب ہے...... پسپائی......" وہ تلخ ہوا۔

"نہیں...... میرا یہ مطلب نہیں۔ یہ حالات ابھی آپ کے لئے سازگار نہیں ہیں...... باد مخالف میں آپ کبھی بھی روشنی کا دیا نہیں جلا سکیں گے...... کچھ دن رک جائیں، انتظار کریں...... ہوا کا رخ دیکھیں اور پھر تیر چلائیں...... ورنہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا...... یہ ذاتی مخالفت نہیں ہے، وطن کی ساکھ کا سوال ہے جب کہ وہ ذاتی دشمنی پر اتر آیا ہے۔"

"اب تک تو میں ہوا کا رخ دیکھ رہا تھا مگر اب انتظار کرنا میرے بس میں نہیں...... اس کی بقا خطرے میں ہوگی۔ اب میں

ایک لمحے کا بھی انتظار نہیں کر سکتا...... یہ جان کیا ہے، اللہ کی دین ہے۔ کیا حرج ہے اگر اس کی راہ میں چلی جائے۔ تو رائیل جان! میں مر بھی گیا تو شہادت جیسا رتبہ ہوگا، جیتا تو غازی ہوں گا۔ یہ احساس ہوگا کہ یہ جان وطن کی امانت تھی اور وطن کے کام آ گئی جو مقصد دل میں لے کر چلا تھا اس کی خاطر اگر یہ بے کار سی جان بھی چلی جائے تو کوئی خوف نہیں...... یہ تو وطن کی مٹی کا قرض ہوگا اگر میرے خون کا آخری قطرہ بھی اس ملک کی مٹی میں جذب ہوگا تو سمجھوں گا میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ میں گنہگار تھا مگر اللہ نے دل میں ایک روشنی جلا دی تھی۔ آخری سانس تک لڑوں گا۔" وہ پرعزم تھا، آنکھوں میں ایمان کے ستارے چمک رہے تھے۔

"آمین......" رائیل کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں مگر ہونٹ کہہ رہے تھے۔

❊ ❊ ❊

عبدالباری نے آخرکار بلی تھیلے سے نکال ہی لی تھی۔ اکرام رحمٰن سے متعلق تمام ثبوت منظر عام پر لے آیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف اکرام رحمٰن خود مستعفی ہوا بلکہ ساتھ ہی تیمور ثقلین کا مستقبل بھی خطرے میں ڈال گیا۔ اس دفعہ بھی اس نے میڈیا کا سہارا لیا تھا اور یہی اس کا مثبت پوائنٹ تھا۔ کیمپوزر کا دور تھا، خوب کوریج کیا گیا کیس کو۔ عبدالباری کو توقع سے بڑھ کر کامیابی ملی تھی۔

"تیمور ثقلین! تم بھول گئے ہو تم ایک عام ہیڈ کانسٹیبل تھے اور میں تمہیں ایس پی کے عہدے پر لایا تھا اور اب تمہارا ماتحت میرے پرخچے اڑانے پر تلا ہوا ہے۔" اکرام رحمٰن نے تیمور ثقلین کے آفس فون کیا تھا، وہ خوب برہم ہو رہا تھا۔

"میں شرمندہ ہوں سر! یہ لڑکا اپنے ارادوں میں اٹل ہے۔ اس طرح چال چلتا ہے کہ سمجھ ہی نہیں آ رہی...... سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ میڈیا کو استعمال کر رہا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی ہے، وہ پیسوں وغیرہ کے لالچ میں آنے والا نہیں۔"

"تو پھر کیا دیکھ رہے ہو۔ بٹاؤ اس کو، اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ تمہاری گردن تک پہنچیں...... کوئی بھی طریقہ استعمال کرو، راستے سے ہٹاؤ، منظر سے غائب کرو...... اب میری زندگی کا سوال ہے۔" وہ کافی پریشان تھا۔

"سر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس طرح ہم پھنس بھی سکتے ہیں ہاں البتہ ایک اور طریقہ ہے جس سے نہ صرف یہ کیس ختم ہو سکتا ہے بلکہ آپ بحال بھی ہو جائیں گے اور یہ لڑکا بھی منظر سے ہٹ جائے گا۔" تیمور ثقلین کے شیطانی ذہن نے کہا۔

"وہ کیا...... جلدی بولو......" وہ بے تاب تھا جاننے کو۔

"آپ کچھ دن خاموش رہیں...... ریلیکس، میڈیا پرسکون ہو جائے، اس کیس کو اسی طرح رہنے دیں۔ آپ کے اتنے تعلقات ہیں انہیں استعمال کریں۔ ہر جگہ آج کل پیسہ استعمال ہو رہا ہے، سب عبدالباری جیسے نہیں ہیں۔ یہاں بہت سے لوگ پیسے سے خریدے جاتے ہیں، ان کو مجبور کریں کہ وہ اس کا ٹرانسفر کر دیں۔ آج کل اگست کے مہینے کے سلسلے میں مختلف پروگرام ترتیب دیئے جا رہے ہیں۔ رضاکارانہ طور پر بہت سے لوگوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں، اگست کا مہینہ آنے والا ہے اور یوم پاکستان کے سلسلے میں ملک بھر میں جہاں بے شمار تقریبات منعقد ہوتی ہیں وہی تخریبی کارروائیاں بھی کی جاتی ہیں۔ خاص طور پر کراچی اور لاہور میں۔ بھجوا دیں اسے وہاں، لاہور یا کراچی۔ اس کے اندر وطن کی بڑی محبت ہے، کروا دیں ٹرانسفر ادھر کوئی گولی اسے بھی لگ سکتی ہے۔ اگر نہ بھی لگی تو بھی کیا، یہاں کوئی اور آ جائے گا پھر آپ افسران بالا سے کہہ سن کر کیس کلیئر بلکہ ختم کرا لیجئے گا۔ اس طرح آپ بحال بھی ہو جائیں گے اور ہمارے اوپر کوئی اعتراض بھی نہیں آئے گا۔ جہاں تک میڈیا کی بات ہے تو یہاں بے شمار ایسے کیس ہوتے رہتے ہیں، کون پوچھتا ہے۔ آج مرے کل دوسرے دن والی بات ہے۔ کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوگی۔ بس جلد از جلد اس کے ٹرانسفر کے آرڈر جاری کروا دیں۔ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں اس طرح مجھ پر شک ہو سکتا ہے، بس یہی شو کر دیں کہ اوپر سے آرڈر آئے ہیں۔"

تیمور ثقلین کے سازشی ذہن نے ایک نیا منصوبہ ترتیب دیا تھا۔

"واہ یار تم تو بڑے کام کی چیز نکلے..... پہلے کہاں تھا یہ مشورہ..... جلد ہی کچھ کرواتا ہوں، چند دنوں میں ہی.....'' اکرام رحمٰن خوش ہو کر کہہ رہا تھا۔

وہ قہقہے لگا رہا تھا، اس کے مکروہ قہقہوں کا ساتھ تیمور ثقلین نے بھی دیا تھا۔

* * *

ادھر ابھی اگست کا مہینہ بھی شروع نہیں ہوا تھا اور سب کچھ یوں آناً فاناً ہوا تھا کہ عبدالباری حیران تھا۔ اس کے لاہور ٹرانسفر کے آرڈر آ گئے تھے۔ وہ سمجھ تو گیا تھا کہ کن لوگوں کی سازش ہے مگر اسے کام کرنا تھا، یہاں نہیں تو لاہور جا کر۔ یہاں جب تک وہ رہا تھا پوری ایمان داری سے اپنا کام سرانجام دینے کی کوشش کی تھی اور اب اسے لاہور چلے جانا تھا۔ اکرام رحمٰن کا کیس چل رہا تھا، ثبوت تو ٹھوس اور جامد تھے امید تھی کہ وہ بچ نہیں پائے گا سو وہ مطمئن تھا۔

وہ لاہور جانے کی تیاری کر رہا تھا، رائنل اس کا سامان تیار کر رہی تھی۔ آج کل اس کی حالت ایسی تھی کہ اسے ہر لمحہ اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی اگر فرض کی ادائیگی کا احساس نہ ہوتا تو وہ رک جاتا۔

"دیکھ لیں کوئی چیز رہ تو نہیں گئی، چیک کر لیں.....'' بیگ تیار کر کے اس نے کہا تھا۔ عبدالباری اسے دیکھنے لگا۔ یہاں سے جانے کو دل نہیں مان رہا تھا۔ ایک بے نام سی اداسی نے دل کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا رائنل..... اکرام رحمٰن جو میری جان کے درپے تھا وہ اتنی جلدی کیسے ہار مان گیا۔ یہ بھی اس کی سازش ہے..... مجھے راستے سے ہٹانے کا ایک طریقہ ہے۔'' وہ رائنل سے کہہ رہا تھا، وہ مسکرا دی۔

"ہو سکتا ہے یہ سازش نہ ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے نیکی کی جیت ہوئی ہو۔ وہ شخص معطل ہو چکا ہے۔ اس کا کیس چل رہا ہے۔ اللہ نے چاہا تو بہتر فیصلہ ہو گا۔ نیکی اور راستی کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔ یہ لوگ پرایمان پختہ کر لیں، آخر کب تک یہ لوگ جیتتے رہیں گے۔ نعوذ باللہ حق اور سچ غلط چیزیں تو نہیں، جب اللہ کے نزدیک ان کا بلند مقام ہے تو وہ زمین میں بھی ان کی حکمرانی پسند کرے گا۔ وہ کبھی بھی اپنے بندوں کے لئے غلط نہیں کرتا۔ بس کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے شاید آپ کی ضرورت یہاں سے زیادہ لاہور میں ہو گی، یہ بات دل کو سمجھا لیں..... بس۔'' وہ پھر اس کی روشنی بنی اس کو سمجھا رہی تھی۔ وہ ہنس دیا۔

"تم..... رائنل..... میرا حوصلہ ہو..... میری راہ کی روشنی ہو..... میں کوشش کروں گا جلدی ملنے آؤں..... تم پریشان نہ ہونا اور ان دنوں تو بالکل نہیں.....'' وہ ایک دم سب چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس کے وجود کو بازوؤں میں بھر لیا تھا، وہ خوامخواہ چہرہ جھکا گئی۔ نہ جانے کیوں دل کی کیفیت بھی عجب ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ اسے کہیں بھی نہ جانے دے۔ آنسو بہنے کو بے تاب تھے۔ وہ بمشکل خود پر کنٹرول کر رہی تھی۔

"رائنل! تم رو رہی ہو.....'' اس کا چہرہ اپنے ہاتھ سے اوپر کرتے وہ پوچھ رہا تھا۔ وہ خود پر ضبط نہ کر سکی تھی۔ اس کے سینے پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تم تو یوں رو رہی ہو جیسے میں ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں..... کم آن جان باری، یار چند دنوں میں، میں لوٹ آؤں گا۔'' اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دے رہا تھا۔ وہ چہرہ اٹھا کر اسے شاکی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ہٹیں پیچھے، آپ کو تو تسلی دینا بھی نہیں آتی۔'' وہ ایک دم خفا ہو گئی تھی۔ وہ قہقہہ بار ہوا تھا۔ پورا کمرہ گونج اٹھا تھا۔

"میری جان! جس جگہ میں جا رہا ہوں وہاں تمہارے بیوہ ہونے کے سو فیصد امکان ہیں۔'' وہ اس کے ساتھ مذاقاً اپنے دل کو بھی بہلا رہا تھا۔ رائنل نے کھینچ کے ہاتھ اس کے سینے پر مار دیا۔ اپنے کندھوں سے اس کے ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ بستر سے کشن اٹھا کر دے مارا۔ وہ مزید ہنسنے لگا تھا۔

"میرے ساتھ ایسی باتیں مت کیا کریں..... زہر لگتے ہیں آپ..... میں کیوں بیوہ ہوں، آپ ہو جائیں.....'' وہ پھر رونے لگی تھی۔ اس کی اس بات پر وہ پہلے سے زیادہ کھلکھلا کر ہنسا تھا۔

"یعنی بیوہ.....'' اس نے جملہ پکڑا تھا۔

"باری.....'' وہ زچ ہو گئی۔

"او میری جان! اتنے اہم موقع کو یوں لڑ جھگڑ کر آنسو بہا کر ضائع مت کرو..... زادِ راہ اکٹھا کرنے دو، تنہائی میں کام آئے گا۔'' اس نے اسے پھر بازوؤں میں بھر لیا تھا پھر لہجہ خود بخود آزردہ سا ہو گیا۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا رائی! جانے کو..... کوئی ایسا منتر پھونکو کہ یہ گھڑی یہیں ختم جائے..... وقت کی گردش رک جائے..... پلیز رائنل.....'' وہ سرگوشی کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ عبدالباری کا سینہ اس کے آنسوؤں سے بھیگنے لگا تھا، اس کے مضبوط بازوؤں کی حدت پر جوش لمس، بے قراریاں و بے تابیاں اس کے اندر کا احوال سنا رہی تھیں۔ وہ اس کی قربت میں مزید نکھرتی گئی۔

پھر وہ چلا گیا تھا، ہزار ہا وعدے کر کے اور بہلاوے دے کر۔ وہ خالی رہ گئی۔ ایک ایک لمحہ کاٹنا مشکل ہونے لگا۔ ان دنوں وہ جس کیفیت سے گزر رہی تھی اس میں اسے کسی ساتھی، کسی اپنے، مونس و غم خوار کی اشد ضرورت تھی۔ کچھ دن باقی رہ گئے تھے پھر اس کے پاس بھی عبدالباری کا ایک انمول تحفہ تھا۔ اس کے بغیر یہ باقی ماندہ دن گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ نہ جانے کس حال میں تھا وہ۔ فون تو روز کرتا تھا سب خیریت ہے کہہ کر بھرپور تسلی بھی دیتا تھا، اپنا خیال رکھنے کی خاص تاکید بھی کرتا تھا۔ اور وہ تھی کہ اس کے بغیر یہاں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ رات کا آخری پہر اس کے لئے کاٹنا مشکل ہو جاتا تھا۔ کمرے میں اس کی سرگوشیاں گونجتیں تو دل بے قرار اور تڑپ اٹھتا۔ آنکھوں کی جھڑی لگتی تو پھر رکتی ہی نہ تھی۔ یہ محبت تھی، بیوی کے جذبات تھے یا نہ جانے کیا تھا، بس اب دن بہ دن اس کا حوصلہ کم پڑتا جا رہا تھا۔

اس کی کنڈیشن کے پیش نظر امی اس کے پاس ہی سوتی تھیں۔ اس رات آخری پہر کوئی بھی نہیں سویا تھا۔ کل چودہ اگست کا دن تھا، ساری رات ٹیلی ویژن پر پروگرام آتے رہے تھے۔ سب ہی جاگ رہے تھے صرف وہی اپنے کمرے میں تھی۔ امی اس کے پاس ہی تھیں، ابھی ان کی آنکھ لگی تھی۔ رائنل کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ باری کو یاد کرتے کرتے اس کی طبیعت ایک دم خراب ہو گئی تھی۔ امی نو وارد بھی تھیں۔ فرقان بھائی اور بابا جاگ رہے تھے، پھوپو انہیں پہلے ہی آگاہ کر چکی تھیں فوراً اسے اسپتال لے جایا گیا تھا۔ ان لمحوں میں اسے صرف اور صرف عبدالباری کا خیال آ رہا تھا اور رہ رہ کر۔ کتنا شوق تھا اسے اپنے نومولود کو دیکھنے کا اور اب وہ کتنا دور تھا، میلوں کے فاصلے پر تھا۔ اسلام آباد سے لاہور تک فاصلہ کم بھی نہیں تھا۔

جنت ایک دم جیسے اس کے قدموں تلے آ گئی تھی۔ ایک خوب صورت، صحت مند بچے کو اس نے جنم دیا تھا۔ عبدالباری کا وارث اس دنیا میں آ چکا تھا۔ فجر کے قریب کا وقت تھا، چودہ اگست کی روشن تاریخ تھی اور عبدالباری خود قطعی بے خبر تھا۔ نہ جانے وہ کہاں تھا؟ کل سارا دن بھی اس نے کوئی فون نہیں کیا تھا۔

بچہ بہت پیارا تھا۔ بنا بنایا چھوٹا عبدالباری تھا۔ وہ کئی ثانیے یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ ہر تکلیف، ہر احساس جیسے بھول گئی۔ ماں بننے کی خوشی ہی ایسی انمول تھی۔ نہ جانے کب آنکھ کھلی تھی، کمرے میں سب ہی تھے۔ وہ دیکھنے لگی۔

"ماشاءاللہ بہت پیارا ہے ہمارا بیٹا.....'' امی کہہ رہی تھیں۔ وہ مسکرا دی۔

"بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔ وہی ناک، وہی نقشہ، صرف آنکھیں موٹی موٹی ماں پر ہیں۔'' بھابی ریمارکس دے رہی

تھیں۔ بہت محبت تھی ان کے لہجے میں۔

"بیٹا جو ہوا عبدالباری کا وہ اسی پر جاتا ہے۔" بابا نے بھی مسکرا کر کہا۔

"عبدالباری کو اطلاع دے دی......" اسے جیسے ایک دم یاد آیا تھا۔

"نہیں...... ایک دفعہ اس کے سیل پر کوشش کی تھی مگر شاید سیل آف ہے۔" فرقان بھیا نے بتایا تو وہ کچھ مایوس سی ہوگئی۔ باقی کا سارا دن اسی طرح گزر گیا۔ کیس بظاہر نارمل تھا مگر وہ بہت کمزور ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر نے دو دن اسپتال ایڈمٹ رہنے کی ہدایت کی تھی۔

رات کو امی سوگئی تھیں، باقی سب گھر چلے گئے تھے۔ اس نے سرہانے رکھا موبائل اٹھالیا جو بھابی دے گئی تھیں۔ کتنی دیر تک نمبر ملاتی رہی پھر ایک کوشش آخرکار کامیاب ہو ہی گئی۔

"باری...... باری...... کہاں تھے...... سیل کیوں آف کیا ہوا تھا؟" وہ اس کی آواز سن کر رو دینے کو تھی۔ بغیر سلام دعا کے ایک دم مخاطب تھی۔

"تم...... رائبل...... خیریت ہے رات کے اس وقت......؟"

"آپ تو یہاں سے جا کر جیسے سب کچھ بھول گئے ہیں...... اتنا بھی یاد نہیں رہا کہ آج کیا تاریخ ہے اور ڈاکٹر نے کیا ڈیٹ دی تھی......" اب اس کے آنسو باقاعدہ بہنے لگے تھے۔ دوسری طرف وہ سچ مچ چونکا۔

"اوہ نو...... سوری...... میری جان...... آئم سو سوری...... آج کل میں، میں بہت مصروف رہا ہوں...... ایک لمحے کی بھی فرصت نہ تھی۔ یوم آزادی ہے آج اور میں بھول گیا کہ ایک اور اہم واقعہ بھی اس ڈیٹ کو میری زندگی میں رونما ہونے والا ہے...... رئیلی سوری...... بتاؤ سب خیریت ہے نا......؟" وہ جاننے کے لیے بے تاب ہوا۔

"آپ کا وارث گزشتہ آخر رات کو چودہ اگست کی تاریخ میں اس دنیا میں آچکا ہے۔" وہ عجوب سے انداز میں اسے یہ خوش خبری سنا گئی تھی۔ اس وقت یوں حالت ہو رہی تھی جیسے وہ سامنے ہو۔

"او رئیلی...... رائبل...... تم سچ کہہ رہی ہو...... میرا بیٹا پیدا ہوا ہے......" دوسری طرف سے وہ خوشی سے پاگل ہونے کو تھا۔

"ہوں......"

"او رائبل...... تھینک یو اللہ میاں......" خوشی سے مخمور آواز تھی۔ "کیسا ہے وہ......؟" لہجے میں دنیا بھر کا اشتیاق تھا۔

"میں کیا جانوں...... آکر دیکھ لیں نا......" رائبل کا موڈ ایک دم شگفتہ ہوا تھا، دوسری طرف پڑنے والا قہقہہ اسے بھی گلنار کر گیا تھا۔

"اب تو ایک لمحہ بھی نہیں لگاؤں گا...... ہوا کے دوش پر اڑتا آؤں گا۔"

"صرف بیٹے کو دیکھنے......"

"نہیں، بیٹے کی والدہ ماجدہ کو بھی...... پیار کرنے آؤں گا، آج کے دن کی اتنی انمول خوشی اسی کے توسط سے تو مجھے ملی ہے۔" وہ کتنا خوش تھا۔ وہ مارِ حیا کے کئی لمحے بول بھی نہ سکی۔

"رائبل" اس نے پکارا۔

"ہوں......"

"تم ٹھیک ہو نا......؟" وہ بہت توجہ لیے پوچھ رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

"ہوں...... کب آرہے ہیں آپ؟" کچھ ہمت کی تھی۔

"کیا تم میرے آنے کا عملی ثبوت دو گی...... بتاؤ رائبل جانم......" وہ ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ پزل ہوگئی اس کھلے ڈلے انداز پر۔

"آپ بہت......"

"بدنیت ہوں......" اس کا جملہ باری نے اچک لیا تھا۔ وہ کھل کر مسکرائی۔

"وہ تو ہیں......"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آکر بتاؤں گا...... دل تو چاہ رہا ہے کہ ابھی آجاؤں، بہت اہم ڈیوٹی پر ہوں...... صرف انتظار کرو۔ بس تین دن...... بس پھر آجاؤں گا۔" وہ سنجیدہ ہوگیا تھا۔

"اور ہاں رائبل اس وقت بہت بزی ہوں، فی الحال اجازت چاہوں گا۔ تم میرے بیٹے کو میری طرف سے بھرپور پیار کرنا۔" وہ ایک دم بہت ہی زیادہ عجلت میں لگ رہا تھا۔

"اور بیٹے کی ماں کو......" رائبل کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ فون بند کرے۔

"بیٹے کی ماں کو ہم خود آکر بنفس نفیس ہینڈل کرلیں گے...... بس بیٹے کی والدہ ماجدہ تھوڑا سا انتظار کرلے......"

عبدالباری نے فون بند کردیا تھا، وہ اس سے بات کرلینے کے خیال سے ہی سرشار ہوگئی تھی۔

دو دن بعد وہ گھر شفٹ ہوگئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ عبدالباری ضرور آجائے گا مگر اگلا دن بھی گزر گیا اور وہ نہ آیا۔ وہ انجانے خدشوں میں الجھتی پریشان ہوگئی...... حتیٰ کہ اس سے اگلے دن اس کی کال آگئی۔

"آپ بہت جھوٹے اور دغاباز ہیں آنے کا وعدہ کیا اور نہ آئے۔" وہ کوسوں دور تھا سامنے ہوتا تو نہ جانے کیا حشر کر ڈالتی۔ اب صرف غصے کا اظہار ہی کر پائی تھی۔

"کیسا ہے ہمارا بیٹا......؟" بہت محبت سے پوچھا گیا تھا۔ وہ پھٹ پڑی۔

"مجھے نہیں پتہ...... اتنی پروا ہے بیٹے کی تو آکر دیکھ لیں۔"

"لگتا ہے بہت ناراض ہو میری جان۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"تو اور کیا نہ ہوں...... آپ کو کیا علم کتنی تکلیف سہی ہے میں نے۔ ایک ایک لمحہ آپ کو کتنا یاد کیا ہے میں نے...... اگر مجھے کچھ ہوجاتا تو پھر کیا کرتے آپ......" وہ رو پڑی تھی بالکل بچوں کی طرح۔ عبدالباری کی دوری نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ وہ حیران تھا۔

"رائبل...... جان عزیز...... کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟ میں تو بہت باحوصلہ اور سمجھدار سمجھتا تھا تمہیں...... اتنی کم حوصلہ تو کبھی نہیں رہیں تم......" دوسری طرف وہ اس کی کیفیت کے خیال سے حیران و پریشان ہو رہا تھا۔

"نہیں باری! یہ خول تھا بہادری اور حوصلہ مندی کا...... آپ نزدیک تھے تو سب کچھ تھا۔ آپ کی دوری نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا ہے۔" وہ رو رہی تھی پوری شدت سے۔ پہلی دفعہ وہ یوں خود سپردگی کا زبان سے اقرار کر رہی تھی وہ بھی یوں کھل کر...... ورنہ تو عبدالباری کو حسرت ہی رہی تھی کہ وہ بھی کچھ کہہ تو لے۔ کس کس انداز میں اسے نہیں چڑاتا تھا اور اب یہ اقرار...... عبدالباری کا دل خوش کن انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

"کیا بھلا......؟"

"میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی...... مجھے اپنے پاس بلالیں یا پھر خود آجائیں ورنہ یہ انتظار مجھے مار دے گا۔" وہ اب بغیر کسی کوما یا فل اسٹاپ کے رو رہی تھی۔ وہ اس اظہار پر سرشار ہوگیا تھا مگر اس کے یوں اس قدر شدت سے رونے پر پریشان بھی ہوا

تھا۔

"میں آ رہا ہوں رابیل! صبح تک پہنچ جاؤں گا...... بس ایک آخری مرحلہ رہ گیا ہے...... بس دعا کرنا کامیاب ہو جاؤں...... ورنہ......" نہ جانے کیا تھا عبدالباری کے لہجے میں، وہ روتے ہوئے چونک گئی۔

"باری! کیا بات ہے...... کوئی مسئلہ ہے......؟" آنسو ایک دم صاف کئے تھے۔ دوسری طرف اسے کون سے حالات درپیش تھے وہ قطعی نابلد تھی۔ جب سے باری یہاں سے گیا تھا اس نے اس سے کچھ بھی ڈسکس نہیں کیا تھا۔ "سب ٹھیک ہے" کہہ کر ہمیشہ ٹال جاتا تھا۔

"کچھ نہیں رابیل جان! بس فیض یاد آ رہے ہیں۔"

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی کوئی بات نہیں
میدان وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں
گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں"

وہ اس کے لہجے کی پھوار میں بھیگتی گئی۔

"باری...... "رابیل کے ہونٹ ہم آواز ہو کر پھر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

"کچھ مت کہنا میری جان! بہت کچھ کہنا ہے۔ بہت کچھ سننا ہے۔ سب آمنے سامنے کہیں گے۔" وہ گمبھیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "تم پر بلیک کلر بہت سوٹ کرتا ہے۔ وہ کل پہن رکھنا۔ میں جب آؤں تو تم مجھے اسی رنگ میں ملو۔ میرے بیٹے کو بھرپور پیار کرنا اور اپنا ہمیشہ خیال رکھنا...... زندگی نے اگر مہلت دی تو اگلی صبح تم سے ان شاء اللہ آ ملوں گا۔" عبدالباری کا لہجہ شاید ٹوٹ رہا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ وہ رو پڑی۔

"باری! آپ کا بیٹا بالکل آپ پر گیا ہے، بنا بنایا عبدالباری ہے۔ صرف آنکھیں مجھ پر ہیں۔" نہ جانے کس احساس سے کہ وہ اسے بتا رہی تھی۔ لہجے میں حسرتیں تھیں۔

"میرا بیٹا جو ہوا......" انداز اب سرگوشیانہ تھا۔ "وہ ایک امید کی کرن ہے ہمارے لئے۔ ایک روشن امید، تجدید عہد کے دن پیدا ہوا ہے وہ میرے لئے، اندھیری راہوں میں ایک کرن، ایک روشنی، ایک عزم لے کر آیا ہے۔ میں لوٹا تو اس کا نام ایمان رکھوں گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ چودہ اگست کا انمول تحفہ ہے میرے لئے۔"

فون بند ہو چکا تھا، وہ کتنی دیر تک ساکن سی بیٹھی رہ گئی۔ نہ جانے کون کون سی تشنگیاں تھیں جو عبدالباری کے لہجے میں بول رہی تھیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ سب کو ہی علم ہو گیا تھا کہ عبدالباری آ رہا ہے۔ سب ہی بہت پرجوش تھے اور وہ خود بھی کہ اگلی صبح ہی صبح لباس فاخرہ بدل کر بچے کے بھی کپڑے بدل کر اس کی منتظر تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کا دل بیٹھتا جا رہا تھا حتیٰ کہ صبح سے دوپہر کا وقت آ گیا۔ کتنی دفعہ وہ اس کے سیل پر ٹرائی کر چکی تھی مگر وہ آف تھا۔ بیل ہی نہیں جاتی تھی۔ اس کا دل ان جانے خوف کے حصار میں سمٹنے لگا۔

بچے کو فیڈ کر کے وہ باہر آئی تھی۔ لاؤنج میں رکھے فون کی بیل بجی تھی۔ اس نے فوراً آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا تھا۔ باقی سب بھی وہیں تھے، سب متوجہ ہوئے۔

"ہیلو...... جی کون...... اچھا مسز عبدالباری؟ جی ایک اطلاع ہے آپ کے لئے لاہور سے۔ میں ان کا خاص ساتھی ارقم بول رہا ہوں۔"

"کیسی اطلاع......؟" اس کا دل اچھل کر حلق میں آ اٹکا گویا ناخنوں سے جان نکل گئی۔ اس خیال سے کہ وہ خود کلام کیوں نہیں کر رہا جب کہ اس وقت اسے یہاں اس گھر میں ہونا چاہئے تھا اور اب یہ فون......؟

"میرے اللہ...... میرے حافظ......! مجھ پر میری برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالنا......" رابیل کا رواں رواں عرش الٰہی کی طرف گڑگڑا رہا تھا۔

"ایس پی عبدالباری صاحب جب سے یہاں لاہور آئے ہوئے تھے کچھ نادیدہ ہاتھ ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے، ہر موقع پر وہ بال بال بچ جاتے تھے پھر انہوں نے سراغ بھی لگا لیا کہ یہ نادیدہ ہاتھ کن لوگوں کے ہیں۔ وہ جرم کی دنیا میں اچھے نام سے نہیں لئے جاتے تھے۔ وطن کے محافظ جب اس کے دشمن بن جائیں تو پھر ان کے سینوں میں دل کی جگہ پتھر ہوتے ہیں۔ غاصب دو چار چہروں کے مالک بے ضمیر لوگ ہوتے ہیں۔ عبدالباری صاحب جو ایک خاص مقصد کے لئے لڑنے کو اس میدان میں اترے تھے وہ اب کیسے ان لوگوں کو جانے دیتے۔ اس ملک کی مٹی کا فرض ادا کرنا چاہتے تھے اپنے خون کا نذرانہ دے کر اس ملک کو شر انگیزوں سے پاک و صاف کر کے۔ دن رات کی پروا کئے بغیر وہ صرف ان لوگوں کو کاٹ رہنا چاہتے تھے جو ملک کے ناسور تھے اور اندر ہی اندر وطن کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے۔ اس کام کے لئے انہوں نے مجھے بطور خاص اسلام آباد سے لاہور بلوایا تھا۔ کچھ غیر ملکی بندے تھے جو ان وطن کے اہم راز اور ویڈیو کیسٹس وغیرہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے اپنے ضمیر فروش بے غیرت حکام اعلیٰ ان کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ چودہ اگست والے دن جب وہ بادشاہی مسجد میں علامہ اقبال کے مزار پر سلامی پیش کرنے افسران کے ساتھ تھے تو اس کے بعد بھی ان پر ایک حملہ ہوا تھا۔ وہ بال بال بچے تھے، اللہ رب العزت کو شاید ابھی ان کو بچانا منظور تھا۔ وہ تو بچ گئے مگر دشمنوں کا مقصد ان کا اپنے راستے سے ہٹانا تھا۔ وہ ایک عرصے سے ان کی ہٹ لسٹ پر تھے۔ گزشتہ رات بھی عبدالباری صاحب نے کچھ نفری کے ساتھ ان تخریب کاروں، غدار وطن، ضمیر فروشوں پر حملہ کر دیا تھا۔ ان کے تمام ساتھی ان کو عین وقت پر دغا دے گئے تھے۔ وہ سب وطن کے دشمنوں کے ہاتھوں بک گئے تھے۔ آخری دم تک عبدالباری صاحب نے ڈٹ کر بڑی جواں مردی، ہمت، حوصلے، عزم و طاقت سے ان سفاک درندوں کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ اہم راز اور کیسٹس وغیرہ حاصل کر لی تھیں مگر پھر وہ دشمنوں کی کثیر نفری کے آگے تنہا کچھ بھی نہ کر سکے۔ مجھے انہوں نے وہ تمام ضروری راز اور چیزیں دے کر بھگا دیا تھا۔ میں آخری دم میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا مگر اس ملک کی بقاء و سلامتی کے لئے مجبور ہو گیا۔ میں ان کی حفاظت نہ کر سکا۔ وہ مجھے بھی بہت عزیز تھے۔ دشمنوں نے ان کو گولیوں کی بوچھاڑ سے چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔ انہوں نے وطن کی زمین پر آخری سانس تک جنگ لڑی تھی حتیٰ کہ خون پانی کی طرح بہنے لگا تھا۔ بہت افسوس سے کہتا ہوں کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ آپ حوصلہ کیجئے گا، آخری دم تک وہ آپ کو یاد کرتے رہے تھے۔"

فون کی لائن بے جان ہو چکی تھی۔ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

"عبدالباری...... بابا...... امی...... بابا......"

اس کے اندر سے کراہیں اٹھنے لگی تھیں۔ بدن سے شعلے سے بلند ہونے لگے تھے۔ جان جسم سے نکلتی جا رہی تھی...... بین تھے...... سسکیاں تھیں...... کراہیں تھیں...... ایک حشر سا برپا ہو گیا تھا پورے وجود میں......

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا
وہ شان سلامت رہتی ہے

چاروں طرف سے صرف ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

وہ عاشق تھا وطن کا، اسے عشق تھا وطن کی مٹی سے۔ وہ اپنا کہا پورا کر گیا تھا۔ وطن کی آن، بان، بقاء سلامتی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کہرام برپا ہو گیا ہو۔ اگلے ہی دن عبدالباری کی لاش آ گئی تھی جس نے سنا تڑپ اٹھا۔ اس کا وجود پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا۔ دشمنوں نے اس پر بری طرح اپنے شوق پورے کئے تھے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر دل تڑپ رہا تھا۔ ہر کوئی غم سے نڈھال تھا۔

کتنے ہی دن اوپر تلے گزرتے چلے گئے۔ پرسہ دینے والوں کی قطاریں سی لگ گئیں اور ان میں وہ چہرے تیمور ثقلین اور اکرام رحمٰن کے تھے جو اپنے عہدے پر بحال ہو چکا تھا جو عبدالباری کی موت کا اصل سبب تھا۔

"وہ بہت نڈر، بے باک اور جواں مرد تھا۔ ہر آگ میں بے خوف و خطر کود پڑتا تھا۔ اس کے ارادے بہت بلند تھے۔ کوئی ڈھا نہیں سکتا تھا اس کے ارادوں کو۔ تخریب کاروں اور غداروں کے لئے اس کے دل میں ایک نفرت سی تھی وطن کے لئے اس کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔" تیمور ثقلین بابا کو کہہ رہے تھے۔ وہ سرد آہ بھر کر رہ گئے تھے۔ ان کا بیٹا مر گیا تھا وہ کس سے شکوہ کرتے۔ پردے کے پیچھے کھڑی رانیل سن رہی تھی۔

"وہ جرأت و حوصلے میں بے مثال تھا۔ وطن کے دشمنوں کو ختم کرنے کا اٹل ارادہ رکھتا تھا۔ وہ نہیں رہا مگر اس کے عہد کو ہم آگے ضرور بڑھائیں گے۔ ہمارے درمیان صرف ایک غلط فہمی تھی۔ ثبوت جھوٹے تھے سو میں دوبارہ بحال ہو گیا ہوں مگر میرے دل میں اس کے لئے ابھی بھی بہت مقام ہے۔ اللہ اسے جنت میں جگہ عطا فرمائے۔ اس ملک میں اس جیسے کئی عبدالباری ہیں مگر وہ اپنی مثال آپ تھا۔ ابھی بھی بہت سے ایسے ہیں جو دل و جان ہتھیلی پر رکھے وطن کی آن، بان اور شان کے لئے لڑ رہے ہیں۔ وہ شہید وطن ہے، حکام اعلیٰ اور افسران سے گزارش کروں گا کہ اسے خصوصی اعزازات اور ستارۂ جرأت و امتیاز سے نوازیں۔ وہ اس لائق تھا۔ اللہ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔"

رحمٰن اکرام اپنی مکروہ زبان سے سب کچھ کہہ رہا تھا۔ رانیل کا جی چاہ رہا تھا کہ ان کو ان کے مکروہ چہروں سمیت اس دنیا سے ہی رخصت کر دے۔

وہ کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ عبدالباری کو گئے کتنے دن ہو گئے تھے مگر وہ ابھی تک اسی سیاہ ماتمی لباس میں تھی جو عبدالباری کو بہت پسند تھا۔ آخری خواہش یہی تو کی تھی اس نے اور ہمیشہ کے لئے یہی لباس اس کا مقصد پورا کر گیا تھا۔

عبدالباری کا بیٹا بے خبر سو رہا تھا۔ اس معصوم کو تو یہ علم بھی نہیں تھا کہ اس پر کتنی بڑی قیامت ٹوٹ چکی ہے۔ بدنصیب کو باپ کے ہاتھ کا لمس بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔

جھک کر اس کی پیشانی چوم لی جو عبدالباری کے لئے ایمان تھا۔ تجدید عہد کے دن پیدا ہونے والا اللہ تعالیٰ کا انمول تحفہ تھا۔ عبدالباری کی قربت کے حسین لمحات کی واحد نشانی تھا۔ ابھی وہ عبدالباری کی تصویر لے کر بستر پر بیٹھی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ امی اور بابا اندر آ گئے تھے۔

"عبدالباری کا ساتھی آیا تھا۔ ارقم جو آخر وقت میں اس کے ساتھ تھا، وہ یہ چند چیزیں دے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ باری کی خاص تاکید تھی کہ تمہیں دے دی جائیں۔" چمڑے کا مضبوط بیگ تھا اس نے تھام لیا۔

"حوصلہ رکھو...... اب ہمیں اس کے بغیر ہی جینا ہے...... وہ اتنی ہی عمر لکھوا کر آیا تھا۔" اس کے سر پر دست شفقت رکھ کر بابا پرنم لہجے میں کہتے ہوئے باہر نکل گئے تھے پھر امی بھی آنکھیں صاف کرتے ہوئے باہر چلی گئیں۔ اس نے بیگ کھولا تھا۔ چند کیسٹیں، ویڈیو، کچھ اور کاغذات تھے۔ کچھ نقشے تھے پھر ایک لفافہ تھا جس کے اوپر لکھا ہوا تھا۔

"میری رانیل کے لئے......" وہ کٹ سی گئی۔

اس نے لفافہ کھول لیا۔ عبدالباری کی پہلی اور آخری تحریر اس کے سامنے تھی۔ اس کے نام پر......

"جانِ عبدالباری!

ہو سکتا ہے جب یہ خط تمہیں ملے میں تم لوگوں میں نہ ہوں...... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس خط کے بجائے میں خود آ جاؤں۔ بہرحال امید پر دنیا قائم ہے۔ اب تو ہمارا تعلق پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔ تم سے فون پر بات کرنے کے بعد خط لکھ رہا ہوں، وقت کا کچھ بھروسہ نہیں اگر خود نہ آ سکا تو یہ خط تو ہوگا نہ۔ اب تو ایک ہی خواہش ہے اپنے بیٹے اپنے نور چشم کو دیکھنے کی۔ اولاد کی محبت انسان کو کتنا حریص بنا دیتی ہے، کچھ سوچا بھی نہ تھا۔ میرے اور تمہارے رشتے کا حسین تحفہ، میرے اور تمہارے خوب صورت لمحات کا اللہ کی طرف سے عطا کیا گیا بہترین ہدیہ...... ہمارا بیٹا...... ہمارا ایمان...... رانیل جان! بہت عرصہ پہلے ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر ہمارا بیٹا پیدا ہوا تو اس کا نام ایمان رکھوں گا اور اگر بیٹی پیدا ہوئی تو اس کا نام امید رکھوں گا۔ یہ ایمان اور امید ہی میرے حوصلے اور میری راہوں کی تاریکیوں کو دور کرنے کا سبب بنے ہیں۔ تمہارا وجود میری کرن ہے۔ تمہارے کردار کی پاکیزگی میری روشنی ہے۔ میرے جذبات کی صحیح راہ متعین کرنے کا سبب بنی ہو تم...... اگر اللہ نے میرا سینہ ایمان کی روشنی سے بھر دیا تھا تو بہت حد تک یہ روشنی تم سے مستعار لی ہے میں نے۔ تمہاری باتیں، تمہارا حوصلہ اور کردار کی پختگی دیکھ کر میں دنگ رہ گیا ہوں۔ کیا کچھ نہیں کیا میں نے تمہارے ساتھ اور تم کسی موڑ پر نہیں ڈگمگائیں۔ میں نے جو زد روبیہ...... [illegible] وہ جائز کی پروا نہیں کی تو صرف اس لئے کہ میں واقعی تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا کسی بھی قیمت پر نہیں اور تم اتنی کم عقل تھیں کہ میرے جذبات کو سمجھنے کے بجائے میری زبان کے اقرار کو "ضد" مان کر مجھے ہمیشہ غلط سمجھتی رہی تھیں۔ تم ایمان کی دیوی تھیں، میرا عشق، میرا امروز، میرا یقین، سب کچھ تھیں۔

رانیل! جب سے میں یہاں آیا ہوں بہت کچھ تم سے چھپانے لگا ہوں۔ مقصد صرف یہی تھا کہ تم ہر طرح کی ٹینشن سے دور رہو۔ اسلام آباد میں تو پھر کچھ امن باقی ہے، پاکستان کا دارالحکومت ہونے کی بنا پر تھوڑا بہت سکون قائم ہے اس میں مگر جب سے یہاں آیا ہوں حیران ہوں۔ تیمور ثقلین اور اکرام رحمٰن جو اس وطن کے ناسور ہیں، جن کے ارادے بہت گھٹیا ہیں، وہ تو کچھ بھی نہیں، یہاں ان سے بڑے ناسور چھپے ہوئے ہیں۔ ان سے بڑے غدار اور شرپسند موجود ہیں یہاں۔ اب مجھے لگتا ہے کہ میرا مقصد تو ابھی شروع ہوا ہے۔ پیچھے جو کچھ کر کے آیا ہوں وہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں کس کس کو ختم کروں گا۔ یہاں تو ہر طرف ان دیکھے ہاتھ وطن کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس کی سلامتی کے درپے ہیں۔ تخریب کاروں کی کارروائیاں دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہیں، غیر ملکی عناصر اپنا نیٹ ورک اس قدر وسیع پیمانے پر پھیلائے ہوئے ہیں کہ جہاں بھی پاؤں رکھتے ہیں بم باری ہونے لگتی ہے۔

رانیل میری جان! یہ اسلامی ملک ہے، جہاں کسی کو بھی امان حاصل نہیں۔ ہر کوئی جل رہا ہے، تڑپ رہا ہے، مر رہا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں، کوئی دیکھنے والا نہیں، اس قوم پر اتنا بڑا ارضی قہر زلزلے کی صورت میں نازل ہوا ہے پھر بھی عبرت حاصل نہیں ہوئی۔ میں تو تیمور ثقلین اور اکرام رحمٰن وغیرہ سے گریزاں تھا، خار کھاتا تھا، یہاں تو ہر شخص کے چہرے پر نقاب ہے۔ ہر شخص کے ہاتھ میں خنجر ہے۔ میں کس کس کو بے نقاب کروں سمجھ میں نہیں آتا۔ جان باری! کیا کہوں کیا بتاؤں؟ جب یہاں آیا تو سب سے پہلا کیس جو ہاتھ لگا وہ ان چند غیر ملکیوں کا تھا جو مشکوک سرگرمیاں کرتے ہاتھ لگے تھے۔ پوچھ گچھ کی تو حقیقت کھلی کہ وہ لوگ یہاں سے کچھ اہم راز اور ویڈیو کیسٹس حاصل کرنے آئے ہیں۔ جب سے آیا ہوں اسی کیس کو سلجھانے پر لگا ہوں۔ انتہائی افسوس سے لکھ رہا ہوں اس وطن کو دشمنوں کے ہاتھوں فروخت کرنے والے ہمارے افسران ہیں جن کے ہاتھوں میں اس وقت ہمارے ملک کی باگ ڈور ہے۔

رانیل! اس وقت بھی میں ایک اہم ریڈ پر جا رہا ہوں، اس سے پہلے کہ وہ اہم راز غیر ملکیوں کے ہاتھ لگیں میں انہیں وطن دشمنوں کے ہاتھوں سے چھین لینا چاہتا ہوں جن پر وطن کی بقا اور سلامتی کا انحصار ہے۔ میں نہیں جانتا واپس لوٹتا ہوں یا نہیں۔ تیاری تو اپنی طرف سے خاصی مکمل ہے مگر مجھے اتنا یقین ہے کہ اب میرا ایمان کبھی کمزور نہیں ہوگا۔ تم میری روشنی ہو۔ وطن کی محبت میری

آ کسیجن ہے۔ میرا بیٹا میرا ایمان بن کر میرے چار سو ہے۔ اللہ نے چاہا اگر کامیاب و سرخرو لوٹا تو وعدہ ہے اپنے بیٹے امید کو بھی لانے کا بندوبست کروں گا۔ بس کچھ انتظار کرلو...... اس سے پہلے اس وطن کے حالات سنوارنا چاہتا ہوں۔ یہ ناسور وطن کے ان کھوکھلے دعوے کرنے والوں کی جماعت ہے جو بظاہر وطن پرست ہیں مگر بباطن شیطان کو بھی پیچھے چھوڑتے ہیں۔ انتہائی گھٹیا اور فرعون فطرت لوگ ہیں...... ان کو ختم کرنا میرا مقصد ہے۔

رائیل! ایک خاص ہدایت ہے، اگر زندہ رہا تو ٹھیک ورنہ میرے بیٹے کے اندر میرے وطن سے محبت کا جذبہ ضرور پیدا کرنا۔ اسے ضرور بتانا کہ یہ وطن کتنی قربانیوں کے بعد حاصل ہوا تھا۔ اس کی بنیادوں میں کتنے لوگوں نے اپنا لہو ڈالا ہوا تھا۔ اسے یہ سبق ضرور دینا کہ "یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں" جب مرنا طے ہے تو کیا فرق پڑتا ہے کہ اگر ایمان کی حالت میں وطن کی راہ میں خون بہے......

میرے بعد کبھی حوصلہ نہ ہارنا۔ تمہارا عزم میری ذات سے نہ ہو۔ وہ ایمان ہو، وہ امید ہو جو اللہ کی طرف سے بیٹے میں پھوٹتی ہے۔ کبھی ہمت نہ ہارنا۔ تھوڑی دیر پہلے تم رو رہی تھیں اور تمہارے آنسو میرے دل پر گر رہے تھے۔ تم تو بہت مضبوط ہو، پھر یہ رونا کیوں؟ بہت کم عمری میں، میں نے تمہارے اندر وہ جوہر دیکھے ہیں جو بڑے بڑوں میں نہیں ہوتے۔ تم سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے...... ایسی ہی تربیت میرے بیٹے کی بھی کرنا۔ تمہارا نام اپنے نام کے علاوہ کسی اور سے برداشت کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا مگر میرے بعد تم آزاد ہو۔ زندگی کے لیے کوئی بہتر فیصلہ کر لینا۔ یہ زندگی بہت بڑی ہے اور وقت و حالات کا کچھ پتہ نہیں۔ میرے بیٹے کو میری طرف سے بھرپور پیار کرنا۔ اگر خود آ گیا تو ٹھیک...... رائیل! اگر تم تک یہ خبر پہنچے کہ میں وطن کے کام آ گیا ہوں تو حوصلہ نہ کھونا، تمہارے آنسو بہت تکلیف دیتے ہیں۔ بس یہ سوچنا کہ نہ جانے کتنی سہاگنوں کے شوہر وطن کے کام آ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ جن کے نام تک نہیں پتہ...... نہ جانے کتنی لاشیں روز بے گور و کفن قبر میں اترتی ہیں کون جانے......

رائیل......! اگر ایسا ویسا کچھ ہو گیا تو میں نے ارقم کو تاکید کر دی ہے۔ وہ تم تک وہ تمام راز اور ویڈیو کیسٹس پہنچا دے گا۔ اب مجھے کسی پر بھروسہ نہیں رہا کہ کس کے حوالے یہ امانت کروں۔ کوئی قابل بھروسہ دکھائی نہیں دیتا اور ارقم تنہا یہ ذمہ داری نہیں نبھا پائے گا سو تمہیں حوصلہ کرنا ہوگا یا پھر میرے بیٹے کے بڑے ہونے کا انتظار کرنا۔ میرے پاس اس کو وراثت میں دینے کو کچھ نہیں سوائے نیک جذبات اور اس تحفے کے، اس امانت کے۔ تم اس امانت کی حفاظت کرنا اگر کوشش کرو تو خود میدان میں اترنا۔ تم کم حوصلہ نہیں...... بہت کچھ کر سکتی ہو بس میں منتظر تھا تمہارے فارغ ہونے کا۔ اگر زندہ رہا تو دونوں مل کر اس وطن کو غلط ہاتھوں کے شر سے بچائیں گے...... اب مزید وقت نہیں ہے میرے پاس۔ وقت بہت کم ہے اور بہت سے امور سرانجام دینے ہیں۔ اجازت دینا...... کچھ کہا سنا معاف کرنا۔ میں نے تمہیں بہت ستایا تھا، صرف تمہارے حوصلے کو آزمانا رہا تھا۔ جب میں نہ رہا تو یاد کرو گی۔ کاش تم محبت بھرا اقرار پہلے کر دیتیں تو نہ جانے کیا کرتا۔ ہاں اگر لوٹا تو ضرور پوچھوں گا، اتنی دیر کیوں کی اقرار محبت کرنے میں، جب ہر طرف میں ہی میں تھا تو پھر کیوں بچتی رہیں مجھ سے۔ امی ابو کے لیے اس لفافے میں علیحدہ خط ہیں انہیں دے دینا۔

زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ اللہ نگہبان

والسلام

تمہارا۔ عبدالباری"

ضبط کے سارے بندھن ریزہ ریزہ ہو گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر پوری شدت سے رونے لگی۔ بلک بلک کر سسکنے لگی۔ وہ پاس تھا تو کبھی خاطر میں نہ لاتی تھی اور اب اس دیس جا بسا تھا کہ جہاں کبھی کوئی لوٹ کر نہیں آتا تو دل بار بار اس کے لوٹ آنے کی دعائیں کر رہا تھا۔

"کہا نا...... بند کرو اپنا یہ ناٹک...... ابھی زندہ ہوں جب مر جاؤں تو تب جتنا چاہے رو لینا۔ ابھی تمہارا ہنسنا اور رونا صرف اور صرف میری مرضی سے ہوا کرے گا...... رائیل بیگم...... سمجھیں تم......" تب وہ سمجھ نہیں سکی تھی اور اب جب وہ نہیں تھا تو صرف رونا ہی آ رہا تھا۔ دل تڑپ رہا تھا، کسی بھی پل سکون نہ تھا۔

"تم پر بلیک کلر بہت سوٹ کرتا ہے...... وہ پہن رکھنا...... جب واپس لوٹوں تو تمہیں اسی کلر میں دیکھوں......" کیسی انوکھی فرمائش کی تھی۔ وہ کٹ سی گئی۔ اب ایسی فرمائش کرنے والا کبھی کوئی فرمائش نہیں کرے گا جب کہ وہ ابھی بھی اس کی خواہش کے احترام میں بلیک لباس پہنے ہوئے تھی۔ ابھی تک یہی گمان تھا کہ شاید سب غلط ہو۔ ابھی پلٹ کر دیکھے گی تو وہ کمرے میں ہوگا۔ کچھ پوچھے گی تو چڑانے لگے گا۔ الٹا سیدھا بولے گا اور جب رونے لگے گی تو ٹوٹ کر برسے گا۔ اس کا بے جان چھلنی چھلنی وجود دیکھ کر بھی یقین نہیں آیا تھا مگر اب...... اس کا خط اس کو یقین دلانے لگا تھا اس کی موت کا۔

"تم تو بہت مضبوط ہو...... پھر یہ رونا کیوں......؟ بہت کم عمری میں، میں نے تمہارے اندر وہ جوہر دیکھے ہیں جو بڑے بڑوں میں نہیں ہوتے۔" وہ پھر انوکھے انداز میں کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔

"رائیل! اگر تم تک یہ خبر پہنچے کہ میں وطن کے کام آ گیا ہوں تو حوصلہ رکھنا، تمہارے آنسو مجھے بہت تکلیف دیتے ہیں۔ بس یہ سوچنا کہ نہ جانے کتنی سہاگنوں کے شوہر وطن کے کام آ جاتے ہیں...... ایسے لوگ جن کے نام تک نہیں پتا۔ کتنی لاشیں روز بے گور و کفن قبر میں اترتی ہیں کون جانے......"

عبدالباری کے لفظوں نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر تسلی دی تو وہ چونک گئی۔ بے اختیار اپنے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا مگر وہ ایک کرن، ایک امید چھوڑ گیا تھا۔ ایمان کی صورت، یقین کی صورت۔ اس کے ہاتھ پہلو میں گر گئے۔

"رائیل! تمہیں حوصلہ کرنا ہوگا...... یا پھر میرے بیٹے کے بڑے ہونے کا انتظار کرنا۔ میرے پاس اسے وراثت میں دینے کو کچھ نہیں سوائے نیک جذبات اور اس تحفے کے، اس امانت کے...... تم اس امانت کی حفاظت کرنا اگر کوشش کرو تو خود میدان میں اترنا...... تم کم حوصلہ نہیں...... بہت کچھ کر سکتی ہو......" عبدالباری اس کے کان میں پھر سرگوشی کر رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میں منتظر تھا تمہارے فارغ ہونے کا، اگر زندہ رہا تو دونوں مل کر اس وطن کو غلط ہاتھوں کے شر سے بچائیں گے۔" اس کے خیالات کتنے انوکھے تھے۔

"ہاں میں تمہارا ساتھ دوں گی...... تمہارے مقصد کو آگے پہنچاؤں گی...... ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچاؤں گی جنہوں نے تمہیں ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھین لیا ہے۔ میرے ایمان کے سر سے باپ کا سایہ چھین لیا ہے۔"

وہ ایک عزم لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر پہلے جیسی شکستگی نہ تھی بیڈ سے تصویر اٹھا کر سینے سے لگا لی۔

"تم تو میرا سایہ تھے۔ تم تو خود میری روشنی تھے۔ تم اتنے اچھے تھے علم نہ تھا...... تم تو خدا کی طرف سے میرے لیے ایک تحفہ تھے۔ جب حقیقت جان گئی تو اس ساتھ پر ہمیشہ شکر کیا تھا۔ گناہگار تم نہیں میں ہوں...... جو تمہاری قدر نہ کر سکی...... اگر علم ہوتا کہ تم اتنی تھوڑی زندگی لکھوا کر لائے ہو تو خدا کی قسم ہمیشہ اپنے بدن کی چھاؤں کیے رکھتی۔ کبھی تمہارا دل نہ دکھاتی...... کبھی تمہارے بڑھے ہاتھوں کو نہ جھٹکتی، کبھی انکار نہ کرتی......" وہ اب اسے صرف یاد کر سکتی تھی۔

"وقت مرگ نہ جانے کتنا تڑپے ہو گے...... ظالموں نے کس طرح سارا وجود چھلنی کر دیا تھا...... کاش میں ساتھ ہوتی کچھ تو تدبیر کرتی...... اپنے بدن کا سایہ کر لیتی...... کم از کم کوئی قطرہ پانی حلق میں انڈیلتی، کتنی تکلیف ہوئی ہوگی تمہیں جب سارا بدن چھلنی ہو گیا ہوگا...... کتنے خوب صورت خواب تھے تمہارے شہادت یا فتح...... اور تم نے اپنا مقصد پا لیا......" وہ رو رہی تھی تصویر کو سینے سے

لگائے جب ننھے ایمان نے رونے کی آواز پر چونکی تھی۔

"تم تو مجھے جینے کا سامان دے گئے ہو...... ہمارے رشتے کی واحد نشانی، ہمارا ایمان...... میں وعدہ کرتی ہوں تم سے کہ میں تمہارا مقصد پورا کروں گی۔ وہ لوگ جو وطن کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں انہیں ختم کرنا ہے۔ تم مجھے جینے کا اک مقصد دے گئے ہو۔ تمہارا ساتھ تھا تو سب کچھ تھا تم نہیں ہو تو سب کچھ یہ وطن ہے۔ اور اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ اپنے بیٹے کو صحیح معنوں میں ایمان بناؤں...... اس قابل بناؤں کہ یہ تمہارے سب ارادوں کی عملی تعبیر بن جائے۔ تمہارے مقصد کی تکمیل کرے۔ یہ وطن کے ان ناسوروں کو نیست و نابود کرے جن کو ختم کرنے کی خواہش لیے تم قبر میں جا اترے......"

اس نے ننھے ایمان کو اٹھا لیا تھا۔ جھلملاتی آنکھوں سے عبدالباری کی تصویر کو دیکھا تھا۔ عبدالباری کے ہونٹوں پر ایک بھرپور مسکراہٹ تھی۔

اے ارض پاک کے جاں باز سپاہی تمہیں ہمارا سلام..
اے ملک و قوم کے جاں نثار غازی تمہیں وطن کی مٹی کا سلام!
اے دل کے مکیں! تمہیں وطن عزیز کے نظارے جادوؤں کی نکھری فضاؤں کی گنگناہٹوں کا سلام!
اے شہید وطن ہا... تمہیں سلام ہو

"جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں"

وہ عبدالباری کی آواز کا ساتھ دیتے ہوئے... اب اسے ساری زندگی اس کے چھوڑے ہوئے مقصد کو نبھانا تھا۔ زندگی کچھ پرسکون سی لگنے لگی تھی۔

ختم شد

کسی پتھر کی مورت

یا رب! غم ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پہ ہے وہ دست دعا ہوتا
امید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا

میں ابھی تک ہتھوڑوں کی بارش محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اپنا پورا وجود ہوا میں معلق ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا کوئی انہونی ہو گئی میری دنیا میں کوئی طوفان آ گیا ہو اور واقعی کوئی طوفان آ گیا تھا۔ مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔

"یہ کیا کر دیا میں نے...... میں کس قدر ظالم باپ تھا کہ اپنی ذات کے حصار میں مقید اپنے ہی نقصان کا شدید سبب بنتا چلا گیا اور مجھے علم ہی نہ ہو سکا۔ وہ لڑکی جسے میں نے ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھا۔ اس کے وجود پر لاتعلقی کے کوڑے برسائے' وہ آج میری روح' میری زندگی کی واحد خوشی' میری زندگی کا سبب بن جائے گی۔ اس قدر شدید محبت کرتا ہوں اسے اور ہمیشہ بے خبر رہا۔" تین دن سے وہ اسپتال میں تھی اور میں تین دن سے ضمیر کی سخت گرفت میں تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ابھی بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی ہو۔ وہی بچی جس نے آج تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کی تھی۔ جس کی زبان سے میرے رویے پر احتجاج کا ایک لفظ تک نہیں نکلا تھا' وہ تین دن پہلے میرے سامنے کھڑی میری ایک ایک لغزش مجھے بتاتی ہوئی مجھے آئینہ دکھا رہی تھی۔ میں تین دن سے اسپتال میں تھا۔ رات کو سلامہ شاہ نے مجھے زبردستی گھر بھیج دیا تھا کہ میں آرام کر سکوں مگر اب آرام کہاں؟ رات بھر اپنی کنپٹیوں کو مسلتے' اپنے شدید نقصان کا تعین کرنے میں مصروف تھا۔ کہاں کہاں میں غلط تھا۔ مجھے اپنی ساری زندگی سے ہی شرم آ رہی تھی۔

"پاپا! آئی ہیٹ یو۔ آئی ہیٹ یو......" مورا کے الفاظ ایک دفعہ پھر میرے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے۔ میں ایک دم بستر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ بیڈ کی سائیڈ دراز کے اوپر میری اور سارا کی شادی کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ جسے میں نے کبھی اپنی زندگی سے جدا نہیں کیا تھا۔ میں نے وہ تصویر اٹھائی۔

تصویر میں موجود سارا آج بھی اپنے ملکوتی حسن سمیت لاثانی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے بھرپور حسن سمیت میرے دل پر بجلیاں گراتی رہی تھی اور یہی خود فراموشی آج میری اس اذیت کا سبب بنی ہوئی تھی۔ میں واقعی جنونی تھا۔ سارہ کی وفات کے تیئس' چوبیس سال بعد بھی میں نے اسے زندہ رکھا ہوا تھا۔ اپنی یادوں میں' اپنے خیالوں میں' اپنی سوچوں میں اپنی ساری زندگی میں۔ وہ کبھی مجھ سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ ایک عرصہ پہلے میں نے اپنے ہاتھوں سے سارہ کے وجود کو لحد میں اتارا تھا مگر تیئس' چوبیس سال تک میں نے خود کو اس کی موت کا یقین ہو جانے کے باوجود دھوکے میں مبتلا کر رکھا تھا کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ محبت کبھی بھی نہیں مرتی۔ ہاں واقعی

میں بہت جنونی تھا اور اسی لیے تو مادرا مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"بہت جنونی ہیں پاپا آپ!..... آپ نے صرف ایک محبت کی اور کیا کیا آپ نے ساری زندگی۔ ماضی پر ماتم کرتے گزار دی' یہ تک نہ خیال آیا کہ میں کون ہوں' کیا رشتہ ہے میرا آپ سے۔" پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اس نے کہا اور جس دن سے وہ جس طرح چپ چاپ اسپتال کے بستر پر پڑی تھی مجھے ہر آن' ہر لمحہ طوفانوں کی زد میں دھکیلتی جا رہی تھی اور اب سارہ کی تصویر کو دیکھتے' اس کے الفاظ یاد کر کے کوئی میرا دل مٹھی میں بھینچ رہا تھا۔

"مادرا! میری زندگی' سچ کہا تم نے میں واقعی بہت جنونی ہوں۔ ماضی میں جینے والا۔" اپنے آپ سے اعتراف کرتے ہوئے میں نے وہ تصویر واپس رکھ دی اور خود کو ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہونے سے نہ روک پایا۔

✠ ✠ ✠

سارہ رحمان میری کلاس فیلو تھی۔ وہ بہت حسین اور پورے ڈیپارٹمنٹ کی جان تھی۔ ہم دونوں ایم بی اے کے ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ شہر کے ایک بڑے بزنس مین کی بیٹی تھی۔ تھا تو حیثیت و مرتبے میں بھی کچھ کم نہیں۔ میرا تعلق بھی ایک کھاتے پیتے فیوڈل گھرانے سے تھا۔ اپنے ماحول سے نالاں' اکتایا ہوا اور لاتعلق۔ مجھے اپنے باپ کی وراثت میں ایکڑوں کے حساب سے ملنے والی جائیداد سے کوئی غرض نہ تھی۔ مجھے بس کام کرنے کا جنون تھا جو میرے باپ غفار شاہ کو ناپسند تھا۔ انہیں میری ذات کے ہر کام میں مداخلت کرنے کی عادت تھی' بچپن کی حدود سے نکلتے ہی میں نے اپنی مرضی کرنا شروع کر دی تھی۔ انہیں ہر ایک کو اپنے زیر اثر رکھنے کا خبط تھا اور میں ان کے زیر اثر رہنے پر قطعی تیار نہ تھا۔ بابا جان کا خیال تھا کہ میں سیاست کی لائن میں آؤں اور مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ میری بغاوت سے ان کی حیثیت مزید مستحکم ہو سکتی تھی جب کہ میں نے ان کے سب ارادوں پر پانی پھیرتے ہوئے بزنس لائن جوائن کی تھی۔ میرے اور بابا جان کے ہمیشہ نظریاتی اختلافات رہے تھے۔ میں اپنے سسٹم سے اکتایا برگشتہ فطرت کا مالک انسان تھا۔ ایسے میں سارہ سے ملاقات ہونا اسے دیکھنا۔ میرے احساسات کا محور بدل گیا تھا۔ پہلی نظر کی محبت کیا ہوتی ہے مجھ پر آشکار ہوئی تھی۔ ایم بی اے کا پورا عرصہ میں نے سارہ سے دوستی رکھی اور اپنے سب جذبوں کو دل میں سنبھالے رکھا۔ پھر جیسے ہی میں نے تعلیم کو خیرباد کہا تو بی بی جان سے سارہ کے متعلق بات کی اور انہوں نے بابا جان سے۔ ہمارے خاندان میں کبھی شادیاں نہیں کی جاتی تھیں۔ میری خواہش جان کر بابا جان بہت برگشتہ ہوئے۔ بی بی جان نے ہر طرح سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی مگر میں اپنے جذبوں پر بند نہ باندھ سکا۔ بابا جان کسی بھی طور پر میری شادی اپنی مرضی کے بغیر کسی غیر خاندان میں کرنے پر راضی نہ تھے اور میں بھی اپنے ارادوں میں اٹل اور ضد کا پکا انسان تھا۔ نجانے کیوں بابا جان سے نظریاتی اختلافات رکھتے رکھتے ان کے ہر فیصلے سے انکار کرنے کی ضدی خاصیت میرے اندر اپنی جڑیں مضبوط کرتی جا رہی تھی۔ بابا جان' سبحان بھائی' دونوں بہنیں بھاوج' بی بی جان سب نے سمجھانے کی کوشش کی مگر میں راضی نہ ہوا اور پھر بابا جان نے غصے میں آ کر مجھے ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل جانے کو کہا اور میں بھی اپنا مختصر سا سامان لے کر ان سے قطع تعلق کر آیا۔

حویلی سے نکلتے ہوئے میں بالکل خالی تھا لیکن ایک عزم میرے ساتھ تھا اور شاید قسمت بھی مجھ پر مہربان تھی کہ مجھے ایک بہت اچھی کمپنی میں اعلیٰ درجے کی ایک ملازمت مل گئی۔ گاڑی' گھر وغیرہ کی بھی سہولت تھی پھر میں نے سارہ کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

پہلے پہل جب سارہ کو یہ علم ہوا کہ میں اسے ایک عرصے سے چاہنے کی جسارت کرتا آیا ہوں تو وہ بہت حیران ہوئی مگر پھر آہستہ آہستہ میرے بار بار اس کی راہ میں آنے پر وہ بھی میری محبت میں مبتلا ہوتی چلی گئی۔ شاید سارا کے والدین مجھ جیسے تنہا شخص سے اپنی چہیتی بیٹی کی شادی کرنے پر کبھی راضی نہ ہوتے اگر میری خاطر وہ اپنے والدین کے سامنے نہ کھڑی ہوتی۔ رو دھو کر' ضد کر کے آخر

کار اس نے اپنے والدین کو راضی کر ہی لیا اور پھر ہماری شادی ہو گئی۔

سارہ کا میری زندگی میں آنا بہت خوش آئند ثابت ہوا۔ جن حالات میں وہ میری زندگی میں آئی تھی' میں مالی مسائل میں الجھا ہوا تھا لیکن اس نے ہر حال میں میرا ساتھ دیا' کبھی بھی میری کم مائیگی پر مجھے طعنہ نہیں دیا۔ وہ عیش و عشرت میں پلی بڑھی لڑکی تھی لیکن میری زندگی میں آتے ہی وہ اپنی گزشتہ زندگی کو' اپنے والدین کے ہی گھر بھول آئی تھی۔ شادی کے بعد میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ بینک سے لون لے کر شراکت داری کی بنیاد پر چھوٹا سا بزنس شروع کر دیا۔ ذرا سیٹل ہوا تو سارہ کے ہمراہ دوبارہ حویلی گیا' میرا خیال تھا کہ اب بابا جان شاید اپنی ضد کو بھول کر مجھے اپنا لیں مگر یہ میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی اور بابا جان نے ہم دونوں کو بہت بے عزت کر کے حویلی سے نکال دیا اور پھر اس کے بعد میرے دل میں دوبارہ حویلی والوں سے ملنے کی کوئی حسرت نہ جاگی۔

سارہ سے شادی کے تین سال بعد اللہ تعالیٰ نے ہم پر کرم کیا۔ سارہ ماں بننے والی تھی۔ جہاں میں بے انتہا خوش تھا وہیں میری خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ سارہ کے والدین جو وقتی طور پر ہم دونوں سے بدظن تھے یہ خوشخبری سن کر وہ سارہ کو اپنے پاس لے گئے۔ میں بھی اکثر وہاں چلا جاتا۔ جوں جوں سارہ کی ڈلیوری کے دن قریب آتے جا رہے تھے میری بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا کیونکہ ڈاکٹرز نے سارہ کے کیس کو نارمل قرار نہیں دیا تھا۔ ان ہی دنوں مجھے اپنے کام کے سلسلے میں ترکی کے وزٹ پر جانا پڑ گیا۔ میں جانے پر راضی نہیں تھا لیکن سارہ نے اصرار کر کے بھیج دیا۔ بقول اس کے کہ میں اس کی خاطر اپنی ترقی کے اتنے اہم موقعے کو مت ٹھکراؤں اور میں چلا گیا۔ ابھی مجھے وہاں پہنچے چار دن ہی گزرے تھے کہ پاکستان سے خبر آئی کہ سارہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ ڈلیوری کے دوران اس کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ یہ خبر میرے لیے ایک زبردست ذہنی جھٹکا ثابت ہوئی۔ نجانے میں کیسے پاکستان پہنچا۔ سارہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا۔ مجھے اپنی نومولود بچی سے بے انتہا نفرت ہوئی جس کی آمد نے مجھ سے میری عزیز از جان بیوی کو چھین لیا۔ میں نے ایک دفعہ بھی اپنی بیٹی کو دیکھنے کو خواہش نہ کی۔ اس کی نانی ہی اسے سنبھال رہی تھیں۔ سارہ کی وفات کے کئی ہفتے بعد بھی میری ذہنی حالت سنبھل نہ پائی۔ اپنے خاندان والوں سے میں بالکل کٹا ہوا تھا' ایسے حالات میں کوئی بھی مجھے ذہنی سپورٹ دینے والا نہ تھا۔ میری توجہ اپنے بزنس سے ختم ہو کر رہ گئی تھی بلکہ زندگی سے بھی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ میری مسلسل عدم دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ میرا بزنس ختم ہو کر رہ گیا۔ اب اس جگہ رہنے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا۔ سب کچھ چھوڑ کر میں واپس گاؤں پہنچا۔ بی بی جان مجھے یوں لٹا پٹا دیکھ کر بہت آزردہ ہوئیں۔ بابا جان اور سبحان بھائی البتہ خاموش ہی تھے۔ کچھ وقت گزرا تو بی بی جان مجھ پر دوبارہ شادی کے لیے زور ڈالنے لگیں لیکن سارہ کے بعد کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ حقیقتاً میں نے سارہ کے بعد کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ حقیقتاً میں نے سارہ کو اپنے تصور میں مرنے ہی نہیں دیا تھا وہ مر کر بھی میرے اندر سے نہ نکلی تھی۔ ایسے میں کسی دوسرے وجود کو اپنی زندگی میں کیسے شامل کر لیتا۔ یہ میرے لیے ناممکن تھا۔ جب اماں جی کے ساتھ بھاوج اور بابا کا بھی دباؤ بڑھنے لگا تو میں پھر سب تعلق ختم کر کے وہاں سے نکل آیا۔ مادرا اپنی نانی کے پاس تھی۔ انہوں نے ہی اس کا نام مادرا رکھا تھا۔ میری عدم دلچسپی دیکھتے ہوئے انہوں نے اسے پاس ہی رکھنے کا فیصلہ کیا تھا جس سے میں بھی مطمئن ہو گیا تھا۔ اب پاکستان میں رہنے کو جی چاہتا تھا۔ "بچا کھچا سب کچھ سمیٹ کر میں لندن آ بسا اور پھر یہاں جاب کر لی۔ پتا نہیں کتنا عرصہ گزر رہا تھا۔ مجھے کبھی مادرا کے وجود کا خیال نہیں آیا۔ ہاں البتہ مادرا کے ننھیال والے اکثر رابطہ کر کے اس کی خیر خیریت سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ اس سے زیادہ مجھے مادرا سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک نفرت سی میرے دل میں اس کے لیے تھی۔ رفتہ رفتہ دس سال گزر گئے اور ایک دن مادرا کی نانی کا فون آیا۔

✠ ✠ ✠

"میں بہت بیمار ہوں۔ زندگی کا کچھ نہیں کہہ سکتی..... مادرا کو میں سارہ کی نشانی سمجھ کر سینے سے لگا کر پالتی آ رہی تھی مگر اب یہاں کے حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ مجھے علم نہیں کہ سارہ کے بھائی بھی مادرا کو بہن کی نشانی سمجھ کر وہی محبت و پیار دیں گے جو میری

موجودگی میں دیتے ہیں۔ وہ تمہاری امانت ہے بیٹا۔ اپنی بیٹی کے بارے میں سوچو۔ وہ اب بڑی ہو رہی ہے تمہاری مسلسل غیر حاضری کے متعلق سوال کرنے لگی ہے۔ میں اسے مسلسل کسی نہ کسی طرح بہلا لیتی ہوں مگر اب بچی کو تمہاری ضرورت ہے۔ جو تحفظ تم دے سکتے ہو وہ میں یا کوئی اور نہیں دے سکتا۔ اس لیے بیٹا اپنی بیٹی کے بارے میں سوچو۔"

پھر مجھے واپس آنا پڑا۔ ماورا کے لیے میرے دل میں قطعی کوئی گنجائش نہ تھی۔ بس ولدیت کے خانے میں میرا نام درج تھا یہی وہ رشتہ تھا جو اسے میری بیٹی بناتا تھا۔ اسے لے کر میں حویلی چلا آیا۔ دس سال بعد میں دوبارہ وہاں آیا تھا۔ وہاں کا ماحول ویسا ہی تھا۔ بابا جان کا رویہ ہنوز وہی تھا۔ پہلے انہوں نے سارہ کو بہو ماننے سے انکار کیا تھا اب میری بیٹی کو اس خاندان کا خون ماننے سے انکاری ہو گئے تھے اور تب پہلی بار میرے دل میں یہ احساس جاگا کہ وہ میری بیٹی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اسے میں حویلی چھوڑ کر واپس لندن چلا جاؤں گا لیکن بابا جان کے خود پسند رویے نے میرے اندر اشتعال بڑھا دیا۔ انہیں یہ گوارا نہیں تھا کہ ان کے اعلیٰ حسب نسب والے خون میں غیر خون کی آمیزش ہو۔ مجھ سے تو وہ متنفر تھے ہی ماورا کو بھی میری بیٹی ماننے سے انکاری ہو گئے۔ میری نزدیک بابا جان کا یوں ماورا کو میری بیٹی ماننے سے انکار کرنا کھلم کھلا میری توہین تھی اور یہ توہین میری مردانگی کو گوارا نہ تھی۔ میں ماورا کو لے کر لندن آ بسا۔

وقت گزرتا چلا گیا اور میں اپنی ذات کے حصار میں بند ہوتا چلا گیا۔ اپنی خود ساختہ نفرت میں غرق یہ جان ہی نہ سکا کہ میں کیا کیا غلطیاں کرتا چلا جا رہا ہوں۔ اب بھی میرے شب و روز سارہ کی یاد میں گزرتے تھے۔ اس کی ذات سے ہٹ کر میں نے دوبارہ زندگی میں کسی اور طرف دیکھا ہی نہ تھا۔ حتیٰ کہ ماورا کو بھی میں یہاں لا کر بھول گیا تھا۔ اس کے لیے میں نے ایک مسلمان گورنس کا بندوبست کر دیا تھا۔ کہنے کو میں اس کی سب ضروریات پوری کرتا تھا۔ بہترین اداروں میں اسے تعلیم دلوا رہا تھا مگر میری نفرت جوں کی توں تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے اندر پلنے والا تلخ احساسات کا مالک رہبان غفار شاہ مزید سرد گلیشیرز میں بدلتا چلا گیا۔

حویلی والوں میں سے سبحان بھائی کے بڑے صاحبزادے سلامہ شاہ نے مجھ سے رابطہ رکھا تھا۔ بس وہی ایک شخص تھا جو صحیح معنوں میں میرا حوصلہ بنا تھا۔ کتنے سالوں بعد ایک دن بالکل اچانک وہ مجھ سے ملنے میرے اپارٹمنٹ پر چلا آیا۔ اسے دیکھ کر جیسے نئے سرے سے جی اٹھا۔ اسی دن مجھے دفتری کام کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر میں جانا تھا۔ اسے اپنے گھر میں ٹھہرنے کا کہہ کر میں چلا گیا۔ دو دن کا کام تھا مگر چند گھنٹے بعد ہی سلامہ شاہ نے موبائل پر اطلاع دی کہ ماورا کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے وہ اسپتال میں ہے حیرت کی بات تھی تب بھی میرے احساسات سرد ہی رہے تھے۔ میں آرام سے اپنا کام مکمل کر کے اگلے دن گھر پہنچا۔ ماورا اسپتال میں ہی تھی۔ سارا دن آرام کر کے میں شام کو اسپتال گیا۔ سلامہ بے چارہ میری محبت و مروت میں وہیں تھا۔ میرے کہنے پر وہ چلا گیا۔ اس کے بعد بھی وہ اکثر ملتا رہتا۔ میرے اصرار پر وہ میرے ساتھ ہی رہنے لگا۔ پھر جیسے ہی اس کا کام ختم ہوا وہ چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ مجھے کہہ گیا کہ وہ بابا جان کو راضی کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ سب پرانی باتیں اور رنجشیں بھلا کر مجھے واپس بلا لیں۔ شاید وہ میرے دل میں حویلی والوں سے متعلق محبت کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا اور میں اس کے جانے کے بعد حویلی والوں کی پیش رفت کا انتظار کرنے لگا۔ سلامہ سے رابطہ اسی طرح قائم تھا۔ اب تو اس کی بدولت بی بی جان' سبحان بھائی' بھاوج وغیرہ سے بھی بات ہونے لگی تھی۔ اکثر خط ملتے تھے اور میں شدت سے واپسی کا منتظر تھا۔ یہاں رہتے ہوئے مجھے یہاں کے معاشرے سے ایک الجھن ضرور رہی تھی۔ ماورا اگرچہ یہیں پلی بڑھی تھی مگر اپنی تمام لاتعلقی کے باوجود میری پوری کوشش تھی کہ اس پر اس معاشرے کے اثرات غالب نہ آئیں۔ اسی لیے تو میں نے اس کے لیے فاطمہ جیسی خاتون کا بندوبست کیا تھا۔ فاطمہ خاتون بہت مذہبی تھیں۔ صوم و صلوٰۃ کی پابند۔ انہوں نے ماورا کی تربیت بھی انہی خطوط پر کی تھی۔ ماورا اپنے لباس گفتگو انداز و اطوار ہر لحاظ سے ایک مکمل مشرقی لڑکی تھی اور اب میری خواہش تھی کہ اس کی شادی یہاں کرنے کے بجائے پاکستان جا کر کروں۔ سلامہ کو جب سے دیکھا تھا میرے اندر عجیب و غریب سے احساسات پیدا ہونے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ میری خواہش جڑ پکڑتی جا رہی تھی کہ کیا ہی اچھا ہو کہ سلامہ شاہ ماورا سے شادی کر لے

اس طرح ایک تو ماورا خاندان میں ہی رہ جائے گی دوسرے شاید بابا جان کے دل میں بھی جگہ بن جائے۔ اس عمر میں میری سوچ بہت لچکیلی ہوتی جا رہی تھی۔ ایک سال کے عرصے میں سلامہ صرف ایک دفعہ لندن آ سکا تھا۔ وہ بھی دو دن کے لیے اس نے مجھے بتایا کہ بابا جان آہستہ آہستہ بدل رہے ہیں۔

پھر چند ماہ بعد ہی اچانک سلامہ شاہ نے فون کر کے بابا جان پر فالج کا اٹیک ہونے کی اطلاع دی۔ اب میں اتنا پتھر دل بھی نہ تھا کہ ان کی بیماری کی اطلاع سن کر بھی نہ آتا۔ نجانے کیوں مجھے یقین تھا کہ اب کے بابا جان مجھے نہیں دھتکاریں گے۔ میں ماورا سمیت وہاں پہنچا۔

فالج کے اٹیک نے بابا جان کی ساری اکڑ ختم کر کے رکھ دی تھی۔ حسب نسب پر فخر و غرور کرنا اور جاگیردار ہونے کا سارا زعم دودھ کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر میرا دل کانپ گیا تھا۔ میرے دل میں کبھی بھی نظریاتی اختلافات کے سوا کوئی برا خیال نہیں آیا تھا۔

مجھے معاف کر دو رہبان پتر! میں نے بہت برا کیا۔" حویلی کے کمرے میں لیٹے وہ کہہ رہے تھے۔ فالج نے ان کے دماغ کو بھی متاثر کیا تھا۔ جسمانی طور پر وہ ٹھیک تھے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھامے وہ رو رہے تھے۔

"معافی مانگ کر مجھے شرمندہ مت کریں..... سب قصور میرا ہے..... بلکہ میں تو خود شرمسار ہوں......" اس لمحے میری ساری زندگی کی برسوں کی ضدی فطرت خود سری و طنطنہ نجانے کہاں جا سویا تھا۔ شاید عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ میری انا بھی سرنگوں ہوتی جا رہی تھی یا پھر بوڑھے باپ کو اس حالت میں دیکھنے کا اثر تھا۔

"یہ تمہاری بیٹی ہے؟" میں نے ان کے ہاتھوں پر بوسہ دیا تو وہ سر اٹھا کر میرے عقب میں کھڑی ماورا کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔ کبھی انہوں نے اسے میرا خون ماننے سے انکار کیا تھا اور اب..... مگر میں نے سر ہلا دیا۔

"ادھر کیوں کھڑی ہو بچی..... ادھر آؤ..... میرے قریب آؤ..... میں تمہارا دادا ہوں..... مجھے بہت حسین لگو گی......" مجھے حیران کرتے اسے بلایا تو وہ کچھ جھجکتی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار کیا۔

"میں غلط تھا..... مجھے بڑا زعم تھا اپنے حسب نسب پر..... مگر اس بیماری نے سب سمجھا دیا ہے۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ مجھے معاف کر دینا بیٹی۔" بابا جان ماورا سے کہہ رہے تھے اور میں خاموش تھا۔

"پاکستان آ کر میں نے بی بی جان کے اصرار پر مستقل یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں لندن کچھ کام نمٹانے گیا تو میرے پیچھے ماورا اپنے ننھیال والوں سے ملنے چلی گئی۔ میں واپس آیا تو وہ بھی آ چکی تھی۔ یہاں آ کر میں بہت خوش تھا۔ ان ہی دنوں ماورا کی نانی اور ممانی اپنے بیٹے شہریار کا رشتہ ماورا کے لیے مانگنے آ گئیں۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ بابا جان نے سلامہ شاہ کے لیے بات کی۔ میری تو دلی مراد بر آئی تھی۔ سلامہ شاہ ہر لحاظ سے معقول تھا۔ بابا جان نے بات کی تو میں انکار کرنے کی گنجائش نہیں نکال سکا۔ انکار کی وجہ بھی نہ تھی۔ بابا جان اور سبحان بھائی نے وہیں بیٹھے بیٹھے دونوں کی شادی کی تاریخ عید الاضحیٰ کے فوراً بعد طے کر دی تھی۔ میں بھی خوش تھا یہ بوجھ جتنی جلدی اترتا اتنا ہی اچھا تھا۔

سلامہ شاہ سے ماورا کی شادی کا فیصلہ کر کے میں بہت خوش تھا۔ لیکن تین دن پہلے ماورا جس طرح اس رشتے پر انکار کر گئی برسوں کی گئی میری کوتاہیاں بھی گنوا گئی تھی ان کو یاد کر کے مجھے اپنے آپ سے بھی نظر ملانا باعث شرم لگ رہا تھا۔

"میں تو ایک بوجھ کی طرح آپ پر مسلط رہی ہوں۔ بیٹی تو کبھی تھی ہی نہیں اور اب بھی ایک بوجھ کی طرح مجھے اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ بڑا دعویٰ ہے آپ کو کہ آپ نے ماما سے بڑی انمول محبت کی ہے۔ ان کی موت کے بعد بھی ان کی محبت کا عہد نبھاتے آ رہے ہیں۔"

مادرا کی آواز میرے دماغ میں گھس رہی تھی۔ ہر طرف صرف انہی لفظوں کی بازگشت تھی۔

''مگر مجھ سے پوچھیے کہ آپ دراصل کیا ہیں؟ آپ تو انسان بھی نہیں ہیں۔ باپ کیا بنتے؟'' ہمیشہ میری سب سے زیادہ بیان چپ چاپ سہنے والی میری بیٹی کیسے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

''میرے ساتھ ناانصافیاں کیں..... اور اب چاہتے ہیں کہ آپ ہی کی طرح کے ایک جنونی شخص سے شادی کر لوں ..... نہیں پاپا..... ایسا کبھی نہیں ہوگا..... نفرت کرتی ہوں اس سے اس خاندان سے اور آپ سے بھی..... پاپا!..... میں آپ کو اس زیادتی پر کبھی معاف نہیں کروں گی.....''

اس کی آواز کی بازگشت تین دن سے میرا احاطہ کر رہی تھی۔ میری جانب سے میرے رویوں سے بددل ہو کر وہ اپنی زندگی ہی ختم کر دینا چاہتی تھی۔ وہ تو اگر بروقت سلامہ شاہ اس کے روم میں نہ چلا جاتا تو شاید اس وقت اس کی قبر پر بیٹھا میں پچھتاوے کے آنسو بہا رہا ہوتا۔ میری آنکھوں سے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔ ''اے اللہ مجھے معاف کر دے..... میں تیرا گناہ گار بندہ بہت ناشکرا تھا۔ ساری عمر تیرے حکم سے سرتابی کی..... تیری رضا سے منہ موڑا..... مجھ سے میری زندگی چھین لے مگر میری بیٹی کو تندرستی دے دے..... مجھے معاف کر دے۔ اے میرے پروردگار معاف کر دے.....'' وضو کر کے آنے کے بعد جائے نماز بچھا کر میں رب کے حضور اپنی غلطیوں پر آنسو بہا رہا تھا۔ بے شک وہی گناہوں سے درگزر کرنے والا ہے اور گناہ گاروں کی بخشش کرنے والا ہے۔ وہ ضرور مجھ گناہ گار کی سنے گا۔

✣ ✣

میں مادرا ابن رہبان شاہ کی اکلوتی بیٹی اور غفار شاہ کی پوتی۔ تھوڑی دیر پہلے سلامہ شاہ میرے سرہانے بیٹھا بہت آزردہ سا تھا۔ وہ مجھے ٹرینکولائزر کے زیر اثر جان کر اپنے رویوں پر پشیمانی کا اظہار کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ کی پشت پر اس کے ہونٹوں کا لمس ابھی بھی باقی تھا۔ میں جو اس سے ہمیشہ نفرت کرتی چلی آ رہی تھی اس وقت آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھنے کی ہمت نہیں کر پائی تھی۔ آج پہلی دفعہ مجھے اس کی محبت کی شدت و گہرائی کا اندازہ ہوا تھا ورنہ اپنے دل میں نفرت کی دنیا بسائے میں کچھ اور محسوس کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس کا آزردہ سا لہجہ میرے دل و دماغ پر اپنے نقش چھوڑ گیا تھا۔

''آئی ایم سوری مادرا..... اگر مجھے علم ہوتا کہ تمہاری نفرت کے پیچھے یہ سب کارفرما ہے تو میں کبھی تمہیں زچ کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ تم میرے گزشتہ رویے کی وجہ سے مجھے قبول نہیں کر رہی۔ میری محبت کو ٹھکرا رہی ہو۔ تم ایک دفعہ اپنے دل کی بھڑاس میرے سامنے نکالتی تو سہی..... اب میں اتنا خودسر و جنونی بھی نہیں ہوں۔ میں تم سے صرف محبت ہی نہیں کرتا تمہاری عزت بھی کرتا ہوں ورنہ بارہا تمہارے رویے نے مجھے مشتعل کیا اور بارہا میرا دل حد سے گزر جانے کو چاہا..... اگر تمہارے احساسات کا پاس نہ ہوتا تو نجانے کیا کر گزرتا۔''

اس کے لفظوں کی پشیمانی میری سماعت میں گھلتی جا رہی تھی۔ کہیں سے کوئی بازگشت بار بار میرے حواس کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

کسی پتھر کی مورت سے محبت کا ارادہ ہے
پرستش کی تمنا ہے عبادت کا ارادہ ہے

میں نے بے بسی سے اپنے ہاتھ کو دیکھا وہاں ان دیکھا لمس ابھی بھی میرے ہاتھ کو دہکا رہا تھا۔ آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔ وہ تو مجھے سویا ہوا جان کر سب کہہ گیا لیکن میں اپنے آپ کو اب پہلے والی مادرا نہیں بنا پا رہی تھی۔ شاید پاپا کے سامنے سب کچھ کہہ کر رو رو کر اپنے دل کا درد بہا کر اب سب احساسات منجمد ہو گئے تھے کوئی فیلنگز نہیں رہی تھیں۔

بار بار ذہن پیچھے کی طرف گردش کر رہا تھا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ میرا ذہن نارمل ہے مگر شاید پاپا کی طرح میں بھی شدت

پسند تھی جو اپنے آپ کو ماضی میں سفر کرنے سے نہیں روک پا رہی تھی۔ کافی دیر تک خود پر کنٹرول کرتے اور بے بس ہوتے میں نے اپنے آپ کو گزشتہ یادوں کے حوالے کر دیا۔ جہاں میرا ماضی تھا۔

پاپا کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ ماما سے محبت اور پسند کی شادی کی پاداش میں انہیں اپنے خاندان سے قطع تعلق کرنا پڑا تھا اور پھر ماما کی وفات اور میرا دنیا میں آنا ان کی نفرت کا سبب بنا تھا۔ میرا بچپن نانی اماں کے گھر میں گزرا تھا۔ انہوں نے ہی میرا نام مادرا رکھا تھا۔ انہیں ماما سے بہت محبت تھی' ماما کی وفات کے بعد پاپا کی نفرت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا تھا اور پھر دس سال میں ان کے پاس رہی۔

ماما کل سات بہن بھائی تھے۔ بڑی خالہ آنسہ پھر ماموں زبیران کے بعد ماموں یحییٰ اور خالہ فوزیہ تھیں پھر دو ماموں عمران اور سیف الرحمٰن تھے سب سے آخر میں ماما تھیں۔ ماموں زبیر کی بیگم شہلا ممانی ان کے بعد آسیہ ممی' طیبہ اور عظمیٰ تھیں۔ سب کے ہی بچے تھے۔ سب ہی گھربار والے تھے۔ ماما کی عدم موجودگی پاپا کی عدم دلچسپی نے مجھے بچپن سے ہی بہت حساس بنا دیا تھا۔ پھر نانی کے گھر میں سب کے رویے کو دیکھتے ہوئے میرے اندر شدید قسم کا کمپلیکس پیدا ہو گیا تھا۔ چاروں ممانیاں اور ان کے بچے ہر لمحہ مجھے یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھے کہ میں ان کے گھر رہ رہی ہوں۔ ان کے روٹی پر پل رہی ہوں۔ چاروں ممانیاں ایک دوسرے سے بڑی لینے کے چکر میں رہتی تھیں۔ ایسے میں اکثر مجھے بھی ہرٹ کر جاتی تھیں لیکن یہاں میرے لیے سب سے بڑا اور مضبوط سہارا نانا اور نانی ہوتے تھے۔ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اکثر میری خاطر ممانیوں اور ان کے بچوں سے بھی الجھ پڑتے تھے۔ بارہا ممانیوں کے طنز اور پاپا کے رویے پر آزردہ ہو جاتی تھی۔

ایک دن نانو اچانک بیمار پڑ گئیں اور پھر وہ اکثر بیمار رہنے لگیں۔ چاروں ممانیاں ایسے میں ان پر زور ڈالنے لگیں کہ وہ پاپا کو بلوا کر مجھے ان کے حوالے کریں۔ پہلے پہل تو ایسا کہنے پر نانو انہیں جب کرا دیتی تھیں مگر پھر رفتہ رفتہ نانو بھی خاموش ہو گئیں۔ نانو کو بہت پرالم رہنے لگی تھی۔ اسی لیے وہ میری جانب سے فکرمند تھیں اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا۔ ممانیاں تو کسی طور مجھے برداشت نہیں کریں گی۔ ایک دن انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے پاپا سے رابطہ کیا ہے وہ بہت جلد مجھے لینے آئیں گے میں یہ جان کر بہت خوش ہوئی۔ یہ جان کرنے سرے سے جی اٹھی کہ اب میں پاپا کے ساتھ رہوں گی مگر کتنے دنوں کا رہنے والا انتظار ایک دن ختم ہو گیا۔ میں لان میں ایک طرف بنی کیاری میں خوشنے مرجھائے پتے چن رہی تھی جب نانا کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ساری ممانیاں ان کے بچے اور ماموں نانو سمیت لان میں ہی کرسیاں ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔ سب ہی متوجہ ہو گئے۔ گاڑی میں نانا ابو کے ساتھ جو شخص برآمد ہوا اسے دیکھ کر میں وہیں ساکت ہو گئی۔

''پاپا.....''

جس شخص سے میں صرف تصویروں کی حد تک واقف تھی آج انہیں سامنے مجسم دیکھ کر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں جہاں تھی وہیں ساکت کھڑی رہی۔ اتنی ہمت نہ ہو سکی کہ آگے بڑھ کر پاپا سے لپٹ جاؤں۔ وہ فرداً فرداً سب سے مل رہے تھے۔

''مادرا.....'' نانی کی آواز پر میں جیسے خواب سے چونکی۔

''جی.....''

مٹی سے اٹے۔ ہاتھوں کو جھاڑتے ہوئے میں نے خود کو سنبھالا۔

''ادھر آؤ مادرا..... ان سے ملو یہ تمہارے پاپا ہیں۔'' نانا جان نے بلایا میں ان کے پاس آ گئی۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سرد سے جامد تاثرات تھے۔ مجھ پر سرسری سی نظر ڈالی تھی۔

''رہبان یہ مادرا ہے..... یہ تمہاری بیٹی ہے۔'' نانو نے پاپا کو بتایا۔

''السلام علیکم پاپا!.....'' ان کے سرد سے انداز پر میں جھجک گئی تھی۔ انہوں نے سر ہلا دیا۔

''کیسی ہیں آپ؟..... '' نہ ہی کوئی پیار نہ ہی کوئی محبت بھرا اظہار' تکلف کے لبادے میں لپٹا ہوا یہ استفسار میرے احساس کو بیدار کر گیا۔

''کیا باپ ایسے ہوتے ہیں؟'' بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھتے میں نے سوچا۔

وہ مجھ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد دیگر لوگوں سے مصروف گفتگو ہو گئے اور میرے اندر جتنی خواہشوں و آرزوؤں نے سر اٹھایا تھا وہ اپنی موت آپ مر گئیں۔

رات کو سب ہی کمروں میں جا چکے تھے۔ میں پاپا کے کمرے میں آ گئی۔ میرے اندر کی دس سالہ بچی اپنے باپ سے باتیں کرنے اپنی تعلیم کے بارے میں بتانے کو مچل رہی تھی۔

وہ کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو رک گئے تھے۔

''آپ اس وقت؟'' وہ شاید اس وقت مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

''وہ پاپا میں..... '' میں جھجک گئی۔

''کچھ کہنا ہے آپ کو..... '' میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اپنے پاس بلا کر ڈھیروں باتیں کریں گے۔ خوب پیار کریں گے مگر ان کا سرد انداز دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔

''جی..... نہیں..... '' میں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ میرا چھوٹا سا دل بہت دکھی ہوا۔

''تو پھر اپنے کمرے میں جا کر سو جائیں۔'' وہ کتاب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے سرد انداز اور سخت لہجے میں کہہ رہے تھے۔ میں ایک دم پلٹی اور باہر نکل آئی اور اپنے کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میرے اندر جو برسوں سے ایک احساس پل رہا تھا باپ کے ملنے پر سر رکھ کر باتیں کرنے کا وہ مزید بڑھتا گیا اور پھر ساری رات میری آنسوؤں میں کٹ گئی۔ میں اپنی عمر سے بڑی باتیں سوچ رہی تھی۔

میرے دل میں پاپا کے لیے بہت محبت تھی مگر ان کی سرد مہری سے کئی شکوے بھی جاگ گئے۔

''وہ مجھے ناپسند کرتے ہیں۔ مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ میری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔'' یہ سوچیں مجھے پاگل کر دینے کو کافی تھیں۔

ہم نانی اماں کے ہاں دو دن رہے پھر پاپا مجھے وہاں سے لے کر گاؤں چلے آ گئے۔ بہت بڑی حویلی تھی۔ وہاں سب لوگ بہت خوش ہو کر پاپا سے مل رہے تھے۔ بچے بھی تھے۔ میرے لیے سب انجان تھے۔ وہ مجھے لے کر اپنی اماں جی کے پاس چلے آئے جو بڑے سے تخت پر براجمان تھیں۔ پاپا کو دیکھ کر وہ والہانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''السلام علیکم بی بی جان!..... '' پاپا ان کے سامنے جھک گئے۔ انہوں نے پاپا کا سر چوم کر گلے سے لگا لیا۔ ''کتنا ترسایا ہے تو نے رہبان اپنی ایک ضد اور خواہش کی خاطر..... کیا سے کیا بنا لی ہے زندگی تو نے..... ایسے بھی کوئی اپنوں سے خفا ہو جاتا ہے۔'' بی بی جان رو رہی تھیں اور پاپا بالکل خاموش تھے۔

''برسوں بعد اس ماں کی یاد کیسے آ گئی تجھے..... '' دوپٹے سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے انہوں نے پاپا کو شاکی نظروں سے دیکھا۔

''میں تو بی بی جان صرف ناراض ہوں..... سارے رشتے ناتے تو آپ لوگوں نے خود ختم کر لیے ہیں۔ کیا میرا دل نہیں تڑپتا آپ سے ملنے کو بھائی اور زہرہ بھابی بچوں کو دیکھنے کو بہنوں کے پاس جانے کو مگر بابا جان نے بھی حد کی ہے پھر میں کس منہ سے اور کیا لینے آ جاتا اور آج بھی..... ''

''چھوڑ چل پچھلی باتوں میں کیا رکھا ہے۔ آج تو خود چل کر آیا ہے۔ یہی کافی ہے میرے لیے۔''

''یہ کون ہے؟'' میری طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے پاپا سے پوچھا۔

''یہ ماورا ہے۔ میری بیٹی..... '' ایک دم پاپا کا انداز سرد ہو گیا یا شاید مجھے محسوس ہوا۔

''اچھا..... ماشاءاللہ بڑی پیاری بچی ہے بالکل ماں جیسی ہے صرف ایک دفعہ دیکھا تھا اسے جب تیرے ساتھ آئی تھی ہو بہو وہی ہے۔ ادھر آؤ بیٹی..... '' انہوں نے پیار سے کہتے ہوئے بازو سے تھام کر مجھے سینے سے لگا لیا۔

''بابا جان اور سبحان بھائی کہاں ہیں؟'' پاپا نے پوچھا۔

''تیرے ابا جی تو دو دن سے اپنے کسی دوست کے ساتھ گئے ہوئے ہیں اور سبحان پتر صبح کا زمینوں پر نکلا ہوا ہے..... آنے ہی والا ہے..... ''

''اماں جی! میں صرف چند دن کی چھٹی پر آیا ہوں۔ آپ کو علم ہو گا کہ ماورا اپنی نانی کے پاس ہی رہتی تھی۔ وہ اب بیمار ہیں اس لیے بلوا کر وہ میرے ساتھ روانہ کر دیا ہے۔ لندن میں تنہا ہوتا ہوں۔ میں اسے کیسے پالوں گا..... اسی لیے حویلی لے آیا ہوں۔''

وہ بی بی جان کو بتا رہے تھے اور مجھے جان کر حیرت ہو رہی تھی۔

مجھے تو پتر کوئی اعتراض نہیں۔ تمہاری بیٹی ہے سو بسم اللہ پر تیرے ابا کو کون سمجھائے وہ ابھی تک اپنی ضد پر اڑے تجھے نہ دیکھنے کی ٹھانے ہوئے ہیں۔ اپنے ابا سے پوچھ لینا..... میں بات کر لوں گی..... '' پاپا نے حامی بھری۔

حویلی میں بی بی جان کے علاوہ پاپا کے بڑے بھائی سبحان انکل بھی رہتے تھے۔ ان کے کل پانچ بچے تھے۔ صبا آپی' سلامہ شاہ' ام رومان' علی اور رضا۔ صبا آپی' ام رومان اور سلامہ شاہ تینوں مجھ سے بڑے تھے جب کہ علی میرا ہم عمر تھا اور رضا مجھ سے چھوٹا تھا۔ ان کی والدہ کا نام زہرہ بیگم تھا' جنہیں سب اماں جی کہتے تھے۔ بی بی جان' اماں جی' سبحان انکل کے علاوہ ان کے بچے بھی بہت اچھے تھے مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے لیکن ان سب میں سلامہ شاہ کچھ بد دماغ سا انسان تھا۔ جب بھی سامنا ہوتا عجیب نظروں سے گھورنے لگتا تھا۔ مجھ سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ ڈیل ڈول اور جسامت کا بھی اچھا خاصا تھا۔ چہرے پر موجود ہلکی ہلکی مونچھیں اسے کچھ دلکش چہرے کا مالک بنا دیتی تھیں۔ بہر حال جو بھی تھا وہ مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ پاپا کے رویے سے میں بدظن ہو چکی تھی مگر ان لوگوں کے خلوص اور محبت بھرے رویے نے پھر سے مجھے پر اسبد بنا دیا تھا۔ میں انہوں میں تھی' اس احساس نے میرے اندر نئی زندگی دوڑا دی تھی۔

بابا جان ابھی تک حویلی نہیں لوٹے تھے۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے تین دن ہو گئے تھے۔ پاپا سارا دن حویلی سے باہر رہتے نجانے کہاں کہاں گھومتے رہتے تھے۔ پاپا کا سن کر میری دونوں پھوپھیاں بھی آ گئی تھیں۔ وہ دونوں بہت اچھی تھیں۔ اتنے دنوں میں میں سب کے ساتھ بہت اچھی طرح گھل مل گئی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ میں ان لوگوں کے لیے اجنبی ہوں۔ مجھے یہاں کسی سے خوف نہیں آتا تھا سوائے سلامہ شاہ کے۔ نجانے کیوں مجھے دیکھتے ہی اس کا اچھا خاصا پرکشش چہرہ بگڑ جاتا تھا۔ نظروں میں پاپا کی طرح کی سرد کیفیت ہوتی تھی۔ زبان سے ابھی تک اس نے کچھ نہیں کہا تھا مگر مجھے اس سے بڑا ڈر لگنے لگا تھا۔ ساتھ ساتھ نفرت سی بھی ہونے لگی تھی۔ نجانے کیوں مگر میری بچپن سے ہی عادت پختہ ہو گئی تھی کہ کوئی مجھے ایک دفعہ نفرت سے پکارتا تھا تو میرے دل میں اس کے لیے ہزار درجے نفرت پیدا ہو جاتی۔ ممانیوں کے ساتھ بھی یہی حال تھا لیکن یہاں۔

ام رومان مجھ سے تین سال بڑی تھی اس کے باوجود ہماری پکی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ تھی بھی بہت اچھی اور پیاری ویسے تو صبا آپی بہت خوبصورت تھیں مگر وہ تو عمر میں سلامہ شاہ سے بھی دو تین سال بڑی تھیں۔ اسی لیے ان سے شرم آتی تھی۔ علی اور رضا بھی میرے دوست بن گئے تھے۔ ہم گھنٹوں اکٹھے مل کر کھیلتے تھے۔ یہاں آ کر میں بہت خوش تھی۔

اگلے دن بابا جان بھی آ گئے۔ پاپا سبحان انکل کے ساتھ کہیں گئے ہوئے تھے۔ پاپا کی آمد اور مقصد جان کر وہ بڑے چراغ پا ہوئے۔ مجھے اور ماما کو برا بھلا کہتے رہے۔ پاپا حویلی لوٹے تو انہوں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا اور ساتھ مجھے بھی۔

"کیا لینے آئے ہو اب تم یہاں..... کیا تعلق ہے تمہارا ہم سے۔" میرے طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا تو نجانے کیوں پاپا کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ وہاں کمرے میں سبھی تھے۔ میں پہلی دفعہ انہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کے الفاظ ان ہی کی طرح غرور و نخوت کا اظہار کرتے انہوں نے کہا مجھے وہ بہت برے لگے۔ سلامہ شاہ کی ہی طرح زہر بھرے۔

"گستاخی معاف بابا جان! جس بات کا آپ کو غصہ ہے وہ تو کب کی منوں مٹی تلے جا سوئی ہے۔ دس سال ہو گئے ہیں اس کے باوجود آپ کی نفرت جوں کی توں برقرار ہے۔ اب تو معاف کر دیں..... " پاپا نے کہا۔ تو جواباً بابا جان استہزائیہ مسکرائے۔

"چلو معاف کر دیتا ہوں مگر ہماری بات وہی ہے۔ جس عورت کو میں خاندان کی بہو تسلیم کرنے پر راضی نہ تھا اس کی بیٹی کو خاندان میں کیسے جگہ دے دوں..... تم اسے جہاں سے لائے ہو وہیں واپس چھوڑ دو تو ہم کچھ سوچیں گے..... میں اپنے اعلیٰ حسب نسب والے خون میں غیر خون کی ملاوٹ قطعی برداشت نہیں کر سکتا..... " ان کے نخوت بھرے انداز میں مطلق فرق نہیں آیا تھا۔

"بابا جی..... یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ یہ میری اور سارہ کی بیٹی ہے۔ میرا خون ہے۔ آپ کے رد کرنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی..... ویسے بھی اب میں اسے وہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ دس سال انہوں نے اسے سنبھالا ہے۔ اب اسے اپنے خاندان کی ضرورت ہے۔" پاپا اپنے بابا جان سے کہہ رہے تھے۔ انہوں نے سر جھٹکا۔

"تو فراہم کر دو تم اسے خاندان کی ضرورت، یہ میری حویلی ہے کوئی یتیم خانہ نہیں کہ میں اس جیسی لڑکیوں کو رکھتا پھروں۔ نہیں سنبھالی جاتی تم سے تو کہیں چھوڑ آؤ مجھ سے امید مت رکھو..... میں نے جو کہہ دیا ہے وہ بدلے گا نہیں..... اگر مجھ سے یا اس حویلی کے کسی فرد سے تعلق رکھنا چاہتے ہو تو یہ شرط ہے میری۔ ورنہ میری حویلی کے دروازے تمہیں کبھی روکیں گے نہیں۔"

"شاہ جی..... " بی بی جان ان کے دو ٹوک فیصلہ کن انداز پر تڑپ اٹھیں۔

"بابا جان آپ..... " سبحان انکل نے کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"نہیں سبحان ایسی نافرمان اولاد کے لیے میری حویلی میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس نے ہمیشہ اپنی من مانی کی ہے۔ برسوں پہلے میں اسے اپنی زندگی سے نکال چکا ہوں۔ یہ اتنے سالوں بعد آیا ہے میں معاف بھی کر دوں مگر اس لڑکی کو جگہ نہیں دوں گا۔ فیصلہ اس کے اپنے ہاتھ میں ہے جو میں نے کہنا تھا کہہ دیا۔"

میں خاموش تماشائی بنی ایک طرف کونے میں کھڑی تھی جب کہ میرا دل اندر ہی اندر کانپ رہا تھا کہ اگر پاپا نے مجھے چھوڑ دیا تو؟

"آپ نے ہمیشہ میری مخالفت ہی کی ہے۔ چاہے وہ معاملہ میری تعلیم کا ہو یا شادی کا۔ ہمیشہ اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری درمیان صرف نظریاتی اور سوچ کی حد تک اختلافات تھے آپ نے ہمیشہ اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ سمجھا۔ ہمیشہ مجھ سے نفرت سے پیش آئے۔ برسوں بعد میں یہاں آیا ہوں اس خیال سے کہ آپ کا دل پسیج گیا ہوگا۔ پتھر میں جونک لگ گئی ہوگی۔ شاید مجھے اپنے سامنے دیکھ کر دل میں تھوڑی بہت گنجائش نکل آئے۔ مگر افسوس..... میں نے پسند کی شادی کر کے کوئی غلطی نہیں کی غلطی تو اب کی ہے کہ آپ کے سامنے آیا ہوں..... جب میرے لیے آپ کے دل میں گنجائش نہیں بنی تو میری اولاد کے لیے خاک بنے گی۔ میں بہت بڑی بھول میں تھا۔" وہ غصے سے کہہ کر اور میرا بازو پکڑ کر وہاں سے نکل آئے تھے۔

رات تک ہم نے حویلی چھوڑ دی تھی۔ پاپا مجھے لے کر اپنے کسی دوست کے گھر آئے تھے۔ چند دن ہم وہاں رہے تھے۔ پاپا کا رویہ اگرچہ وہی تھا مگر اب میں مطمئن تھی کہ میں پاپا کے ساتھ ہوں۔ اس دوران پاپا میرے پاسپورٹ اور ویزہ وغیرہ کا انتظام کرتے رہے۔

پھر ہم لندن آ گئے۔ یہاں آتے ہی پاپا نے سب سے پہلے میرا ایڈمیشن کروایا۔ پھر میرے لیے ایک مسلمان گورنس کا بھی بندوبست کر دیا۔ وہ خاتون بہت پڑھی لکھی اور مذہبی تھیں۔ شادی کے بعد شوہر کا انتقال ہو جانے کے بعد بالکل تنہا تھیں۔ پاپا میری

طرف سے فکرمند تھے تو وہ میرے ساتھ رہنے پر رضامند ہو گئیں اور اس طرح مجھے بالکل ایک ماں کی طرح انہوں نے پالا تھا۔ میرا خیال رکھا تھا۔ وہ بہت محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ پاپا کے متعلق سب کچھ جانتی تھیں۔ پاپا کا رویہ میرے ساتھ اب بھی ویسا ہی ہوتا تھا۔ سرد مہری لیے ہوئے اگرچہ وہ مجھ سے لاکھ لاتعلق رہتے تھے مگر کبھی ضروریات سے بے خبر نہیں ہوئے تھے۔ تعلیم سے لے کر ہر چیز مجھے وقت پر مہیا کی۔ وہ بلاشبہ ایک بہت اچھے باپ تھے اگر کبھی اپنے خول سے نکل کر میرے ساتھ محبت بھرا رویہ رکھ لیتے تو۔ وقت آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔ میں نے پہلے اسکول پھر کالج اور اس کے بعد یونیورسٹی تک کا سفر بڑے آرام سے طے کیا تھا۔ اس دوران بارہا میرا جی چاہا کہ میں پاپا کے سرد رویے پر چیخ اٹھوں۔ انہیں جھنجوڑ دوں۔ وقت کے ساتھ ساتھ بجائے کمی آنے کے پاپا کے انداز و اطوار میں شدت ہی آئی تھی۔ برملا ناپسندیدگی کا اظہار کرنے لگے تھے۔ میں دس سالہ بچی کی طرح ہر وقت ان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہتی تھی کہ شاید کوئی مسکراہٹ میرے نام کی بھی ہو۔ کوئی جذبہ میرے وجود سے بھی متعلق ہو اور ہر بار ناکام رہتی تھی۔ میں گھنٹوں پاپا کے رویے پر پُرملال اور رنجیدہ رہتی تھی۔

رفتہ رفتہ میرے دل و دماغ میں بھی ان کے خلاف غبار بڑھنا شروع ہو گیا۔ محبت کے ساتھ ساتھ نفرت بھی جگہ پانے لگی۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں شدید بیمار ہوئی مگر ان کے اندر احساس تک نہ جاگا۔ کبھی ایک محبت بھرا جملہ نہ بولا..... باپ پتھر بھی ہوتے ہیں مجھے یقین کرنا پڑا۔ گزرتے وقت میں پاپا کے خاندان نے پلٹ کر خبر تک نہ لی۔ سوائے ایک فرد کے اور وہ سلامہ شاہ تھا جس کا نام ابھی بھی میرے اندر نفرت کا احساس جگا دیتا تھا۔ اکثر اس کی ٹیلیفون کالز، خطوط اور گفٹس موصول ہوتے رہتے تھے جو سب کے سب پاپا کے نام ہوتے تھے۔

مجھے نہ اس شخص سے کوئی سروکار تھا نہ ہی اس کے خطوط سے۔ میرے لیے اس کا پورا خاندان ہی قابل نفرت تھا گزرتے وقت میں میں نے لوگوں سے بے پناہ نفرت محسوس کی تھی۔ بہت شدت سے نفرت کا زہر بویا تھا اپنے اندر۔ سلامہ شاہ اور اس کے غرور سے پھاڑ بابا جان دونوں کے الفاظ ہمیشہ بازگشت بن کر میرے دل و دماغ پر کچوکے لگاتے رہتے تھے۔ ان دونوں کی آنکھوں سے چھلکتی گہری نفرت و ناگواری اب بھی میرے تصور میں زندہ تھی۔ سلامہ شاہ کی آنکھوں سے عیاں ہوتی وحشت میرے وجود میں ابھی تک ایک عجب سی آگ جلا دیتی تھی مگر ان سب کے باوجود میں پاپا کے رویے سے بدظن ہو کر کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا سکی۔ پاپا پہلے تو مجھے ماما کی موت کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے اب تو اپنے خاندان کی جدائی کا سبب بھی مجھے سمجھنے لگے تھے اور میں بے پناہ محبت کے ساتھ نفرت کا پیدا پروان چڑھاتے ان سے ان کی کوتاہیوں کا سبب نہ پوچھ سکی۔ حتیٰ کہ وقت بدلنے لگا۔

✠ ✠ ✠

"میں برسوں نفرتوں میں جیا میں نفرتوں میں مرا بس یہی آرزو تھی میری کوئی چاہتا مجھے بھی۔"

اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی میں رک گئی۔

"ہاں تو پھر کیا کروں میں..... اپنے خاندان کی جدائی اب میرے لیے ناسور بنتی جا رہی ہے۔ اور اگر سارہ کی بیٹی اور میرا خون نہ ہوتی تو کبھی اتنی طویل سزا نہ جھیلتا..... "

پاپا فون پر کسی سے کہہ رہے تھے اور میرا وجود سناٹوں کی زد میں تھا۔ وہ بارہا اپنے رویوں لفظوں سے مجھے یہ احساس دلا چکے تھے کہ میں ان کے لیے قابل نفرین ہوں مگر اب یوں دیگر لوگوں سے بھی اپنی نفرت بیان کرنے لگے کہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ باپ کا یہ کون سا روپ ہے میں ساکت تھی۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔

"یہ ناممکن ہے..... بابا جان کے حقارت بھرے جملوں نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں اسے لے کر یہاں آ گیا ورنہ سارہ کے بعد کبھی کسی اور چیز کی خواہش نہیں رہی۔ اب بھی صرف اور صرف اس لیے برداشت کر رہا ہوں کہ سارہ کی بیٹی ہے..... ورنہ۔"

نجانے دوسری طرف کون تھا۔ کس سے کہہ رہے تھے مگر ان کا ایک ایک لفظ میرے دل میں ترازو ہوتا جا رہا تھا۔ وہ صرف اپنے باپ کی ضد میں مجھے یہاں لے کر آئے تھے۔ یہ احساس ہی میری محبت کا خون کر دینے کو کافی تھا۔ اتنی نفرت...... اتنی ناگواری...... میں بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی جب کہ میرے دل میں طوفاں برپا تھا۔

"یار کیا بتاؤں میں...... زندگی کے اس موڑ پر آ کر لگتا ہے سب کچھ بے کار ہے۔ ماورا کی وجہ سے میں سب چھوڑنے پر مجبور ہوا تھا ورنہ بابا جان تو مجھے ابھی حویلی میں رکھنے پر راضی ہیں۔ اب تو سلامہ شاہ بھی کہہ رہا تھا کہ وہ بابا جان کو راضی کرے گا۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو...... "ابھی وہ مزید گفتگو میں مصروف تھے مگر میرے اندر مزید سننے کی سکت نہ تھی۔ ایک دم وہاں سے ہٹ آئی اور پھر اپنے بستر پر گر کر کتنی دیر تک ماما کی موت کا ماتم کرتی رہی۔ اللہ سے شکوہ کرتی رہی۔

اگلے دو دن تک میری طبیعت کافی خراب رہی۔ میں بالکل گم صم ہو گئی۔ فاطمہ ماما بار ہا مجھ سے دریافت کر چکی تھیں مگر میری چپ نہ ٹوٹی۔ اکثر شدید ڈپریشن میں مجھ پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی مگر یہ کیفیت کبھی طویل نہیں ہوتی تھی۔ چند گھنٹے گزرنے کے بعد میں اپنے آپ کو نارمل کر لیتی تھی مگر اب...... مجھے بخار اور سر درد بھی تھا۔ فاطمہ ماما کے بے پناہ اصرار پر میں ڈاکٹر کے پاس چلی آئی چیک اپ کے بعد اس نے تنبیہ کی کہ اگر میرا ڈپریشن ختم نہ ہوا تو یقیناً میرا نروس سسٹم متاثر ہو سکتا ہے مگر میں کیا کرتی یہ حساسیت میرے اختیار میں نہیں تھی۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ پاپا کی نفرت ہی تو تھی۔ دو دن آف کر کے تیسرے دن میں یونیورسٹی چلی آئی۔ میرا سارا وقت یونیورسٹی میں خالی الذہنی کیفیت میں ہی گزرا۔ یونیورسٹی کے بعد طبیعت ایک دم بگڑ گئی تھی چکر پر چکر آ رہے تھے۔ میں فوراً گھر پہنچی۔ دروازہ بند کر کے آگے بڑھی تو وہاں لاؤنج کے صوفے پر پاپا اور ان کے ساتھ بیٹھے شخص کو دیکھ کر میرے قدم وہیں رک گئے۔ اگر زندگی میں ایک دفعہ اس شخص کو نہ دیکھ چکی ہوتی تو تب بھی میں تو اسے پہچان جاتی۔ اس کی شکل ہو بہو پاپا سے ملتی جلتی تھی۔ حیرت سے میری آنکھیں پھٹنے کو تھیں۔

"سلامہ شاہ......" میرے لب ہولے سے ہلے۔ وقت نے اسے کافی بدل ڈالا تھا لمبا قد' بھرا بھرا صحت مند تر و تازہ سڈول جسم سرخ و سپید دلکش چہرہ اور اس پر گھنی سیاہ مونچھیں۔ وہ بھی مجھے دیکھ چکا تھا مگر اسے یوں اچانک اس حالت میں دیکھ کر میرے دل و دماغ میں اس کے کہے برسوں کے جملے ہتھوڑے برسانے لگے تھے۔ یہ شخص مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ برسوں پہلے اس کے منہ سے اپنے لیے نفرت سے بھرے الفاظ سنے تھے کس طرح اس نے میری ذات کی توہین کی تھی۔ میرے چہرے کے تاثرات یک دم کرخت ہو گئے۔ ایسے شخص کو دیکھنے کو بھی میرا جی نہیں چاہا تھا اس سے پہلے کہ میں سامنے سے ہٹتی وہ کھڑا ہو گیا۔

"السلام علیکم......" وہ بڑی متانت و سنجیدگی سے سلام کر رہا تھا۔ بڑی اپنائیت تھی اس کے لہجے میں۔ شاید وہ بھی مجھے خوب پہچان چکا تھا۔ جواباً سر د نگاہوں سے میں نے اسے دیکھا تھا۔ ایک سخت شاکی نظر پاپا پر اور اس پر ڈال کر میں مزید رکے اور توجہ دیے بغیر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

اپنے کمرے میں آ کر اپنی اس حرکت بلکہ بد اخلاقی پر مجھے عجیب سا سکون ملا تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں نے اس شخص کے برسوں پہلے کہے گئے الفاظ کا بدلہ لے لیا ہو۔ میرے اندر کی تڑپتی سسکتی میری انا کو یک گونہ خوشی حاصل ہوئی تھی۔

میری طبیعت تو پہلے ہی خراب تھی سر چکرا رہا تھا۔ اب اسے یوں اچانک دیکھ کر مجھے کوفت بھی ہونے لگی۔ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ میں اپنے آپ کو مکمل طور پر پر سکون رکھوں ورنہ میری کوئی نس پھٹ جائے گی لیکن اپنے آپ کو نارمل نہیں کر پا رہی تھی۔ چکراتے سر میں درد کی ٹیسیں شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ سرہانے پر سر پٹختے میری چیخیں نکلنے کو بے تاب تھیں مگر میں مسلسل ضبط کر رہی تھی اور پھر ایک دم جیسے مجھے کچھ ہونے لگا تھا۔ ادھر سے اُدھر سر پٹختے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا اور مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔

"آہ......" آنکھیں کھلیں تو ایک کراہ کے ساتھ میں اطراف میں دیکھنے لگی۔ ذہن بالکل خالی تھا اپنے اردگرد کے ماحول سے مانوس ہونے میں کچھ وقت لگا تھا پھر جب اجنبی چہروں میں ایک نحیف وجود کے ساتھ ایک سفید بستر پر اپنے وجود کو لیٹا دیکھا تو حیرانگی ہوئی۔ فوراً اٹھنے کی کوشش کی۔

"اوں...... ہوں...... لیٹی رہو...... وہ مجھ پر جھکا ہوا میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے کہہ رہا تھا ڈرپ لگی ہوئی ہے۔" میں بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس دفعہ بھی اس کے لہجے میں بہت اپنائیت تھی۔ وہ مجھے دونوں کندھوں سے تھام کر لٹاتے ہوئے پیچھے ہٹا۔

"آپ......"

ساری صورتحال کا ادراک کرتے ہوئے میرے لبوں سے صرف یہی لفظ ادا ہو سکا۔

"تمہیں برین ہیمبرج ہوا ہے۔ اس وقت تم اسپتال میں ہو۔ خدا کا شکر ہے۔ اب تم خطرے سے باہر ہو......" وہ کرسی گھسیٹ کر میرے قریب بیٹھ گیا۔ مسکرا کر بتا رہا تھا اور حیرت کے ساتھ یاد کرنے کی کوشش میں تھی کہ مجھے ہوا کیا تھا۔ بے پناہ سر درد اور بے ہوشی کے بعد اب ہوش آیا تھا تو علم ہوا کہ گزشتہ لمحوں میں مجھ پر کیا کیفیت گزر رہی تھی۔

"پاپا...... ماما...... پاپا کہاں ہیں؟......" کمرے میں صرف سلامہ شاہ کو ہی دیکھ کر میں نے پوچھا۔

"انکل تو اپنے آفس کے کام کے سلسلے میں آؤٹ آف سٹی ہیں۔ میں نے فون کر دیا ہے۔ وہ جلد پہنچ جائیں گے...... البتہ فاطمہ آنٹی کو میں نے گھر بھیج دیا ہے وہ یہیں تھیں۔" اس نے مفصل جواب دیا تو میں چپ چاپ اسے دیکھتی گئی۔

"مجھے یہاں کون لایا تھا؟" کچھ دیر خود سے ہی الجھتے آخر کار میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"میں لایا تھا...... چچا جان تو چلے گئے تھے۔ رات کو میں ہی ایارٹمنٹ میں تھا۔ سو تمہارے پڑوسی ڈاکٹر مسعود کی مدد سے تمہیں یہاں پہنچایا تھا۔" مسکرا کر اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔ گزرے وقت کا اس کے چہرے پر شائبہ تک نہ تھا جب کہ اس کی اپنائیت محسوس کر کے میری سوچیں عود آئیں۔ میں اس شخص سے انتہائی نفرت کرتی تھی لیکن یہ کیا ہو رہا تھا کہ مجھے اسپتال لے کر آنے والا یہ شخص تھا۔ میری بے یقینی ابھی بھی قائم تھی جب کہ اس نے مسکرا کر میری کلائی تھامی تھی۔ شاید نبض چیک کرنے کو۔ میں اب مکمل حواس میں تھی ایک دم میں نے اپنی کلائی کھینچ لی۔ اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

"میں ڈاکٹر کو انفارم کرتا ہوں کہ تمہیں ہوش آ گیا ہے۔" اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی بات ضرور تھی کہ میں نے فی الفور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کمرے سے جا چکا تھا اور میں ابھی تک کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ کہاں وہ مجھ سے شدید نفرت کرتا تھا اور اب کہاں اس کی مہربانیاں۔

"مجھے برین ہیمبرج ہوا تھا......" مجھے حیرت ضرور ہو رہی تھی اس لیے کہ میں پھر بھی زندہ ہوں جب کہ مجھے انہوں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا کیا وہ اس قدر شدید نفرت کرتے ہیں مجھ سے کہ میرے مرنے اور جینے سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ دیوار پر آویزاں کیلنڈر سے نظر آتی اگلے دن کی تاریخ دیکھ کر میرا دل غم و کرب کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ پھر وہی سوچیں تھیں اور وہی اذیت اور سلامہ شاہ...... میں نے سر جھٹکا پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔

سلامہ شاہ مجھے یہاں لایا تھا۔ میرے وجود کو چھونے والا وہ تھا جس سے میرا صرف نفرت کا رشتہ تھا۔ ایک دم میرا پورا وجود سنسنا اٹھا۔ اسی تصور سے کہ میں تو بے ہوش تھی اور وہ...... میں مزید کچھ بھی نہیں سوچ سکی تھی کیونکہ میرا ذہن ہی نہیں آنکھیں بھی ایک گہرے اندھیرے میں ڈوب گئی تھیں۔

مجھے دوبارہ ہوش شاید آدھی رات کو آیا تھا۔ وہ شخص ابھی بھی وہیں کمرے میں تھا۔ میں ابھی بھی مشینوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ڈرپ بدستور لگی ہوئی تھی۔ سلامہ شاہ کرسی پر بیٹھا سو رہا تھا۔ میں کچھ زیادہ غور و فکر نہ کر سکی۔ میرے ذہن پر غنودگی چھائی ہوئی تھی۔

"پا..... پ..... پانی..... " میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ایک دم مجھے پانی کی طلب ہوئی۔ لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا جو میری آواز سنتا اور جو تھا وہ شاید گہری نیند میں تھا۔ میں نے خود اٹھنے کی کوشش کی مگر ہاتھ ٹیبل پر رکھی دوائیوں سے الجھ گیا۔ نتیجتاً کئی دوائیاں زمین پر جا گری تھیں۔ میرا تنفس بری طرح الجھا ہوا تھا۔ نقاہت سے برا حال تھا۔ میں بے دم ہو کر واپس لیٹ گئی۔ کھٹکے کی آواز سے سلامہ شاہ بھی متوجہ ہو گیا۔ پہلی نظر مجھ پر پڑی تھی مجھے حواس میں پا کر وہ فوراً میرے قریب آ گیا۔

"کیا ہوا مادرا..... طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" مجھے بمشکل گہری سانس لیتے دیکھ کر اس نے پریشانی سے پوچھا تو میں رونے لگی۔ اٹھنے کی کوشش میں بازو میں لگی ڈرپ کی سرنج میں کسی نس میں الجھ گئی تھی۔ ڈرپ میں خون کی آمیزش ہونا شروع ہو چکی تھی۔ سلامہ شاہ کی نظر جیسے ہی ڈرپ پر پڑی اس نے سرعت سے سرنج بازو سے نکال کر کر نس کے اوپر روئی رکھ دی۔

"میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں..... " میری کیفیت سے پریشان ہو کر وہ کہہ رہا تھا۔

"پانی..... مجھے پانی چاہیے۔" میں بمشکل کہہ پائی تھی..... وہ فوراً پانی لے آیا۔

سلامہ شاہ کے سہارا دے کر پانی پلانے پر میرے خشک کانٹے جیسے حلق میں کچھ سکون آیا۔ میں اس کے سہارے لیٹے ہوئے گہری سانس لے رہی تھی ساتھ ہی میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"مادرا..... تم ٹھیک تو ہو نا..... بابا..... میں ڈاکٹر کو بلاؤں..... " تشویش سے دیکھتے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ پوچھ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ غنودگی ابھی برقرار تھی۔ وہ بستر پر ہی بیٹھ گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگا۔ مجھے ساتھ ساتھ اپنا ذہن پر سکون رکھنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ اس کی ہدایت کو سنتے سنتے مجھے پتا نہیں چلا کہ کب دوبارہ آنکھ لگ گئی۔

اگلے دن دوپہر کے قریب میں بیدار ہوئی تھی۔ کل کی نسبت میری طبیعت کچھ ٹھیک تھی۔ فاطمہ ماما کمرے میں تھیں اور ان کے ساتھ پاپا بھی تھے جب کہ سلامہ شاہ کہیں نہیں تھا۔

"کیسی طبیعت ہے اب آپ کی بیٹا؟" مجھے پکارتے ہوئے ان کا لہجہ پرتکلف انداز ہوتا تھا۔ انہوں نے متوجہ دیکھ کر پوچھا تو میں ان کے اس قدر نارمل انداز پر سر ہلا گئی۔ اب تلخ سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر سرائیت کر گئی تھی اور ساتھ ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

میرے مکمل طور پر صحت یاب ہوتے ہی مجھے ڈسچارج کر دیا گیا۔ اس دوران سلامہ شاہ دوبارہ نہیں آیا تھا اور اس کے نہ آنے پر میں نے سکھ کی سانس لی۔ ورنہ اپنے جذبات و کیفیات پر قابو پانا میرے لیے مشکل ہو جاتا تھا۔ خوامخواہ میرا ذہن بھٹکنے لگتا تھا اور خود بخود میرے دل و دماغ میں نفرت کے جھکڑ چلنے لگتے تھے۔

طبیعت سنبھلی تو میں یونیورسٹی جانے لگی۔ میری تعلیم متاثر ہو رہی تھی۔ میں اکنامکس میں ماسٹر کر رہی تھی۔

سارا دن یونیورسٹی میں گزار کر گھر لوٹی تو فاطمہ ماما کھانا ٹیبل پر سجائے میری اور پاپا کی منتظر تھیں۔ ٹیبل پر کافی اہتمام کر رکھا تھا۔ لباس بدل کر اور نماز ادا کر کے ابھی میں ٹیبل پر پہنچی ہی تھی کہ کال بیل بجی۔ ماما مجھے کھانے کا کہہ کر چلی گئیں۔ میں ابھی پلیٹ میں سالن ڈال رہی تھی جب ماما کے ساتھ سلامہ شاہ کو دیکھ کر میرا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"السلام علیکم..... " مسکرا کر اس نے مجھے کہا تو میں بس سر جھکا گئی۔

"آپ بیٹھیں نا، رہبان بھائی نے مجھے کال کر دی تھی اسی لیے میں نے ڈنر کا اہتمام کر لیا۔ وہ کچھ آفس ورک کی وجہ سے لیٹ ہو جائیں گے۔ آپ بیٹا بیٹھیں اور کھانا شروع کریں۔ وہ تھوڑی دیر میں پہنچ جائیں گے..... " ماما کے انداز سے محسوس ہوا کہ اس شخص کو پاپا نے مدعو کیا تھا۔ میرا دل برا ہوا۔ وہ میرے سامنے ہی ٹیبل پر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ میرا کوفت سے برا حال ہو گیا۔ میں پہلو بدل کر رہ گئی۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے اب مادرا!..... " ماما نے اسے سالن ڈال کر دیا تو کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔ میرے چہرے کے اعصاب بھی کشیدہ ہو گئے تھے۔ جب کہ ماما کچن سے نکل گئی تھیں۔

"ٹھیک ہوں..... تھینکس..... " کڑواہٹ میرے لہجے سے صاف عیاں تھی۔

وہ میرے کڑوے لہجے پر مسکرا دیا اور اس کی مسکراہٹ دیکھ کر میرا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔

"اسٹوپڈ کہیں کا..... " میں دل ہی دل میں کڑھی۔

"انکل بتا رہے تھے کہ تم اکنامکس کی اسٹوڈنٹ ہو۔" کچھ توقف کے بعد اس نے پھر پوچھا۔ اسے یا تو میرے چہرے کے تاثرات نظر نہیں آ رہے تھے یا پھر جان بوجھ کر بھی انجان بن رہا تھا۔ خوامخواہ بے تکلف ہونے کے چکر میں تھا۔ میں اور تپ گئی۔

"جی..... میں..... " اندر ہی اندر کڑھ کر رہ گئی۔ ادھر سے ادھر پہلو بدلا۔ اس شخص کی موجودگی میرے لیے ناقابل برداشت تھی جلدی جلدی نوالے لینے لگی۔ ماما نہ جانے کہاں رہ گئی تھیں ابھی تک نہیں لوٹی تھیں۔

"اسٹڈی کیسی جا رہی ہے تمہاری..... " وہ شاید میرے ضبط کی حد دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے گھورا۔ میں کھانے سے ہاتھ کھینچ چکی تھی۔ کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میری ذات یا میری اسٹڈی سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے مسٹر سلامہ شاہ۔ آپ اپنے انکل کے مہمان ہیں اسی حد تک محدود رہیں تو بہتر ہے۔" پھنکار کر غصے سے کہتے مجھے اس کے قریب سے ہو کر باہر نکلنا تھا جب اس کے قریب سے گزرتے اس نے میری کلائی تھام لی تو میں ششدر سی پلٹی۔ بے یقینی سے اس پر نظر ڈالی۔ ایک دم سنجیدہ چہرہ لیے وہ مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ آج تک کسی کے اندر اتنی جرأت نہاں ہوئی تھی کہ مجھے انگلی سے بھی چھو لے اور یہ شخص......

"اوہ..... چھوڑو میرا بازو..... " احساس توہین اور ذلت سے میرا دل زمین میں گڑ جانے کو جی چاہا۔ ایک دم ہاتھ کھینچا تھا۔ اگلے ہی لمحے میرا ہاتھ اٹھا تھا کچھ بعید نہیں تھا کہ میرا ہاتھ اس پر اٹھ جاتا کہ تبھی اس جسارت پر اس کا حشر بگاڑ دیتی مگر اسی دوران فاطمہ ماما کچن میں داخل ہوئیں ان کے ہمراہ پاپا بھی تھے۔

"معاف کرنا بیٹا کچھ دیر ہو گئی..... " پاپا سلامہ شاہ سے کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں اس پر ایک ایک زہر بھری نظر ڈال کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

رات کو کھانا تیار کرنے کے لیے میں کمرے سے باہر نکلی تو کچن میں داخل ہوتے ہی پہلا سامنا اسی سے ہوا۔ میں تو سمجھی تھی کہ وہ چلا گیا ہوگا مگر اسے اس قدر بے تکلفی سے کچن میں چائے بناتے دیکھ کر حیران ہوئی نجانے ماما کہاں تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میرے چہرے کے زاویے خود بخود بدل گئے۔

"ہیلو..... کیسے مزاج ہیں اب..... دوپہر کو تو بڑی گرما گرمی والی کیفیت تھی۔" اسے نظر انداز کر کے میں فریج سے رات کے کھانے کا سامان نکالنے لگی۔ مجھے ایک دم غصہ آ گیا گویا جان ہی تو جل گئی میری اس کی اس قدر بے تکلفی پر۔

"شٹ اپ..... " میں پلٹ کر پھنکاری۔ "میں تلملاتے ہوئے تمام چیزیں لے کر ٹیبل پر جا بیٹھی۔ وہ میرے اس قدر آگے بگولا انداز پر متبسم تھا۔ میں جل کر رہ گئی جب سے آیا تھا میرا جی جلا رہا تھا۔

"اتنا غصہ..... وہ بھی مجھ ناچیز سے..... ویسے اتنی نازک سی ہو تم..... اس قدر غصہ کرنے سے مزید غضب ڈھانے لگتی ہو۔" وہ بھی اپنے مگ میں چائے لے کر میری طرف آ گیا۔

"سلامہ شاہ..... " میں حیرت سے گنگ رہ گئی۔ کس قدر بے تکلفی پر اتر آیا تھا یہ شخص۔

"میں جب سے آیا ہوں۔ تمہارا یہی مزاج دیکھ رہا ہوں جب کہ فاطمہ ماما تعریفیں کرتی نہیں تھکتیں تمہاری۔ ویسے غصے کے علاوہ اور کیا مشاغل ہیں تمہارے۔" اس نے حد ہی تو کر دی تھی۔

"بکواس بند کرو..... میں پاپا کی وجہ سے آپ کو برداشت کر رہی ہوں اگر مزید آپ نے کوئی بے ہودگی کی تو میں آپ کا

سر پھاڑ دوں گی..... " بے بسی کی حد ہی تو تھی۔ میں تلملا کر ایک دم ہونٹ بھینچ گئی وہ مسکرا کر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ میرا وجود ان پر نفرت سے جلنے لگا۔

" آپ کا پاپا سے رشتہ ہے اس کو اسی تک رکھیں..... میں آپ لوگوں کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

" کیوں ایسا کیا گناہ کر دیا ہے ہم لوگوں نے؟ تم کزن ہو میری سگی بہت قریب تعلق ہے ہمارا..... تمہارے کہہ دینے سے رد تو نہیں ہو جائے گا۔" وہ بہت ہی سنجیدہ ہو کر کہہ رہا تھا۔ میرے چہرے پر خود بخود اس کے الفاظ سے استہزائیہ مسکراہٹ آ ٹھہری۔

" بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہیں مسٹر سلامہ شاہ آپ تو۔" اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں مسکرا دی جب کہ میری آنکھوں میں صرف نفرت ہی نفرت تھی۔ " آپ کی کزن وہ بھی میں یعنی ماورا رہان غفار شاہ۔ کیا مذاق ہے زبردست بھئی..... " اب میں باقاعدہ ہنس رہی تھی۔ " میں ماورا اس ساری کی بیٹی ہوں جو آپ جیسے اعلیٰ حسب نسب والے خاندان کے لیے کلنک کا ٹیکا ثابت ہوئی تھیں..... حیرت ہے بھول گئے آپ تو..... جب کہ مجھے تو اچھی طرح ازبر ہے کہ اعلیٰ حسب نسب والا خاندانی خون ہے آپ کا تو جس میں میری ماں اور میری وجہ سے ملاوٹ ہو جاتی تھی..... چچ چچ چچ ..... " ہنسی کی بجائے اب میرے لہجے سے نفرت ہی نفرت جھلک رہی تھی وہ لب بھینچے مجھے دیکھ رہا تھا۔

" آپ نے بھی کیا خوب لطیفہ سنایا ہے۔ میں آپ کی عم زاد ہوں یعنی گہرا تعلق ہے میرا آپ سے..... یہ بھی خوب کہی آپ نے..... " پھر میری ہنسی شروع ہو گئی اور رکنے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں نے برسوں پہلے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت دیکھی تھی۔ اس کے لہجے میں سارے نفرت کے زہر کو چکھا تھا اور اسی زہر نے میرا روم روم نیلا کر دیا تھا اور اب اچانک ' یہ کزن ' والی بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

" بس کرو ماورا..... یہ کیا بے ہودگی ہے..... " میرے مسلسل ہنسنے پر آخر کار وہ چیخ اٹھا اور میں یہی چاہتی تھی ایک دم ہنسی ضبط کیے اسے زہر بھری نظروں سے گھورا۔

" بے ہودگی نہیں سلامہ شاہ! حقیقت ہے۔ جسے آپ بھول رہے ہیں۔ کیوں مجھے میری اوقات سے باہر نکال رہے ہیں آپ۔ محترم! جب کہ میں اپنی حدود اور قیود اچھی طرح پہچانتی ہوں اور میرا آپ کو بھی مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ بھی اپنی اوقات اچھی طرح جان لیجئے۔ ورنہ حد سے تجاوز کریں گے تو منہ کے بل گریں گے۔ اونچے حسب نسب والے اعلیٰ خاندان کے پاک و صاف خون ہیں۔ کیوں آپ محترم مجھ گناہ گار کو مزید گناہ گار کر رہے ہیں۔"

زہر بھرے انداز میں اس کی آنکھوں میں بے خوفی سے آنکھیں گاڑ کر کہتے میں نے دس سال کی عمر میں حویلی میں گزارے ان چند دنوں کا قرض اتارا جنہوں نے میری روح کو نفرت کے تیروں سے گھائل کیے رکھا تھا۔

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا تھا پھر ایک گہری سانس خارج کرتا وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کے چلے جانے پر میں نے سر جھٹکا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مزید کچھ کہے گا مگر اس کے یوں بغیر کچھ کہے چلے جانے پر مجھے حیرت ہوئی۔

سلامہ شاہ ہوٹل چھوڑ کر اب یہیں رہنے لگا تھا۔ میرے ہی گھر میں رہتے میرے ہی سامنے مالکانہ حقوق کا استعمال کرتے وہ مجھے مزید زہر لگنے لگا تھا۔ اس کی وجہ سے میں نے خود کو مزید مصروف کر لیا۔ میری پوری کوشش ہوتی تھی کہ اس سے کم سے کم سامنا ہو۔ بعض اوقات یونیورسٹی میں کلاسز کے بعد بھی لائبریری میں بیٹھی رہتی۔ گھر آتی تو کمرے میں بند ہو جاتی۔

اس دن میں روٹین سے کچھ لیٹ ہو گئی تھی بھاگم دوڑ میں تیار ہو کر گھر سے نکلی تو وہ بھی پاپا کی گاڑی لیے کہیں جانے کو تیار تھا۔ میں اسے نظر انداز کر کے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی مگر چند منٹ بعد ہی اس نے گاڑی میرے قریب ہی لا کر روک دی۔

" یونیورسٹی جا رہی ہو..... ڈراپ کر دوں گا..... " دروازہ کھول کر اس نے مجھے آفر کی۔ میں نے اسے

دیکھا۔ اس دن کے بعد ہمارا سامنا بہت کم ہوا تھا لیکن مخاطب صرف چند ایک بار ہی ہوئے تھے۔ اس کے باوجود اس کے رویے میں میری کسی بات کا اثر نہ تھا۔

" نو تھینکس..... یہ میرا روزانہ کا معمول ہے..... میں بآسانی چلی جاؤں گی..... " کھردرے لہجے میں انکار کر کے میں نے اس سے مزید الجھے آگے بڑھنا چاہا تو اس کی بات پر رک گئی۔

" یہ ہر وقت کی " انا " بھی اچھی نہیں ہوتی ماورا ڈیئر..... ماضی میں جو بھی ہوا اس میں نہ تو میرا قصور تھا اور نہ ہی تمہارا..... کبھی غصے سے نکل کر بھی دیکھ لیا کرو..... تمہاری صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔" مسکرا کر آنکھوں میں شرارت لیے وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرا تو برا حال ہونے لگا۔

" شٹ یور ماؤتھ..... آپ کو کوئی حق نہیں میری ذات پر یوں کمنٹس پاس کریں۔" تڑخ کر میں نے کہا۔ وہ کھل کر ہنسا۔ میرا خون کھول اٹھا۔

" حق کی بھی تم نے خوب کہی ماورا! سگی عم زاد تو ہو ہی..... مزید رشتہ بنانے میں دیر نہیں لگے گی۔ بشرطیکہ تم بھی اپنے دل میں تھوڑی سی گنجائش پیدا کر لو..... "

میں غصے میں آگے بڑھ آئی تھی۔

سارا دن یونیورسٹی میں میرا جلتے بھنتے گزرا۔ اس کی اس قدر جرأت اور فضول بات پر کھل کر رونے کو جی چاہا..... پیریڈ آف ہوتے ہی میں لائبریری میں چلی آئی۔ عجیب سی کیفیت سوار تھی مجھ پر۔ وہ ذکر اس کے الفاظ میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ میں بچی تو نہ تھی جو اس کے لفظوں کا مفہوم نہ سمجھتی۔ میں سارا وقت لائبریری میں بیٹھی رہی۔ گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا پھر وہاں تھا کون جو میری راہ تکتا سوائے فاطمہ ماما کے جب کہ پاپا کو میرے وجود سے نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ رغبت۔ تو پھر وہاں جا کر میں کیا کرتی۔ ایک لمحے کو میرا دل شدت سے چاہا کہ میں یہاں سے کہیں چلی جاؤں کسی ایسی جگہ جہاں کسی انسان کا وجود تک نہ ہو۔ کیسی بے بسی تھی۔ کتنی بار میری آنکھیں بہہ گئیں اور کتنی بار میں نے چپکے سے صاف کر لیں۔ یہ پبلک پلیس تھی کھل کر رویا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یونہی بیٹھے بیٹھے نجانے کتنا وقت گزر گیا۔

" اس طرح فرار اختیار کرتا کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہوا کرتا..... مل بیٹھ کر مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ یوں چھپ چھپ کر رونے سے بہتر ہے کہ آپ کسی اپنے کے پاس بیٹھ کر کھل کر رو لیں اپنا دکھ کہہ لیں۔ یہ فرار آپ کو سوائے منظر عام پر لانے کے کچھ نہیں..... " ابھی میں بھیگی آنکھوں سمیت وقت کا تعین ہی نہیں کر پائی تھی۔ جب اس آواز کے برعکس آنکھیں استہزائیہ انداز میں میرے ضبط کو جھنجھوڑ گئی تھیں اور ان الفاظ .....

" آپ..... یہاں..... " مجھے تو توقع نہیں تھی کہ وہ یہاں کہیں ہو گا۔ وہ مسکرا کر اپنے دونوں ہاتھ ٹیبل پر جما کر میری آنکھوں میں بغور دیکھتے ٹیبل پر جھک گیا تھا۔

" فاطمہ آنٹی نے بھیجا تھا تمہیں تلاش کرنے کو..... بقول ان کے کہ آج سے پہلے کبھی تم اتنی دیر گھر سے غائب نہیں ہوئیں۔ انہی کی نشاندہی پر میں سیدھا یہاں پہنچا ہوں اور شکر ہے تم مل گئیں ورنہ مجھے خوار ہونا پڑتا..... " اب وہ سیدھا کھڑا اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں بغیر کچھ کہے اپنی چیزیں اٹھا کر وہاں سے نکل آئی یہ دیکھے بغیر کہ وہ بھی آ رہا ہے یا نہیں۔ روڈ کراس کر کے میں اسٹاپ کی طرف جا کر بس روٹ دیکھنے لگی۔ سلامہ شاہ گاڑی لیے منتظر تھا۔ میں نظر انداز کر گئی۔ تبھی وہ گاڑی لے کر میرے قریب آ کر رک گیا۔

" چلو آ کر بیٹھو..... " دروازہ کھول کر وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے میں فوراً بیٹھ جاؤں گی۔ غصہ تو بہت آیا مگر میں لب بھینچے کھڑی رہی۔

''ماورا..... '' وہ گاڑی سے نکل آیا۔ '' مانا کہ ماضی میں ہم سے بہت سی غلطیاں ہوئیں مگر ہر وقت حال کا ماضی کے تناظر میں جائزہ لینا عقل مندی نہیں کہلاتا..... مانا کہ تم مجھ سے شدید نفرت کرتی ہو اتنی کہ میری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی مگر میں تو تم سے نفرت نہیں کرتا۔ میں تو ہر وقت تمہاری صورت دیکھنا چاہتا ہوں یہ کیوں نہیں سمجھتی..... '' اس کے اس غیر سنجیدہ انداز پر میں نے تڑپ کر اسے گھورا۔

''اس طرح گھورنے سے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس وقت میں خود نہیں آیا بلکہ بھیجا گیا ہوں۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے یوں ہی سڑک پر کھڑے ہو کر تمہاری منتیں کرنے کا..... اب میرا وقت ضائع نہیں کرو..... اتنا فالتو نہیں ہوں کہ تمہارے نخرے برداشت کروں..... '' وہ اب بھی بانک رہا تھا۔ میرا ضبط سے برا حال تھا۔ کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

''اوہ بیوٹی فل کپل..... '' میں اسی طرح کھڑی تھی جب ایک ویسٹرن لڑکی اپنی ستائشی نظروں سے سراہتی بے باکی سے کمنٹس پاس کرتی آگے بڑھ گئی۔ سلامہ شاہ تو ایک دم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ جب کہ میرا خفت سے برا حال ہو گیا۔ میرا چہرہ تپش سے جلنے لگا۔

تم اگر نہیں چاہتی کہ ایسا مزید کوئی جملہ ہم سنیں تو پلیز مزید وقت ضائع کیے بغیر اندر بیٹھو۔ ورنہ ارد گرد لوگوں کو تم دیکھ ہی رہی ہو کہ کیسے ہمیں سراہ رہے ہیں..... '' احساس توہین کی انتہائی گہرائی کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے اطراف میں نگاہ دوڑائی تو واقعی بہت سی نظروں کو خود پر جمے دیکھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں اندر بیٹھ گئی۔

''سنیے میں آپ کو پہلے بھی کہہ چکی ہوں آپ کا تعلق صرف پاپا سے ہے۔ اپنی حد تک محدود رہیں تو بہتر ہے۔''

''گاڑی سلو رفتار سے چل رہی تھی جب میں نے کسی شوخ سی دھن پر بجنا کر کہا۔

''نہ بے نصیب..... کچھ تو کفر توڑا..... ورنہ لگتا تھا کہ آج زبان تک ہی بھول گئی ہو۔'' محظوظ انداز میں میرے اس طرز عمل سے وہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''پلیز سلامہ شاہ انتہا ہوتی ہے کسی چیز کی۔ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو..... '' اب کے میرے انداز میں بے بسی و لاچارگی تھی۔ وہ چہرہ موڑ کر مجھے بغور دیکھنے لگا۔

''میں آپ کو صاف صاف کہہ رہی ہوں۔ آئندہ میرے رستے میں آنے کی قطعی ضرورت نہیں۔''

''اور میں بھی تمہیں کہہ رہا ہوں۔ میرا ہر رستہ تم تک ہی آئے گا۔ تم پہلی نظر سے ہی مجھے اچھی لگی ہو اور مجھے بہت کم چیزیں یوں اٹریکٹ کرتی ہیں۔'' گاڑی روک کر وہ کہہ رہا تھا۔ میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''میں کوئی چیز نہیں ہوں۔ جیتی جاگتی انسان ہوں۔''

''ہوں..... پھر محبت تو واقعی جیتے جاگتے انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔'' وہ ابھی بھی غیر سنجیدہ تھا۔ شوخ سی مسکراہٹ تھی لبوں پر۔

''کیا بکواس ہے یہ..... شرم آنی چاہیے آپ کو ایسی باتیں کرتے ہوئے۔'' اس کے لفظ ''محبت'' استعمال کرنے پر میرا ضبط جواب دے گیا تھا۔ میری ذات کے کبھی پرخچے اڑانے والا آج مجھ سے محبت کی بات کر رہا تھا۔ ''ہونہہ آپ محبت کریں گے مجھ سے۔ نفرت کرتی ہوں میں آپ سے اور آپ کے پورے خاندان سے۔ میں آج بھی وہی ماورا ہوں، جسے انتہائی حقارت سے اپنی حویلی کی چار دیواری میں کھڑے ہو کر آپ نے کہا تھا کہ میں اپنی اوقات سے آگے مت بڑھوں۔ وہی ماورا ہوں پھر آپ کیسے بھول گئے۔ جب کہ میں نے ہر لمحے ان کی بازگشت اپنے اندر محسوس کرتے نفرت کے پودے کو جو آپ کی ہی دین تھا پروان چڑھایا ہے اور اب آپ بات کرتے ہیں محبت کی۔ مجھے وہ سب یاد ہے۔ نفرت و اذیت کے زہر میں ڈوبا آپ کا کہا گیا ایک ایک لفظ۔ میں بھی اپنی

توہین نہیں بھولوں گی اور آپ نے ہی سلامہ شاہ مجھے اپنی حدود میں رہنے کی تلقین کی تھی اور اب آپ خود حدود کو پار کر رہے ہیں۔'' بھرائی ہوئی چیختی آواز میں بمشکل سب کہہ پائی۔

''ماورا..... میں نادم ہوں۔ جو بھی کہا وہ بہت جذباتیت میں کہا تھا بالکل نا سمجھی میں۔ تب میں بابا جان کے زیر اثر تھا۔ اب ایسی کوئی بات نہیں..... میں سب اچھی طرح دیکھنے اور سمجھنے لگا ہوں' اب حقیقت آنکھیں بند کر کے دیکھنے کے بجائے آنکھیں کھول کر قبول کرنے لگا ہوں۔''

''مجھے آپ کی کوئی معذرت نہیں چاہیے نہ ہی آئندہ آپ میرے سامنے ایسی باتیں کریں گے۔ میں اگرچہ یہاں پلی بڑھی ہوں مگر میری تربیت جن ہاتھوں میں ہوئی ہے۔ انہوں نے مجھے ان لغویات سے نفرت کرنا ہی سکھایا ہے۔ آپ کچھ بھی کہیں مگر اپنے ماضی سے جدا نہیں ہو پائیں گے۔ لاکھ تاویلیں گھڑ لیں مگر میری نفرت تو ختم نہیں ہوگی۔''

بات ہی ختم کر کے میں باہر دیکھنے لگی۔ وہ بھول سکتا تھا مگر میں نہیں..... اس کے بعد ہمارے درمیان بالکل خاموشی رہی تھی۔ وہ مجھے گھر چھوڑ کر چلا گیا اور میں نے اس کے اتنی جلدی ٹل جانے پر شکر ادا کیا۔

سلامہ شاہ کچھ دن سے میرے رویوں سے مایوس ہو کر شاید اپنی دھن بدل گیا تھا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا۔ ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ اگر وہ باز نہ آیا تو میں پاپا سے ضرور شکایت کر دوں گی۔ مجھے اس کا بار بار اپنی راہ میں آنا اور یوں اظہار کرنا صرف فراڈ ہی لگ رہا تھا۔ شاید اپنے ماضی میں موجود روا رکھے گئے رویوں کی وجہ سے اب کسی طرح مجھ کو تکلیف پہنچانا مقصود تھا۔ مجھے تو اس کی یہ محبت صرف اور صرف زچ کرنے کا ایک انداز لگ رہی تھی۔

پاپا اپنے آفس میں تھے فاطمہ ماما گھر یلو خریداری کرنے گئی ہوئی تھیں۔ یونیورسٹی سے آ کر میں گھر پر تنہا تھی۔ کچھ دن سے سلامہ شاہ بہت مصروف رہنے لگا تھا۔ فاطمہ ماما سے ہی علم ہوا کہ وہ جس کام کے لیے آیا ہوا تھا اس کا آفس سیٹ ہو چکا ہے اب وہ جلد ملک واپس چلا جائے گا۔ کال بیل کی آواز پر میں نے دروازہ کھولا تو سلامہ شاہ کو سامنے دیکھ کر حیران ہی ہوئی۔ چند دن سے وہ اس وقت گھر میں کم ہی آتا تھا جب کہ آج تو لنچ ٹائم بھی اوور ہو چکا تھا۔

''السلام علیکم..... '' وہ اندر آ گیا۔ میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی وہ بھی پیچھے ہی چلا آیا۔

''ماورا..... '' میرے یوں نظر انداز کرنے پر اس نے ایک دم میرا بازو تھام کر اپنی جانب کیا۔

''سلامہ شاہ! پلیز اپنی حد میں رہیں..... آئندہ مجھے ہاتھ لگانے کی غلطی نہ کرنا ورنہ میں سچ مچ تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔''

اس کی بدتمیزی پر میرا دماغ تو کھول ہی اٹھا۔

''حد میں ہی تو ہوں ماورا ابھی تک..... ورنہ جس چیز کو میں ایک دفعہ اپنے لیے پسند کرتا ہوں اس کے لیے مجھے کبھی اتنا خوار نہیں ہونا پڑتا۔ وہ لمحوں میں میرے قبضے میں ہوتی ہے مگر تم مسلسل مجھے خوار کر رہی ہو۔'' تحکم و نخوت لیے وہ کہہ رہا تھا۔

''مگر سلامہ شاہ! چیزوں اور انسانوں میں بہت فرق ہوتا ہے اور شاید آپ کو اس فرق کا اندازہ نہیں تبھی میرے سامنے اپنی خاندانی فطرت کا مظاہرہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

مگر یاد رکھیں میں آپ کے بابا جان کی جاگیر نہیں جس پر آپ اپنا حق جتائیں۔'' میرا لہجہ زہر خند تھا۔ وہ لب بھینچے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''جانتا ہوں..... مگر تم میرے جذبات کو کیوں نہیں سمجھ رہیں..... '' اپنے لہجے کو کنٹرول کر کے کچھ دھیمے پن سے کہا تو میں خاموش رہی۔ بار بار ایک ہی بات کو دہراتے اب مجھے خود بھی کوفت ہونے لگی تھی۔

''ماورا..... '' وہ میرے سامنے آ کر میرے چہرے پر بکھرے بالوں کو پیچھے ہٹاتے مسکرا رہا تھا۔ میں ساکت سی اس کی

جرأت پر گنگ رہ گئی۔ کتنا وحیات تھا یہ شخص۔

"میرے پاس بہت کم دن رہ گئے ہیں۔ میرا کام ختم ہو چکا ہے تقریباً..... تم اگر......"
اس کے ہاتھ کو جھٹک کر میں نے اپنے آپ کو کچھ بھی کہنے سے روکا۔

"ماورا..... "میری لاتعلقی پر وہ زچ ہو گیا۔

"بہت وحیات انسان ہیں آپ..... بڑا دعویٰ ہے آپ کو کہ محبت کرتے ہیں مجھ سے۔ کیا ہے محبت آپ کی۔ صرف مجھے جھکانا۔ درحقیقت میں نے پہلی ہی نظر سے آپ کی نفی کی تھی اور آپ کو یہی بات ہضم نہیں ہو رہی۔ میری نفرت کے جواب میں میری انا اور نسوانیت کو پامال کرنے کو محبت کہتے ہیں۔ کیا خوب ناٹک رچا رہا ہے آپ نے..... مگر افسوس میں آپ کے لیول کی لڑکی ہوں ہی نہیں۔ مجھے آپ جسٹ ٹائم انجوائے منٹ استعمال کر لیں۔"

"ماورا..... ماورا..... غلط سمجھ رہی ہو تم..... انتہائی غلط سوچ ہے تمہاری۔"

"تو درست کیا ہے۔ آپ بتا دیں..... "میرا لہجہ طنزیہ اور استہزائیہ تھا۔

"درست یہی ہے کہ میں دل کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ صرف تمہاری ہاں کا منتظر ہوں تا کہ میں پاکستان جا کر اپنے والدین سے تمہارے حوالے بات کر سکوں مگر اس سے پہلے میں تمہارے اپنے متعلق تمام گلے شکوے دور کرنا چاہتا ہوں۔ تم جس خود ساختہ نفرت میں جکڑی بیٹھی اور سوچا اور سمجھا ہی نہیں چاہتیں۔ وہ تمام غلط فہمیاں دور کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے گزشتہ تمام رویوں کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ بشرطیکہ تم تحمل سے میری بات سنو تو سہی۔" وہ انتہائی زچ انداز لیے کہہ رہا تھا اور میں نے اس کی تمام باتیں سن کر کوفت بھرے انداز میں اسے دیکھا۔

"اگر میں آپ کے رویوں کو بھول کر آپ کی باتوں پر یقین کر بھی لوں تو سلامہ شاہ حقیقت ہے کہ آپ کا خاندان مجھے کبھی قبول نہیں کرے گا۔ سلامہ شاہ آپ کے اونچے حسب نسب کے دعویدار بابا جان کی انا بلبلا اٹھے گی۔ بڑا مان ہے انہیں اپنے اعلیٰ خاندانی خون پر..... تو وہ میرا خون کیسے برداشت کریں گے۔ بتائیں آپ پھر کیا کریں گے۔"

"اول یہ کہ وہ صرف میرا خاندان ہی نہیں تمہارا بھی خاندان ہے۔"

"ہاں ضرور ہوتا اگر وہ میری ذات کی نفی نہ کرتے مجھے اپنے اعلیٰ خون ہونے کا احساس نہ دلاتے میں ضرور خود کو ان سے منسلک کر لیتی اگر درمیان میں کچھ نہ ہوتا..... "میرے جواب پر اس نے ایک گہری سانس لی تھی اور ساتھ ہی مجھے یوں دیکھا جیسے میرا دماغ لاعلاج ہو۔

"تو تم طے کیے ہوئے ہو کہ اپنا دل صاف نہیں کرو گی۔"

"نہیں ضرور کروں گی جب آپ کے بابا جان مجھے قبول کر لیں گے تب بات بنے گی۔ تب آپ کے متعلق میں کوئی جواب دوں گی۔ قبل از وقت کچھ بھی نہیں۔" کچھ دھیمے پڑتے میں نے کہا۔

"میں انہیں راضی کر لوں گا اور مجھے یقین ہے وہ ضرور راضی ہوں گے..... "اس کا لہجہ پرعزم تھا۔

مجھے بہت برا لگا تبھی میں استہزائیہ ہنس دی۔

"ہونہہ..... وہ راضی ہوں گے..... میں آپ کے خاندان کو اچھی طرح جانتی ہوں سلامہ شاہ! آپ نفرت کے پاگلوں پر ایک ناقص عمارت تعمیر کرنے کے صرف خواب بن رہے ہیں جب کہ میری ایسی کوئی حماقت کرنے کی خواہش نہیں۔ جس شخص نے پچیس سال گزرنے کے باوجود اپنے بیٹے کو معاف نہیں کیا۔ وہ شخص مجھے کیسے قبول کرے گا۔ بہت بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہیں آپ تو..... "نخوت سے سر جھٹکتے میں اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ لاک کر گئی تھی کہ اس بحث کا کوئی حل نہیں۔

اب تو شاید سلامہ شاہ نے بھی ہار مان لی تھی۔ اس دن تفصیلی گفتگو کے بعد اس نے دوبارہ اس موضوع کو نہیں چھیڑا۔ اول تو ہمارا سامنا ہی کم ہوتا تھا اگر کبھی ہو بھی گیا تو میں فوراً وہاں سے ہٹ جانے کی کوشش کرتی تھی۔ یہاں لندن میں اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ وہ واپس جا رہا تھا۔ ٹکٹ کنفرم ہو چکی تھی۔ پاپا اس کے چلے جانے کے احساس سے ہی رنجیدہ ہو رہے تھے جب کہ میں پرسکون ہو گئی تھی۔ خوامخواہ میں اپنے گھر میں ہی محتاط ہو کر رہ گئی تھی۔

سلامہ شاہ کی کل رات کی فلائٹ تھی۔ آج وہ سارا دن گھر پر ہی تھا۔ چھٹی کا دن تھا میں اور پاپا بھی گھر پر ہی تھے۔ فاطمہ ماما سے اس نے اپنی پیکنگ کر دینے کو کہا تھا۔ وہ گھر سے نکلا تو ماما نے مجھے آلیا اور کہا۔

"ماورا! سلامہ شاہ نے مجھے سامان پیکنگ کر دینے کو کہا تھا مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ تم ہی میرے ساتھ آ جاؤ....."

میں چپل مرچنگ کر رہی تھی۔ انکار کرنا چاہا پھر خاموش ہو گئی۔ اب وہ اس عمر میں بے چاری تنہا کیا کیا کرتیں سارا گھر تو سنبھالا ہوا تھا انہوں نے۔ وہ مجھے چیزیں پکڑاتی گئیں اور میں ترتیب سے پیکنگ کرتی گئی۔ انہوں نے مجھے ایک فائل پکڑائی اسی وقت کال بیل بجی۔

"تم کام کرو میں دیکھتی ہوں..... "مجھے اشارہ کر کے وہ باہر نکل گئیں۔ میں فائل کے اندر موجود کاغذات کو ترتیب دینے لگی تمام آفیشل پیپرز تھے تبھی کاغذات کے اندر رکھی کتنی تصاویر میرے ہاتھوں میں آ گئیں۔ وہ ساری کی ساری میری تصاویر تھیں۔ میں حیران تھی سب کی سب وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پر لی گئی تھیں بچپن سے لے کر اب تک کی کئی تصاویر کچھ یونیورسٹی کی تھیں اور کچھ گزشتہ سالوں کی۔ نجانے اس کے ہاتھ کیسے لگ گئیں۔

ان وحشتی آنکھوں میں ایک تصور بسا رکھا ہے
اس دل کی ہر تمنا میں بس تیرا نام ہوا
مت پوچھ اے جان دلبر! حال اس بے حال کا
کبھی تھا جو وہ بہت فرحاں اب اکثر رات بھر وہ رویا ہے

ایک تصویر کی پشت پر یہ اشعار درج تھے یہ اشعار پڑھنے کے بعد میں ابھی خیر تو کی سے منتشر میں غرق تھی کہ جب پشت سے ہاتھ بڑھا کر کسی نے یہ تمام تصاویر کھینچ لی تھیں۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ خونخوار چہرہ لیے کھڑا گھور رہا تھا۔

"میرے سامان کی اس طرح تلاشی لینے کا تمہارا کیا مقصد تھا؟....." وہ پوچھ رہا تھا اور میں اس کے یوں الزام لگانے پر تپ چڑھ گئی۔ "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔"

"یہ تصاویر..... "فی الحال لڑنے جھگڑنے کے بجائے میرا ذہن اسی میں الجھا ہوا تھا۔

"تمہاری ہیں..... "آرام سے بتا کر اس نے تمام تصاویر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں منتقل کیں۔

"میں اندھی ہوں جو مجھے اپنی صورت دکھائی نہ دی۔ یہ آپ کے پاس کیا کر رہی ہیں؟"

تصاویر پر قبضہ جمانے سے مجھے طیش آ گیا تھا۔

"کم از کم یہ بے جان تصاویر میرا کوئی کام کرنے یا باتیں کرنے سے تو رہیں۔ البتہ تصویر والی کبھی کبھار میرے تصور میں آ کر میرے تنہا راتیں ضرور آباد کر دیتی ہے۔ اکثر تو سینے پر سر رکھ کر..... "اس وقت مجھے اس سے اس گھٹیا جواب کی قطعی توقع نہ تھی اوپر سے اس کی جسم میں آگ لگا دینے والی مسکراہٹ شرم و حیا تو جیسے اس میں تھی ہی نہیں۔ یوں گھور رہا تھا کہ گویا آنکھوں سے ہی نگل لے گا۔ میرا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ شرم سے برا حال تھا۔

"واپس کریں شرافت سے میری تصویریں....."

''نکال سکتی ہو تو نکال لو......'' جیب کے اوپر ہاتھ رکھ کر تھپتھپاتے ہوئے مسکرا کر چیلنجنگ انداز میں گویا تھا۔

تمام شرم و حیا گویا گھول کر پی گیا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے پرخچے اڑا دوں۔

''ڈوب مرو تم..... اچار ڈال لیجیے گا ان تصویروں کا مگر یاد رکھیں آپ کے یہ حربے اور ایسی باتیں میرے دل میں مزید شدید نفرت پیدا کریں گی۔''

میں پھٹ ہی تو پڑی تھی۔ اس کی اس قدر عامیانہ نظریں مزید برداشت سے باہر تھیں۔ وہ یکدم میرے قریب آ گیا۔

''بہت توہین کی ہے تم نے میرے جذبوں کی..... تمہارا کیا خیال ہے میں کوئی گرا پڑا اور فطرت طبیعت کا حامل ایک جذباتی انسان ہوں..... نہیں مادرا ڈیئر..... میں کبھی عام سے عام چیز کے لیے بھی اپنے معیار سے نہیں گرا اور تم سے محبت کرنا میری زندگی کی سب سے پہلی اور بڑی حماقت ہے۔ کبھی کسی کے سامنے اس طرح اپنا دعا بیان نہیں کیا۔ تم نے ہر بار میری پیش رفت پر میری تضحیک کی۔ میری بے لوث محبت پر شک کیا۔ یوں مذاق اڑایا۔ مگر اب نہیں..... میں بار بار اگر تمہاری راہ میں اپنے مقام و مرتبے کو بھول کر حائل ہوا بھی ہوں تو صرف اس لیے کہ شاید اسی طرح تمہارے دل سے نفرت کا رنگ اتر جائے مگر اب مزید نہیں..... محبت تم سے کی ہے اور شادی بھی تم سے ہی کروں گا وعدہ ہے میرا۔

تم سے..... اپنی عزت نفس کو کچل کر مردانگی وانا کو پس پشت ڈال کے تمہاری نفرت کو برداشت کیا ہے تو صرف اس لیے کہ مجھے تم سے محبت تھی..... تمہیں اپنا اسیر نہ کیا تو کہنا..... بے شک چیلنج سمجھ لو اسے.....''

مجھے وہ اچھی طرح سنا کر کمرے سے نکل گیا تو مارے حیرت کے میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔ جہاں سے وہ چند سیکنڈ پہلے نکل کر گیا تھا۔

سلامہ شاہ پاکستان چلا گیا۔ جس دن اس کو جانا تھا اس دن میں سارا دن اپنے کمرے میں بند رہی تھی۔ وہ چلا گیا تو میں باہر نکلی۔ اگلے دن یونیورسٹی سے آ کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات کو پڑھنے کے لیے کتابیں نکالنے کی طرف آ گئی۔ تین دن ہو گئے تھے مجھے کسی بک کو ہاتھ لگائے۔ ابھی میں کتابیں دیکھ ہی رہی تھی جب کتابوں کی ایک جانب گفٹ ریپر میں لپٹا گفٹ دیکھ کر میں ٹھٹک گئی۔ یہی وہ گفٹ تھا جو میری سالگرہ والے دن سلامہ شاہ نے مجھے دینا چاہا تھا اور میں نے انکار کر دیا تھا اور اب یہ گفٹ یہاں کیسے پہنچا۔ کون رکھ کر گیا۔ میرا ذہن الجھ گیا تھا۔ تمام کتابیں چھوڑ کر میں نے گفٹ اٹھا لیا۔ گفٹ کے نیچے ہی ایک بند لفافہ بھی دکھائی دے گیا۔ میں دونوں چیزیں لے کر بستر پر آ بیٹھی۔

''مادرا ڈیئر!

ہو سکتا ہے جب تک یہ گفٹ تمہاری نظروں میں آئے میں یہ سرزمین چھوڑ جاؤں۔ تمہارے رویوں سے تو اندازہ ہو گیا ہے کہ تم کبھی میری بات نہیں سنو گی۔ تمہاری نفرت اتنی گہری ہے کہ میری بے پناہ محبت اور لاتعداد کوششیں بھی اسے ختم نہ کر سکیں۔ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو اور تم اس سلسلے میں حق بجانب بھی ہو۔ پہلی دفعہ جب تم ہماری حویلی آئی تھیں تو اس وقت میں نے جو کہا تم سے جو رویہ رکھا وہ بھی سچ ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اپنے ابا جان کے بجائے میں بابا جان کے زیادہ قریب رہا ہوں۔ بابا جان کی طرح میری سوچ بھی تنگ نظر ہوتی گئی۔ مگر پھر جب خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جاگی تو علم ہوا کہ بابا جان کہاں کہاں غلط ہیں اور ساتھ ہی اپنی کوتاہیاں بھی۔ میں اپنے متعلق کوئی صفائی نہیں دوں گا۔ جب میں نے مانا کہ میں غلط ہوں تو وہیں سے میں نے واپسی کی طرف سفر شروع کر دیا۔ یہاں آنا تم لوگوں سے ملنا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ میں جب یہاں آیا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی تم سے محبت کر بیٹھوں گا۔ تمہیں دیکھا اور جانا اور تب ہی بہت آگے تک سوچا..... مگر تمہاری سوچ نے مجھے بہت ٹھیس پہنچائی۔ یہ گفٹ تمہارے لیے ہی خریدا تھا۔ اب واپس لے جا کر کیا کروں گا۔ امید تو نہیں کہ تم قبول کرو بے شک پھینک دینا۔ ہاں جب سے

میں یہاں آیا ہوں ایک دفعہ بھی تمہیں جیولری کے نام پر کوئی چیز پہنے نہیں دیکھی۔ ہماری حویلی میں بی بی جان اماں جی اور دونوں بہنیں سب ہی کچھ نہ کچھ پہنے رکھتی ہیں۔ خاص طور پر چوڑیاں تو ہر وقت۔ تمہیں یوں ہر وقت سر جھاڑ منہ پھاڑ رہتے دیکھ کر اکثر میرا دل چاہا تھا کہ دیکھوں تو سہی تم چوڑیاں پہن کر کیسی لگتی ہو۔ یہ تحفہ بھی اسی خواہش کی تکمیل کے لیے خریدا تھا۔ مگر افسوس..... اللہ حافظ۔

خط لفافے میں رکھ کر میں نے گفٹ ریپر پھاڑا۔ اندر کیا ہے علم تو ہو ہی چکا تھا۔ اب دیکھنے میں حرج ہی کیا تھا۔ سنہری ڈبیہ تھی ڈھکن کھولا تو گولڈ کی جگمگاتی ہیرے کانچ کی طرح کی ڈھیروں چوڑیاں تھیں۔ شاید درجن بھر..... میں حیران دیکھتی رہ گئی..... اتنی قیمتی سونے کی چوڑیوں کی مجھے امید نہ تھی۔ میرے تصور میں صرف کانچ کی چوڑیاں تھی اور یہ تحفہ خوبصورت بھی تھا اور قیمتی بھی۔ میں نے بے دلی سے ڈھکن بند کر کے بیڈ پر ڈال دیا۔

نہ سلامہ شاہ کے خط نے میرے دل و دماغ پر کوئی اثر ڈالا اور نہ ہی تحفے نے۔ میں خاموشی سے کتابیں لینے دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

پاپا نے سلامہ شاہ کے چلے جانے کا بہت اثر لیا۔ اس کی فون کالز اور خطوط والی میلز کا وہ اکثر بے چینی سے انتظار کرنے لگے تھے نجانے انہیں کون سی چیز بے چین رکھتی تھی۔ بار بار میرا جی چاہا کہ خود سے پوچھوں مگر برسوں کی سرد مہری و اجنبیت کی دیوار ہم دونوں میں حائل تھی وہ کچھ بھی پوچھنے نہیں دیتی تھی۔

آہستہ آہستہ وقت آگے بڑھنے لگا۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے۔ سلامہ شاہ کی پیش قدمیاں اسی طرح قائم و دائم تھیں۔ اکثر اس کے خطوط آتے رہتے تھے۔ کوئی خط میرے نام بھی ہوتا تھا۔ جس میں اکثر سلامہ شاہ نے اپنے جذبات کا اظہار شاعری کی زبان میں کر دیا ہوتا۔ شروع شروع میں جب اس کے خط آنے لگے تو اکثر میری کیفیت بدلنے لگی تھی مگر جب یہ معمول بنتا چلا گیا تو میں نے بھی خود پر قابو پا لیا۔ میں سلامہ شاہ کو روک نہیں سکتی تھی مگر اس سے محبت کرنا بھی میرے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ اسی خاندان کا لڑکا تھا جنہوں نے نہ صرف مجھے بلکہ میری ماما کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں سلامہ شاہ کی تمام باتوں کو بھی مان لیتی تو یہ فراموش نہیں کر سکتی تھی کہ میری ذات کو ابھی تک پاپا نے بھی تسلیم نہیں کیا تو ان لوگوں سے کیا توقع۔

میرے سالانہ امتحان اسٹارٹ ہوئے تو ہر بات بھلا کر یکسوئی کے ساتھ کچھ تھیسس پروجیکٹ رہ گیا تھا۔ اسے کمپلیٹ کرنے لگی۔ دن رات میرے اس میں صرف ہونے لگے۔ خدا خدا کر کے یہ کام مکمل ہوا تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔ یونیورسٹی کے بعد میں نے تھوڑا عرصہ آرام کیا اور پھر ایک کمپنی میں ملازمت ڈھونڈ لی۔

اس دن تھکی ہاری گھر لوٹی تو روزانہ کی ڈاک چیک کی۔ پاکستان سے میرے نام آنے والا خط میں بغیر کھولے ہی بتا سکتی تھی بھیجنے والا کون ہے۔

''ایسا نہیں ہو تا یہ شخص.....'' ہمیشہ کی طرح لفافہ چاک کرنے سے پہلے میں نے یہ سوچا تھا۔

''ڈیئر مادرا!

میری اس قدر پیش رفتی پر وہی سرد موسم ہے لگتا ہے اپنا سکھ چین برقرار و سکون سب وہیں تمہارے پاس ہی چھوڑ آیا ہوں لگتا ہے تمہارے سلوک نے مجھ جیسے خود مند کا کیا حشر کر دیا ہے۔ یہاں تو صرف خالی خولی وجود ہی لے کر آیا ہوں۔ اب مہینوں گزرنے کے بعد بھی وہی کیفیت ہے۔ میرے سب جذبے تو تمہارے پاس ہی رہ گئے ہیں۔ اب تو بقول زبان شاعر یہی صورتحال محسوس ہوتی ہے کہ:

کس پتھر کی مورت سے محبت کا ارادہ ہے
پرستش کی تمنا ہے' عبادت کا ارادہ ہے

جو دل کی دھڑکنیں سمجھے نہ آنکھوں کی زبان سمجھے نظر کی گفتگو سمجھے نہ جذبوں کا بیان سمجھے اسی کے سامنے اس کی شکایت کا جس سے محبوب کے سر پر جوں تک نہ رینگے۔ اب تو میرے بے سکونی پر ماں جی' بہنیں اور بی بی جان تک سب استفسار کرنے لگی ہیں۔ تمہارا نام لے تو لوں تمہاری جانب سے پیش رفت تو ہو..... نہ میرا مقصد تمہیں رسوا کرنا ہے اور نہ ہی تمہاری تضحیک میری مراد ہے۔ یوں سمجھو کہ عشق کے اپنے ہی آداب ہوا کرتے ہیں مائی ڈیئر..... بس اتنی چھوٹی سی التجا ہے کہ اتنا پتھر مت بن کہ خود ہی ٹوٹ گرے اک روز احساس کے آئینے میں اک ٹھیس ہی کافی ہے انتظار کی صلیب پر جاں بلب اپنے وعدے کے ایفا ہونے کا منتظر سلامہ شاہ۔ خط تھا یا لفظوں کی صورت میں جذبات کا ایندھن۔ میرے اندر خط پڑھ کر احساس کی کئی تند و تیز لہریں برپا ہو گئی تھیں۔ بہت کوشش کے باوجود میں اپنے ذہن سے تمام الفاظ کو جھٹک نہیں سکی تھی۔ خیالات، احساسات اور جذبات کا ایک سیلاب تھا جو میرے اندر موجزن اک نیا تلاطم خیز طوفان برپا کر گیا تھا۔

''نہیں..... مجھے خود کو سنبھالنا ہے..... ورنہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا.....'' اس سے پہلے کہ میں تباہی مچا دینے والے طوفان کی نذر ہوتی جذبات کے سمندر میں میں نے ہوش کے ناخن لیتے عقل کا دامن تھاما تھا۔

سلامہ شاہ کو گئے ایک سال ہونے کو تھا۔ اس ایک سال میں وہ صرف ایک دفعہ دو دن کے لیے لندن اپنے کسی آفس ورک کے لیے آیا تھا ان دنوں میرا رزلٹ آیا ہوا تھا۔ فاطمہ ماما کے ساتھ میں ان کے بھائی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ اکثر ماما کے ساتھ میں ان کے رشتہ داروں کے ہاں چلی جاتی تھی۔ ماما مجھے اپنی بیٹی کہتی تھیں۔ اسی لیے جہاں بھی جاتیں مجھے ساتھ لیے رکھتی تھیں۔ ہم واپس لوٹیں تو معلوم ہوا کہ وہ آیا تھا۔ بابا کو بہت دکھ ہوا کہ وہ اپنے بھائی کے ہاں کیوں رہیں۔ جلد آ جاتیں تو سلامہ شاہ سے بھی ملاقات ہو جاتی..... وقت کے ساتھ ساتھ میں نے خود کو بہت مضبوط کر لیا تھا۔ پاپا کی نفرت اور سرد رویے نے میرے دل میں کسی کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے میں پاپا کے کسی بھی رشتہ دار کو قبول نہیں کروں گی۔ جس طرح یہ لوگ محض میرے لیے اذیت کا باعث بنے تھے اسی طرح میں بھی انہیں ٹھکرا دوں گی۔ جب سے مجھے علم ہوا تھا کہ پاپا بھی سلامہ شاہ کو میرے لیے پسند کرنے لگے ہیں تب سے میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ چاہے پاپا کا خاندان مجھے قبول کرے یا نہ کرے مگر میں سلامہ شاہ کو کبھی قبول نہیں کروں گی۔ جب پاپا کے دل میں میرے لیے کوئی گنجائش نہیں تو وہ سب جائیں بھاڑ میں..... میری نفرت مزید بڑھ گئی تھی۔

پھر ایک دن سلامہ شاہ کا فون آیا کہ اس کے بابا جان کو فالج کا اٹیک ہوا ہے۔ پاپا یہ سن کر بہت بے چین ہوئے۔ ان کی بے چینی دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ان کے باپ نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اب وہ سب بھلا کے ان کے پاس جانے کے لیے بے تاب تھے۔ سلامہ شاہ نے پاپا کو پاکستان آنے کو کہا تھا اور پاپا اسی چکر میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ میں بھی ساتھ ہی جا رہی تھی۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر فاطمہ ماما کے سمجھانے اور پھر اس مقصد نے مجھے بابا جان سے اپنا آپ تسلیم کروانا ہے۔ میں جانے کو راضی ہو گئی تھی۔ میرے اور پاپا کے بے پناہ اصرار پر بھی ماما ساتھ چلنے کو تیار نہ ہوئی تھیں۔ یہاں ان کے بہن بھائی تھے وہ ان کے پاس جانے کی تیاریاں کرنے لگیں۔

پاپا پاکستان اپنی آمد کی اطلاع کر چکے تھے۔ ہمیں ایئرپورٹ سے ریسیو کرنے والا سلامہ شاہ ہی تھا۔ ایک سال کے عرصے میں اس کا رنگ روپ مزید نکھر آیا تھا۔ پہلے ہی پُر وجاہت تھا۔ اب مزید غضب ڈھانے لگا۔ میں دیکھ کر رہ گئی۔ پاپا سے معانقہ کرنے کے بعد مجھے بغور دیکھنے لگا۔

''کیسی ہو تم ماورا.....'' بظاہر سادہ سا انداز تھا مگر اس کی آنکھیں۔ میں لمحہ بھر کو ہی دیکھ پائی۔

''آئی ایم فائن.....'' جواب دینا ہی تھا۔ ایک عرصہ بعد سامنا ہو رہا تھا اس کے باوجود میرا لہجہ خود بخود سرد ہو چکا تھا۔ یہ میں لندن سے ہی طے کر کے چلی تھی کہ سلامہ شاہ کے لیے مجھے اپنے رویے و انداز میں ذرا بھی تبدیلی گوارا نہیں۔ وہ میرے سرد انداز پر مسکرا دیا۔

''ذرا بھی نہیں بدلیں..... بالکل ویسی کی ویسی ہو۔'' سر سے پاؤں تک میرا بغور جائزہ لیتے اس نے کہا تو میں اندازہ نہ کر سکی کہ یہ کمنٹس میرے ''سر جھاڑ منہ پہاڑ'' حلیے پر یا سرد انداز پر۔

''چلیں۔'' وہ سامان اٹھا کر پاپا کے ساتھ چلنے لگا۔ حویلی پہنچنے پر ہمارا خوب اچھی طرح خیر مقدم کیا گیا۔ سب کے رویے بہت نارمل ہی تھے۔ خاص طور پر بابا جان کو دیکھتے ہوئے۔ پاپا سے مل کر وہ خوب روئے تھے بار بار اپنے رویے پر معافی مانگ رہے تھے۔ میں خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔ یہی وہ شخص تھا جس نے انتہائی حقارت و نفرت سے اپنے خاندانی مرتبے اور خون پر فخر کرتے میرے وجود سے انکار کیا تھا اور اب۔

وہ مجھ سے بھی اپنے گزشتہ رویوں کی معافی مانگ رہے تھے۔ رو رہے تھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ ان کی جانب سے نفرت سے منہ موڑ لوں۔ چیخ چیخ کر کہوں کہ میں آپ کی کچھ نہیں لگتی۔ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں مگر کس بنیاد پر..... جب کہ مجھے تو میرے باپ نے بھی قبول نہیں کیا تھا۔ تو ان کے ہی ساتھ رہی تھی ایک عمر گزار دی تھی اور یہ تو پھر دادا تھا۔ میں خاموشی سے سرد و جامد تاثرات لیے بیٹھی رہی۔

رات کھانے کے بعد میں لان میں آ گئی۔ سلامہ دونوں بہنیں شادی شدہ اور سسرال میں ہی تھیں۔ علی اور رجا میرے مقابل تھے قد کاٹھ میں سلامہ شاہ کی طرح کے تھے مگر مزاج میں قدرے مختلف تھے۔

تھک کر میں میز جیسوں پر آ بیٹھی..... میں یہاں تو آ گئی تھی مگر اندر ہی اندر ماضی کے حوالے سے میں شکست و ریخت کا شکار تھی۔ پاپا کی سرد مہری ماضی کے بابا کے رویے مسلسل میری سوچوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

''کیا سوچ رہی ہو؟..... ایسے کیوں بیٹھی ہو؟'' خیال کتاب کرتے کچھ وقت سرکا تھا جب سلامہ شاہ کی آواز پر پلٹ کر میں نے دیکھا' وہ میرے عقب میں ہی ستون سے ٹیک لگائے مجھ پر ہی نظریں جمائے ہوئے تھا۔ چاند اپنی آخری تاریخوں میں تھا بالکل مدھم روشنی میں وہ بھی کچھ اداس سا تھا جب کہ ستون کے اوپر نصب الیکٹرک بلب کی دودھیا روشنی میں اپنی مونچھوں کو انگلیوں سے سنوارتے سلامہ شاہ ایک خواب ناک تصور ہی تو لگ رہا تھا۔ سرمئی رنگ کے سوٹ میں اس کی پر رعب چھا جانے والی شخصیت واقعی متاثر کن تھی۔ مجھے اس بات کا اعتراف دل ہی دل میں ضرور کرنا پڑا۔ ایک نظر ڈال کر آسمان کی جانب زرد سے چاند کو دیکھنے لگی۔

''ماورا..... کچھ پوچھا ہے میں نے تم سے؟.....'' وہ کچھ دیر میری جانب سے شاید جواب کا منتظر رہا تھا۔ جب کافی دیر تک میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ جھنجلا گیا۔ خاصا حق جتانے والا انداز تھا۔

''میں تمہارے کسی بھی سوال و جواب کی پابند نہیں.....'' اس کے یوں حق جتانے پر میں نے خفگی سے دیکھا تو وہ مسکرا کر میرے پاس آ بیٹھا۔

''ذرا بھی نہیں بدلی تم..... میرا خیال تھا کہ وقت و حالات تمہاری سوچوں پر ضرور اثر انداز ہوں گے مگر تم تو..... اس طرح سرد گلیشیئر جذبات لیے ہوئے ہو۔'' وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔

''ہاں سچ کہا آپ نے..... میرا ظاہر و باطن ایک سا ہے پھر میں کیسے بدل جاتی..... شاید وقت ضرور مجھ پر اثر انداز ہوتا اگر ایک عرصے آپ لوگوں کی نفرت کا ذائقہ نہ چکھا ہوتا۔ یہ تذلیل کیے جانے کا ذائقہ اتنی جلدی تو نہیں مٹے گا۔ نفرت کی گہری تہہ ہے جو

میرے دل و دماغ پر جمی ہوئی ہے یہ پیش رفت تو ان کے لیے کچھ بھی نہیں۔" میں ایک عام سی لڑکی نہیں ہوں جو یہ سب دیکھ کر گزشتہ بھول جائے۔"

"اور ماضی کو مسلسل یاد کر کے صرف اس میں جیے جانا بھی عقل مندی نہیں ہے۔" میری بات کے جواب میں اس نے بھی طنزاً کہا تھا۔

"آپ کہہ سکتے ہیں میری جگہ اگر آپ ہوتے تو کیا کرتے....." میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ میرا لہجہ طنزیہ تھا۔

"میں ماضی پر ماتم کرنے کے بجائے حال کو سازگار بنانے کی کوشش ضرور کرتا کیونکہ یہ میرے اختیار میں تھا۔"

اس نے بغیر میرے طنز کا برا مانے مسکرا کر کہا تو مجھے اپنے اندر آگ سی سلگتی محسوس ہوئی۔

"میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں بابا جان کو راضی کر لوں گا۔ آج میں سرخرو ہوں تم کیا کہتی ہو۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ اگر بابا جان تمہیں قبول کر لیں تو تب بات کروں۔ اب سب کچھ نارمل ہے۔ تم اس خاندان کا ایک حصہ ہو اب کیا کہتی ہو؟" اس کے سوال پر میں کچھ بھی بول نہیں سکی تھی یہ نہیں تھا کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ بلکہ تو میں لندن سے ہی کر کے آئی تھی مگر اب سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہوں۔ امید نہیں تھی کہ وہ میری ہی بات کو میرے سامنے دہرائے گا۔

"سلامہ شاہ! جب لندن میں آپ کے سلسلے میں نے انکار کیا تھا تو اس کی بنیاد آپ خود تھے اور اب..... میں کبھی بھی اس خاندان کا حصہ نہیں رہی اور نہ ہی بننا چاہوں گی۔ کہنے کو میری بنیاد میرا تشخص یہیں سے ہے۔ میں کبھی اس حویلی میں قدم نہ رکھتی اگر مجھے اپنی ذات کی پہچان نہ چاہیے ہوتی۔ یہ خاندان آپ کا ہے۔ میں اس خاندان کا فرد ہونے کے باوجود یہاں کے لیے اجنبی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔ میں کل بھی سارہ کی بیٹی تھی جس کے لیے آپ کے چچا نے سب کو ٹھکرا کر شادی کی تھی میں آج بھی اس کی بیٹی ہوں اور کل بھی رہوں گی۔ برسوں بعد آپ کے بابا جان نے بیماری کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھے تسلیم کر بھی لیا ہے مگر میں کبھی تسلیم نہیں کروں گی۔ میں صرف اسی لیے یہاں آئی ہوں۔ آپ مجھ سے یہ سوال دوبارہ مت کیجیے گا۔ تب بھی یہی جواب ہوگا۔" انکار کر کے میں اپنی جگہ سے اٹھنے لگی تھی جب سلامہ شاہ نے تلملا کر میرا بازو تھاما۔

"تم میری اور میری محبت کی مسلسل توہین کر رہی ہو ماورا!....." اس کی اس حرکت پر میں بھڑک اٹھی۔

"کیسی توہین سلامہ شاہ!..... چھوڑیں میرا بازو۔ بارہا میں آپ سے کہہ چکی ہوں مجھ سے اس طرح پیش مت آیا کریں۔ ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے۔ میرا دل نہیں مانتا آپ کے لیے تو زبردستی ہے کیا۔ میں آپ کے لیے راضی ہوتی ہوں یا نہیں یہ میرا حق ہے۔ آپ کون ہوتے ہیں چھیننے والے۔ اس طرح کی حرکتیں کر کے آپ مجھ پر اپنا عامیانہ و گھٹیا پن تو ثابت کریں گے سوائے محبت کے۔ نہ مجھے آپ سے غرض ہے اور نہ ہی آپ کی محبت سے۔" اس کے شکنجے سے اپنا بازو چھڑا کر میں اس سے زیادہ مشتعل ہوئی تھی۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔ میں اٹھ کر اندر کی جانب بڑھنے لگی تو ایک دم اس نے میرا راستہ روکا۔

"سنو ماورا..... آج تک تمہاری نفرت میں نے محبت سمجھ کر جھیلی ہے صرف یہی سوچ کر کہ بعض اوقات شدید ترین نفرت بھی شدید ترین محبت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ میں تم پر اچھی طرح واضح کر چکا ہوں کہ سلامہ شاہ کی یہ فطرت نہیں کہ جس کو وہ اپنے لیے ایک دفعہ پسند کر لے اور پھر اس سے دستبردار ہو جائے۔ یہ میری محبت میری انا اور غیرت کو گوارا نہیں۔ تم سے محبت میری پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ تمہیں چاہا ہے دل کی گہرائیوں سے۔ تمہاری پرستش کی ہے۔ تمہارے پیچھے ایک عرصہ خوار ہوا ہوں۔ جب یہ سب کچھ میری شخصیت کو زیب نہیں دیتا تھا۔ بار بار اپنی عزت نفس کو کچل کر تمہیں راضی کرنا چاہا۔ حتیٰ کہ تمہاری خاطر بابا جان جیسے سنگدل ضدی انسان کی ضد کو موم کیا۔ صرف تم تک رسائی پانے کے لیے۔ ہر پل تمہارے احساسات کا خیال رکھا ہے۔ اب مزید نہیں۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تمہیں جھکا کر یا توڑ کر حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اب..... میری طلب میری

جستجو میری آرزو تم ہو..... ابھی تم نے میری ضدی فطرت اور شدت پسندی دیکھی نہیں..... میں توڑنا بھی جانتا ہوں اور جھکانا بھی..... ذہن میں رکھنا مائی ڈیئر....." وہ ایک دھمکی آمیز نظر ڈال کر آگ برساتے لہجے میں سب سنا کر زمین پر اپنے وزنی جوتوں کی دھمک پیدا کرتا اندر بڑھ گیا۔

* * *

پاپا اپنے بابا کی عیادت کے لیے آئے تھے لیکن یہاں آ کر انہوں نے مستقل رہائش کا ارادہ کر لیا تھا۔ مجھے یہ جان کر بہت اذیت ہوئی مگر میں اب بھی ان کو کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ ان کے فیصلے پر خاموش رہی۔ وہ لندن کچھ ضروری امور نمٹانے چلے گئے تو میرا دل نانو کے ہاں جانے کو چاہنے لگا۔ یہاں میں سب کی توجہ کے باوجود بولائی بولائی پھرتی تھی۔ بس میرا دل چاہتا تھا کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ سلامہ شاہ اپنے کام کے سلسلے میں زیادہ تر شہر میں ہی رہتا تھا مگر ہر دوسرے دن وہ حویلی میں ہوتا تھا۔ اس کا دن بدن بدلتا رویہ..... طنزیہ فقرے و عامیانہ جملے میرے ضبط کی انتہا تھی۔ نجانے میں کیسے ضبط کیے ہوئی تھی۔ نانو کی تقریباً روز ہی کالز آ رہی تھیں۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔ پاکستان آ کر میں نے ان سے سب سے پہلے رابطہ کیا تھا اسی لیے وہ بے قرار تھیں۔ میں نے سبحان انکل سے جانے کی بات کی تو وہ مجھے لے جانے کو تیار ہو گئے۔ سلامہ شاہ نے البتہ مخالفت کی مگر بابا جان اور بی بی جان کے کہنے پر چپ ہو گیا۔ اس طرح میں نانو کے ہاں چلی آئی۔ انکل مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ میرا کچھ دن رہنے کا ارادہ تھا۔

ماضی کے رویوں کے برعکس سب لوگ محبت سے ملے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ میں گزشتہ رویوں کو بھول گئی تھی۔ لیکن یہاں اب دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جہاں دہرانا تھا وہاں میں بھولی نہیں تھی۔ نانا، ماموں، ممانیاں ٹھیک سے ملی تھیں۔ ان کے بچے سب ہی ملنسار تھے۔ ان سب کے لیے میرا لندن پلٹ ہونا خاص اہمیت رکھتا تھا۔ کچھ بابا کا مضبوط خاندانی پس منظر توجہ کا حامل تھا جو بھی تھا یہاں آ کر حویلی کی نسبت میں نے زیادہ اطمینان محسوس کیا تھا۔ سب ہی کزنز لڑکے اور لڑکیاں ہم عمر تھے۔ خوب رونق ہوتی تھی۔ البتہ ان سب میں مجھے طیبہ مامی کا بڑا بیٹا شہریار برا لگا تھا۔ وہ شاید مجھ سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا تھا۔ بے چارہ ہر وقت مجھے امپریس کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ وہاں حویلی میں سلامہ شاہ جان کا آزار تھا اور یہاں شہریار نیا درد پیدا ہو گیا۔ مجھے حیرت بھی ہوتی اور ہنسی بھی آتی وہ طیبہ مامی، جنہیں کبھی میرا یہاں مستقل رہنا بہت کھٹکا کرتا تھا۔ وہی اب مجھ پر دل و جان سے فریفتہ ہو رہی تھیں۔ دونوں ماں بیٹا کچھ زیادہ ہی متاثر ہوئے لگ رہے تھے۔ چلیں ان کے برعکس دیگر لوگ گزارے لائق تھے۔ اسی لیے میں انہیں نظر انداز کر جاتی تھی۔

رات کو میں اپنے کمرے میں تھی جب ملازمہ نے مجھے فون کی اطلاع دی۔ میں باہر آ گئی۔

"ہیلو....."

"السلام علیکم..... میں سلامہ شاہ بات کر رہا ہوں....." دوسری طرف سے فوراً تعارف کرایا گیا۔ تعجب کے ساتھ میں نے ایک گہری سانس لی۔

"جی فرمایئے..... کیسے زحمت کر لی۔" حسب عادت میرا لہجہ سرد ہو گیا۔

"تم کب واپس لوٹ رہی ہو؟" جواباً وہ بھی آرام سے پوچھنے لگا۔

"فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں..... اس ہفتے تو میں بڑی خالہ کے ہاں جاؤں گی اس کے بعد چھوٹی خالہ کے ہاں اگر جلدی فرصت مل گئی تو سوچوں گی....." جس طرح وہ میرے رویے سے چڑ رہا تھا میرا دل بھی اس کو چڑانے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا پروگرام سنایا۔

"کوئی ضرورت نہیں تمہیں اس طرح ادھر ادھر سیر سپاٹے کرنے کی۔ جلدی واپس آؤ۔ دو تین دنوں میں چچا جان واپس آ رہے ہیں اور تمہیں ان کے آنے سے پہلے یہاں ہونا چاہیے۔ بہت مل لیا تم نے اپنے رشتہ داروں سے......" وہ جس طرح حاکمانہ لہجے میں کہتا مجھ پر حکم چلا رہا تھا اس سے میرا خون کھولنے لگا۔

"میں آپ کی پابند نہیں ہوں کہ آپ کے حکم پر دوڑی چلی آؤں گی...... حاکم ہوں گے آپ اپنی جاگیر کے...... جب جی چاہے گا آؤں گی......"

"ماورا میں نے تمہیں کہا ہے نا کہ تم واپس آؤ۔ سمجھ میں نہیں آ رہا جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔" میرے غصہ دلانے پر وہ غصے سے کہنے لگا۔

"اور شاید آپ کو بھی سلامہ شاہ میری بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ میں فی الحال نہیں آؤں گی اور نہیں کا مطلب ہوتا ہے نہیں...... سمجھے آپ......" دوٹوک انکار کر کے میں نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ ابھی میں گہری سانس لے کر واپس پلٹی ہی تھی کہ دوبارہ گھنٹی بج اٹھی۔

"اب کون ہے......؟"

"ماورا...... میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ میری ضد کو آواز مت دو...... تمہیں یہ دھمکی مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔ سوچ لیں۔ کل صبح میں واپس جا رہا ہوں...... تمہیں بھی ساتھ چلنا ہے میرے۔ لینے آؤں گا تمہیں تیار رہنا...... بصورت دیگر جو بھی کروں گا پھر بھگتنا۔" جیسے ہی میں نے فون اٹھایا تھا اس نے پھنکارتے ہوئے کہہ کر فون بند بھی کر دیا اور میں ریسیور کو گھور کر رہ گئی۔

اگلے دن ناشتہ کر کے میں ادھر ادھر ہو گئی۔ دس بجے کے قریب ماموں نے مجھے آ کر اٹھا دیا۔

"حویلی سے تمہارے دادا کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ تم آج ہی حویلی پہنچو کل تک تمہارے پاپا پاکستان آ رہے ہیں۔ تمہیں لینے تمہارا تایا زاد سلامہ شاہ نیچے آیا بیٹھا ہے۔

انہوں نے مجھے بتایا تو میں ہونق چہرہ لیے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"مگر ماموں مجھے تو ابھی کچھ دن رہنا تھا......"

"میں نے سلامہ شاہ سے کہا بھی تھا لیکن وہ مان ہی نہیں رہا...... کہہ رہا تھا کہ تمہیں لے کر ہی جائے گا...... پھر تمہارے دادا کا فون آ گیا اور میں انکار نہ کر سکی...... جلدی سے تیار ہو جاؤ وہ نیچے انتظار کر رہا ہے۔"

سلامہ شاہ یوں اپنی دھمکی پر عمل کر کے دکھائے گا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا میں روہانسی ہو گئی۔ یہ شخص مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش لگا۔

"تم ہاتھ منہ دھو لو میں اقرا کو بھیجتی ہوں وہ تمہاری پیکنگ کر دے گی۔" ماموں ہدایت دے کر باہر نکل گئیں اور میں بے بسی سے سر تھام کر رہ گئی۔

"کتنا چالاک اور حاکم طبیعت کا مالک ہے یہ شخص۔" میں کلستے ہوئے کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔ تیار ہو کر اپنا بیگ لے کر نیچے آئی تو وہ ماما جان کے ساتھ بیٹھا باتیں بگھار رہا تھا۔ مجھے بمع سامان کے دیکھ کر اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ چمکی۔ جسے دیکھ کر میں اندر ہی اندر بل کھاتی رہی۔

اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بھی میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس شخص کو شوٹ کر دوں نجانے کیسے خود پر ضبط کر رہی تھی۔

"کیسے ماورا جی! کیسے گزرے دن؟" گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ سے نکالنے کے بعد بہت فاتحانہ مسکراہٹ لیے پوچھ

رہا تھا میں تلملا کر رہ گئی۔

"بات نہیں کریں مجھ سے......" بے بسی نے آنکھوں میں مرچیں لگا دی تھیں۔

"اف اتنا غصہ......" وہ ہنس رہا تھا۔ "یار تم سے بات نہیں کروں گا تو پھر کس سے کروں گا۔ اس وقت تم ہی مجھے دستیاب ہو۔ یوں بھی اب تم ایسی بے مروت تو مت بنو...... میں تمہارے اس کھونچو کزن سے لاکھ درجے بہتر ہوں۔ فرسٹ کزن ہوں بہت حق بنتا ہے میرا......" وہ مسلسل سلگتے ہوئے لہجے میں مسکرا کر میرا جی جلا رہا تھا۔

"میں نے آپ کو کہا بھی تھا کہ ابھی کچھ دن رہنا چاہتی ہوں۔" بے بسی سے میرا برا حال تھا۔

"رات فون کر کے میں نے تمہیں اسی لیے خبردار کر دیا تھا۔ اب کچھ کہنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔" میرا جی جل کر رہ گیا۔

"آپ...... کتنے برے ہیں میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے...... کیوں میری جان کو آ گئے ہیں......" میری آواز یکدم بھرا گئی تو اس نے بھی گاڑی کو بریک لگا دیے۔

"محبت کرتا ہوں تم سے کیسے چھوڑ دوں تمہیں...... بہت آگے نکل آیا اب پیچھے ہٹنا میرا شیوہ نہیں۔ تمہاری نظر میں میری یہ بات نہیں تو رہی......"

"میں کچھ نہیں سمجھتی اور نہ ہی سمجھنا چاہتی ہوں۔ نہ یہ ناممکن ہے جدا ہو کر جی سکتی ہوں اور نہ آپ کر سکتے ہیں۔ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیں مجھے معاف ہی رکھیں۔" اب کے بے بسی کے بے پناہ احساس سے میں واقعی رو دینے کو تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو ٹھہرے تھے۔ جنہیں میں روکنے کی کوشش میں تھی۔

"تم ایسی ادائیں دکھاؤ گی تو سچ کہہ رہا ہوں ہمارا منزل تک پہنچنا ضرور مشکل ہو جائے گا۔" میں کہیں راستے میں ایکسیڈنٹ ضرور کر بیٹھوں گا۔ بہتر ہے خود پر کنٹرول رکھو۔

میرے آنسوؤں کی جانب اشارہ کرتے سلگتے انداز میں اس نے مجھے بری طرح ٹوک دیا۔ میں نے فوراً اپنا چہرہ صاف کیا۔ نجانے کیا ہو رہا تھا مجھے جو خود پر کنٹرول کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ میں بھری آنکھوں سمیت رخ موڑ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔

کسی پتھر کی مورت سے محبت کا ارادہ ہے پرستش کی تمنا ہے عبادت کا ارادہ ہے وہ دھیمے سروں میں ذرا ہونگ کرتے "اسٹیرنگ پر اپنی انگلیاں بجاتے شوخ سی آواز میں گنگنانے لگا۔" گاڑی کے خاموش ماحول میں میری "سوں سوں" کے ساتھ اس کی آواز عجیب ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

جو دل کی دھڑکنیں سمجھے نہ آنکھوں کی زباں سمجھے نظر کی گفتگو سمجھے نہ جذبوں کا بیاں سمجھے اسی کے سامنے اس کی شکایت کا ارادہ ہے میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں پہلو بدل کر رہ گئی۔ وہ اس درجہ شوخ جسارت پر اتر آئے گا میں لق و دق تھی۔ اپنی ظاہری شخصیت کے ساتھ بلاشبہ ایک خوبصورت گنگناتی آواز کا بھی مالک تھا۔ گیت کے بول ماحول کے ہم آہنگ تھے۔ مجھے یکدم اس کا خط یاد آ گیا جو اس نے لندن بھیجا تھا۔ اس میں بھی یہی اشعار تھے۔ میں صرف اپنے اوپر ضبط کیے بیٹھی رہی۔

یہ سوچا ہے کہ دل کی بات اس کے روبرو کہہ دیں نتیجہ کچھ بھی نکلے آج اپنی آرزو کہہ دیں اس کی شوخ آواز مسلسل میرے اعصاب کو جھنجوڑ رہی تھی۔ میں بالکل لاتعلق ظاہر کیے باہر دیکھتی رہی جب کہ ذہن اس کے صرف ایک لفظ میں کھویا ہوا تھا۔

محبت بے رخی سے اور بھڑکے گی وہ کیا جانے طبیعت اس ادا سے اور بگڑے گی وہ کیا جانے کہ اپنا کس قیامت کا ارادہ ہے۔ شوخ آواز میں گاتے اس نے میری طرف دیکھا تھا اسی دوران میں نے بھی پلٹ کر دیکھا تو وہ بھرپور انداز میں ہنس دیا۔ میں فوراً نظر پلٹ گئی۔ نجانے میں کیسے خود کو سنبھال رہی تھی۔ اپنی خودداری انا اور نسوانیت کا پاس نہ ہوتا تو ایک لمحے کی دیر میں ٹوٹ کر رہ جاتی۔

ریزہ ریزہ ہوتے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی تھی۔ میں بھی انسانی جذبات و احساسات کی مالک کب تک خود کو پتھر بنائے رکھتی جبکہ وہ مسلسل میرے پتھر جذبات کو پگھلانے کے درپے تھا۔

کسی پتھر کی مورت سے محبت کا ارادہ ہے پرستش کی تمنا ہے' عبادت کا ارادہ ہے وہ شوخ آواز میں مسلسل ان لفظوں کی تکرار کر رہا تھا۔ میری آنکھوں سے میرا دل بھی قطرہ قطرہ ٹپکنے لگا۔ آخر یہ شخص چپ کیوں نہیں ہو جاتا۔ چہرہ موڑے میں صرف رو رہی تھی۔ جب کہ میرے دل کی بستی نجانے کن طغیانیوں کے زیر اثر تھی۔ پہلی بار مجھے اپنی شکست کا احساس ہو رہا تھا کہ اگر اس طرح وہ میرے ضبط کو آزماتا رہا تو کسی دن میں واقعی ہار جاؤں گی۔

"ماورا..... " کچھ توقف کے بعد اس نے پکارا۔ "ماورا..... " اب کے اس نے میرا کندھا چھوا تو میں چیخ اٹھی۔

"کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے..... میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی..... نہیں کر سکتی قبول میں آپ کی محبت..... میرے دل میں نہیں بچی آپ کے لیے گنجائش..... جب سب جانتے ہیں تو پھر بھی کیوں میرا سکون برباد کر رہے ہیں..... کیوں میری جان لینے کے درپے ہیں....."

میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی..... وہ بغیر جواب دیے مسلسل گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔

"ساری بات یہ ہے ماورا کہ میں جب بھی بھول کر بھی تمہاری جانب سے اس بری طرح ہونے والے ردعمل کے اظہار کو نظر انداز نہیں کر پا رہا..... تمہیں حاصل کرنا میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ میں آج بی بی جان سے بات کروں تو تم آرام سے میری زندگی میں شامل ہو جاؤ گی۔ تمہارا حصول میرے لیے نہ کبھی مشکل ہے اور نہ ہی ناممکن..... ساری بات دل کے تعلق کی ہے جو مجھے کوئی انتہائی قدم اٹھانے نہیں دیتا..... مجھے نہ جانے کیوں آج بھی یقین ہے تم ضرور بدلو گی۔ شاید اس لیے میں مسلسل خود کو تمہاری نظروں سے گراتا چلا جا رہا ہوں لیکن یہ سچ ہے نہ میری محبت کوئی فریب ہے اور نہ میرے جذبوں کی شدت میں کوئی کھوٹ' میں صرف تمہیں راضی کرنا چاہتا ہوں۔ اتنی گہری نفرت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی جب کہ اب تو سب حالات نارمل ہو چکے ہیں تو پھر تمہارا یوں روکنا آخر کیا وجہ ہے۔ جب تک تم وجہ نہیں بتاؤ گی میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔" کچھ دیر بعد میرے چپ ہونے پر اس نے یہ سب کہا تھا۔

"آپ صرف ایک لاحاصل کے لیے بھاگ رہے ہیں اور کچھ نہیں..... اگر آپ کا یہی ارادہ ہے تو بخوشی بھاگتے رہیں مگر میں وہی رہوں گی..... " اب میں خود کو سنبھال چکی تھی۔ وقتی جذبات کا سمندر اتر چکا تھا۔ شاید سلامہ شاہ نے میری طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہا پھر وہ لب بھینچ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سرکیفیت اتر آئی تھی جو میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

اگلے ہی دن بابا بھی لوٹ آئے۔ سلامہ شاہ کا رویہ کبھی بے حد لونگ ہو جاتا اور کبھی بے حد سرد۔ انہی دنوں نانا نانی اور ماموں ممانی شہریار کا رشتہ لے کر آ گئے۔ میں جو سلامہ شاہ کی طرف سے پریشان تھی اب شہریار کے نام کے درد سر نے آ لیا۔ میں شش و پنج میں تھی پاپا اور دیگر لوگوں نے سوچ کر جواب دینے کو کہا تو وہ لوگ پرامید انداز میں واپس لوٹ گئے۔ تیسرے دن سلامہ شاہ آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ آتے ہی وہ ضرور باز پرس کرے گا طنز و تمسخر سے نوازے گا مگر رات تک خیر خیریت ہی رہی۔ سارا دن تو نہیں البتہ رات کو میرے کمرے میں آیا۔ میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی اسے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کسی کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے شاید دستک دی جاتی ہے۔ لگتا ہے آپ کو ایسے آداب سکھائے نہیں گئے..... " اس کے یوں دندناتے کمرے میں گھس آنے پر مجھے بہت غصہ آیا۔ جتنی میں کوشش کرتی تھی کہ اس سے منہ ماری کم ہو اتنا ہی وہ مجھے اشتعال دلاتا تھا۔

"ایسی اخلاقیات کا مظاہرہ اجنبیوں کے لیے کیا جاتا ہے تم تو پھر میری اپنی....."

"کیوں آئے ہیں یہاں؟" اس سے پہلے کوئی ناقابل برداشت جملہ اس کے منہ سے نکلتا میں نے گھبرا کر پیش بندی

کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کا مسکراتا چہرہ مزید چمکنے لگا۔

"تمہیں مبارکباد دینے آیا ہوں۔ خیر سے تمہاری شادی کی تاریخ طے پا گئی ہے۔ عیدالاضحیٰ کے پورے آٹھ دن بعد..... " بڑے آرام سے میرے حواس پر بم چھوڑے وہ کرسی پر ٹک گیا اور میں ہونق بنی رکھ رہی تھی۔

"تو گویا پاپا نے تن تنہا ہی میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ مجھ سے پوچھے' میری رضامندی جانے بغیر کر دیا..... " میں بے یقین تھی۔

"یہ تو میرے کل ہی فون کرنے پر اماں جی نے یہاں کی صورتحال بتائی تھی۔ فوراً سب کام چھوڑ کر بھاگا ہوں۔ ورنہ وہ کھونچو شخص سچ مچ تمہیں لے اڑتا اور میں تمہارے راضی ہونے کے انتظار میں ہاتھ ملتا رہ جاتا..... " وہ مزید کہہ رہا تھا اس کے اگلے جملوں نے میرے چھکے چھڑا دیے تھے۔ کتنا مطمئن تھا۔ اب کے میں نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں ایک دم بے چین ہو گئی۔ سلامہ شاہ کے چہرے کی گہری مطمئن' آسودہ حال فتح مند مسکراہٹ بہت سے ان کہے بھید کھول رہی تھی۔

"میں نے بابا جان وغیرہ کو منع کر دیا ہے جب خاندان میں متبادل رشتہ موجود ہے تو پھر وہ لوگ باہر دیکھتے بھی کیوں..... چچا جان تو خود یہی چاہتے تھے اور میرے لیے تو یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے پھر کیسے چوک جاتا۔ تم سے محبت کی ہے ماورا شاہ۔ تم میری ہو اور ہمیشہ رہو گی۔ کسی کو اعتراض نہیں۔ اس طرح منگنی وغیرہ کے جھنجھٹ کے بغیر شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔

وہ انکشاف پر انکشاف کر رہا تھا اور میرا مارے صدمے و حیرت کے برا حال تھا۔ سارے حواس گویا مختل ہو گئے تھے۔ پاپا یوں بھی کریں گے۔ ساری زندگی ہمیشہ لاتعلق رہے۔ میرے ساتھ ناانصافی کی مجھ سے نفرت بھرا رویہ رکھا اور اب میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ بغیر مجھ سے پوچھے۔ میری رضا جانے' مجھے بتائے بغیر کر رہا۔ جیسے کوئی پتھر کی مورت ہوں جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ سلامہ شاہ کی طرف سے نہیں پاپا کی جانب سے۔

"ماورا..... لگتا ہے..... اس خبر نے تمہارے حواس پر کچھ زیادہ ہی اثر کر دیا ہے۔"

"مجھے یوں بے حواس اپنی طرف گھورتے دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھ کر میری طرف آیا۔

"نہیں..... پاپا مجھ سے پوچھے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے..... ہرگز نہیں..... جھوٹ بولتے ہیں آپ..... " یکدم حواسوں میں آ کر میں اس پر الٹ پڑی۔

"ڈیئر جی سے..... کول ڈاؤن ڈیئر..... ایسا تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ وہ اگر تم سے پوچھتے تو اتنا بڑا فیصلہ بھی نہ ہوتا..... ویسے بھی ہمارے خاندان میں لڑکیوں سے ان کی مرضی نہیں پوچھی جاتی۔ فیصلہ سنایا جاتا ہے۔" انتہائی غرور سے کہتا وہ میری حالت سے لطف اٹھا رہا تھا۔

"میں کبھی تم سے شادی نہیں کروں گی۔ سنا تم نے..... وہ اور ہوتی ہوں گی جنہیں فیصلے سنائے جاتے ہوں..... ماورا ان میں شامل نہیں ہو سکتی..... " اس کے الفاظ اور صدمے سے میرا برا حال تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر سارے عالم کو بتا دوں کہ مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔

"جانتا ہوں میں..... مگر میں تم سے شادی کروں گا اور اسی طے شدہ تاریخ پر ہی ہو گی۔ میں نے وعدہ کیا ہے اور نبھاؤں گا۔ تمہیں کسی اور کے نام کا ہونے دوں یہ میری غیرت کو کبھی گوارا نہیں..... تم میری محبت کو مانو یا نہ مانو..... میرے وجود سے لاکھ انکار کرو۔ نفرت کا اظہار کرو میں سب سہہ لوں گا..... لیکن ماورا یہ کبھی گوارا نہیں کروں گا کہ تم میرے علاوہ کسی اور کے سنگ رخصت ہو' فیصلہ ہو چکا ہے اور تمہیں ہر حال میں ماننا ہو گا۔ تم اب اس خاندان کا حصہ ہو۔ یہاں کی ایک فرد ہو اور ہماری خاندانی روایتیں اپنے

فیصلے بدلا نہیں کرتیں۔ خاص طور پر اس طرح کے فیصلے تو ساری عمر برقرار رہتے ہیں چاہے کوئی خوش ہو یا ناخوش..... سمجھیں تم.....
اس کا مسکراتا لہجہ یک دم درشت ہو گیا۔ تلخی و تندی سے کہتے وہ کمرے سے نکل بھی گیا اور میں منہ پر ہاتھ رکھے دیکھتی رہ گئی۔

"ہماری خاندانی روایتیں اپنے فیصلے بدلا نہیں کرتیں..... خاص طور پر اس طرح کے فیصلے تو ساری عمر برقرار رہتے ہیں..... چاہے کوئی خوش ہو یا ناخوش..... سمجھیں تم....." اس کے یہی الفاظ مسلسل میرے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔

"نہیں..... اگر ایسا ہوا تو میں بے موت مر جاؤں گی..... پاپا آپ اس موڑ پر میرے ساتھ اتنی بڑی زیادتی نہیں کر سکتے..... اب مزید نہیں..... بالکل نہیں....." میں زور سے چیخنے اور رونے لگی۔ یوں لگ رہا تھا کہ پاپا نے یہ آخری کیل ٹھونک کر میرے بالکل مردہ وجود کو تابوت کی نذر کر دیا ہو۔ میں بلک بلک کر روئی مگر میری آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔ میری روتی بلکتی سسکتی آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔ میری روتی بلکتی سسکتی آواز دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ آئی تھی اور میں روتے روتے بستر پر گر گئی۔

* * *

"آپ نے کیا سمجھ رکھا ہے کہ میں مٹی کا کوئی بے جان بت ہوں۔ ایک بے روح گڑیا ہوں جو کچھ محسوس نہ کرتی ہو۔ میں نے اپنی زندگی کے تئیس چوبیس سال آپ کی نفرت کا عذاب سہا ہے۔ اس لیے کہ باپ تو صرف باپ ہوتے ہیں کبھی تو اس پتھر میں بھی شگاف پڑے گا۔ کبھی تو آپ موم ہوں گے میری چپ میرا خاموش احتجاج، میری نظروں کی بے بسی آپ کا سینہ چیر دے گی مگر آج آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ باپ پتھر بھی ہو سکتے ہیں۔ آپ جیسے ظالم بھی ہوتے ہیں۔ آئی ہیٹ یو پاپا۔ رئیلی آئی ہیٹ یو....."

ساری رات اپنی قسمت کو کوستے ہوئے میں نے پاپا کے کمرے کے دروازے پر دستک دے دی۔ کچھ دیر بعد کھل بھی گیا۔ پاپا مجھے یوں اپنے سامنے دیکھ کر حیران تھے مگر میں کچھ بھی سوچنے سمجھنے سے قاصر تھی۔ غم نے میرا دماغ شل کر دیا تھا۔ میں اندر آ گئی اور اب میرے منہ سے جو نکلتا جا رہا تھا میں کہتی جا رہی تھی۔ ساری رات روتی رہی تھی اور اب بھی میری آنکھیں بہہ رہی تھیں۔

"ماورا..... یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تمیز سے بات کرو۔ کیا کہہ رہی ہو تم....." انہوں نے مجھے میرے بے باک بدتمیزانہ انداز پر ٹوکا تو میں پہلے سے زیادہ چیخ اٹھی۔

"مت کہیں مجھے ماورا..... کچھ نہیں لگتی میں آپ کی..... آپ جیسے پتھر، بے ضمیر انسان کیا جانیں کہ تمیز کیا ہے۔ مت رسوا کریں میرے اور اپنے رشتے کو۔ کوئی حق نہیں آپ کو میرا نام لینے کا بھی۔ میں نے بچپن سے اب تک آپ سے صرف محبت کی ہے۔ بت کی طرح پوجا ہے آپ کو مگر جواباً آپ نے مجھے کیا دیا۔ نفرت۔ صرف اور صرف نفرت۔ اتنی گہری کہ بارہا میرا مر جانے کو جی چاہا۔ ماما مر گئیں تو کیا میرا قصور تھا۔ نہیں پاپا اس سارے معاملے میں میرا کہیں بھی کوئی قصور نہ تھا مگر آپ نے صرف اور صرف مجھے سزا دی۔ آپ کتنے ناشکرے انسان ہیں پاپا..... ماما کی موت تو مرضی ربی تھی جس میں کسی کا کوئی دخل نہ تھا لیکن نہ صرف آپ نے اس کے حکم کو نہ مان کر اس کے حکم سے انکار کیا بلکہ اس کی وحدہٗ لاشریک ذات سے بھی منکر ہو گئے۔ آپ ساری عمر سوگ مناتے رہے۔ خود پر ساری زندگی کی خوشیاں حرام کر لیں صرف ایک بات کے پیچھے سب کچھ ختم کر دیا۔

"بکواس نہیں کرو ماورا..... حواس میں تو ہو تم....." پاپا نے مجھے یوں کہنے پر ٹوک دیا تھا۔

"یہ بکواس نہیں پاپا!..... کبھی آپ اپنا محاسبہ کریں تو احساس ہوگا کہ کتنے بڑے گناہ گار ہیں آپ۔ آپ کے سلوک نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ یہ سب کچھ تو صرف ایک احساس ہے اور یہ احساس وہ تازیانہ ہے جو ہر لمحے آپ نے پاپا میرے وجود پر اپنی نفرت کی صورت میں برسایا ہے۔ بڑی نفرت تھی نا آپ کو میرے وجود سے اور بڑی محبت کرتے تھے ماما سے۔ تو کہا ہوتا اللہ سے کہ وہ

مجھے اٹھا لے اور ماما کو بھیج دے۔ آپ اس کے حکم پر راضی ہی نہ ہوئے تو مجھے نانو کے گھر پھینک دیا۔ آپ کیا جانیں کہ وہاں گزرا ایک ایک لمحہ میری زندگی میں کتنی محرومیاں دے گیا تھا۔ کس قدر جذباتی بن گئی ہوں میں نفرت ہی نفرت اگنے لگی تھی میرے اندر۔ اور یہ سب کچھ آپ کی بدولت ہوا۔ وہاں لوگوں کی باتیں، ممانیوں کے طنز، ان کے بچوں کے رویے سب میرے اندر کی لڑکی کو زندہ درگور کرتے گئے۔ کیا کیا نہ بیتی مجھ پر۔ میں نے آپ کے زندہ ہونے کے باوجود یتیموں کی سی حسرت بھری زندگی گزاری اور اب اس موڑ پر آ کر کیا خیال ہے آپ کا کہ آپ کے فیصلے پر سر جھکا دوں گی۔ آپ کی بدولت مجھے یہ خاندان بھی قبول نہیں..... سلامہ شاہ سے تو میں نے زندگی میں کبھی شادی کرنے کا سوچا بھی نہیں۔ پاپا میں سب سہہ لیتی اگر آپ مجھے اس موڑ پر روند کرتے جس شخص کا نام لینا بھی میں قابل نفرت گردانتی ہوں، آپ اسی کے ساتھ مجھے ساری زندگی کے لیے باندھ رہے ہیں۔ آپ کے خاندان نے مجھے کبھی تسلیم نہیں کیا اور آج آپ ان کی ذرا سی عنایت پر مجھے قربان کر رہے ہیں تا کہ آپ ماضی کی تلخیوں کو مٹا کر اپنے لیے بہتر جگہ تلاش کر سکیں۔ میں تو اس خیال سے یہاں آ گئی تھی کہ شاید آپ کبھی مجھے میری ذات کا مان سونپ دیں۔ سب نظر انداز کیے خود پر ہزاروں پہرے بٹھائے یہاں رو رہی ہوں اور آپ کا خیال ہے میں اس شخص سے شادی کر لوں گی جس سے میری نفرت کا صرف اور صرف ایک ہی سبب ہے کہ وہ آپ کا بھتیجا ہے۔ اس خاندان کا بیٹا ہے....."

میں یکدم چپ ہو گئی۔ بولتے بولتے میرا حلق خشک ہو گیا۔ پاپا چپ تو بیٹھے تھے۔ بس مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے نفرت سے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

"بہت جنونی ہیں پاپا آپ! آپ نے صرف ایک محبت کی تھی اور بس کیا آپ نے۔ آپ تو صرف ماضی میں جینے والے انسان ہیں اور مجھے بھی ایسا ہی بنا دیا..... آپ نے اپنی ساری زندگی ماضی کی یادوں کے سہارے گزار دی۔ حتیٰ کہ اب تک یہ خیال نہ آیا کہ میں کون ہوں؟ کیا رشتہ ہے میرا آپ سے۔ کبھی احساس نہ جاگا کہ آپ کے اندر کوئی بیٹی کی صورت میں ایک جیتا جاگتا وجود بھی ہے آپ کے اردگرد ہے۔ جسے کھانے پینے، تعلیم، رہائش وغیرہ کے علاوہ کچھ اور بھی چاہیے..... میں تو ہمیشہ ایک خود کی طرح آپ پر مسلط رہی ہوں۔ بیٹی تو کبھی تھی ہی نہیں اور اب بھی یہی بوجھ آپ اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ بڑا دعویٰ ہے کہ آپ نے ماما سے بڑی اصول اور باوفا محبت کی ہے۔ ان کی محبت کے بعد بھی ان کی محبت کا عہد نبھاتے رہے ہیں مگر مجھے ایک بات بتائیے کہ درحقیقت آپ ہیں کیا..... آپ تو اچھے انسان بھی نہیں باپ کیا بنتے؟ میرے ساتھ ناانصافیاں کیں اور اب چاہتے ہیں کہ آپ کی ہی طرح کے ایک جنونی شخص سے شادی کر لوں..... نہیں پاپا..... ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ نفرت کرتی ہوں میں اس سے، اس خاندان سے بھی اور آپ سے بھی..... اور آپ کو بھی اس زیادتی پر کبھی معاف نہیں کروں گی۔" میں روتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی تھی مگر دروازے ہی پر سلامہ شاہ کو کھڑے دیکھ کر میرے قدم ٹھٹکے۔ ایک نفرت بھری نظر میں نے اس پر ڈالی۔

"ماورا....." اس نے مجھے پکارا مگر میں اپنی ہی آنکھوں کو سختی سے رگڑ کر بغیر پلٹ کر اسے دیکھے بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

میں ساری رات روتی رہی۔ میرا دل اندر ہی اندر ٹوٹ چکا تھا۔ سر اب درد سے پھٹ رہا تھا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔ ادھر سے ادھر ٹہلتے نجانے میرے ذہن میں یکدم کیا آ سمائی تھی۔ میں پاپا جان کے کمرے آئی تو انہیں جائے نماز پر بیٹھے دیکھا۔ میری نظر ان کی دوائیوں پر جا پڑی۔ ان دوائیوں میں سے میں نے ایک شیشی اٹھا لی۔ میں انہیں انکار کرنے کے ارادے سے آئی تھی مگر اب ان کو نماز میں دیکھ کر میں کچھ اور سوچنے لگی۔

"اگر یہ زندگی ہی نہ ہوگی تو سب دکھ ہی ختم ہو جائیں گے۔" شیشی لے کر میں واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ موت بہت سے مسئلوں کا حل ہوتی ہے۔ ایک میرے مر جانے سے اگر پاپا کو سکون مل جاتا ہے تو یہ سودا اتنا مہنگا بھی نہ تھا۔

ماضی میں چکر لگا کر میرا دماغ حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔ گہری طویل سانس خارج کر کے میں نے اپنے بہتے آنسو صاف کیے۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ سوائے میرے۔ سو مجھے اتنا طویل وقفہ مل گیا تھا کہ میں گزشتہ واقعات کا اعادہ بآسانی کر سکی۔

اس دن میں نے باباجان کی خواب آور گولیاں کافی مقدار میں نگل لی تھیں اور اس کے بعد مجھے اسپتال کے اس کمرے میں ہوش آیا تھا۔ ایک عرصہ میں نے نفرت کی وادیوں میں بھٹکتے زندگی گزاری تھی۔ اب پاپا کا رویہ بدلا ہوا اور محبت سے بھرا ہوا تھا۔ میرے لیے بہت اجنبی تھا۔ میرے اندر کے جذبات اب ختم ہو چکے تھے۔ نفرت محبت اب کچھ بھی باقی نہیں تھا مگر میں اپنے اندر کی تلخی ابھی تک ختم نہیں کر پا رہی تھی۔ تین دن سے میں کچھ نہیں بولی تھی۔ کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ پاپا' سلامہ شاہ' بی بی جان' سلامہ کی والدہ کوئی بھی آتا تو میں آنکھیں بند کیے لیٹی رہتی۔ کسی سے بات کرنے' نظر ملانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ نفرت کرتے کرتے اب کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ عجیب بے بسی کا مقام آ گیا تھا زندگی میں۔

پاپا کو میں نے ان کی غلطیوں کا احساس دلا دیا تھا مگر ساتھ ساتھ اپنی بھی بہت سے غلطیاں تین دن سے مجھے یاد ہو رہی تھیں' سب سے بڑی لغزش تو خودکشی کرنے کی یہ کوشش تھی میں بھی پاپا کی طرح وہی غلطی کرنے جا رہی تھی۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہ یہ کتنا قابل مذمت فعل ہے۔ اللہ کے ہاں ایسے لوگوں کی کبھی بخشش نہیں۔ جہنم ہی صرف حصے میں آتی ہے۔ جذبات میں انسان وقتی ہوش کھو بیٹھتا ہے۔ تبھی تو ہمارا اسلام ہمیں ہر حالت میں ہوش سے سوچ سمجھ کر کام کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ جذبات اندھے ہوتے ہیں' چاہے وہ بے پناہ محبت کے ہوں یا نفرت کے۔ پاپا کی نفرت نے مجھے کس قدر اندھا بنا دیا تھا کہ اپنی زندگی داؤ پر لگانے چلی تھی۔ اگر اللہ مجھے نہ بچاتا تو میں تو اپنے جذبات کے ہاتھوں اپنی آخرت تباہ کر چکی تھی۔ مجھ جیسے جذباتی لوگوں کا شاید یہی المیہ ہوتا ہے کہ صرف پچھتاوے ہی ان کا مقدر بنتے ہیں۔ یہ زندگی تو صرف آزمائش کا گھر ہے اور میں بھی کتنی ناشکری ہوں۔ سب کچھ تو تھا میرے پاس اس کے باوجود میں اللہ سے شکوہ کرتی رہی..... وہ ذات تو بے نیاز' رحمان و رحیم ہے اور ہم بندے اپنی کم فہمی و کم عقلی سے نقصان اٹھا لیتے ہیں۔

یا اللہ تو مجھے معاف کر دے..... بے شک تو رحمان ہے..... میں غلط تھی..... جذبات میں بہت بڑا فعل سرزد ہو گیا..... یا اللہ احسان ہے تیرا..... شکر ہے تیری ذات کا کہ تو نے مجھے بچا لیا ورنہ جہنم کی گہری کھائی ہی میرا مقدر ہوتی..... "سرہانے میں منہ دیے میں مسلسل رو رہی تھی۔

اسپتال سے حویلی پہنچ کر بھی ماورہ کی چپ نہیں ٹوٹی۔ وہ کسی سے کچھ نہیں کہتی۔ نہ ہی کوئی الزام اور نہ ہی کوئی ناراضگی بس مسلسل چپ سی تھی جو کسی کو بھی کچھ کہنے نہیں دیتی تھی۔ باباجان سے لے کر پاپا تک سب ہی اندر ہی اندر پچھتا رہے تھے۔ سلامہ شاہ سے بھی سامنا کم ہوتا تھا وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ وہ خود ہی اس کے سامنے نہیں آتا تھا۔

عیدالاضحیٰ قریب آ رہی تھی۔ سب اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر دیگر امور کی طرف متوجہ ہو گئے تو اسے بالکل ہی چپ لگ گئی۔ ام رومان اور صبا دونوں ہی عید کرنے حویلی آئی ہوئی تھیں۔ ام رومان کا زیادہ تر وقت ماورا کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ اس کے باوجود ماورا کا خودساختہ خول نہیں ٹوٹ پایا تھا۔ ام رومان اٹھ کر گئی تو وہ کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگی۔ صبا اور رومان کے بچے لان میں کھیل رہے تھے۔ ان کی معصوم سی چہکار بس ماورا کے اندر مزید محرومیاں پیدا کر گئیں۔ وہ جھلملاتی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"ماورا..... " پاپا کی آواز تھی وہ یکدم پلٹی وہ مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ گزرے دنوں میں کس قدر شفیق و مہربان ہو گئے تھے۔

"کیا دیکھ رہی ہو باہر؟" خوشگوار موڈ لیے انہوں نے پوچھا تو وہ بستر پر آ بیٹھی۔ لب بالکل ساکت تھے۔

"ماورا..... کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں..... کیا میرے گناہ و غلطیاں ناقابل معافی ہیں۔ اب میرے پاس سوائے پچھتاوے و پشیمانی و ندامت کے کچھ بھی نہیں..... کیا تم میری جھولی میں معافی کے چند لفظ بھی نہیں ڈال سکتی..... کچھ تو کہو..... یہ

چپ توڑ دو..... بے شک میرے گزشتہ تمام رویوں پر مجھے برا بھلا ہی کہو..... "اس کے یوں پتھر رویے پر آزردہ ہو کر کہہ رہے تھے۔ وہ یکدم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ اب وہ اتنی پتھر بھی نہیں تھی کہ اپنے باپ کو اپنے سامنے یوں گڑگڑاتے دیکھتی۔

"ماورا..... میری بیٹی..... میری جان۔" اس کے یوں پھوٹ پھوٹ کر رونے پر وہ تڑپ کر آگے بڑھے اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"پاپا..... کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ ایسا..... ایک بار بھی آپ کے دل میں میری محبت نہیں جاگی۔ کیا ایک دفعہ بھی آپ کا دل مجھے پیار کرنے کو نہیں چاہا۔ بتائیں پاپا کیوں کر لیا تھا آپ نے خود کو یوں پتھر کہ میری محبت بھی کسی کام نہ آئی۔" آج وہ بالکل نارمل ہو کر ایک ننھی سی بچی کی طرح ان کے سینے سے لگی گلے شکوے کر رہی تھی۔ بڑی حسرت تھی اسے پاپا کے سینے سے لگ کر ان سے اپنے دل کی ساری باتیں کرنے کی اور آج اس کی برسوں پرانی خواہش پوری ہو رہی تھی۔

"بس..... میری بیٹی بس..... اب نہیں رونا..... میں پلٹ آیا ہوں۔ مجھے احساس ہو گیا ہے اپنی غلطیوں کا..... بہت دفعہ ایسا ہوا کہ میرا دل تمہاری طرف مائل ہوا۔ تم سے ڈھیروں باتیں کرنے کو جاہا' تمہیں سینے سے لگانے کی خواہش نے جنم لیا لیکن ہر بار میری انا نے مجھے روک دیا۔"

پاپا بھی رو رہے تھے۔

"آئی ایم سوری پاپا..... میں نے آپ کو بہت دکھ دیا..... مگر میں کیا کرتی..... آپ کے سوا میرا تھا ہی کون..... آپ کی یہ مسلسل لاتعلقی مجھے اندر ہی اندر مارے جا رہی تھی اور پھر اس دن آپ کے مرے سے نکلنے کے بعد میرا دل چاہا تھا کہ میں اپنے آپ کو ختم کر لوں اور پھر کچھ کچھ نہ آئی..... میرا دل بہت دکھی ہو رہا تھا اور میں نے وہ کچھ کر لیا جو اللہ کو کبھی پسند نہیں آتا۔"

"چپ..... بس اب کچھ نہیں کہنا..... مجھے احساس ہو گیا ہے ان شاء اللہ اب کوئی کوتاہی نہیں ہو گی..... بس اب تو ازالے کا وقت ہے۔"

"پاپا نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔"

رومان کے زبردستی کرنے پر وہ کمرے سے باہر نکلی۔ بقر عید پر ذبح ہونے والے بکرے لے کر آیا جو خاص طور پر سارا سال پالے ہی اسی مقصد کے لیے گئے تھے۔ ساری خواتین بکرے دیکھ رہی تھیں۔ رومان بھی ادھر چلی گئی۔ جہاں بکرے بندھے تھے وہ ستون سے لگ کر دیکھنے لگی۔ علی' رومان' صبا' باجی' رنا سارے ہی افراد جمع تھے۔ خوش ہو رہے تھے۔ صبا اور رومان کے بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے شور کیے جا رہے تھے۔ بہت عرصے بعد ماورا کو یہ پرشور زندگی کی مسرتوں سے مزین ماحول خوبصورت لگا۔ ورنہ زندگی تو گویا اس کے اندر سے ختم ہو گئی تھی۔ پاپا کی محبت کیا ملی تھی ساری دنیا اچھی لگنے لگی تھی۔ رومان اسے یوں کھڑے دیکھ کر مسکرائی اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

"دیکھنا ماورا!..... یہاں حویلی میں بکرا عید پر میٹھی عید سے بھی زیادہ رونق ہوتی ہے۔ قربانی ہوتی ہے۔ گوشت بانٹا جاتا ہے۔ طرح طرح کے پکوان پکتے ہیں۔ ہم لوگ تو گوشت کی خوشبو سے پیٹ بھر لیتے ہیں۔ پہلے دن بکرے ذبح کیے جاتے ہیں پھر دوسرے دن بڑے جانور کی قربانی کی جاتی ہے۔ تین دن تو اس مصروفیت میں گزر جاتے ہیں۔ یقین مانو ہم عورتوں کی شامت آئی رہتی ہے۔" وہ اسے بتا رہی تھی اور وہ صرف مسکراتی رہی۔

"ویسے یہ عید پہلے سے زیادہ خوشیاں لے کر آ رہی ہے۔ تمہاری اور بھائی کی شادی جو طے ہے سمجھ نہیں آ رہی کہ عید کی تیاریاں کریں یا شادی کی....." وہ مزید کہہ رہی تھی ماورا کے مسکراتے لب بھنچ گئے۔ اتنے دن ہو گئے تھے مگر اس موضوع پر تو اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ انکار کی اب کوئی بھی وجہ نہیں رہی تھی مگر اس کا دل سکڑ کر پھیلا تھا۔

سلامہ شاہ! کے تمام رویے کیسے بھول جاتی۔ اس کا یوں فخریہ طور پر بتانا کہ ان کے فیصلے بدلا نہیں کرتے نے ہی اسے اتنا بڑا قدم اٹھانے پر مجبور کیا تھا اور اب ردمان کا یہ کہنا اس کے دل میں بہت سی اذیت ناک لہریں اٹھیں۔

"ہمارے ہاں بڑی روایتی قسم کی عید ہوتی ہے۔ عید والے دن کوئی آ رہا ہے' کوئی جا رہا ہے۔ ملازموں کے آتے ہی اعلان کر دیا ہے کہ اب میں کچن میں نہیں گھسوں گی۔ میرے دونوں بیٹے تو ایسے آفت کے پرکالے ہیں۔ ایک منٹ بھی ان سے انگھ ہٹاؤں تو طوفان برپا کر دیتے ہیں۔ انگلی پر نچاتے ہیں مجھے ایک پاؤں ادھر تو دوسرا ادھر بالکل ذیشان پر گئے ہیں۔ وہ بھی ایسے ہی ہیں۔ ویسے اماں جی نے تمہاری بری تیار کرنے کی ذمے داری لگا دی ہے۔ صرف انہی تین چار دنوں میں۔ کچھ نہ پوچھو ہماری شامت آئی ہوئی ہے۔" وہ ہنس ہنس کر بتا رہی تھی اور مادرا کا ضبط جواب دینے کو تھا۔

"میں اندر جا رہی ہوں..... میرا دل گھبرا رہا ہے۔" نجانے کیوں وہ اس ذکر سے بھاگ رہی تھی۔

"کیوں..... خیریت..... کیا ہوا؟..... " اس نے فوراً پرتشویش انداز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں..... ویسے ہی..... " وہ سر ہلاتی اندر اپنے کمرے میں آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد پاپا اندر آئے تو وہ بالکل گم صم سی بیٹھی تھی۔

"پاپا!..... میں سلامہ شاہ سے شادی نہیں کروں گی..... " انہیں دیکھ کر اس نے کہا۔

"مگر مادرا..... "

"پاپا پلیز..... میں کہہ رہی ہوں نا..... مجھے وہ بالکل پسند نہیں..... بہت برا لگتا ہے وہ مجھے..... اس کے لیے مجھے مجبور مت کریں..... میرا دل نہیں مانتا..... " میرا اعزاز قطعی تھا۔

"تو پھر کیا کرو گی..... تمہاری نانو نے شہریار کے لیے کہا تھا..... تم راضی ہو تو پھر میں ان سے بات کرتا ہوں..... " اس کے انکار سے انہیں بہت تکلیف ہوئی تھی اس کے باوجود انہوں نے بردباری سے کہا تو وہ رونے لگی۔

"نہیں پاپا..... مجھے نہیں پتا..... مجھے کسی سے بھی شادی نہیں کرنی..... کسی سے بھی نہیں' نہ سلامہ سے' نہ شہریار سے..... " اس کی اس بچگانہ بات پر رہبان شاہ ہنس پڑے۔

"اچھا۔ یہ بتاؤ تم سلامہ شاہ کو کیوں ناپسند کر رہی ہو..... پہلے تو میں یہ سمجھا اب..... " انہوں نے ملائمت سے پوچھا تو وہ سر جھکا گئی۔

"پاپا آپ کو شاید برا لگے لیکن میں اس خاندان میں خود کو کبھی ایڈجسٹ نہیں کر پاؤں گی۔ جذباتی طور پر مجھ میں برداشت بہت کم ہے۔ میں یہاں کے طور طریقوں' رسم و رواجوں کو کبھی قبول نہیں کر پاؤں گی۔ اس خاندان نے چوبیس سال تک مجھے قبول نہیں کیا۔ اب اگر قبول بھی کیا ہے تو سب کی اپنی اپنی غرض ہے اور میں کسی کی غرض کی بھینٹ نہیں چڑھوں گی۔"

صاف اور دوٹوک انداز میں اس نے بات کی تھی۔ اس نے صرف ایک کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا تھا سب کو ہی شامل کیا تھا۔ رہبان شاہ صاحب چپ چاپ دیکھتے رہ گئے۔ وہ کیا کر سکتے تھے یہ سب پچھلوں کا اپنا ہی کیا دھرا تھا۔

رہبان شاہ نے سب کو مادرا کا فیصلہ سنا دیا۔ اس کا انکار سب تک پہنچا دیا۔ سب ہی چپ چاپ دیکھتے رہ گئے۔

"چچا جان وہ جذباتی ہے۔ صرف ایک سطحی بات سوچ رہی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کی بات مانی بھی جائے۔" سلامہ شاہ نے کہا۔

"نہیں سلامہ شاہ! تم میرے داماد بنتے یہ میری خوش نصیبی تھی مگر اب میں اپنی جانب سے مادرا کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا..... " وہ کہہ کر خاموشی سے اٹھ گئے بعد میں ان لوگوں کے درمیان مزید گفتگو ہوتی رہی۔

اماں جی' بی بی جان' صابر اور ردمان سب ہی بہت دکھی تھیں اتنے عرصے بعد سلامہ شاہ کسی لڑکی کے لیے راضی ہوا تھا خود اپنی زبان سے کہا تھا لیکن مادرا.....

مادرا اس رشتے سے انکار کرکے پہلے سے زیادہ ذہنی طور پر پریشانی کا شکار ہو گئی۔ پہلے تو سلامہ شاہ کا رویہ تنگ کرتا تھا مگر اب..... وہ جو ردمان سے تھوڑی بہت گھل مل گئی تھی ان دو دنوں میں پھر گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ رات کو وہ اپنے کمرے سے نکل کر لان کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ سردیاں زوروں پر تھیں۔ موسم دن بدن ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ رات کو بھی اوس پڑتی تھی ساتھ میں دھند بھی۔ اس وقت سیڑھیاں بھی گیلی تھیں مادرا اگرچہ مکمل طور پر گرم کپڑوں میں لپٹی تھی اس کے باوجود سرد لہر اندر تک اترتی جا رہی تھی۔ اس معاملے میں وہ کافی حساس تھی موسم اس پر بہت جلد اثر انداز ہوتا تھا۔

دھند کی لپیٹ میں چاند بہت مدھم دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ابھی یونہی بیٹھی تھی جب گیٹ کھلنے پر گاڑی اندر داخل ہوئی۔ سلامہ شاہ صبح کا شہر گیا ہوا تھا اور اب رات گئے لوٹا تھا۔ مادرا اسے گاڑی کھڑی کرکے سیڑھیوں کی طرف آتے دیکھتی رہی۔

"اتنی سردی میں اس وقت تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اتنے دنوں بعد وہ براہ راست مخاطب ہوا تھا۔ اپنی طرف سے تو سلامہ شاہ نے آرام سے پوچھا تھا مگر غصے کی ہلکی سی رمق ضرور تھی۔ جب سے اس نے رشتے سے انکار کیا تھا سلامہ شاہ کا غصہ حد سے بڑھا ہوا تھا صرف چچا کا احساس تھا ورنہ لمحوں میں اس کا دماغ درست کر دیتا۔

"نظر تو آپ کو بھی آ گیا ہے کہ میں کیا کر رہی ہوں" سلامہ کے غصے سے استفسار پر اس نے اسی کے لہجے میں جواب لوٹایا۔ "کم از کم اس وقت واک کرنے سے تو رہی۔"

"اٹھو یہاں سے اور اندر چلو..... مرنے کا ارادہ ہے کیا..... اس قدر سردی ہے اس قدر دھند ہے..... " مادرا کو گھور کر اس نے ڈپٹا تھا۔

"آپ جائیں آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" سلامہ شاہ کے ڈپٹنے پر اس نے بھی روکھے پن سے کہا تو سلامہ شاہ کا دماغ بھنا گیا۔ غصہ تو پہلے بھی تھا۔

"فکر کی بچی..... اٹھو یہاں سے ورنہ دوں گا الٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ..... عجیب شوق ہیں تمہارے۔ سارا عالم سردی سے بچنے کی کوشش میں بستروں میں دبکا بیٹھا ہے اور تم ہو کہ..... " آگے بڑھ کر مادرا کا بازو تھام کر کھڑا کرتے اس نے سخت خشمگین نظروں سے گھورا تو مادرا ایک لمحے کو سچ مچ خوفزدہ ہو گئی۔ اس سے کیا بعید تھا اتنا تو حاکم و خودسر ہے اگر واقعی جھانپڑ لگا دیتا تو۔

"خوامخواہ..... ایسے ہی رعب مت جمائیں..... ہاتھ تو لگا کر دیکھیں مجھے..... بڑے آئے کہیں کے دھمکیاں دینے والے..... " اپنا بازو چھڑوا کر پیچھے ہٹی تو سلامہ شاہ نے گھورا۔

"یہ دھمکیاں نہیں ہیں عمل بھی کرتا ہوں۔ تمہیں شاید یوں قسطوں میں مرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔ اسی لیے آئے دن نئے نئے مرض کے سر کیے اسپتال پہنچی ہوتی ہو..... " وہ طنز کر رہا تھا دراصل غصہ تو اس بات کا تھا کہ اس نے آخر انکار کیوں کیا۔ سب کچھ تو اب نارمل تھا پھر وہ کیوں اب تک وہی پتھر کی مورت بنی ہوئی ہے۔

"آپ اپنی حد میں رہیں سلامہ شاہ!..... مجھ پر طنز کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔" اس کی پچھلی بات پر تیخ پا ہوتے ہوئے اس نے کہا تو سلامہ شاہ ہنس دیا۔

"حق کی بھی تم نے خوب کہی..... سارا سارا دن اور ساری ساری رات ہسپتال میں خوار ہوتا رہا ہوں۔ آرام سے اندر چلو ورنہ اٹھا کر لے جاؤں گا..... " دھمکی دیتے اس نے کہا تو وہ تلملا گئی۔ اس کے ساتھ مغز ماری کرنے کے بجائے پاؤں پٹختے اندر آ گئی..... اپنے کمرے میں بھی آ کر وہ خود سے الجھتی رہی۔

عید میں صرف دو دن باقی تھے۔ حویلی میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ ام رومان اسے کمرے سے زبردستی باہر نکال لائی۔ ان سب میں سے کسی کے بھی رویے میں رشتے سے ناراضگی کا شائبہ نہ تھا۔ وہ جو پہلے ہی انکار کر کے خود سے الجھی ہوئی تھی ان کے رویے دیکھ کر مزید شرمندہ ہوتی چلی گئی۔ صبا، رومان، اماں جی، بی بی جان ڈھیروں کپڑے پھیلائے بیٹھی تھیں۔ وہ بھی بیٹھی گئی۔ دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ بی بی جان نے شہر سے سب کے لیے عید کے لیے کپڑے منگوائے تھے اس کے لیے بھی کتنی ساری چیزیں تھیں۔ وہ تو ہمیشہ ایک سادہ سے حلیے میں رہی تھی۔ اگر بہت ضرورت پڑی تو ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا لی۔ اب اپنے لیے یہ ڈھیروں چیزیں دیکھ کر حیران ہوتی۔

''یہ سب میرے لیے ہے.....''

''تو اور کیا..... یہ سب تم پہنو گی بہت جچے گا تم پر.....'' بی بی جان نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے محبت سے کہا تو صبا نے مسکرا کر سوٹ اٹھا کر اس کے ساتھ لگا دیا۔ رومان اس کا ہاتھ پکڑ کر چوڑیاں پہنانے لگی۔

''او مائی گاڈ..... اتنا سب۔ مجھ میں نہیں پہنوں گی..... نو..... نیور..... اتنا آکورڈ لگے گا۔ اتنا ہیوی ہے یہ سب کچھ۔ مجھ سے نہیں سنبھالا جائے گا یہ سب کچھ کوئی سادہ سا سوٹ ہوتا بھی.....''

''تم تو آرام سے بیٹھی رہو..... عجیب شوق ہیں تمہارے مائیوں والے..... میں شادی نہیں کروں گی۔ یہ نہیں پہنوں گی..... تو پھر کیا کرو گی.....'' رومان نے اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے اس ایک دم چپ کرا دیا۔ وہ خجل سی ہو گئی۔

''دیکھیں تو سہی..... کیسی لگتی ہے یہ بندیا تم پر.....'' صبا باجی نے بندیا اٹھا کر اس کے ماتھے پر سجا دی۔ وہ ''ناں، ناں'' کرتی رہ گئی تھی مگر کسی نے بھی دھیان نہ دیا۔

''دوپٹہ جس پر بہت ہیوی کورٹی اور موتیوں کا کام تھا۔ اماں جی نے بھی اس کے سر پر اوڑھایا تو وہ لجا سی گئی۔

''دیکھیں بی بی جان آپ کی یہ پوتی بن سنور کر کیسی شہزادی لگنے لگی ہے۔'' رومان اسے چھیڑ رہی تھی۔ بی بی جان نے اسے مزید لپٹا لیا۔ ماورا کا شرم سے برا حال تھا۔ یوں ہی گرتی پڑتی پلکیں اٹھا کر اماں جی کی طرف دیکھنا چاہا تو ان کے عقب میں کھڑے سلامہ شاہ کو دیکھ کر وہ مزید شپٹا گئی۔ وہ نجانے کب اندر آیا تھا۔ بڑی گہری نظروں سے تک رہا تھا۔

''ماشاء اللہ! میری بچی ہے ہی پیاری..... شہزادی ہی تو ہے۔ اللہ میرے رہبان کی خوشی سلامت رکھے.....'' بی بی جان نے ایک دم اس کی پیشانی چومی۔

''سلامہ بھائی! اب آپ بھی بتا دیں کیسی لگ رہی ہے ماورا؟.....'' ام رومان سلامہ کی آنکھوں میں چھلکتے جذبے دیکھ کر شرارت سے بولی تو سلامہ سمیت سب ہنس دیے۔ اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اماں جی نے رومان کو ڈانٹا۔

''چلو..... میری بچی کو زیادہ تنگ نہیں کرو.....'' انہوں نے دلار سے کہا تو وہ دوبارہ سر بھی نہ اٹھا سکی۔ سلامہ شاہ کمرے سے باہر نکلا تو وہ بھی سب کچھ وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

جذبے نجانے کیوں بے لگام ہوئے جا رہے تھے۔ خوش رنگ خوشبو جیسے۔ سلامہ شاہ کی شخصیت کبھی بھی نظر انداز کیے جانے والی نہ تھی تو پھر وہ کیوں پتھر بنی رہی جب کہ وہ ابھی بھی اس کے تصور میں غرق تھا۔

''کیا میں واقعی سلامہ شاہ سے کبھی نفرت کرتی تھی اتنی گہری کہ کوئی گنجائش نکلنا بھی مشکل تھی اور جب کہ اب تو حالات نارمل تھے۔ پاپا کا رویہ بھی بہتر تھا تو میں کیوں اڑی رہی اپنی ضد پر.....'' تین دنوں میں پہلی دفعہ یہ سوال وہ خود سے کر رہی تھی اور اندر سے جو جواب آیا تھا اسے سن کر وہ کئی لمحے ساکت بیٹھی رہی۔

ان دو دنوں میں یہی ہوا تھا کہ اس کے جذبے رخ بدل گئے تھے شاید اس رات جب سلامہ شاہ اس کمرے میں جانے کا

کہہ رہا تھا کس قدر احساس تھا اسے کہ وہ کہیں سردی میں بیمار نہ پڑ جائے جب کہ وہ غصے میں تھا اور غصے میں تو وہ خود بھی شاید گزرے دنوں کی وجہ سے تھا۔ پاپا سے سب کچھ کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد نفرت جیسے کسی جذبے کا اب تصور بھی نہیں تھا۔ بس سلامہ شاہ سے اس نے کبھی بے پناہ نفرت کی تھی اب اس کے نام کے جذبے اس کے اندر سر ابھارنے لگے تھے جب کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ہی اپنی ساری راہیں بند کر چکی تھی۔

عید والے دن حویلی میں خوب رونق تھی۔ اس کی دونوں پھوپھیاں بھی اپنے بچوں سمیت آئی ہوئی تھیں۔ قربانی کے بعد گوشت بانٹنے اور پکوان بنانے میں سبھی مصروف ہو گئے تھے۔ وہ بھی بجھے دل کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ نجانے کیوں باہر جانے کو موڈ نہیں بن رہا تھا۔ اماں جان کی لائی ہوئی تمام چیزیں زیب تن کی ہوئی تھیں۔ پہلی دفعہ وہ یوں سجی سنوری تھی۔ بہت منفرد خوبصورت بھی لگ رہی تھی۔ پاپا اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے کہ کسی اور سے ابھی تک سامنا ہی نہیں ہوا تھا پھر وہ خود بھی بچنے کی کوشش میں تھی۔ بستر سے اٹھ کر الماری کی طرف آ گئی۔ ادھر سے ادھر تلاش کر کے اسے وہ چیز مل گئی تھی جس کی اسے تلاش تھی۔ بستر پر بیٹھ کر اس نے ڈبے میں سے تمام چوڑیاں نکال کر اپنے دائیں ہاتھ میں پہننا شروع کر دیں۔ یہ وہی چوڑیاں تھیں جو لندن میں سلامہ شاہ اس کے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ یہاں آتے ہوئے وہ انہیں اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ سلامہ شاہ کو واپس کر دوں گی مگر یہاں آ کر ادھر کے مسئلوں میں الجھنے میں واپس ہی نہ کر پائی تھی اور اب جب کہ بچھڑنے کا تھا تو خود سے بہت لڑنے کے بعد اس نے آج پہلی بار یہ چوڑیاں پہن لی تھیں۔

''ارے تم کیا آج بھی کمرہ نشین ہوئی بیٹھی ہو۔ باہر چلو سب تمہارا پوچھ رہے ہیں۔'' صبا باجی اندر آئیں اور اسے چوڑیاں پہنے دیکھ کر چونکیں۔

''ارے یہ اتنی پیاری گولڈ کی چوڑیاں کہاں سے لیں تم نے.....؟'' انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ جھینپ گئی جواب بھی نہ بن پڑا۔

''اچھا اب باہر چلو وہاں تمہاری سسرال آئی بیٹھی ہے۔'' اگلے ہی لمحے انہوں نے مزید کہا تو وہ حیران ہوتی۔ چونک کر انہیں دیکھا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ چچا جان نے تمہارے ننھیال والوں کو ہاں کہہ دی تھی۔ آج وہ نکاح کی تقریب کرنے آئے ہیں۔ تم تو اندر بند ہو تمہیں کیا خبر؟''

''صبا باجی.....'' وہ منہ کھولے ہکا بکا تھی۔ ابھی تو اسے اپنے جذبوں کی خبر ہوئی تھی۔ ابھی تو اسے پاپا کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرنا تھا لیکن یہ کیا.....

''اماں جی اور بی بی تمہیں تیار کر کے لانے کو کہہ رہی ہیں۔ اب جلدی کرو وقت نہیں ہے میرے پاس۔'' انہوں نے جیسے اس کے اڑے اڑے حواس دیکھے ہی نہ تھے۔ ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا۔

''مگر صبا باجی.....'' وہ رو پڑی۔

''اگر مگر کچھ نہیں۔ تم سلامہ بھائی کے لیے راضی نہ تھیں ہم نے زبردستی نہیں کی۔ جب تم ہی راضی نہیں تو پھر کیا فائدہ۔ یہ بندھن باندھنے کا۔ چچا جان تو ادھر بھی راضی نہ تھے مگر ہم سب کے سمجھانے پر راضی ہو گئے۔'' صبا باجی نے سنجیدگی سے اسے بتایا۔ اس کے آنسو مسلسل بہنے لگے۔

''صبا باجی! پلیز کچھ کریں..... مجھے نہیں پسند یہ شہریار..... اتنا برا ہے وہ..... سلامہ شاہ تو اس سے کئی درجے بہتر

ہیں..... میں نادم ہوں، میں واقعی غلطی پر تھی۔ مگر میری غلطی کی اتنی بڑی تو سزا نہ دیں۔" وہ ایک دم اپنے جذبے عیاں کر گئی۔ صبا خاموشی سے اسے دیکھے گئیں۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔

"اب میں کچھ نہیں کر سکتی..... فیصلہ ہو گیا ہے۔ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ اب واقعی کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم ہماری بھانجی ہو، جتنی یہ ہمارے لیے خوشی کا مقام تھا کیونکہ ہمارے بھائی کی خوشی تم سے ہے لیکن ہمارے بڑوں کی زبان بھی کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ کاش تم سمجھ سکتیں۔" انہوں نے اسے چپ کرا دیا۔

نجانے انہوں نے اسے کب تیار کیا تھا۔ سجایا سنوارا تھا۔ دلہن بنا کر وہ اسے ہال کمرے میں لے گئی تھیں جہاں ساری حویلی والی اور مہمان عورتیں جمع تھیں۔ نانو ممانیاں اس سے بہت محبت سے ملیں۔ وہ ٹھنڈے یخ ہاتھوں کو جکڑے واقعی پتھر کی مورت بنی بیٹھی تھی۔ سب اس کی تعریف کر رہے تھے۔ سراہ رہے تھے مگر وہ یہاں کہاں تھی۔ اس غائبانہ ذہنی حالت میں اس کا نکاح بھی ہو گیا۔ بابا جان کے پاس نکاح کا رجسٹر لے کر آئے ان کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھتے اس نے دستخط کر دیے۔ پھر پتا نہیں وہ کب تک وہاں بیٹھی رہی تھی اور کیا کیا ہوتا رہا تھا۔

صبا باجی اس کی ذہنی حالت محسوس کر کے اسے وہاں سے نکال کر دوبارہ اس کے کمرے میں لے آئیں۔

"صبا باجی....." ان کے کندھے سے لپٹ کر وہ خوب روئی۔ سب اس کے ساتھ زیادتیاں کرتے آئے مگر اس نے پہلی دفعہ کسی کے ساتھ زیادتی کی تھی اس کی بھی تو سزا اس کو ملی تھی یہ ساری عمر کے رونے کی صورت میں۔

"اب بس بھی کرو ماورا..... اور کتنا روؤ گی۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا....." انہوں نے کافی دیر بعد خود سے جدا کرتے ہوئے کہا تو وہ پھر بلک اٹھی۔

"یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا ہے..... اور اوروں کے ساتھ کیوں نہیں ہوتا..... کیا ساری محرومیاں میرے ہی مقدر میں ہیں۔"

"ماورا..... صبر سے کام لو..... تم تو خود خاصی سمجھدار ہو..... اتنی جذباتیت کیوں....." انہوں نے کہا تو وہ سر جھکائے روتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ اٹھ کر خاموشی سے باہر نکل گئیں۔ غصے میں آ کر اس نے بھاری دوپٹہ نوچ کر پھینک دیا۔ بھاری کام سے مزین فراک اور پاجامے میں اس کا وجود دیکھنے کے لائق تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے سارے زیورات اتار کر بستر پر پٹخ دیے۔ دائیں ہاتھ میں صرف اب وہی چوڑیاں تھیں جو سلامہ شاہ نے دی تھیں۔ روتے ہوئے وہ پلٹی تو نظر دروازہ بند کیے اس کے ساتھ پشت لگا کر کھڑے سلامہ شاہ سے جا الجھی۔ وہ بڑی دلچسپ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ گھنی مونچھوں تلے کشادہ لب نجانے کیوں مسکرا رہے تھے جب کہ ماورا کے خیال میں اسے سنجیدہ ضرور ہونا چاہیے تھا۔ آخر کو اتنے دعوے کیے تھے اس نے اور اب..... مگر یہ یہاں آیا کیوں اور یہ ہنس کیوں رہا ہے۔ ماورا نے بھیگا چہرہ صاف کر کے اسے دیکھا وہ ایک ایک قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"آپ..... آپ....." سلامہ شاہ کے تیور اور اس کی یہ پیش قدمی وہ گھبرا گئی۔ کہیں غم سے میری طرح اس شخص کا دماغ تو نہیں چل گیا۔ ماورا نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"آپ..... آپ..... کب آئے....." ماورا کے اوسان خطا ہونے کو تھے۔ لڑکھڑاتا لہجہ تھا۔ سلامہ شاہ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ وہ مزید بدحواس ہوئی۔

"اگر تم یہ پوچھتیں کہ کیوں آیا ہوں تو بہت اچھے انداز میں جواب دیتا۔" سینے پر ہاتھ باندھ کر بے باک نظروں سے دیکھتے اس نے گل افشانی کی تو وہ جز بز ہو گئی۔ پہلے بھی جو ہوا تھا نا قابل قبول تھا۔ اب یہ سلامہ شاہ اور اس کے تیور..... آخر یہ اتنا خوش کیوں ہے۔" اسے الجھن ہوئی۔

"جب تم رونے دھونے میں اور زیور اتار کر پھینکنے میں مصروف تھی تو اندر آیا تھا۔ صبا باجی نے بڑی ڈرامائی چویشن بتائی تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں تم غم کی شدت سے کوئی اوٹ پٹانگ حرکت نہ کر بیٹھو۔" آخر کو ہم تمہاری ایک ایسی حرکت بھگت چکے تھے..... لیکن یہاں آ کر دیکھا تو ایسی کوئی صورتحال نہ تھی' تم تو مرنے مارنے والے موڈ میں ہو....." وہ شاید صرف اس کا جی جلانا چاہتا تھا۔ آخر کو بڑے دعوے تھے محبت کے۔ اب اتنی جلدی کیسے جان بخشی کر دیتا۔ اس نے اس کی اس ساری بکواس پر شکایتی نظروں سے دیکھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اسے نظریں جھکانا پڑیں۔ سلامہ شاہ کی نگاہوں میں کوئی شریفانہ تیور نہ تھے۔ اس نے گھبرا کر رخ بدلنا چاہا تو سلامہ شاہ نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے مزاحمت بھی نہ کرنے دی۔

"یہ..... یہ..... آپ....." بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ماورا کی اس شخص کے ساتھ ایک بھی یاد نہ تھی۔ ہمیشہ دونوں محاذ آرائی کی سی حالت میں رہے تھے اور اب اس کی یہ جسارت جب کہ درمیان میں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اس پر چیخ بھی نہ سکی۔ اس کی ضد دیکھ کر اسے باز بھی نہ رکھ سکی۔ دل عجیب طوفانوں کی زد میں تھا۔

"آپ جائیں یہاں سے..... مجھے تنگ نہ کریں۔" رندھی آواز میں کہتے اس نے اس کے ہاتھ جھٹکنا چاہے تو سلامہ شاہ ہنس دیا۔

"تم چاہے مجھے جتنا مرضی تنگ کرو اور اب بھی وہ کہتے ہیں نا کہ رسی جل گئی مگر بل نہ گیا۔ رو رو کر ان خوبصورت آنکھوں کا ستیاناس مار لو گی مگر منہ سے نہیں پھوٹو گی۔" ہنسی روک کر اس نے کہا تو وہ شرمندہ سی ہو کر بھی رو دی۔ "اس شخص کو صبا باجی نے سب بتا دیا ہے اب یقیناً یہ مجھے طنز کی مار مارے گا۔ کیسا ظالم ہے یہ بھی....."

"کیا مطلب ہے آپ کا؟..." سلامہ کی بات نے اس کے اعصاب جھنجھوڑ دیے تھے۔ ذرا چہرہ صاف کر کے پوچھا۔

"مطلب بھی میں سمجھاؤں یا تم سمجھاؤ گی....." اس کے گمبھیر لہجے پر ماورا اتنی بری طرح الجھی کہ آنسوؤں کی روانی میں ایک دم اضافہ ہوا۔

"پلیز۔ چھوڑ دیں مجھے..... جائیں یہاں سے....." اپنے کندھوں سے اس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش میں ناکام ہو کر اس نے چیخ کر کہا۔

"ماورا..... اب بس بھی کرو..... سچ کتنا پانی ہے تمہاری آنکھوں میں۔ ایک عرصے سے اپنے پیچھے خوار کیا ہے تم نے مجھے اور اب آنسو بہا بہا کر جان لینے کے درپے ہو۔"

اس کے بہکتے جذبوں سے عاری آواز پر وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی۔

"پاپا نے بہت غلط کیا میرے ساتھ..... میں نے انہیں منع بھی کیا تھا مگر پھر بھی انہوں نے آج نکاح کر دیا..... مگر مجھے نہیں کرنی اس شہریار گھونچو سے شادی..... سن لیں۔ آپ بھی..... کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔

سلامہ شاہ شہریار کو گھونچو کہنے پر زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"آپ ہنس کیوں رہے ہیں۔" اس نے غصے سے پوچھا۔

"اب تم یوں احمقوں والی حرکتیں کرو گی تو میں ہنسوں بھی نہیں....." ہنسی دبا کر اس نے ماورا کی آنکھوں میں جھانکا پھر اس کے تمام آنسوؤں کو پوروں سے چن لیا۔ وہ کوئی مزاحمت بھی نہ کر سکی۔ صرف اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں ان گنت جذبوں کی روشنی تھی۔

"تمہارا کسی شہریار وغیرہ سے نکاح نہیں ہوا....." اس نے ایک دم ماورا کے حواس پر بم پھوڑا۔

"کیا...... تو پھر؟" وہ پھیلی آنکھوں سے حواس باختہ تھی۔

"تو پھر مجھ سے ہوا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میرا تم سے وعدہ ہے محبت تم سے کی ہے شادی بھی تم سے کروں گا دیکھ لو کتنا سچا ہوں میں اپنی محبت میں بقول شاعر

میں اپنے عشق میں سچا ہوں اور کہتا ہوں
میرے لہو میں بہت زہر ہے رقابت کا
ہزار اس نے چاہا میں بکھر جاؤں
پر میں نے صبر کیا، صبر بھی قیامت کا

تم سے محبت کی ہے۔ تمہارے احمقانہ انکار پر بہت غصہ آیا کہ جی تو چاہا منٹوں میں دماغ سیدھا کروں۔ اس طرح تمہارے سارے کل پرزے ٹھیک ہو جائیں گے مگر پھر سوچا، ہو تو تم پتھر کی مورت ہی۔ اتنے عرصے سے سر پھوڑ رہا ہوں کیا فائدہ ہے۔ تھرڈ آوٹ پر اپر چینل استعمال کرو۔ اب افسوس ہو رہا ہے کہ یہ پراپر طریقہ کاش پہلے استعمال کیا ہوتا تو کب کی ہماری دسترس میں ہوتی۔"

وہ ہزار ہا جذبوں میں گھرا اسے بتا رہا تھا اور ماورا کی وہ حالت تھی گویا کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ مرتے مرتے دوبارہ زندگی ملی تھی۔ خدا کیسے پل میں مہربان ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

"اب کیوں رو رہی ہو؟" روتے میں ہنس دی۔

"ہیں اب کیا ہوا ہے.....؟" اس نے گھورا۔

"یہ بھی کوئی انسانوں والا طریقہ تھا میری جان نکال کے رکھ دی اور صبا باجی بھی کیسی ڈکٹیٹر بن بیٹھی تھیں۔ ذرا بھی میرے رونے کا احساس نہ کیا۔ اتنا نہ ہوا کہ مجھے بتا ہی دیں۔" ہنسی روک کر کچھ خفگی سے اسے دیکھا تو وہ ہنس دیا۔

"تمہیں اگر وہ بتا دیتیں تو یہ سارا معاملہ کیسے سلجھتا۔ تم نے اچھا خاصا چوپٹ کر دیا تھا وہ تو بھلا ہو میرے بڑوں کا کہ ان کی عقل تمہاری طرح گھاس چرنے نہیں گئی تھی۔ بہتر فیصلہ کیا۔ میری بھی رائے تھی کہ تمہیں لاعلم رکھا جائے۔ تمہارا کیا تھا تم پھر کوئی کھڑاک کر دیتیں بمشکل ہی تو قابو میں آئی ہو۔ ویسے تمہیں شرم آنی چاہیے تھی یوں مجھ سے اپنے جذبات چھپانے پر۔ جب میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا ایک ایک جذبہ تمہارے سامنے تھا تو تم نے یہ بے ایمانی کیوں کی؟" وہ ایک دم یوں باز پرس پر اتر آیا تھا جیسے درمیانی تعلقات ہمیشہ ہی سے اسی طرح قائم دائم تھے۔ ماورا نے گھورا۔

"میں نے کوئی بے ایمانی نہیں کی۔ مجھے خود علم نہیں تھا وہ تو ان ہی دو تین دنوں میں علم ہوا کہ..... " وہ کہتے کہتے ایک دم رک گئی۔ سلامہ شاہ کو دیکھا وہ پوری طرح متوجہ تھا۔

"کہ محترمہ ہمارے عشق میں مبتلا ہو چکی ہیں۔" وہ ہنسا۔ وہ زچ ہوئی اس کی خوش فہمی پر۔

"میں کوئی مبتلا وبتلا نہیں ہوئی بس بات ساری یہ ہے کہ پوری ایمانداری سے سوچا تو آپ کی محبت اور آپ کی شخصیت اتنی بری بھی نہ تھی۔ اسی لیے..... " وہ شرارتی انداز میں مزید کچھ کہتی جب سلامہ شاہ نے اس کے ہونٹوں پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔"

ختم